خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

جنوری 2014

نگران اعلیٰ

معراج رسول







جلد44 • شمارہ 01 جنوری 2014 • زرسالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون:35895313(021) فیکس35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

اُمّید

جون ایلیا

وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ ان زمانوں میں بھی جن کی کچھ نشانیاں ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جن کے بارے میں ہم نے کچھ دھندلی کہانیاں سنی ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو نیم تاریخی کہے جاتے ہیں۔ ان زمانوں میں بھی جو تاریخی کہلاتے ہیں اور اس زمانے میں بھی جس میں ہم اور تم سانس لے رہے ہیں۔ ہاں وہ قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کا چین رہی ہے اور ہے۔

انسان نے اس کی زندہ رکھنے والی آنچ کے سہارے نہ ختم ہونے والے برفانی دور گزارے۔ وہ سب کچھ وہاں زمین، آسمان اور آگے پیچھے اور دائیں بائیں کا سب کچھ سہتا رہا اور صرف اسی کے سہارے رہتا رہا۔

وہ نہ ہوتی تو آج انسانی تاریخ نام کی کوئی چیز بھی نہ پائی جاتی۔

تو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔

اگر تو ہم سے، ہمارے دلوں سے کوچ کر جائے

تو ہمارا ہر سانس جاں کنی کا سانس ہو۔

ہماری پتلیاں پتھرانے لگیں اور ہم دم توڑ دیں۔

تو ہم میں ہے اور اس طرح ہے جس طرح ہم تجھ میں ہوں۔

اے سیجاز ادی! تو ہماری صحت اور طاقت ہے۔

اے دل آبادی، خزاں، بہار اور ان کے بیچ ہماری دل آبادی

تو زردی میں بھی ہمارا آسرا ہے اور سرسبزی میں بھی

ہم نے تجھے چوترے پر بٹھایا اور تیرے دونوں پاؤں

چوترے سے نیچے اپنے سینے پر رکھے

اور پھر بیج ڈالنے والوں نے اتر سے دکن تک

اور پچھم سے پورب تک بیج ڈالے

اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے

اور پھر فصل پکی اور کاٹی گئی

اناج کو گاہا گیا

اور تیرے دونوں پاؤں ہمارے سینے پر تھے

ہم تیرے ہی سہارے زندہ ہیں۔

اور تیرے ہی بھروسے پر دن اور رات کے سارے کام کرتے ہیں۔

تو ہی ہمارا آسرا اور ہمارا بھروسا ہے۔

یہ دن، بہت برے دن ہیں۔

یہ راتیں بہت بری راتیں ہیں۔

پر ہم تیرے آسرے اور تیرے بھروسے پر گزران کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف بپتیں، دشمنیں اور ہلاکتیں ہیں

مگر ہم قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین کے سہارے جیتے ہیں۔

ہم تیرے سہارے جیتے ہیں۔

اور اب بھی اچھے دنوں اور اچھی راتوں کے خواب دیکھتے ہیں

اے قبیلوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قوموں کے دلوں کے چین! ....

عزیز قارئین

السلام علیکم!

جنوری 2014ء کا پہلا دلفریب شمارہ آپ کے زیرِنظر ہے...... نیا سال...... نئی سوچ، نئے ولولے مگر...... حالات میں کوئی نیا پن نہیں...... اللہ کرے یہ نیا سال ہماری زندگی اور ملکی حالات و واقعات میں بھی کچھ خوشگوار تبدیلی لائے (الٰہی آمین) کیونکہ مسلسل زود رنجی اعصابی دباؤ میں مبتلا کرتی ہے اور دہشت گردی، مہنگائی، بم دھماکے، بے روزگاری، باقاعدہ لوڈشیڈنگ کے بے قاعدہ بلوں کی یلغار کا تسلسل عوام کو پست ہمت اور بدظنی کی طرف مائل کرنے کا سبب بنتے جارہے ہیں۔ یہ حکمران طبقے کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ جب محکوم نہ ہوں تو حکمرانی کا تصور حماقت ہے۔ بات اگرچہ فلسفیانہ رخ اختیار کرگئی ہے مگر فلسفے بھی تو زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ چھوٹی سی بات ہے گزشتہ ماہ کرسمس اور قائداعظم محمد علی جناح کی پیدائش کا دن منایا گیا مگر کتنا بڑا تضاد ہے کہ غیر مسلم اپنے عوام کے لیے ایسے موقعوں پر مہنگائی اور منافع خوری کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دیتے ہیں تاکہ ہر طبقہ اپنے حصے کی خوشیوں کا بھرپور لطف اٹھا سکے جبکہ مسلم دنیا میں رمضان، عید یا کوئی بھی تہوار ہو مہنگائی اور منافع کی شرح کے لیے ہر میزان اور حد کو توڑ دیا جاتا ہے۔ گیس کی لوڈشیڈنگ کے دن اگر نوٹ کیے جائیں تو جمعۃ المبارک کو خاص طور پر گیس کو کم یا بالکل بند کردیا جاتا ہے جب لوگ نماز کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں...... بے بسی اور بے حسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے، آج کل حکومت کی جانب سے بے روزگاری کے خاتمے کے لیے آسان شرائط پر قرضہ جات کی سہولت کا بڑا شور ہورہا ہے مگر بے اعتباری ہے کہ اس کی شفافیت پر یقین کرنے کو دل ہی نہیں مانتا...... کاش اس اقدام سے بیچ بیچ بے روزگار نوجوانوں کو فائدہ پہنچے اور انہیں بھی درست سمت میں رہنمائی میسر آئے (آمین) آنے والے سال کے اس پہلے ماہ میں کشکول سیریل کا اختتام ہورہا ہے۔ 30 اقساط پر مشتمل یہ داستان آپ کی دلچسپی کا باعث رہی، اگلے ماہ ان شاء اللہ ان صفحات پر آپ کی نئے مگر دلچسپ کرداروں سے ملاقات ہوگی...... خوب صورت احساسات لیے اب چلتے ہیں اپنی نت کھٹ محفل کی جانب جہاں بے شمار سندیسے ہمارے منتظر ہیں......

☒ **بلیک کیٹ**، بلدیہ، کراچی سے ایک طویل غیر حاضری کے بعد شور و غل کے ساتھ شامل محفل ہیں ”سسپنس کے سرورق پہ دوشیزہ کے ہمراہ بھوت کو دیکھ کے خون کھول اٹھا، حالتِ جلال میں بھوت کو لات رسید کرتے ہوئے محفل کی جانب دوڑ لگائی۔ اے لو جی ایک کچہ بچہ صدارت کے جھولے میں لیٹے فیڈر پیتے قلقاریاں مار رہے ہیں۔ کچے بچے کے خط میں خاص بات سسپنس کی چمچہ گیری ہے اسی وجہ سے ان کو صدارت ملی ہے نا؟ صنف کرخت کے نمائندے بابر بھیا آپ ابھی تک زندہ ہیں ہم تو سمجھے تھے پرلوک سدھار چکے ہوں گے ویسے آپ کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ راجا راحیل اللہ جی عمران بلوچ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ مرحوم اچھے تبصرہ نگار تھے، احمد خان توحیدی اس ماہ بھی محفل غائب ہوجاتے تو کیا بات تھی۔ ویلڈن بشریٰ افضل بی صنف کرخت سے اب مقابلہ کانٹے کا ہوگا اس کارِخیر میں آپ کا ہاتھ بٹانے میں آگئی ہوں۔ اعجاز راحیل آپ جگا جی ہیں؟ پتا نہیں کیوں ہمارے منہ سے جگا جی کے بجائے ڈاکا جی نکل جاتا ہے، ادریس احمد خان شریف بھائی ہیں اس لیے ان کو معاف کرتی ہوں۔ بھائی قدرت نیازی بخدا آپ کے تبصرے میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ انجم ریاض اور ماریہ فاروق ڈیئرز تحریر میں کچھ شوخی کا عنصر نمایاں کرو۔ آسیہ مقبول چودھری آپ آتے ہی چھا گئی ہو ویسے یہ بھوت باتوں سے نہیں لاتوں سے مانتے ہیں۔ زوبیا اعجاز آپ محفل میں اچھا اضافہ ہو جو لوگ آپ پہ تنقید کرتے ہیں ان کو ہلکی پھلکی جھاڑ پلا دیا کرو، عاصم اقبال چہال کا تبصرہ اچھا لگا...... ارررے ذیشان بدر منیر آپ کہاں گم ہوگئے تھے۔ اب محفل میں مستقل آتے رہنا، باجی طاہرہ گلزار ماشاء اللہ آپ نے کتنی پیاری تجویز دی۔ اللہ آپ کی زبان مبارک فرمائے اور کچھ صفحات بڑھ جائیں، چلبلے کھٹے میٹھے تبصرہ نگار ہمایوں سعید راج آپ 83 کے ہوں یا 93 کے ہم آپ کے فین ہیں، چھت سے لٹکنے والے نہیں بلکہ پرستار سمجھیے گا۔ گل مروت آپ صنف نازک کی نمائندگی کیا کرو۔ صنف نازک کی نمائندگی کیا کرو صنف کرخت کی چمچہ گیری نہیں اور یہ قیصر اقبال آپ کے بھائی ہیں کیا، بتائیے؟ محمد جاوید آپ کے شوخ تبصرے محفل کو چار کیا آٹھ چاند لگا لیتے ہیں۔ نواب صاحب کی ماروی کو میں دیوتا کا نعم البدل سمجھی تھی مگر کہانی بالکل اچھی نہیں لگی، انوار صدیقی کی کشکول نکھرتی جارہی ہے۔ نگینہ کی موت کا افسوس ہوا آکٹوپس کا بیڑہ غرق ہو۔ حاشیہ بردار بہت اچھی لگی۔ ش م جمیل نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے ٹکڑے ہونے کو بہت اعلیٰ طریقے سے قلمبند کیا، کھلاڑی کاشف زبیر کی بھی اچھی تھی میں ویسے بھی کاشف زبیر کو ذوق و شوق سے پڑھتی ہوں، گیری جونز کی آنکھ مچولی اچھی لگی۔ رقصِ اجل میں منظر امام نے جاگیرانہ نظام کو اجاگر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے نہ جانے کتنی چندا اس بے ہودہ نظام کی بھینٹ چڑھ کے قربان ہوچکی ہیں۔ طاہر جاوید کی کہانی تحفۂ دل کو اداس کرگئی۔ اشعار کی محفل میں سوہا جی، مسز بابر عباس، ابرار وارث کے شعر اچھے لگے۔ سر جی ایک تو گھر کے بے حساب کام اوپر سے لائٹ کی لوڈشیڈنگ اس وجہ سے اتنا ہی تبصرہ کرپائی ہوں۔“

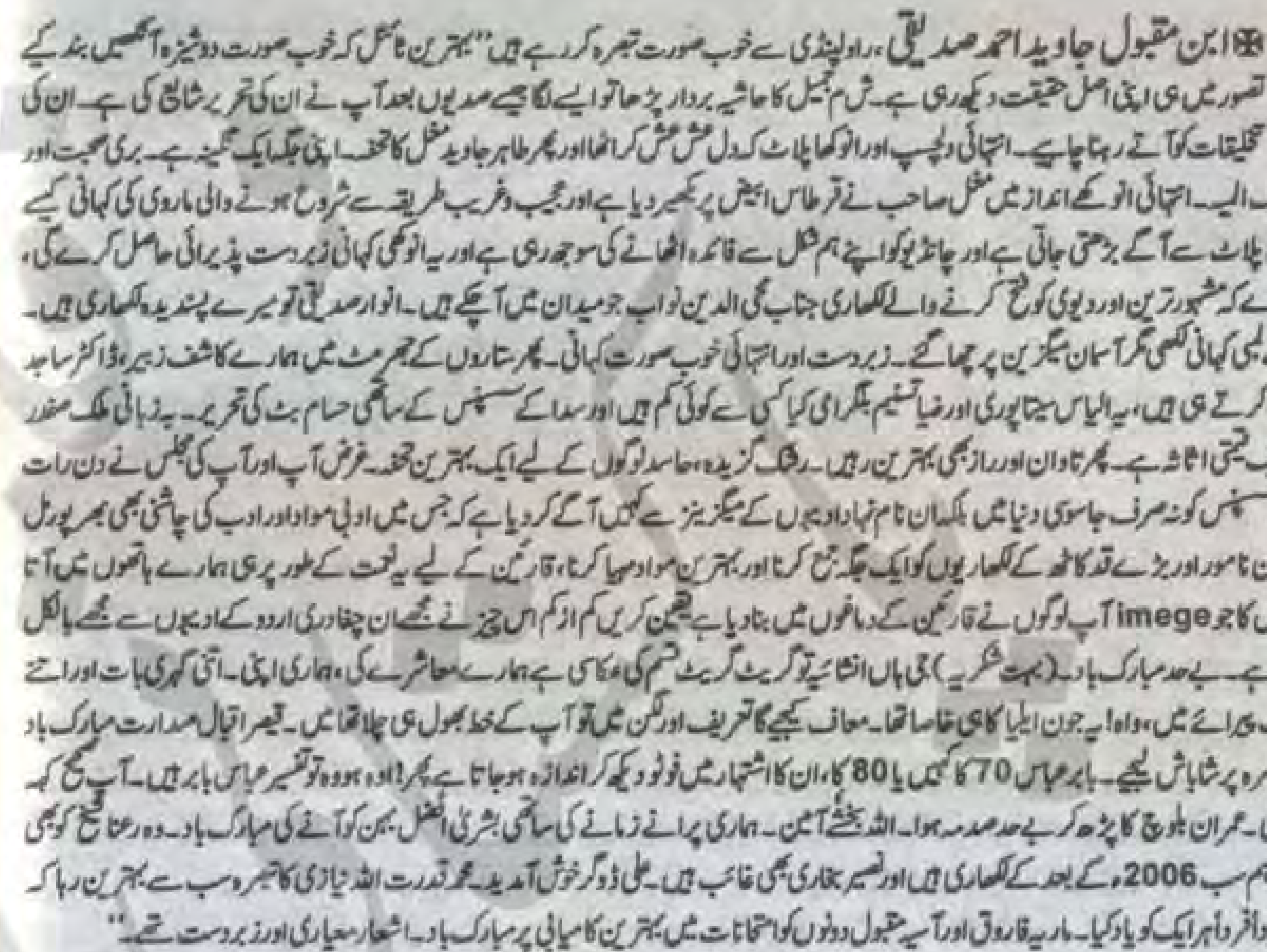
☒ **اشفاق شاہین**، کراچی سے محفل میں شرکت کررہے ہیں ”مسافر میری پسندیدہ کہانی تھی اور میں سرورق یا کچھ بھی پڑھے بغیر سب سے پہلے مسافر پڑھتا تھا، درمیان میں جب کہانی میں تیزی آئی تو اندازہ ہوا کہ مسافر اپنے اختتام کی طرف جارہی ہے، پچھلے ورق پلٹ کر مسافر کا پہلا صفحہ دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا کہ یہ آخری قسط ہے پھر تو کہانی کو پانچوں گیئر لگ گیا اور میڈم نے سب کچھ اتنی تیزی سے پلان کیا کہ ہم چاہنے کے باوجود انہیں روک نہ سکے، مسافر میں جو چاشنی، شدت اور سنسنی خیزی تھی وہ اب شاید ہی پڑھنے کو ملے، پچھلے ماہ لکھنا تھا لیکن باوجود کوشش کے نہ لکھ پایا تو اس بار پہلی فرصت میں لکھ رہا ہوں، باقاعدگی سے سب سلسلے پڑھتا ہوں، باقاعدگی سے لکھا نہیں جاتا کہ شپ Ship کی نوکری ہی ایسی کہ مصروفیات حد سے زیادہ ہوتی ہیں۔ نئی تحریر ماروی پڑھی، نواب صاحب کے کردار بہت پڑھے لکھے اور پلاننڈ ہوتے ہیں، ان کا اپنا ایک مخصوص اسٹائل ہے، یہ الگ بات ہے کہ ان کی ہر کہانی دلچسپ نہیں ہوتی، کم از کم

میرے لیے بلاشبہ وہ بہت بڑے رائٹر ہیں۔ دوسرے نمبر پر کشکول زبردست جارہی ہے، کشکول پڑھنے کے بعد ہی سرورق، اداریہ اور باقی کہانیوں کا نمبر آتا ہے، بہرحال سسپنس ایک مکمل رسالہ ہے جس میں ہم سب کی دلچسپی کے لیے بھرپور مواد موجود ہے۔ ”آپ کے خط“ میں بھی خوب رونق لگی ہے اور محفل شعر و سخن کی تو کیا تعریف کریں، تھوڑی سخاوت آپ بھی کردیں اول، دوم اور سوم اشعار کے لیے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر تین سو، دو سو اور ایک سو کے ایزی لوڈ کا اعلان کردیں تو سلسلے کو 8 چاند لگ جائیں گے۔“

☒ **امین مراد انصاری**، کراچی سے چلے آرہے ہیں ”دسمبر 2013ء کا شمارہ سسپنس ڈائجسٹ 23 نومبر کو ملا۔ اپنا خط پاکر دلی خوشی ہوئی، شکریہ۔ آپ گزشتہ شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی انشائیہ میں جون ایلیا کا نظر آنا، بہت خوب صورت اور دل و دماغ کو چھو لینے والی تحریر تھی۔ ابھی ڈائجسٹ کا پوری طرح مطالعہ نہیں کیا ہے۔ انشائیہ اور خطوط کا کالم ہی دیکھا ہے۔ خطوط کے اس کالم میں طاہرہ گلزار، پشاور نے مشورہ دیا ہے کہ ڈائجسٹ کی قیمت بڑھادی جائے۔ ارے بہا ہم غریبوں کا خیال کرو، آپ کی تو فیکٹری چل رہی ہے لیکن ہمیں تو نوکری بھی نہیں ملتی۔ امید ہے کہ نئے سال کے آغاز میں کچھ نئے سلسلے بھی شروع کیے جائیں گے۔ ڈائجسٹ میں عوامی کالموں کی کمی ہے، پلیز غور فرمائیے گا۔ تمام دوستوں کو اور تمام اسٹاف کو نیا سال مبارک۔“

☒ **مظہر سلیم**، مرادگڑھ، رحیم یار خان سے تشریف لارہے ہیں ”نومبر کے شمارے کے لیے ہم نے اپنا تبصرہ بہت محنت سے تحریر کیا تھا۔ ہم نے سوچا ہمارا تبصرہ اکیس توپوں کی سلامی کے ساتھ مسند اقتدار تک پہنچے گا لیکن ہوا یوں کہ بڑے بے آبرو ہوکے تیرے کوچے سے ہم نکلے۔ خیر ظلم برداشت کرتے ہوئے ایک بار پھر محفل میں وارد ہونے کی جسارت کررہے ہیں (شکریہ) دسمبر کے سسپنس کا سرورق دلکشی سے خالی محسوس ہوا کیوں ہوا ہم کوئی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ جون ایلیا کا انشائیہ اور آپ کا اداریہ ہمیشہ سے ہمارے لیے رغبت کا باعث رہے ہیں۔ ہمارے تعریفی و توصیفی لفظ آپ کی کاوشوں کا احاطہ کیسے کریں؟ لفظ بہت چھوٹے ہیں۔ خطوط میں ہمارے دیرینہ رفیق قیصر اقبال کچہ صاحب ظرافت کی چاشنی لیے جامع اور بہترین تبصرے کے ساتھ پہلے پائیدان پر خوش نظر آئے، مبارکاں۔ برادرم اعجاز احمد راحیل ہم آپ کی تلخ نویسی کا شکوہ نہیں کریں گے بس ایک سوال ہے کہ قیامت تو ہمارے دل پر آئی آپ کیوں روئے؟ بشریٰ افضل صاحب آپ کے تبصروں میں تحریر کے رنگ پھیکے ہیں ذرا توجہ دیں۔ قدرت اللہ نیازی آپ کے خطوط میں ”ادب“ کم اور بونگیاں زیادہ شتر بے مہار کی طرح سر اٹھائے گھومتی رہتی ہیں کیوں جی؟ محفل میں شامل نئی تبصرہ نگار انجم ریاض کا تبصرہ اچھا لگا، آسیہ مقبول چودھری فرسٹ ڈویژن لینے پر مبارکباد قبول کریں۔ گل مروت! اکبر شاہ کے حوالے سے لکھی گئی آپ کی بات پر بے اختیار ہنس پڑے۔ باقی تبصرہ نگاروں میں سید اکبر شاہ، علی ڈوگر کے تبصرے اچھے لگے۔ زوبیا اعجاز کا تبصرہ ان کے سابقہ تبصروں کی نسبت بہت اچھا تھا، بہت خوب زوبیا جی! اسعدیہ بخاری، تفسیر عباس اور آغا فرید احمد خان کی کمی محسوس ہوئی۔ کہانیوں کی ابتدا نواب صاحب کی نئی قسط وار کہانی ”ماروی“ سے کی۔ ابتدا ہی سے ”ماروی“ نے ہمیں اپنا اسیر کرلیا ہے۔ محبوب علی چانڈیو کے تھمے آگے نجانے کیا گل کھلائیں۔ ویسے ہماری تمام ہمدردیاں مراد علی منگی کے ساتھ ہیں۔ معروف جتی کا کردار پسند آیا۔ منظر امام کی تحریر رقص اجل تعفن زدہ ماحول اور پرانے موضوع پر لکھی گئی تحریر تھی مگر مصنف کے جداگانہ اندازِ تحریر نے جدت پیدا کردی۔ داستان کی بے مروتی اچھی نہیں لگی، چندا کے ساتھ ہونے والے ظلم اور موت دکھی کرگئی۔ تاریخ کے اوراق کا آئینہ ”لذت آشنائی“ ایک تہذیب، ایک معاشرے کی جیتی جاگتی کہانی جس میں بل کھاتے ہوئے واقعات ہماری توجہ کا مرکز رہے۔ رنجیت سنگھ کا کردار اچھا لگا۔ آخری صفحات کی سوغات ”دھوپ چھاؤں“ ذیشان کی بے بسی حاجرہ عرف ڈولی کی دل پھینک فطرت کی عکاس یہ داستان ذیشان کی موت پر ہماری آنکھیں نم کرگئی، اب بات کرتے ہیں اس شمارے کی سب سے بہترین کہانی کی۔ ش م جمیل کے قلم کا شاہکار ”حاشیہ بردار“ قلم کی حرمت کا دفاع کرتے ہوئے صاحب تحریر ایک بہترین کہانی کے خالق قرار پائے۔ صائمہ کا موقف صحیح تھا، تاہم احسان ضیا کی بے بسی افسردگی کا باعث بنی۔“

☒ **ثمینہ حبیب**، مری آباد، کوئٹہ سے محفل کی زینت بنی ہیں ”سال کا آخری سسپنس حیرت انگیز طور پر 18 نومبر کو ملا۔ سرورق اچھا تھا، خاص کر رنگوں کا امتزاج بہترین رہا۔ کہانیوں کی ابتدا آخری کہانی سے کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی دھوپ چھاؤں پڑھی ہوئی کہانی ثابت ہوئی۔ کھلاڑی میں کہاں تو ایف بی آئی والوں نے مجرموں کو پکڑنے کی غرض سے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہاں آخر میں گیری نے خود ہی مجرموں کو بھاگنے کا موقع فراہم کیا۔ یہ کیا بات ہوئی بھر......؟ ملک صفدر حیات کی کہانی حسام بٹ کے قلم کی زبانی مجرم محرم جرم و سزا بڑی دلچسپ کہانی رہی۔ رشک گزیدہ کا نام دوست گزیدہ ہونا چاہیے تھا۔ ایڈی نے اپنے دوست کو ہی ڈس لیا۔ طاہر جاوید مغل کی طبع زاد کہانی تحفہ پڑھ کے دل بوجھل ہوگیا۔ تحفہ کچھ زیادہ ہی مہنگا پڑ گیا فہد احمد کو۔ تاوان میں جعلی کرنسی والے نوٹ سے تاوان ادا ہوگیا اور بیوی بھی بازیاب ہوگئیں لیکن اغوا کنندگان کے ساتھ ساتھ لیونارڈو بھی نہ کبھی پکڑا تو جائے گا ناں......؟ راز بہت گنجلک لگی اس لیے آدھی پڑھ کے چھوڑ دی۔ کہانیوں میں اتنا ہی پڑھ پائی ہوں۔ انشائیہ لوگ کیا کہیں گے کی تفسیر تھی اگر زندگی بھر یہی سوچتے رہیں کہ فلاں کام کے کرنے یا نہ کرنے پر لوگ کیا کہیں گے تب تو گزر گئی زندگی۔ اداریہ میں انکل جی عیسوی سال کی جدائی اور اسلامی سال کے آغاز کی بات کررہے تھے۔ اسلامی سال کا آغاز کچھ اچھا نہیں رہا۔ راولپنڈی میں یوم عاشور پر ہونے والے فساد نے تمام دردمندوں کو دکھی کردیا بس اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے (آمین) بابر عباس، مسز عباس آپ کے زردے کی دیگ کی اصطلاح نے کافی محظوظ کیا۔ راجا راحیل! اللہ آپ کو اور دیگر بے جرم اسیروں کو معصوم اسیرانِ کربلا کے صدقے میں قید سے رہائی دلائے۔ آمین۔ عمران بلوچ کی موت پر دل از حد ملول ہوگیا (اناللہ وانا الیہ راجعون) اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ علی ڈوگر خوش آمدید۔ انجم ریاض جی میرا بھی نہ صرف پہلا بلکہ اس کے بعد بھی باقاعدگی سے لکھنے کے باوجود کافی سے زیادہ تبصرے نہیں چھپے لیکن آپ کی بات درست ہے کہ کوشش کامیابی کا دوسرا نام ہے۔ اب خط نہیں چھپتا اس وجہ سے ہم رسالہ پڑھنا تو نہیں چھوڑ سکتے ناں......؟ ماریہ فاروق، آسیہ مقبول دونوں کو امتحان میں کامیابی پر مبارکباد۔ ذیشان بدر منیر! آپ کی بات سے صد فیصد اتفاق کرتی ہوں کہ ہم ایک دفعہ ہی بغاوت کیوں نہیں کردیتے، اس چوپٹ نظام کے خلاف جس میں غریبوں سے جینے کا حق تک چھین لیا گیا ہے۔ کتر نیں اس بار معمول سے زیادہ رہیں۔“



ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، راولپنڈی سے خوب صورت تبصرہ کر رہے ہیں "بہترین ٹائٹل کہ خوب صورت دوشیزہ آنکھیں بند کیے تصور میں ہی اپنی اصل حقیقت دیکھ رہی ہے۔ ش م تجمل کا حاشیہ بردار پڑھا تو ایسے لگا جیسے صدیوں بعد آپ نے ان کی تحریر شائع کی ہے۔ ان کی تخلیقات کو آتے رہنا چاہیے۔ انتہائی دلچسپ اور انوکھا پلاٹ کہ دل عش عش کر اٹھا اور پھر طاہر جاوید مغل کا تحفہ۔ اپنی جگہ ایک نگینہ ہے۔ بری صحبت اور موبائل کا ایک المیہ۔ انتہائی انوکھے انداز میں مغل صاحب نے قرطاس ابیض پر بکھیر دیا ہے اور عجیب وغریب طریقہ سے شروع ہونے والی ماروی کی کہانی کیسے انوکھے ترین پلاٹ سے آگے بڑھتی جاتی ہے اور چانڈیو کو اپنے ہم شکل سے فائدہ اٹھانے کی سوجھ رہی ہے اور یہ انوکھی کہانی زبردست پذیرائی حاصل کرے گی، کیوں نہ کرے کہ مشہور ترین اور ردیوی کو فتح کرنے والے لکھاری جناب محی الدین نواب جو میدان میں آچکے ہیں۔ انور صدیقی تو میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ منظر امام نے لمبی کہانی لکھی مگر آسمان میگزین پر چھا گئے۔ زبردست اور انتہائی خوب صورت کہانی۔ پھر ستاروں کے جھرمٹ میں ہمارے کاشف زبیر، ڈاکٹر ساجد امجد تو جگمگ کرتے ہی ہیں، یہ الیاس سیتاپوری اور ضیا تسنیم بلگرامی کیا کسی سے کوئی کم ہیں اور سدا کے سسپنس کے ساتھی حسام بٹ کی تحریر۔ یہ زبانی ملک منظور حیات بھی ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ پھر تاوان اور راز بھی بہترین رہیں۔ رشک گزیدہ، حاسد لوگوں کے لیے ایک بہترین تحفہ۔ غرض آپ اور آپ کی مجلس نے دن رات محنت کر کے سسپنس کو نہ صرف جاسوسی دنیا میں بلکہ ان نام نہاد ادیبوں کے میگزینز سے کہیں آگے کر دیا ہے کہ جس میں ادبی مواد اور ادب کی چاشنی بھی بھرپور مل رہی ہے۔ ان نامور اور بڑے قد کاٹھ کے لکھاریوں کو ایک جگہ جمع کرنا اور بہترین مواد مہیا کرنا، قارئین کے لیے یہ نعمت کے طور پر ہی ہمارے ہاتھوں میں آتا ہے۔ سسپنس کا جو imege آپ لوگوں نے قارئین کے دماغوں میں بنادیا ہے یقین کریں کم ازکم اس چیز نے مجھے ان چنادری اردو کے ادیبوں سے مجھے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ بے حد مبارک باد۔ (بہت شکریہ) جی ہاں انشائیہ تو گریٹ گریٹ قسم کی عکاسی ہے ہمارے معاشرے کی، ہماری اپنی۔ اتنی گہری بات اور اتنے خوب صورت پیرائے میں، واہ! یہ جون ایلیا کا ہی خاصا تھا۔ معاف کیجیے گا تعریف اور لگن میں تو آپ کے خط بھول ہی چلا تھا میں۔ قیصر اقبال صدارت مبارک باد اور بہترین تبصرہ پر شاباش لیجیے۔ بابر عباس 70 کا کہیں یا 80 کا، ان کا اشتہار میں فوٹو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے پھر اوہو وہ تو تفسیر عباس بابر ہیں۔ آپ کچھ کہہ رہے ہیں بھئی۔ عمران بلوچ کا پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا۔ اللہ بخشے آمین۔ ہماری پرانے زمانے کی ساتھی بشریٰ افضل بہن کو آنے کی مبارک باد۔ وہ رعنا فتح کو بھی لے آئیں۔ ہم سب 2006ء کے بعد کے لکھاری ہیں اور نصیر بخاری بھی غائب ہیں۔ علی ڈوگر خوش آمدید۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ سب سے بہترین رہا کہ انہوں نے فرداً فرداً ہر ایک کو یاد کیا۔ ماریہ فاروق اور آسیہ مقبول دونوں کو امتحانات میں بہترین کامیابی پر مبارک باد۔ اشعار معیاری اور زبردست تھے۔"

عاصم اقبال جسپال، ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "رواں ماہ کا شمارہ سسپنس ہمیں 21 تاریخ کو زندان میں گویا خشک مردہ پتوں پر شبنم کی بارش کی طرح مہربان ہوا تو جان میں جان آئی، جیسے ہم نے تیرے نام کی تختی دبوچ لی...... سب رنگ کائنات کے مٹھی میں آگئے، کے مصداق بالکل سچ ثابت ہوا۔ حسب سابق جون ایلیا دل کی اتھاہ گہرائیوں کو چھو جانے والی دل آویز گفتار کا تانا بانا بنتے ہوئے کیا خوب عکاسی حالات کی ہے، ہم لکھا کہ ہمارا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہے ہی نہیں۔ بعدازاں محفل یاراں کے دریچہ خوشبو میں پہلے نمبر پر بھائی قیصر اقبال کچھ کو کرسی صدارت پر براجمان پایا۔ مبارک جناب من آپ کی شمولیت کو ایک سال گزرا اس پر بھی صد گل نچھاور واقعی حق دار ٹھہرے۔ اعجاز احمد راحیل صاحب سسپنس کی خوشیوں والی بات مجھے بھی ایسے ہی ہمہ وقت محظوظ کرتی ہے۔ شادیوں کے سیزن کے معاملہ پر کافی تجربہ کار لگتے ہیں فارغ وقت شادی کارڈ تقسیم تو نہیں کرتے ہٹ تبصرہ ازگنڈ۔ ماروی کی پہلی قسط پڑھی، محی الدین نواب صاحب نے دلچسپی کی نئی سیریل شروع کی ہمراو کا گدھا گاڑی سے محبوب چانڈیو تک کا سفر زبردست، جنون محبت بنی دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کہ ماروی کے لیے جیت کس کے نصیب میں ہے۔ لذت آشنائی پڑھی، الیاس سیتاپوری کی تحریر مہاراجا رنجیت سنگھ کی عیش پرستی اور حریت، موراں کی انتہائی محبت اور رازداری زبردست رہی اور چوتھے قیوم ضیا تسنیم بلگرامی کی کہانی نے ہمارے ایمان کو توانائی بخشی۔ نہایت عمدہ انتخاب دین دوستی کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ مجرم محرم اور تاوان دونوں اچھی کہانیاں تھیں۔ محفل شعروسخن میں تمام احباب کی کوشش اچھی تھی، خاص طور پر سوہاجی، سعدیہ ناز، احمد خان توحیدی، طاہرہ گلزار کا انتخاب پسند آیا۔"

رانا منشی حماد فریاد، قیدی سزائے موت سینٹرل جیل، ساہیوال سے محفل میں حاضر ہیں "آج نومبر کی 16 تاریخ ہے صبح سے ہی جسم پر کپکپی طاری تھی جسم شدت بخار سے تپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے بابا رفیق حوالدار کے پاس گیا تھا تاکہ وہ اسپتال کال کروائے اور ڈاکٹر دوا دے جائے مگر بارک کے گیٹ پر پہنچے پر علم ہوا کہ بابا رفیق تو بینٹ لینے کے لیے شہر گیا ہوا ہے۔ جھٹ سے دل میں خیال آیا کاش وہ آتے ہوئے ہمارا محبوب رسالہ بھی لیتا آئے۔ ہاں تو میں ڈبل کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا کہ اعجاز بھائی نے آکر پکارا۔ حماد فریاد تمہارا بخار اتاروں؟ میں نے کمبل سے سر نکالا تو اعجاز نے سسپنس میرے چہرے کے سامنے کر دیا۔ یقین جانیے جھوٹ کی بات نہیں ہے۔ جسم میں انجانی سی توانائی کی لہر دوڑ گئی اور بخار و کپکپی لمحے میں ختم ہو گئی۔ کمبلوں کی تہ لگا کر سرہانے رکھا اور اپنے محبوب کے سراپا کو نگاہوں سے چوم کر اپنی محبت کی مہر ثبت کی۔ ٹائٹل پر نظر ڈالی تو سرورق پر چھپنے والا آدمی تاش کے حکم کے گولے سے مشابہ دکھائی دیا۔ ساتھ میں کوئین بھی آنکھیں موندے کنگ کے خیالوں میں مدہوش تھی۔ کوئین کے حسن کو چار چاند لگانا ذرا انکل کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جون ایلیا صاحب سے نظر بچا کے اپنی من پسند محفل میں پہنچے جہاں مدیر انکل کو گزرے سال پر توجہ کناں پایا۔ واقعی دسمبر کا مہینا دل میں یاسیت بھر دیتا ہے اور انسان گزرنے والے دنوں کو یاد کر کے خود کو غمگین کرتا رہتا ہے پھر جنوری کا مہینا نئی امیدیں اور نئی سوچیں لے کر آتا ہے۔ پھر سے جنوری جب خود کو دسمبر میں تبدیل کر لیتا ہے تو ہم وہی یادیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں جن کا کوئی حاصل نہیں ہوتا۔ ارے یہ کیا اب کے بار کرسی صدارت پر قبضہ ماسٹر لوگوں کا؟ آپ کی محبت کا ایک سال مکمل ہونے پر آپ نے جو سالگرہ کی تقریب منائی اس کے لیے کرسی سے اچھا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ماسٹر جی یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی تحریر نے آپ کو صدارت بخشی ہے۔ اپنے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک پر انکل جی کا شکریہ ضرور بجالانا۔ ساغر صدیقی صاحب آپ نے یہ تو بتایا نہیں سسپنس نے آپ کو کون سی خوشیاں دی ہیں اور دوسروں کی شادیوں پر خوش ہونے کے بجائے خود کیوں نہیں شادی رچا لیتے؟ بابر عباس لکھاریاں سے اپنی تجلیں ضبط کرتے نظر آئے، بھائی صاحب اگر اچھی بھلی عورت بلکہ

لڑکی آپ کو زردے کی دیگ نظر آرہی ہے تو اس میں آپ کی نظر کا قصور ہے مخلصانہ مشورہ ہے رات سونے سے پہلے لطیف سرمہ آنکھوں میں ڈالا کریں، انشاء اللہ پھر آپ کو زردے کی دیگ بھی حسینہ نظر آئے گی۔ راجا راحیل سرگودھا جیل سے آئے آپ کا خط اچھا تھا۔ عمران بلوچ کے بارے میں جان کر دل دکھی ہو گیا۔ احمد خان توحیدی آپ کی بات سن کر حضرت عیسیٰ کی بات یاد آگئی جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اگر کوئی آپ کو دائیں طرف تھپڑ مارتا ہے تو بائیں طرف بھی سامنے کر کے کہیں ایک اور...... آپ کا خط نوکری کی نذر رہا آپ نے اس بات کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دوسرا خط لکھ ڈالا۔ حافظ عمران صاحب، میڈم شکیلہ اگر شہر یار کو مل جاتی تو ہماری تشنگی ختم ہو جاتی، تشنگی کو سلسلہ وار جاری رکھنا تو سسپنس کا خاصا ہے۔ انجم ریاض صاحب اگر انسان پہلی ہی کوشش میں کامیاب ہو جائے تو تیمور لنگ جیسے لوگوں کا نام تاریخ میں کیوں آئے۔"

مہرین ناز، حیدرآباد سے محفل میں چلی آرہی ہیں "ہم سب کی زندگی سے ایک سال جدا ہو رہا ہے، بقول شاعر کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا، جیون کا اک اور سنہری سال گیا۔ سسپنس ہمیں 16 نومبر کو ملا۔ ٹائٹل پر نظر دوڑاتے ہی خوشگوار حیرت سے واسطہ پڑا۔ اتنا خوب صورت اور منفرد سرورق بے حد پسند آیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب کا "نظر آتا" بالکل کھری بات، پوری دنیا میں یہی نظر آتا ہے۔ اب آتی ہوں اپنی حسین 2013ء کی آخری محفل کی طرف، مسز بابر عباس مجھے آپ کے تبصرے بہت پسند آتے ہیں آپ کے تبصروں میں مزاح کا عنصر ہوتا ہے۔ عروہ خان بھی اچھا لکھتی ہیں۔ احمد خان توحیدی آپ کے خط پڑھ کر الجھن ہوتی ہے، پورے جملے لکھا کریں۔ سید ظفر علی میرے ہم شہر یہ آپ کا تبصرہ تھا یا...... بشریٰ افضل جی آپ نے حکیم خان کو وارننگ دی، بہت اچھا لگا۔ حکیم خان جیسے لوگوں کو ڈھیل نہیں دینی چاہیے۔ ویلکم علی ڈوگر۔ میرے پچھلے پسند کرنے کا شکریہ۔ سید اکبر آپ مجھے کچھ خوشامدی ٹائپ کے بندے نظر آتے ہیں۔ اعجاز احمد راحیل میں ساہیوال کی اس ماں کو سلام پیش کرتی ہوں جس نے آپ جیسا شیر میدان بیٹا پیدا کیا اور آپ کے تبصرے...... واللہ کیا بات ہے۔ حبیب احمد چنائے اور عبدالغفور خان آپ دونوں کا میری حوصلہ افزائی اور مبارک باد دینے کا شکریہ۔ گل بے مروت آپ نے بھی راحیل کو بہت مکھن لگایا، مگر انگور کھٹے ہیں...... ذیشان بدر اور محمد خواجہ آپ کا انداز تحریر پسند آتا ہے۔ باقی میں اس محفل کے تمام قاری ساتھیوں کی مشکور ہوں جنہوں نے میرے تبصرے اور اشعار کو سراہا اور مبارک باد دی۔ اب کہانیوں پہ اپنی رائے دینے سے پہلے قارئین کی توجہ سسپنس ادارے کی ایک بے مثال کاوش پر چاہوں گی کہ اس بات کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، کہانی شروع ہونے سے پہلے ابتدائیہ میں کہانی کا جو تعارف دیا جاتا ہے وہ بہترین کارکردگی ہے۔ اس سے ہمیں کہانی پڑھنے کا تجسس ہوتا ہے، دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور کہانی کا مقصد بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لذت آشنائی، الیاس سیتاپوری کی بہترین تحریر ہے۔ رنجیت سنگھ نے موراں کو واقعی آشنائی کیا ہوتی ہے، روشناس کروا دیا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحفہ ہمارے لیے واقعی حسین گفٹ ثابت ہوئی۔ انسان کو اپنی ضروریات اور خواہش کو حد میں رکھنا چاہیے۔ کشکول بھی بازی لے جانے میں کامیاب رہی۔ دھوپ چھاؤں میں ڈاکٹر ساجد امجد نے سسپنس کی آخری کہانی کا حق ادا کیا۔ حاجرہ (ڈولی) جیسی لڑکیاں کیا سوچ کر انتقام کی راہ پر چل پڑتی ہیں کہ آگے اپنی زندگی بھی تباہ کر لیتی ہیں۔ مجنوں، چاہتوں اور جذبات سے گزرتی نواب انکل کی ماروی مجھے بے حد پسند آئی۔ بلاشبہ نواب انکل ایک منجھے ہوئے رائٹر ہیں، جن کی تحریریں اثر رکھتی ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس بار مراسلے اور چٹکلے بے حد اچھے تھے۔ محفل شعروسخن میں تمام شعر قارئین اور سلیکٹرز کے اعلیٰ ذوق ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔"

کائنات مریم اینڈ جانوی دیوی، بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان سے محفل کی زینت بنے ہیں "دسمبر کا شمارہ اس سال کی آخری آب وتاب کے ساتھ ہمارے ہاتھ میں آیا تو 2013ء کے جانے کا دکھ اور 2014ء کے آنے کی خوشی بھی محسوس ہوئی۔ ہم دونوں جرنلزم کی اسٹوڈنٹ ہیں۔ سسپنس ایک عمدہ اور معیاری رسالہ ہے جو ہم نیو جنریشن میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ اپنے خطوط کی محفل میں ملتان کا کوئی تبصرہ نگار نظر نہیں آتا اس لیے ہم نے سوچا اس محفل میں ہمارا بھی حق ہے۔ (جی بالکل۔ خوش آمدید) قاری ساتھیوں سے التماس ہے کہ ہمارے اچھے رزلٹ کی دعا کی جائے۔ اس خطوط کی محفل کا مقصد ادارے کی کارکردگی پہ تعریف و تنقید کرنا تھا اور اچھے رائٹرز حضرات کی حوصلہ افزائی کرنا، مگر اب ایسا نظر آتا ہے۔ ہمارے تبصرہ نگار اپنی ذاتی رنجش نکالتے ہیں۔ انکل قیصر گیارہ ماہ کی کوشش کے بعد ہوائیوں میں اڑتے نظر آئے، بابر عباس انکل آپ کے تبصرے بہت مزے دار ہوتے ہیں۔ علی ڈوگر بھیا آپ تو آتے ہی چھا گئے۔ اعجاز بھائی آپ کے تبصرے تو اس محفل کی شان ہوتے ہیں۔ مہرین ناز آپی آپ کے تبصرے مراسلے اور اشعار ہم سب فرینڈز کو بہت پسند آتے ہیں۔ سعدیہ دیدی ہر تبصرے میں آپ پہ تنقید کی جاتی ہے، آپ پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟ سسپنس کے تمام رائٹرز شاندار لکھتے ہیں، ادارے کی سلیکشن بہترین ہوتی ہے۔ محفل شعروسخن کا تو جواب نہیں۔ پہلے ہمیں سلسلہ وار کہانیاں پڑھنے کا وقت نہیں ملتا تھا، مگر اب ماروی سے پڑھنا شروع کریں گے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی دھوپ چھاؤں کی ڈولی جیسی لڑکیاں کبھی سکھی نہیں رہ سکتیں۔ الیاس سیتاپوری لذت آشنائی میں رنجیت سنگھ کے حالات سے آشنائی اچھی لگی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحفہ آج کل کے انداز زندگی



کی ترجمان ہے۔ بے جا خواہشیں انسان کو کہیں کا نہیں رکھتیں۔ محی الدین نواب انکل کی ماروی کا ٹائٹل اور ماروی لکھنے کا انوکھا انداز بہت شاندار ہے۔ اللہ پاک ہمارے سسپنس کو 2014ء میں مزید شہرت کی بلندیوں پر لے جائے۔'' (آمین)

✠ **عباسہ مغل**، ڈونگہ، ضلع گجرات سے چلی آرہی ہیں ''جب سے والد محترم کو سسپنس پڑھتے دیکھا یا جب سے خود پڑھنا شروع کیا پہلی بار سسپنس بذریعہ ہاکر 17 نومبر کو ملا۔ خوشی تو بہت ہوئی لیکن گزشتہ ماہ سسپنس پڑھنے کے سلسلے میں گھر والوں سے کافی گرما گرمی ہوگئی اور ہم نے قسم اٹھائی تھی کہ اب نہیں پڑھیں گے مگر دیکھتے ہی قسم توڑ دی اور چھپ چھپا کر پڑھ ہی لیا۔ جون ایلیا کا انشائیہ ''نظر آنا'' حقیقت پر مبنی تھا۔ منافق تو ہم سب ہی ہیں، ہیں کچھ اور دکھاتے کچھ اور ہیں، لوگوں کے ڈر سے۔ اداریہ تو میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ خطوط کی محفل میں بھی ہر کوئی حکومت کو نصیحتیں کرتا اور رونا روتا نظر آیا۔ بابر عباس آپ نے ٹائٹل پر تبصرہ کر کے حنائی رنگ اور عورتوں کی انسلٹ کی ہے آپ کی سز نے ڈانٹ نہیں پلائی۔ عمران حیدر بلوچ کی موت کا بے حد افسوس ہوا جیسے کوئی اپنا فوت ہوگیا ہو، رب العزت انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ حبیب احمد چنائے آپ نے کترنوں میں بچوں جیسی شرارت کی مگر شعر میں تو حد کر دی دونوں بہت زیادہ پسند آئے۔ سب سے پہلے مجرم محرم پڑھی۔ اچھی تحریر تھی۔ پھر ماروی پڑھی شاید وہ پہلی کہانی ہے جس کے لیے میرے پاس الفاظ ہی نہیں، پہلی قسط ہی اتنی مسحور کن تھی کہ دل دھڑکنا بھول گیا، اتنی اچھی لگی کہ دوبار پڑھی۔ ویلڈن محی الدین صاحب۔ تاوان میں سیر کو سوا سیر مل گیا۔ رقص اجل میں دلشان کی گھٹیا ذہنیت پر بہت غصہ آیا اگر تقدیر نے اس کا ساتھ دیا تھا تو بے چاری تقدیر کی ماری چندا کا کیا قصور تھا۔ راز میں ہنری نے بڑی عقلمندی سے خود کو بے گناہ ثابت کر دیا اور راز بھی معلوم کرلیا۔ دھوپ چھاؤں میں وہی والدین کے حوالے سے بچوں کی نفسیات پر پڑنے والے برے اثرات پر ذرا مختلف انداز میں روشنی ڈالی گئی اور فوٹوگرافی کا کمال دکھایا گیا۔ تحفہ کہانی بھی بہت پسند آئی لڑکے بری صحبت میں بیٹھ کر اپنی نامکمل خواہشات کو پورا کرنے کے لیے وہی صحبت اختیار کرلیتے ہیں پھر نتیجہ وہی برا۔'' (آپ نے شعر کے ارسال کا طریقہ پوچھا تو ایسا کچھ مشکل نہیں ہے۔ ایک الگ صفحے پر کوپن لگا کر اپنی پسند کا شعر صاف صاف لکھ کر اسی آپنے پر اپنے خط والے لفافے میں ڈال کر بھیج دیجیے)

✠ **زویا اعجاز**، لاہور سے تبصرہ کررہی ہیں ''تمام ہم وطنوں کو نیا ہجری سال مبارک۔ سال رواں کے آخری ڈائجسٹ نے سولہ نومبر کو درشن کروائے۔ ٹائٹل کافی یونیک تھا۔ انشائیہ میں جون ایلیا ہماری معاشرتی منافقت سے بیزاری کا اظہار کرتے نظر آئے۔ محفل میں حسب معمول دنگل جاری تھا۔ کافی تبصروں میں جلنے کی بدبو واضح محسوس ہوئی۔ نیازی صاحب اور قیصر اقبال صاحب۔ اپنی آنکھوں سے تعصب کا چشمہ ہٹا کر دیکھیے۔ کاظمی کی طرح آپ کو بھی کافی فہم و ادراک ملے گا۔ عمران بلوچ کی وفات کا پڑھ کر بہت رنج ہوا۔ پروردگار انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ چنائے صاحب۔ یہ لطیفہ پرانا ہوچکا ہے اور حقیقت جانتے بھی ہیں۔ مظہر سلیم اور احسان سحر کو بلیک لسٹ دیکھ کر بہت (افسوس ہوا) (افسوس کا ہے کا...... انہوں نے دوسرے لوگوں کو جگہ دے کر کچھ غلط نہیں کیا) حاشیہ بردار کو میں اسٹوری آف دی منتھ قرار دوں گی۔ سقوط ڈھاکا بلاشبہ ہر پاکستانی کے لیے ناقابل مندمل زخم ہے، یہ کہانی دل سے پڑھے جانے کے لائق تھی، ذرائع ابلاغ کی منافقت اور گھناؤنا کردار بھی خوب آشکار ہوا۔ صائمہ کا جرأت مندانہ فیصلہ، حلفیہ بیان اور دلائل ناقابل فراموش ہیں۔ دوسرے نمبر پر دھوپ چھاؤں رہی۔ والدین کے باہمی اختلافات اولاد کی نفسیات میں ناقابل اصلاح کجی پیدا کردیتے ہیں جن کا ان کو احساس تک نہیں ہوتا اور نتیجہ ڈولی جیسے کرداروں کی صورت میں نکلتا ہے، ذیشان کا کردار قابل رحم رہا۔ تیسرے نمبر کی حقدار رقص اجل ٹھہری۔ سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کے نزدیک محبت ناقابل معافی جرم ہے۔ چندا سے یہی گناہ سرزد ہوا جس کی اس نے عبرت ناک سزا بھگتی، دلشان بھی حقدار تھا اس سزا کا لیکن نہ ملی۔ کاشف زبیر کی سنسنی خیز کہانی ہالی ووڈ موویز جیسی تھی تاہم بوریت بالکل نہیں ہوئی۔ اپنے جانے پہچانے مقامات کا تذکرہ کرتی مغل اعظم کی سادہ و دلکش تحریر تحفہ بھی بہت عمدہ تھی۔ لذت آشنائی میں خالصہ دور کے چند مخفی پہلو سامنے آئے۔ مہاراجا رنجیت سنگھ کا کردار کافی دلچسپ تھا۔ کشکول فی الحال شیخ حامد کی فرعونیت اور قانونی اداروں کی بے بسی کی ڈگر پر چل رہی ہے۔ ماروی کا آغاز حسب توقع جاندار ہے تفصیلی رائے ابھی محفوظ ہے۔ مجرم محرم میں فردوس اور ماسٹر نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے انسانیت سوز راستہ اپنایا۔ چوتھے قیوم بھی بہت خوب صورت تحریر تھی۔ کترنیں بھی اے ون جبکہ اشعار میں محمد جاوید کا انتخاب بہترین تھا۔ سال رواں کا یہ آخری شمارہ ہر لحاظ سے پچھلے گیارہ شماروں پر سبقت لے گیا۔'' (بہت شکریہ)

✠ **آغا فرید احمد خان**، بکھر سے محفل میں شریک ہیں ''دسمبر کا سسپنس 15 نومبر کو سب سے پہلے مجھے ملا، یہ میرا خیال ہے، کیونکہ سب دوست یہ بتا رہے تھے کہ انہیں نہیں ملا۔ سسپنس سال کے آخر کا سرورق بنانے میں خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ قیصر اقبال محفل کی صدارت کررہے تھے، جس کو ڈھیروں مبارک، باقی بھی تمام دوستوں کے خط بہترین تھے۔ ماروی کی پہلی قسط بہترین تھی، کہانی کی اٹھان سے ہی پتا لگ رہا ہے کہ آگے جا کر بہت ہی عمدہ صورت اختیار کرے گی، ویسے بھی نواب انکل کے ہاتھ میں قلم ہے۔ آخری صفحات پر دھوپ چھاؤں میں ذیشان کے ساتھ بھی ڈولی نے دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلا۔ یاد رہ جانے والی تحریر تھی۔ مغل انکل اس بار مختصر تحریر کے ساتھ آئے۔ تحفہ شاندار تحریر تھی۔ فہد کو اپنی سالگرہ کا وہ موبائل سیٹ کا تحفہ پوری زندگی یاد رہے گا۔ رقص اجل منظر امام کی دل چھو لینے والی کہانی تھی جو کوئی بھی پڑھے ایک ہی نشست میں ختم کرنے کے سوا چھوڑے ہی نہیں، چندا کے ساتھ بہت ہی برا ہوا۔ دلشان کی تو پھر بھی زندگی سنور گئی، کیا ہی اچھا ہوتا کہ دلشان چندا کو اس کے ہر حال میں قبول کرتا اور ویسے بھی یا تو ہر قربانی دینے کو تیار بیٹھی تھی۔ ملک صاحب کی مجرم محرم کو کہ دلچسپ کہانی تھی لیکن بہت سارے جھول تھے جن کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ حاشیہ بردار، سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں لکھی گئی ایک نئے انداز کی تحریر مزہ دے گئی۔ محفل شعر و سخن میں تمام انتخاب اچھا تھا، اس کے علاوہ کترنیں بھی مزیدار اور معلوماتی تھیں۔''

✠ **شوکت شہریار**، اوکاڑہ سے تشریف لائے ہیں ''حسب معمول اس دفعہ سسپنس کا شمارہ 17 تاریخ کو ملا۔ کرسی صدارت پر اپنے پیارے بھائی



قیصر اقبال کا نام دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ارے یہ کیا، ہمارا تو خط شائع ہی نہیں ہوا اور پھر جب بلیک لسٹ کی کرسی صدارت پر اپنا نام دیکھا تو دوبارہ دل باغ باغ ہوگیا کہ چلو سسپنس کے قیمتی صفحات پر ہمارے نام کا اندراج تو ہوا۔ خطوط میں مجھے قیصر اقبال، اعجاز راحیل، تفسیر عباس اور حکیم سلامت پوری کے خط بہت اچھے لگتے ہیں۔ جناب راجا راحیل بھائی اللہ تعالیٰ آپ کو جلد رہائی نصیب فرمائے۔ سرورق کی کیا تعریف کروں کیونکہ ذاکر صاحب ہمیشہ ایسے ہی شاہکار تخلیق کرتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی تحریر پڑھی۔ جس میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے ثابت کیا کہ محبت میں ہر ستم برداشت کیا جاسکتا ہے۔ کاشف زبیر کی تحریر میں گیری نے جان بوجھ کر جوزف کو فرار ہونے کا موقع دیا جس کی ایک ایف بی آئی ایجنٹ سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ ملک صفدر حیات نے بڑی ذہانت سے ماسٹر جمشید اور فردوس جیسے مکروہ انسانوں کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ رقص اجل اور تحفہ بھی خوب صورت تحریریں تھیں۔ ماروی کی پہلی قسط بہت اچھی لگی۔ آخری صفحات پر دھوپ چھاؤں میں ڈولی یقیناً ایک نفسیاتی مریضہ تھی جو اپنے گھر والوں کے ساتھ ذیشان کو بھی لے ڈوبی اور ساری عمر کا پچھتاوا ہاتھ آیا۔ اشعار میں قیصر اقبال، اعجاز راحیل، سعدیہ ناز، سوہائی اور تفسیر عباس بابر کے اشعار پسند آئے۔'' (شکریہ)

✠ **قیصر اقبال گچھ**، بکول ضلع بھکر سے محفل میں شریک ہورہے ہیں ''میری زندگی میں ان دیکھے اور مخلص دوستوں کا اضافہ کرنے والے میرے پیارے سسپنس پر مجھے اس وقت بہت پیار آیا، جب سسپنس ڈائجسٹ کی وساطت سے ملنے والے میرے بہت ہی پیارے دوست اور بھائی اعجاز احمد راحیل نے کال کر کے مجھے محرم میں پاک پتن بابا فرید کے میلے پر آنے کی خصوصی دعوت دی اور وہ خوشی کی کیسی گھڑی تھی جب اعجاز راحیل اور تفسیر بھائی نے دسمبر کا سسپنس خریدا، اس پر اپنا ایک شعر لکھا اور سائن کر کے میرے پیارے سسپنس کا تحفہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی وہاں پر بنائی گئی تصاویر کا تحفہ بھی۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ سب آج کے نفرتوں کے زمانے میں کسی کی بے لوث محبتیں اور بے غرض دوستیاں تھیں اور یہ جس کی وساطت سے قسمت میں آئیں اس کا، جی ہاں! میرے سسپنس کا شکریہ۔ سال 2013ء کا آخری شمارہ، نئے سال کی آمد پر خوشگوار سپنے دیکھتی سرورق کی حسینہ کو خواب چھوڑ اور داخل ہوئے اپنی محفل میں۔ بابر عباس صاحب اپنے ہم عصر رمضان پاشا کو بھائی اور طاہرہ گلزار اور بشریٰ افضل کو آنٹی، یقیناً حکیم خان کے کشتے نے الٹا اثر کیا ہے۔ سید اکبر شاہ، بے لوث محبتوں کا شکریہ چھوٹے بھیا۔ ابتدائی صفحات کی کہانی لذت آشنائی، راجا رنجیت سنگھ کے واقعات، عطر سنگھ کا کردار اور موراں کے حالات، تاریخ کے اوراق سے بہترین انتخاب۔ کشکول کی یہ قسط بھی بس گزارے لائق تھی۔ افضل خان اور شبنم کی شادی پر خوشی ہوئی اور اب افضل خان کو بھی اپنے کس بل نکالنے کا خوب موقع مل رہا ہے۔ نواب صاحب کی ماروی کی اٹھان اچھی ہے۔ کہانی آگے چل کر مزید دلچسپی کا باعث بنے گی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی آخری صفحات کی کہانی دھوپ چھاؤں، شاید ہمارے معاشرے کو ابھی کیا کبھی بھی اتنا آزاد نہیں ہونا چاہیے کہ اولاد ایسی سرکش ہو۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔''

✠ **سعدیہ بخاری**، ضلع اٹک سے اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ چلی آرہی ہیں ''دسمبر کا سرورق کافی اٹریکٹو تھا اور سرورق تو سرورق بیک پیج بھی کافی خوش رنگ تھا۔ انشائیہ کا سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے۔ محفل خطوط پہ دستک دی ہر سال کی طرح یہ سال بھی بیت گیا اور وہ ہی مسائل وہ ہی حالات اور آنے والے سال کے لیے خوش گمانیاں۔ 2013ء کی آخری محفل خطوط دسمبر کے سرد موسم میں بھی بہت گرما گرم نظر آئی۔ اداریہ پڑھ کر جیسے ہی پہلے خط پر نگاہ پڑی بے اختیار یہ محاورہ یاد آگیا۔ ''بندر کے گلے موتیوں کی مالا'' قیصر اقبال ٹھیک اسی وقت جب آپ کے خط لکھنے کی پہلی سالگرہ تھی میری دوسری سالگرہ تھی۔ دوسرے نمبر پہ بابر انکل براجمان ہیں دیکھیں آپ نے اپنا انداز تحریر تھوڑا تبدیل کیا تو آپ کی پوزیشن بھی تبدیل ہوگئی۔ قیدی ساتھیوں کے توسط سے محفل کے ساتھی عمران حیدر بلوچ کی وفات کا پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ آسیہ متبول بہت مبارک باد بھی اب مٹھائی کہاں ہے؟ زویا سسٹر لیجیے آپ کی شکایت کا بہت خوب صورت ازالہ سال نو کے سسپنس میں آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کی کہانی حاضر ہے۔ قدرت اللہ نیازی بھائی یہ کیا آپ نے شوشے چھوڑنے کی سیریز شروع کررکھی ہے اور تخریب کاری کا الزام مجھ معصوم پر؟ کہانیاں پڑھنے کا آغاز کیا ''ماروی'' سے، گریٹ رائٹر محی الدین نواب اپنے مخصوص جیسے اسٹائل میں دلچسپ سلسلے وار کہانی لے کے آئے۔ سراد اور محبوب کا ہم شکل ہونا اور ماروی سے محبت عجیب لگا لیکن پڑھ کر مزہ آیا۔ مجرم محرم میں مُردوں

روشنی کی پکار

✠ **روشنی رشید**، دھمیال کیمپ راولپنڈی سے محفل کی زینت بن رہی ہیں ''خط کی محفل میں بہت عرصے بعد حاضری دے رہی ہوں لیکن جناب مدیر اعلیٰ صاحب اور سسپنس کی پوری ٹیم آپ سب کو اور اپنے تمام سسپنس کے قارئین کو روشنی نے ہر لمحہ یاد کیا ہے اور ہمیشہ آپ سب کو دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں۔ (بہت شکریہ) ذیشان بدر منیر آپ کا خط پڑھا اور فوراً خط لکھنا شروع کردیا میں نے۔ آپ کی محفل میں حاضری بہت اچھی لگی۔ میں ہر مہینے محفل خط میں پرانے ساتھیوں کو ڈھونڈتی تھی لیکن سب پتا نہیں کہاں غائب ہوگئے ہیں؟ آپ کے خط آنے سے بہت خوشگوار ہوگیا موسم۔ آپ میرے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ اے جے کسانہ آپ بھی بہت یاد آتے ہیں۔ ڈاکٹر تنویر عباس (ڈیرہ غازی خان) خاطر علی ہمدم (کوئٹہ سے) ذیشان بدر منیر، شکیلہ عبدالرؤف عدم (راولپنڈی سے) رانا حبیب الرحمٰن، آصف راجا (لاہور سے) حمیرا رضا آپ سب میرے بہت قیمتی اثاثہ ہیں۔ آپ سب سے ملنے کو بہت دل کرتا ہے۔ ٹرپل ایس اسماعیل (خیبر ایجنسی سے) آپ کہاں غائب ہیں؟ جلدی سے محفل میں آئیں اور محفل کو رونق بخشیں۔ چودھری سرفراز آپ بھی محفل میں حاضری دیں ورنہ بہت سخت جرمانہ لگ جائے گا روشنی کی طرف سے۔ امین انجم (قصور سے) آپ سب گھر والے کیسے ہیں، خیریت سے آگاہ کریں۔ آپ کے لیے روشنی کی بہت زیادہ دعائیں فوراً محفل میں حاضری دیں۔ ذیشان بدر منیر شادی بھی کرلی اور بتایا بھی نہیں، کوئی بات نہیں۔ مبارکباد قبول کرو۔ بیٹے کا نام بھی اپنے نام کی طرح خوب صورت رکھنا اور پیدائش کے عدد کے مطابق رکھنا، تاکید ہے۔ انکل معراج رسول آپ سے گزارش ہے کہ میرا خط سارا شائع کیجیے گا۔ میں آپ کی بہت شکرگزار رہوں گی۔ باقی ابھی رسالہ زیر مطالعہ ہے۔''



کی اس قدر بے حرمتی کہ انسانیت شرما جائے۔ آخری صفحات کی شاہکار کہانی دھوپ چھاؤں زبردست تھی۔ ذیشان بے چارہ ڈولی کی دوہری شخصیت اور سائیکی کا شکار ہو گیا، وہ کہتے ہیں نا عشق جسے خلل ہے دماغ کا اور والدین کی ناچاقی اور جھگڑے ایک آفاقی مسئلہ ہے۔ کشکول میں جہاں آکٹوپس کی کارروائیاں تیز ہوتی جا رہی ہیں وہیں قانون کا شکنجہ بھی اس کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کے روحانی سلسلے میں اس بار خواجہ محمد زبیر کی روحانی کرامات و واقعات بہت ہی پسند آئے۔ مترجم و مختصر کہانیاں اس مرتبہ ٹاپ کلاس تھیں، پہلے نمبر پر رہی حاشیہ بردار، آمریت کا اس قدر بھیانک روپ بھی ہے پہلے اندازہ نہ تھا۔ سقوط ڈھاکا کے مختلف پہلوؤں میں سے یہ ایک نیا اور دلچسپ پہلو سامنے آیا۔ صائمہ کا فیصلہ قابل تحسین ہے۔ دوسرے نمبر پر رہی دی ون ان اونلی کاشف زبیر کی کھلاڑی، ڈاکو کھلاڑیوں کی حرکات و سکنات بہت فنی تھیں۔ تحفہ مختصر لیکن بہت پراثر تحریر ثابت ہوئی۔ رقص اجل وڈیرا شاہی کے ظلم و جبر اور محبت کے برے انجام کی دکھی داستان۔ رشک گزیدہ، تاوان اور راز بھی پسند آئیں۔ محفل شعر و سخن میں سوہاجی، نور اللہ اور زوہیب احمد کا انتخاب خوب تھا۔ کتر نیں زیادہ اور اچھی تھیں۔ خاص طور پر قیصر اعوان کی یادداشت والی کترن لاجواب تھی۔ تمام قارئین کو آنے والا سال مبارک، اللہ کرے یہ نیا سال ہم سب کے لیے، ہمارے پاکستان کے لیے اور امت مسلمہ کے لیے امن و امان اور خوشیوں بھرا ثابت ہو۔ (آمین)"

✠ **محمد جاوید، تحصیل علی پور** سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "چشم عاشق نیا مکھڑا تکتے ہی سب پرانے مکھڑے بھول گئی۔ خوب سرور کشید کیا۔ ادب کے افق پر چمکتا ہوا سسپنس ڈائجسٹ وہ درخشاں چاند ہے جس کے اردگرد ان گنت دھنک رنگ ستارے جھلمل جھلمل جھلملا رہے ہیں۔ 8 نومبر کو محکمہ ڈاک نے عظیم دانشور، دوراندیش درویش اور منفرد انداز بیاں کے حامل محترم معراج رسول کے روحانی دوست جون ایلیا کی برسی کے موقع پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آپ کی تصویر سے مزین 8 روپے کی مالیت کا ٹکٹ نکالا۔ ماروی میں مثلث کردار مراد، ماروی اور محبوب مسئلہ محبت، ماروی میں میم کی تکرار بہت ہے اب خدا جانے یہ امر اتفاق ہے یا سر محی الدین نواب کی گہری سوچ کا خفیہ پہلو۔ لذت آشنائی سے خوب لذت کشید کی، یک چشمی مہاراجا رنجیت ایک مضبوط حکمران اتنا بھی غیر متعصب نہیں تھا۔ سردار عطر سنگھ کی معصومانہ حماقتوں سے دل شاد کام ہوا، موراں جیسی عورتیں کبھی بھی پسند نہیں رہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی مستند دینوی کاوش چوتھے قیوم میں خواجہ زبیر کو قرب الٰہی کے بلند و بالا مرتبے پر براجمان پایا۔ ش م جمیل حاشیہ بردار میں ملک ٹوٹنے کے عوامل چھوٹے بڑے سربراہوں کی کوتاہیوں ڈوے داریوں کو احسن انداز اور دلائل میں بیان کر گئے۔ تنویر ریاض کی راز ابھی تک راز ہی ہے۔ ملک صفدر حیات کو مشن ڈیم سیبل...... پوسیبل کرنے پر غائبانہ سیلیوٹ۔ دھوپ چھاؤں کے مسافر کی نمناک مسافرت کا سفر بالآخر دیوانے جادوگر کی سانسوں کی مالا ٹوٹنے پر منتج ہوا۔ غلطیوں سے مبرا سلسلہ کشکول میں آہنی اعصاب کے مالک شیخ حامد کے سامنے سارے کردار ہیچ ہیں، قانونی و غیر قانونی اداروں کو نہایت عقل مندی سے دماغ کی ڈگڈگی سے بندروں کی طرح ناچنے پر مجبور کر رہا ہے۔ سعدیہ بخاری کے لیے ان میں دم نہیں بس قیمہ ہی قیمہ رہ گیا ہے، اینڈ ہے۔ محمد ہمایوں سعید مظہر سلیم کو دیا گیا جواب بے تو بوگی کس کو کہتے ہیں۔ ماریہ فاروق آپ کچھ غائب ہی نہیں بلکہ غائب دماغ رہتی ہیں مسافر کہانی ختم ہو چکی ہے۔ ویسے حیرت کی بات ہے محفل کی تمام لڑکیوں نے فرسٹ ڈویژن سے ہی کامیابی حاصل کی ہے۔ ادریس خان کی خودکلامی بھی پسند آئی۔ قیصر اقبال کلول تمہارے منہ میں خاک، آغا فرید نے بوگی نہیں ماری بلکہ ہلکا پھلکا سا مذاق کیا ہے۔ تبصرۂ اول کا اعزاز پانے والی شخصیت کی اگلے ماہ ادارہ کے زریں خیالات کے ساتھ رنگین تصویر شائع کی جائے اس طرح بہتر سے بہتر لکھنے کی تحریک پیدا ہوگی۔ خواتین کی تعداد میں اضافہ کے لیے خواتین کے لیے چند صفحات مختص ہونے چاہئیں۔"

✠ **افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر** سے محفل میں شریک ہو رہے ہیں "دسمبر 2013ء کا سسپنس خوب صورت ٹائٹل سے سجا ٹھنڈے ٹھنڈے نومبر میں فرحت بخش تازگی کا احساس دلا رہا ہے۔ ٹائٹل اس مرتبہ ہر بار کی طرح سے تھوڑا ہٹ کے ثابت ہوا اور یہ تبدیلی دل کو بھا گئی۔ انشائیہ میں جون ایلیا "نظر آتا" گویا مجھ ہی پر لکھی گئی تھیں یہ لائنیں۔ کیا بتاؤں کتنی دیر ان الفاظ میں کھویا رہا۔ کاش، جون ایلیا کی خواہشات پوری ہوں، مگر کاش، کاش ہی ہوتا ہے۔ محفل آپ کے خط میں بھی ساتھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں کمربستہ نظر آئے۔ اس مرتبہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی سے پنگا نہیں لیتے۔ اس لیے اس محفل کے خطوط پر نو کمنٹس، سسپنس کی سلسلہ وار کہانی کبھی نہیں پڑھتا تھا آج سے پہلے۔ مگر آج یہ روایت ٹوٹنی پڑی۔ ماروی نام ہی ایسا ہے کہ بندا خود بخود کھنچتا ہے۔ کہانی تو ابتدا ہی سے اپنی مثال آپ ہے۔ ابتدائی صفحات پر تاریخ کے جھروکوں سے تحریریں ہمیشہ سے فیورٹ رہی ہیں۔ آخری صفحات بھی خوب جچ رہے تھے۔"

✠ **بشیر احمد خان جنڈ، جنگ ضلع اٹک** سے چلے آ رہے ہیں "گزشتہ بار خط لکھا تھا مگر شائع نہ ہو سکا۔ خیر! کوئی بات نہیں یہی بہت ہے کہ آپ نے میری گزارش مان لی۔ اس دفعہ سسپنس میں طبع زاد کہانیاں بہت ہی شائع ہوئی ہیں اور خوب دلچسپ اور مزیدار ہیں۔ خاص کر ڈاکٹر ساجد امجد کی دھوپ چھاؤں اور طاہر جاوید مغل کی کہانی تحفہ بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ علاوہ ازیں ملک صفدر حیات کا کارنامہ مجرم محرم بہت اچھی ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دوبارہ گزارش کروں گا کہ اسی طرح سسپنس میں زیادہ سے زیادہ طبع زاد کہانیاں شامل کیا کریں اور مغربی کہانیوں کے ترجمے جتنے کم ہوں اچھا ہے۔"

✠ **ابرار وارث، سندیلیانوالی** سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس دفعہ کا ماہنامہ 20 نومبر کی سرد پڑتی شام کو ایک نرم گرم جھونکے کی طرح آملا۔ ٹائٹل پر جاذب نظر مجسمہ تھا۔ ماروی کو پڑھنے کی چاہ میں سسپنس کھولا تو خطوط سے نظر چرا نہ سکے۔ سب سے پہلے قیصر اقبال کچہ کا تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ کرسی صدارت پر بیٹھنے اور سالگرہ کی مبارکباد لیکن لگے ہاتھ یہ بھی بتا دیں کہ سالگرہ کتنے ویں سال کی ہے۔ اپنا خط ڈھونڈا لیکن نہیں ملا، شاید غریب کا صبر آزمایا جا رہا ہے (اب تو خوش ہیں) بابر عباس بھئی طاہرہ جی نے کوئی غلط تو نہیں کہا تھا، غلط تو آپ خود کہہ رہے ہیں کہ آپ 70 سال کے بڈھے ہیں۔ راجا راحیل اللہ آپ کو بے گناہ ثابت کرے اور جلد آپ کو اسیری سے رہائی دے۔ عمران حیدر بلوچ کو اللہ فردوس بریں میں جگہ دیں۔ حافظ محمد عرفان میں بھی آپ کی طرح طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریروں کا شیدائی ہوں، پتا نہیں کب تک یہ پیاس بجھائیں گے مغل انکل کی کہانی سے۔ راجا ثاقب، حبیب احمد چنائے لیجیے آپ کا اضطراب ختم ہوا ماروی آ گئی۔ طاہرہ باجی پلیز لکھنا نہ چھوڑیے۔ ہمایوں سعید خوش قسمت ہو کہ نومبر کا شمارہ آپ کو عید سے پہلے مل گیا لیکن ہمیں تو وہی پرانے دستور کے مطابق عید سے سات دن بعد ملا



تھا۔ ہمایوں بھائی آج کل کراچی کے راؤنڈ پر ہو۔ سب سے پہلے محی الدین نواب کی ماروی پڑھی۔ شکر ہے اس میں فرضی مار دھاڑ نہیں تھی۔ مراد کی ماروی سے محبت اور محبوب کا ماروی سے عشق...... پتا نہیں ان دونوں کا کیا بنے گا بہرحال دونوں کا کردار جاندار ہے۔ پلیز ایڈیٹر صاحب اور انتظامیہ سسپنس آپ سے گزارش ہے کہ آخری صفحات پر کاشف زبیر اور مریم کے خان یا طاہر جاوید اور اسما قادری کو لے آئیں، پلیز پلیز۔ طاہر جاوید کی تحفہ بڑی ایک سبق آموز مختصر تحریر تھی۔ واقعی سچ ہے کہ جب گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے اور ایثار کو خودغرضی سمجھ لیا جائے تو قدرت انتقام کیوں نہ لے، سکندر تو مر گیا لیکن اپنے بھائی کے لیے پچھتاوے چھوڑ گیا۔"

✠ **راجا ثاقب محمود جنجوعہ، پنڈ دادن خان** سے تشریف لائے ہیں "دسمبر کے سسپنس ڈائجسٹ کا ٹائٹل دل کو چھو لینے والا تھا۔ ٹائٹل کی حسینہ نے سسپنس ڈائجسٹ کو چار چاند لگا دیے۔ جون ایلیا نے اپنے انشائیے "نظر آتا" میں ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے دوغلے پن کو خوب طنز کا نشانہ بنایا اور اس کی بھرپور مذمت کی۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی لذت آشنائی نے مہاراجا رنجیت سنگھ کے دور کی خباثتوں کا پردہ چاک کیا۔ ش م جمیل کی حاشیہ بردار جو کہ سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں تحریر کی گئی، نے ہمیں اس سازش کے اصل حقائق سے آگاہ کیا اور ہمارے ضمیروں کو خوب جھنجوڑا۔ مجرم محرم میں ملک صفدر حیات نے اپنی فرض شناسی اور ذہانت کا بھرپور ثبوت دیا اور آخرکار اصل مجرم کو پکڑ لیا۔ محی الدین نواب کی سلسلے وار کہانی ماروی کی پہلی قسط بہت ہی دلچسپ اور تجسس سے بھرپور تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی چوتھے قیوم بہت متاثر کن تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی دھوپ چھاؤں اندھی محبت کا سودا کرنے والے ایک جادوگر کی بہت ہی دل گداز داستان تھی۔ محفل شعر و سخن میں حافظ محمد عرفان کا قطعہ دل کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ آپ کے خط کے تمام تبصرے بہت زبردست تھے۔"

✠ **مسٹر اینڈ مسز بابر عباس، بگیانہ روڈ کھاریاں** سے تبصرہ کر رہے ہیں "سسپنس کا نیا شمارہ جو کہ 2013ء کا آخری شمارہ ہے ماہ دسمبر کی شکل میں، یہ 20 نومبر کو ملا۔ اس بار سرورق کو ڈاکٹر انکل نے اس عنوان سے دیا ہے کہ فرق تلاش کریں تو عزیز ہم وطنو... فرق تلاش کرو۔ سر جی افسوس سے پہلے کہ میں مزید کچھ لکھوں میں یہ کہنا چاہتا ہوں میرے عزیز ہم وطنو سانحہ راولپنڈی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ جب بھی کوئی ایسا ہولناک واقعہ ہوتا ہے ہمارے سیاست دان یک زبان ہو کر ایک ہی لفظ کہتے ہیں کہ ہم اس واقعے کی پرزور مذمت کرتے ہیں۔ سر جی کیا ہمارے ارباب اختیار ان سنگین واقعات کی پرزور مذمت ہی کرتے رہیں گے۔ ان کا سدباب نہیں کریں گے۔ سر جی 2013ء اپنے اندر بہت سے ہولناک اور سنگین واقعات لیے ہم سب سے رخصت ہوا۔ آنے والا نیا سال ہم سب کے لیے بہت ساری خوشیاں لائے اور ہمارے ملک میں جو خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے وہ بند ہو جائے۔ اس بار بھی کرسی صدارت پر قیصر اقبال کچہ او موری میرا مطلب کچہ صاحب تشریف فرما ہیں اور ساتھ ہی ساتھ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم سب کو کہہ رہے ہیں کر لو جو کرنا ہے۔ سر جی کسی بھی رسالے یا ڈائجسٹ کے سرمایہ افتخار اس کے قارئین ہوتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر بادولت کا خط تھا مگر اپنے خط کی حالت دیکھ کر اتنا ہی دکھ ہوا جتنا ملالہ یوسف زئی کو نوبل انعام نہ ملنے پر ہوا ہوگا، میں اپنا قومی کھیل اپناتے ہوئے احتجاج کرتا ہوں۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔ (اگر آپ کا پورا خط شائع کر دیا جائے تو صرف آپ کا ہی خط شائع ہو سکے گا، کسی اور کی گنجائش نہیں رہے گی اب بتائیے قینچی درست ہے یا نہیں) عمران بلوچ کا پڑھ کر بڑا افسوس ہوا رب کائنات عمران بلوچ کو اپنی جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ سید ظفر علی صاحب ناصر ملک صاحب گریٹ ہیں اسی لیے ہم قارئین کو ایک گریٹ کہانی پڑھنے کو دی۔ اس بار قیصر بھیا غائب تھے، بھیا جی کہاں ہو۔ بشریٰ افضل آنٹی اس بار عہد رفتہ کو آواز دیتی نظر آئیں اب تو بڑھاپے میں آنٹی کی نظر بھی کمزور ہو گئی۔ جیسے کوئی ندیدہ بچہ اپنی من پسند چیز کو دیکھ کر اس کی طرف لپکتا ہے بس اسی طرح سسپنس ہاتھ میں آتے ہی میں ماروی کی طرف لپکا۔ محی الدین نواب کی ماروی سسپنس کی ماروی ہم سب کی ماروی، جیسا نام ویسا کام اور نام ہی کافی ہے جیسے الفاظ کے مالک محی الدین نواب صاحب اپنے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ ماروی لیے حاضر تھے۔ ماروی کی پہلی قسط نے ہی ہمیں اپنے سحر میں جکڑ لیا ہے۔ ویل ڈن نواب صاحب۔ کشکول کو بادل نخواستہ مجبوری پڑھ رہا ہوں یقین کریں بالکل مزہ نہیں آ رہا، آپ سے درخواست ہے اسے بند کر کے اور کوئی سلسلہ شروع کریں۔ آخری صفحات پر اس بار ڈاکٹر ساجد امجد صاحب بڑے عرصے بعد تشریف لائے اور کیا زبردست تشریف لائے کہ رنگ جما دیا۔ دھوپ چھاؤں اس میں کوئی شک نہیں، ڈاکٹر صاحب کی ایک یادگار تحریر تھی بہت اچھے ڈاکٹر صاحب۔ ضیا تسنیم بلگرامی صاحب کی تحریر ہمیشہ پراثر اور دل میں اتر جانے والی ہوتی ہے۔ منظر امام صاحب جب بھی آتے ایک منفرد انداز لے کر آتے ہیں۔ ان کی رقص اجل اپنی مثال آپ تھی۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری سے حسام بٹ صاحب اس بار مجرم محرم لے کر آئے، مجرم محرم ایک سبق آموز اور اچھی کہانی تھی۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

ذیشان بدر منیر، نیو کشمیر ٹاؤن، رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی۔ محمد صفدر معاویہ، تحصیل و ضلع خانیوال۔ بشریٰ افضل، بہاولپور۔ محمد آصف، نامعلوم مقام۔ رانا حبیب الرحمٰن، سینٹرل جیل لاہور۔ احمد ریاض، نیول کالونی ڈالمیا، کراچی۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ، خانیوال۔ سید اکبر شاہ، اوگی، مانسہرہ۔ ہارون رشید، آف کانٹنگ، مردان۔ سید محی الدین اشفاق، فتح پور تحصیل کروڑ، لیہ۔ ڈاکٹر نعیم اکبر، مانسہرہ۔ اعجاز احمد راحیل، ساہیوال۔ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال۔ ڈاکٹر عمران فاروق، جھنگ۔ رحیمہ سرور، ساہووالی، لاہور۔ عبدالشکور، کورنگی، کراچی۔

سانحۂ ارتحال

ادارے کے پرانے رفیق کار اور مقبول مصنف محی الدین نواب کی پہلی اہلیہ 10 دسمبر کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ادارہ ان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

مٹّی کا فساد

الیاس سیتاپوری

مٹی پتھر اور گارے سے بننے والا یہ خاکی انسان جب اختیارات کی قوت پاتا ہے تو کون جانے کہ کیسے کیسے فتنہ و فساد کا باعث بنتا ہے... بہرحال تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ انسان نے کس کس روپ میں کیسے کیسے کردار ادا کیے مگر بالآخر آخری ٹھکانا وہی جو ایک حقیر اور فقیر انسان کو بھی نصیب ہوتا رہا... یعنی دو گز زمین کا ٹکڑا... فنا کا یہ فلسفہ اگرچہ اس بادشاہ کی سمجھ میں بھی آگیا تھا مگر اس وقت تک کافی دیر ہوچکی تھی وہ جو دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر کتنی ناانصافیوں کا مرتکب ہوگیا تھا اور ایک وہ حسن کی دیوی تھی کہ جس کی ہوس کا کنواں بھر کے ہی نہیں دے رہا تھا جبکہ دہری چالیں چلنے والی اس ناگن کو خبر تک نہ ہوسکی کہ بادشاہ اس کے چلن سے واقف ہوچکا ہے لیکن ہارے ہوئے اپنے دل کے ہاتھوں اس کے اشاروں پر ناچنے کے لیے تیار تھا کیونکہ یہ بازی عشق کی بازی تھی جو ہارے بھی تو مات نہیں ہوتی... بس اسی سوچ کے دائرے میں قید وہ اس دلربا کی اداؤں پر ایسا گھائل ہوتا رہا کہ آخری لمحات میں بھی اف تک نہ کی... چاہت ہو تو ایسی ہو جو ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی لوگ ان کے قصے دہراتے رہیں یہ اور بات کہ ہر دور میں دہرانے کے نتائج مختلف نکلتے رہے... لیکن ایک نکتے پر بالآخر ہر دور میں اتفاق پایا گیا کہ مٹی کا فساد مٹی سے پیدا ہوکر بالآخر مٹی ہی میں دفن ہوجاتا ہے۔



اُندلس میں حکم بن ہشام کا جب انتقال ہوا تو اس کے بیٹے عبدالرحمٰن کی عمر اکتیس سال تھی۔ کہتے ہیں یہ عبدالرحمٰن اضداد کا مجموعہ تھا۔ اس اکتیس سالہ ولی عہد نے جب مسند خلافت پر قدم رکھا تو ملک کے حالات بہت ساز گار اور پرسکون تھے۔ اسے دورانِ خلافت دحکمرانی جن چار شخصیتوں سے گہرا واسطہ رہا۔ وہ مشہور فقیہہ امام یحییٰ، مشرق کا مشہور مغنی زریاب، بے مثل حسن اور دلربا اداؤں کی پیکر ملکہ طروب اور بلا کا ذہین اور فرمانبردار غلام نصر تھے۔ ان چاروں کی شخصیتوں اور ان کے کاموں پر نظر ڈالیے تو عبدالرحمٰن کی مجموعہ اضداد ذات کو سمجھنے میں کچھ مدد مل جائے گی۔

عبدالرحمٰن کا باپ حکم گناہوں کا اعلیٰ ارتکاب کرتا تھا اور اس پر ذرا بھی شرمسار نہ ہوتا تھا۔ فقیہانِ شہر اور علمائے عصر کو حکم کے طور و طریق ذرا بھی پسند نہ تھے۔ انہوں نے مل جل کر حکم کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔

امام مالک کے عظیم القدر شاگرد امام یحییٰ نے اس بغاوت کی نگرانی کی لیکن خونخوار اور سخت گیر حکم نے اس بغاوت کو سختی سے کچل دیا۔ امام یحییٰ گرفتار کر لیے گئے۔ بہت سے فقیہہ اور عالم قتل کردیے گئے۔ حکم کے ظلم اور سفا کی نے باغیوں کے حوصلے پست کردیے۔ جب اسیر امام یحییٰ کو حکم کے روبرو پیش کیا گیا تو اس نے نفرت سے سوال کیا۔

''یحییٰ! سچ سچ بتا کیا تیرے دل میں اب بھی میرے لیے نفرت کا جذبہ موجود ہے؟''

بہادر فقیہہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں اب بھی تجھ سے نفرت کرتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تجھ سے نفرت کرنا عین اطاعت خداوندی ہے۔''

اس اشتعال انگیز جواب سے حکم مشتعل نہیں ہوا۔ اس نے خلاف معمول ہنس کر اس بہادر فقیہہ سے کہا۔ ''یحییٰ! وہی خدا جس نے تجھے مجھ سے نفرت کا حکم دیا ہے، مجھے چشم پوشی کا حکم دے رہا ہے۔ جا تو آزاد ہے، میری طرف سے تجھے اجازت ہے کہ جہاں چاہے خدا کے سایۂ رحمت میں زندگی بسر کر۔''

اس غیر متوقع فراخدلانہ جواب نے امام یحییٰ کا دل جیت لیا، چنانچہ جب حکم کا اکتیس سالہ بیٹا عبدالرحمٰن برسرِ اقتدار آیا تو امام یحییٰ نے اس سے کہا۔ ''ابن حکم! قیامت زیادہ دور نہیں ہے کیا تم یہ پسند نہیں کرو گے کہ میں تمہیں قیامت کے دن شرمندہ اٹھنے سے بچالوں؟''

عبدالرحمٰن نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''میں آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔ یہاں تک کہ اگر مجھ سے اپنے حرم میں بھی کوئی نازیبا اور خلاف شرع حرکات سرزد ہوجائیں تو بھی آپ کو یہ حق حاصل رہے گا کہ آپ سرزنش فرمائیں اور مجھ پر حدِ شرعی جاری فرمادیں۔''

امام یحییٰ نے مسرت کا اظہار کیا، بولے۔ ''اللہ نے چاہا تو میں تیرے خارج اور باطن کو آلودگیوں سے بچالوں گا۔''

امام یحییٰ کو عبدالرحمٰن نے اپنا مشیر بنالیا۔

قصرِ ابیض کے باب الجامع سے نکل کر عبدالرحمٰن جامع قرطبہ میں داخل ہوگیا۔ غلام نصر اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ بادشاہ شمال مغربی دروازے سے مسجد میں داخل ہوگیا۔ وہ دو طرفہ حوض اور باغیچوں کے بیچ سے گزر کر ان ستونوں کی صف میں داخل ہوگیا جو اس کے دائیں بائیں دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ ان ستونوں سے گزر کر بادشاہ مسجد کی محراب میں داخل ہوگیا۔ یہاں منقش شاہ بلوط کی رحل پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا۔ بادشاہ قرآن کے سامنے سجدے میں گر گیا اور دیر تک آنسو بہاتا رہا۔ وہ سسکیاں لے لے کر اپنے خدا سے دعا مانگ رہا تھا۔

''الٰہ العالمین! تو میری خوبیوں اور کمزوریوں سے واقف ہے۔ تو ان میں اعتدال قائم کردے اور مجھے توفیق دے کہ میں اپنے معاملے میں بھی عدل و انصاف سے کام لے سکوں۔''

اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر نصر کو مخاطب کیا۔ ''نصر! تیرے باپ دادا عیسائی تھے لیکن خود تو نے اسلام قبول کرلیا۔ اب یہ بتا کہ کیا تو دل سے مسلمان ہوا ہے یا ملازمت اور دولت کی خاطر اسلام قبول کرلیا ہے؟''

نصر نے فوراً جواب دیا۔ ''میں نے اسلام کو اس کی سچائیوں کی وجہ سے اختیار کیا ہے ورنہ دین مسیحی برا تو نہیں تھا۔''

بادشاہ نے قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تب پھر تو خدا کے کلام کی قسم کھا کر مجھے اس بات کا یقین دلا کہ تو ہمیشہ میرا وفادار رہے گا۔''

نصر نے فوراً ہی اللہ کے کلام کو ہاتھ میں لے کر وفاداری کی قسم کھائی۔ بادشاہ نے کہا۔ ''نصر! تو نے میرا دل خوش کردیا۔ اللہ نے چاہا تو میں بھی تجھے خوب خوب نوازوں گا۔''

جامع مسجد سے جب وہ شاہی محل میں واپس آگیا تو اس کی بیگمات میں سے کسی ایک میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ بادشاہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر اس کے روبرو حاضر ہوجاتیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دروازے کھلے رکھے اور

انتظار کرتی رہیں کہ بادشاہ سلامت ان کے کمرے میں قدم رنجہ فرمائیں۔

شاہی محل کے جھروکوں سے بیگمات جھانک جھانک کر یہ دیکھ رہی تھیں کہ دیکھیں بادشاہ جاتا کس کے پاس ہے۔ بادشاہ نے ایک جگہ کھڑے ہوکر اپنی بیگمات کے جھروکوں کی طرف دیکھا اور پھر ملکہ طروب کی خدمت میں روانہ ہوگیا۔ طروب پہلے ہی چشم براہ تھی۔ اس نے چند قدم چل کر بادشاہ کا استقبال کیا۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ظلِ اللہ! میری خوش نصیبی کہ تخت نشینی کے بعد آپ نے مجھ ناچیز کا اتنا خیال رکھا کہ سب سے پہلے یہاں تشریف لائے۔ امیر المومنین کا میں کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

بادشاہ نے سرتاپا اشتیاق بن کر جواب دیا۔ ''طروب! تو لونڈی کی حیثیت سے میرے حرم میں داخل ہوئی تھی لیکن آج تو میرے حرم، میری مملکت کی ملکہ ہے۔''

''وہ سب بجا ہے۔'' طروب کے ہونٹوں پر شوخی کھیل رہی تھی۔ ''لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ اس ملک میں میری حیثیت ثانوی ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' بادشاہ نے اس کا ہاتھ، ہاتھ میں لے لیا۔

طروب کو بولنے میں پس وپیش تھا، بے دلی سے بولی۔ ''اس وقت میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، امیر المومنین اگر نہ سنیں تو بہتر ہے ورنہ ڈر ہے کہ اس ناچیز کی باتیں گراں خاطری کا باعث بن جائیں گی۔''

بادشاہ نے محبت سے طروب کی پیشانی کو چوم لیا، بولا۔ ''طروب! بخدا تو میری بات کا یقین کر، تیری پیشانی انوارِ حسن سے یوں منور ہے جیسے ضیائے ایمانی اور نورِ تقویٰ سے مسجد کی محراب۔''

طروب کا چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ بادشاہ کی آغوش میں سمٹ گئی۔ ''کیا یہ غلط ہے کہ ظلِ اللہ نے یحییٰ فقیہہ کو حد سے زیادہ اختیارات دے دیے ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ یحییٰ فقیہہ وہی شخص ہے جس نے امیر المومنین کے پدرِ بزرگوار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا؟ لیکن ناکام رہا تھا اور مرحوم بادشاہ نے علوئے ہمتی اور فراخ دلی سے کام لے کر اسے معاف کردیا تھا۔''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''یہ درست ہے لیکن ان باتوں کا مقصد؟''

طروب نے کہا۔ ''میں اس دن سے ڈرتی ہوں جب یحییٰ فقیہہ آپ کی محل سرا میں بھی دخیل ہوجائیں گے۔ میں یحییٰ کی عزت کرتی ہوں لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں کہ وہ ہم دونوں کی محبت میں حائل ہوں۔''

بادشاہ نے طروب کی زلفیں ہاتھ میں لے کر نتھنوں سے لگالیں اور ان کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہونے لگا۔ اس نے اپنی دونوں آنکھیں اس طرح بند کرلیں گویا اسے زلفوں کا نشہ چڑھ گیا ہو۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ''طروب! تو میری زندگی ہے اور تو میری اس محبت کا شاید اندازہ نہیں کرسکتی جو تیرے لیے میرے دل میں موجزن ہے، میں اس وقت تک حرم کی دوسری عورتوں سے لطف ولذت حاصل نہیں کرسکتا جب تک میں تیرا تصور نہ کرلوں۔ یحییٰ کا مرتبہ اور مقام اپنی جگہ لیکن یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ وہ تیرے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے۔''

طروب نے بادشاہ کی سیاہ ڈاڑھی اور سر کے سیاہ بالوں کے درمیان اس کا سرخ وسفید چہرہ اپنے چہرے کے قریب ہوتے محسوس کیا۔ یہاں تک کہ بادشاہ کی گرم اور تیز سانسیں اسے اپنے رخساروں اور ناک کی لو پر ہلکی ہلکی آنچ کی طرح محسوس ہونے لگیں۔ اس نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور بولی۔ ''نہیں، ابھی اس وقت نہیں، میرے سر میں شدید درد ہورہا ہے۔ میرے پورے جسم میں خون کے ساتھ تپ دوڑ رہی ہے۔''

بادشاہ نے اس کے ہاتھوں کو ہٹانے کی کوشش کی، بولا۔ ''طروب! میں تیرا مطلب خوب سمجھتا ہوں، میں تیرا مزاج داں ہوں۔ شاید تو مجھ سے تحفہ لینا چاہتی ہے۔''

طروب نے جواب دیا۔ ''وہ تو میرا حق ہے۔ میں بادشاہ کے تحفوں کو تبرکات کی طرح قبول کرتی ہوں۔''

بادشاہ نے طروب کے دونوں ہاتھ زبردستی اس کے چہرے سے ہٹادیے اور اسے اپنی آغوش میں لے لیا، پوچھا۔ ''بول، تو مجھ سے تحفے میں کیا لینا پسند کرے گی؟''

طروب نے جواب دیا۔ ''آج میں بادشاہ سے ایک ایسا تحفہ لوں گی جس کی قیمت سے میں خود اپنی قیمت کا تعین کروں گی۔''

بادشاہ نے پوچھا۔ ''تیرا مطلب؟''

طروب نے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ بادشاہ نے اپنے دل میں میری کیا قیمت مقرر کی ہے۔''

بادشاہ نے اسے ایک دم چھوڑ دیا، بولا۔ ''اچھا یہ بات ہے۔'' اس کے بعد وہ اس سے الگ ہوگیا، بولا۔ ''طروب! اب میں تجھ سے اسی وقت ملوں گا جب تجھے تیری حیثیت کے مطابق کوئی تحفہ دے چکا ہوں گا۔''

طروب نے بادشاہ کی عبا پکڑلی اور دوڑا [illegible] کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی، بولی۔ ''میرا اس سے یہ [illegible] سد ہرگز نہ تھا کہ میں بادشاہ کو ناراض کردوں، میں آپ کو یوں ہرگز نہ

جانے دوں گی۔"

بادشاہ نے مسکرا کر اس کے گال پر ایک چپت رسید کی۔ محبت سے بولا۔ "میں ناراض نہیں ہوں جانِ خلافت۔ میں نے جو کچھ کہا خوش دلی سے کہا۔"

طروب دامن چھوڑ کر بادشاہ کے پیروں سے لپٹ گئی۔ موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "نہیں، اس سے میرا دل مطمئن نہیں ہوگا اور اس وقت میں بادشاہ کو یوں نہیں جانے دوں گی۔"

بادشاہ کے دل پر طروب کی باتوں نے بڑا اثر کیا اور اس کے آنسوؤں نے تو بادشاہ کے دل کو مسل کر رکھ دیا۔ طروب کے ساتھ ہی وہ بھی فرش پر دوزانو ہو گیا اور اس نے اسے اپنی آغوش میں لے کر طروب کی ساری کدورت دھو ڈالی۔ کافی دیر بعد جب شاد کام بادشاہ طروب کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو طروب نے مسکرا کر اسے یاد دلایا۔ "بادشاہ نے جس تحفے کا مجھ سے وعدہ کیا ہے اسے میں لیے بغیر نہ رہوں گی کیونکہ میں اسے تحفے کے طور پر نہیں تبرک کی طرح قبول کروں گی۔"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔ "ضرور ضرور، تجھے تحفہ ضرور ملے گا۔"

☆☆☆

غلام نصر نے درباری موسیقار منصور کا ایک عریضہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں منصور نے بادشاہ کو مطلع کیا تھا کہ مشرق کا مشہور موسیقار زریاب اپنے اہل وعیال کے ساتھ مرحوم خلیفہ حکم کے ایما پر قرطبہ آرہا تھا لیکن جب زریاب کو یہ معلوم ہوا کہ خلیفہ حکم انتقال فرما چکے ہیں تو وہ واپس جانے پر آمادہ ہو گیا لیکن اسے بہت زیادہ سمجھا بجھا کر قرطبہ آنے پر آمادہ کرلیا گیا۔ اتنا کچھ کہہ کر درباری موسیقار منصور نے بادشاہ سے پوچھا تھا کہ "زریاب کو قرطبہ لایا جائے یا نہیں؟"

بادشاہ نے فوراً حکم جاری کردیا۔ "اسے فوراً ہمارے پاس روانہ کردیا جائے۔" اس کے بعد بادشاہ نے اپنے عمال کو علیحدہ فرمان جاری کیے، ان فرمانوں میں انہیں ہدایات کی گئی تھیں کہ زریاب اور اس کے خاندان کا بطور خاص خیال رکھا جائے۔

اس کے بعد بادشاہ نے اپنے خواجہ سراؤں کے افسر کو حکم دیا۔ "تم خچر اور سواریاں لے کر بہت جلد زریاب کے پاس پہنچو اور اس سے اپنے تعلقات استوار کرو۔"

خواجہ سرا سردار نے ہامی بھرلی اور زریاب کے استقبال کو آگے بڑھا۔

یحییٰ فقیہہ نے بھی ہمت کرکے بادشاہ سے کہا۔ "بادشاہ کو ان فضول اور غیر اسلامی احکامات کے اجرا میں اتنی دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔"

بادشاہ نے تنک کر غصے میں جواب دیا۔ "یحییٰ! میں تمہارے اس اعتراض اور مشورے کو ماننے پر آمادہ نہیں ہوں۔"

یحییٰ نے غصے میں کہا۔ "یہ میں کب کہتا ہوں کہ تم میری بات مانو بلکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم آلودگیوں سے بچے رہو۔"

بادشاہ نے یحییٰ سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ وہ اندر جانے لگا تو یحییٰ نے اسے زبردستی روک لیا، بولا۔ "میں تجھ سے چند بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

بادشاہ اور یحییٰ کی جھڑپ سے جھروکے میں بیٹھی ہوئی طروب بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے بادشاہ کا لہجہ تیز ہوتا، طروب کی خوشی میں اضافہ ہوجاتا لیکن جب یحییٰ حاوی آجاتا اور بادشاہ نرم پڑ جاتا تو پھر طروب کو بڑا دکھ ہوتا۔

یحییٰ نے غصے میں پوچھا۔ "تو یہ بتا کہ تیرے مال و زر سے معمور خزانے کس کے لیے ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "رعایا کے لیے۔"

یحییٰ نے فوراً اپنی عبا سے ایک رقعہ نکال کر بادشاہ کی طرف بڑھا دیا اور پوچھا۔ "یہ رقعہ کس کا ہے؟"

بادشاہ نے رقعہ کھولا تو یہ اس کے اپنے ہاتھ کا لکھا۔ اس میں بادشاہ نے وزیر خزانہ کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک لاکھ دینار کی قیمت کے زیورات طروب کو دیدے۔

بادشاہ نے رقعہ کو پھر تہ کردیا اور کہا۔ "یہ میرا رقعہ ہے۔"

یحییٰ نے جوش میں کہا۔ "اتنی قیمتی شے خزانے سے نہیں نکلنا چاہیے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "لیکن جو اس قیمتی شے کو پہنے گی وہ اس سے زیادہ قیمتی ہے۔"

طروب یہ جواب سن کر پھولی نہ سمائی۔ یحییٰ نے کہا۔ "عبدالرحمٰن! اس وقت تو، تو جو کچھ بھی کہے گا میں مان لوں گا لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ ضرور کہوں گا کہ تو یہ جو کچھ کر رہا ہے، بددیانتی ہے۔"

یحییٰ کی اتنی سخت بات بھی عبدالرحمٰن برداشت کر گیا۔ ایک لاکھ دینار کی قیمت کے زیورات طروب کی خدمت میں پہنچا دیے گئے جنہیں پا کر طروب پھولی نہ سمائی۔

☆☆☆

زریاب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شام کے وقت قرطبہ میں داخل ہوا۔ یہاں اسے رہنے کے لیے جو مکان دیا گیا تھا اس میں ضروریات زندگی کی ہر شے موجود تھی۔ زریاب نے پوچھا۔ "یہ کس کا مکان ہے؟"

اسے جواب دیا گیا۔ "آپ کا۔ ہمارا بادشاہ آپ کے فن کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔"

اس رات بادشاہ نے زریاب اور اس کے لڑکوں سے ملاقات کی۔ یہیں یحییٰ فقیہہ بھی موجود تھے۔

بادشاہ نے زریاب سے کہا۔ "مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ تجھے میرے باپ نے بلایا تھا لیکن وہ تیری آمد تیرے فن سے محظوظ اور لطف اندوز ہوئے بغیر ہی اس دنیا سے چلے گئے اور جب تیری آمد کی خبر مجھے ملی تو میں نے تجھے فوراً طلب کرلیا۔"

زریاب نے ڈرتے ڈرتے اشارۃً سوال کیا۔ "کیا مجھے یہاں معاشی مسائل سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں تیرا اور تیرے خاندان کا کفیل ہوں۔" اس کے بعد بادشاہ نے ایک کاغذ کے پرزے پر اپنا حکم لکھا۔

"آج کے تیسرے دن زریاب اور اس کے بیٹوں کو میرے روبرو پیش کیا جائے۔"

بادشاہ نے یہ پرزہ اپنے وزیر کے حوالے کردیا اور کہا۔ "آج کے تیسرے دن زریاب اور اس کے بیٹوں کو میرے روبرو پیش کیا جائے۔"

یحییٰ فقیہہ نے جوش میں مخالفت کی۔ "یہ سب کچھ حرام ہے اور غربا کے خزانے کو فضولیات اور ممنوعات پر برباد اور ضائع کیا جارہا ہے۔"

بادشاہ نے سوچا کہ یحییٰ کو تو ایسی باتیں کرنا ہی چاہئیں۔

بادشاہ یہاں سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ طروب اسے اندر آتے دیکھ کر کہیں چھپ گئی۔ اس وقت وہ ان زیورات سے لدی ہوئی تھی جنہیں شاہی خزانے سے نکالا گیا تھا اور جن کی قیمت ایک لاکھ دینار بتائی گئی تھی۔

بادشاہ دیر تک طروب کو تلاش کرتا رہا لیکن جب مایوس ہوگیا تو اس نے بہ آواز بلند طروب کو مخاطب کیا۔ "طروب! تو کہاں ہے؟ کیا تو ان زیورات سے خوش نہیں ہوئی، کیا یہ زیورات کم مالیت کے ہیں؟ کیا تو کچھ اور چاہتی ہے؟"

طروب نے کوئی جواب نہیں دیا بہ دستور چھپی رہی۔ بادشاہ نے اسے پھر مخاطب کیا۔ "طروب! تو کہاں ہے، میں

دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ زیور تیرے جسم پر کیسے لگ رہے ہیں؟"

طروب بہ دستور خاموش رہی اور بادشاہ اسے اضطراب اور بے چینی سے تلاش کرتا رہا۔ آخر تنگ آکر بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا طروب مجھ سے ناراض ہے؟"

طروب جہاں بھی تھی وہاں چپکے چپکے ہنس رہی تھی۔ بادشاہ نے کہا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر طروب مجھے مزید پریشان نہ کرے اور خود کو مجھ پر ظاہر کردے تو میں اتنی ہی قیمت کے زیورات اور نذر کروں گا۔"

اچانک بادشاہ کی نظریں ایک قدآدم مرتبان کی طرف اٹھ گئیں، اس کے اندر سے طروب یوں نمودار ہورہی تھی گویا اسے کسی بازی گر نے اپنے سحر سے نمودار کرلیا ہو۔ بادشاہ دوڑ کر مرتبان کے قریب پہنچ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ طروب کی بغلوں میں ڈال کر مرتبان سے باہر نکال لیا، بولا۔ "واللہ اگر تو کچھ دیر اور روپوش رہتی تو میں پاگل ہوجاتا۔"

طروب نے اپنے جسم پر سجے ہوئے زیورات پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور جواب دیا۔ "میں تو اس لیے نمودار ہوگئی ہوں کہ بادشاہ نے مجھے مزید تبرکات سے نوازنے کا وعدہ کرلیا ہے۔"

عبدالرحمٰن نے اس سرو قامت اور فتنہ حسن وشباب کو جوش و سرمستی سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا، بولا۔ "طروب! تیری ہر بات میں ایک مزہ ہے۔ تیری ہر ادا میں ایک کیف ہے۔ تو چپ رہ کر شرارت کرتی ہے تو اس سے دل کی دھڑکن میں قیامت کی تیزی آجاتی ہے اور جب تو سامنے آکر عشوہ و ادا دکھاتی ہے تو میری جان پر بن جاتی ہے۔"

طروب نے شرارت سے پوچھا۔ "امام یحییٰ میرے زیورات کی بابت کیا فرما رہے تھے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "وہ کہتے تھے اتنے قیمتی زیورات شاہی خزانے سے نہیں نکلنے چاہئیں۔"

طروب نے پوچھا۔ "پھر آپ نے انہیں کیا جواب دیا؟"

بادشاہ نے کہا۔ "میں نے کہہ دیا کہ جو ان قیمتی زیورات کو پہنے گی وہ ان سے زیادہ قیمتی ہے۔"

طروب خوشی سے جھوم گئی لیکن شرارتاً سوال کیا۔ "یہ زیورات کتنی مالیت کے ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "ایک لاکھ دینار۔"

طروب نے طنزیہ پوچھا۔ "تو آپ کی نظر میں میری اتنی ہی قیمت ہے؟"

بادشاہ نے کہا۔ "نہیں، کیا تو نے میرے اس جواب پر غور نہیں کیا جو میں نے امام یحییٰ کے استفسار پر انہیں دیا تھا۔ میں نے یحییٰ فقیہہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جو ان زیورات کو پہنے گی وہ ان سے زیادہ قیمتی ہے۔"

طروب آزردہ ہوگئی، اس کا منہ لٹک گیا۔ آنکھیں غم سے جھک گئیں۔ چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی۔ غم واندوہ کی سنجیدگی لیے آہستہ آہستہ بولی۔ "کیا میں نے آپ سے یہ نہیں کہا تھا کہ میں آپ کے عطا کردہ تحفے کی مالیت سے اپنی قدر و قیمت کا اندازہ کروں گی۔ اگر بادشاہ کی نظر میں واقعی ایک لاکھ دینار سے زیادہ میری قیمت تھی تو میرا تحفہ بھی ایک لاکھ دینار سے زیادہ کا ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ بادشاہ کے قول اور فعل میں مطابقت اسی لیے نہیں ہے کہ ان کا فعل دل کا تابع ہے اور قول زبان کا، چنانچہ بادشاہ کے دل میں جو میری قیمت تھی بادشاہ نے اتنی ہی قیمت کا تحفہ مجھے پیش کیا۔"

بادشاہ ذرا گھبرا گیا، بولا۔ "طروب! تو صرف حسین ہی نہیں بلا کی ذہین بھی ہے۔ میری باتوں کے کیا معنی و مطالب نکالے ہیں اس کا جواب نہیں۔" پھر کچھ دیر طروب کی شکل دیکھتا رہا، بولا۔ "اگر میں اپنی پوری سلطنت تیرے قدموں میں رکھ دوں تب بھی یہ تیری قیمت نہیں ہوگی۔"

طروب نے خوشی سے کہا۔ "میں سلطنت لے کر کیا کروں گی یہ بڑی دردسری کا سودا ہے۔ مجھے تو تحفوں کی حصولیابی کی ہوس ہے۔ بادشاہ کو چاہیے کہ وہ اپنا وعدہ ایفا کریں اور مزید تحفے عطا فرمائیں۔"

بادشاہ نے اسی وقت وزیر خزانہ کے نام ایک نیا فرمان جاری کیا، اس میں اتنی ہی مالیت کے مزید زیورات فراہم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ بادشاہ جب اس فرمان کو اپنے قلم سے لکھ رہا تھا تو اس کے سیدھے ہاتھ کی تیسری انگلی میں چمکتی ہوئی قیمتی انگوٹھی طروب کے دل و دماغ میں حرص و طمع کی آگ روشن کررہی تھی۔ جب بادشاہ فرمان پر دستخط کرکے اسے تہ کرنے لگا تو طروب نے اس کی انگوٹھی والی انگلی پکڑلی اور غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ کتنی دلکش انگوٹھی ہے۔ یہ میری انگلی میں کیسی لگے گی؟"

بادشاہ نے انگوٹھی اتار کر طروب کی انگلی میں پھنسادی، بولا۔ "اب تو خود ہی دیکھ لے کہ یہ تیری انگلی میں کیسی لگ رہی ہے۔"

طروب مٹھی بند کرکے اور کھول کر انگوٹھی کو دیکھتی رہی پھر بولی۔ "یہ تو بہت اچھی لگ رہی ہے۔ امیرالمومنین کے ہاتھ سے زیادہ اچھی لگ رہی ہے۔"

بادشاہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "پھر تیری منشا کیا ہے؟ تو

کیا چاہتی ہے؟ میرا خیال ہے تیری نیت خراب ہوچکی ہے لیکن یہ انگوٹھی تجھے نہیں دوں گا۔"

طروب نے ادھر ادھر دیکھ کر بادشاہ کو پیار کرلیا، بولی۔ "میں کب یہ کہتی ہوں کہ آپ اپنی انگوٹھی واقعی مجھے مرحمت فرمادیں۔ یہ تو وقت کی بات ہے کل جب میں آپ کی طرف راغب ہوئی تھی تو میں نے یہ سوچا تک نہ تھا کہ میری آپ کی نظر میں اتنی بڑی قدر و قیمت طے پائے گی۔" پھر وہ انگوٹھی اتارنے لگی، بولی۔ "میں تو یوں ہی مذاق کررہی تھی۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں نے یہ انگوٹھی دوبارہ پہننے کے لیے نہیں اتاری تھی۔ اب تو یہ تحفے میں لینی ہی پڑے گی۔"

طروب نے بادشاہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، بولی۔ "بخدا میں نے اتنے سخی ہاتھ نہیں دیکھے۔"

☆☆☆

حسب فرمان تیسرے دن زریاب اور اس کے چار بیٹوں کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ اس دن بادشاہ کے آس پاس امرائے سلطنت کا ہجوم تھا۔ بادشاہ کا غلام نصر، بادشاہ کے بالکل پیچھے بجا آوری فرمان کی خاطر مستعد اور چوکس کھڑا تھا۔ یہاں آس پاس کی دیواروں میں بالکونی جیسے روزن بنے ہوئے تھے۔ ان روزنوں میں رنگ برنگی باریک جالیوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بادشاہ کی حرم موجود تھی۔ باریک پردوں کے اس پار سے زیورات کے کھنکنے بجنے کی موسیقی بلند ہورہی تھی اور ان کے لباس کی سرسراہٹیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ان میں چار بالکونیاں سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ جن میں سے ایک میں طروب بیٹھی تھی۔ دوسری میں بادشاہ کی مدثرہ نامی محبوبہ تھی، تیسری میں اس کی کنیز حکم تھی اور چوتھی میں کنیز شفا۔ مدثرہ بھی اس کی کنیز تھی لیکن بادشاہ نے اسے آزاد کرکے بیوی بنالیا تھا۔ کنیز حکم کو شعر و شاعری سے بڑی رغبت تھی اور موقع محل سے اشعار خوب چست کیا کرتی تھی۔ پورے محل میں اس کے گانوں کی بڑی دھوم تھی۔ آواز بھی بہت اچھی پائی تھی۔ بادشاہ کو اس سے بھی والہانہ لگاؤ تھا۔ تیسری کنیز شفا کے حسن و جمال نے بادشاہ کو الگ اپنا گرویدہ بنا رکھا تھا۔ یہ سب مشرق کے نامور مغنی زریاب کا گیت سننے جمع ہوئی تھیں۔

پھر بادشاہ کے حکم سے نبیذ کا دور چلا۔ نبیذ کھجور کی شراب کو جائز قرار دیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے نبیذ کا پیالہ اپنے ہاتھ سے زریاب کو پیش کیا اور جب وہ نبیذ پی چکا تو بادشاہ

نے اسے گانا سنانے کا حکم دیا۔ زریاب نے اپنا عود سنبھالا۔ یہ پانچ تاروں والا عود تھا۔ اس سے پہلے عود میں صرف چار تار ہوا کرتے تھے۔ پانچواں تار خود زریاب کی اختراع تھا۔

زریاب نے بادشاہ اور حاضرین دربار کو عود کی خصوصیات بتائیں، اس نے عود کے پہلے اور زرد رنگ کے تار کو انگلی سے چھو کر متعارف کروایا۔

"امیر المومنین اور امرائے دربار! یہ زیر کا تار کہلاتا ہے۔ اسے عود میں قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے۔" اس کے بعد دوسرے سرخ رنگ کے تار کو چھو کر بولا۔ "یہ سرخ تار جیسا کہ آپ صاحبان ملاحظہ فرمارہے ہیں زیر کے تار سے دوگنا موٹا ہے، اسے مثنیٰ کہتے ہیں اور اسے عود میں وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں خون کو۔" پھر تیسرے تار کو چھو کر بولا۔ "اور یہ سفید تر مثلث کہلاتا ہے۔ یہ جیسا کہ آپ صاحبان خود دیکھ رہے ہیں کہ یہ دوسرے تار سے دوگنا موٹا ہے، اس کی سفیدی کا یہ مطلب ہے کہ یہ عود کے جسم میں بلغم جیسی حیثیت کا مالک ہے۔" پھر چوتھے تار کو چھیڑ کر بولا۔ "اور یہ سیاہ تار بم کا تار کہلاتا ہے۔ یہ موٹائی میں تیسرے سے دوگنا ہے اور اسے عود میں وہی حیثیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں سودا کو۔" پھر پانچویں تار کو نہایت شان سے چھیڑ دیا۔ "اور اس تار کو عود میں اس ناچیز نے بڑھایا ہے۔ یہ سرخ رنگ کا تار ان چار تاروں میں لطف و آہنگ میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔" پھر ان تاروں کو اس نے عقاب کی ہڈی کی مضراب سے چھیڑ دیا، بولا۔ "پہلے یہ مضراب لکڑی کی ہوا کرتی تھی لیکن عقاب کی ہڈی کی مضراب خالص میری ایجاد ہے۔"

بادشاہ نے زریاب کو نبیذ کا ایک پیالہ اور پیش کیا، بولا۔ "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ تو تاریخ میں میرے دربار کا مغنی کہلائے گا۔"

امرائے دربار نے بھی صدائے داد و تحسین بلند کی۔ باریک اور زرتار پردوں کے پیچھے سے بھی تحسین و آفرین کا ترنم جاری تھا۔

بادشاہ نے زریاب کو گانے کا حکم دیا۔ زریاب نے اپنا ہی گیت گانا شروع کردیا۔

"صاحب کمال ہونا بھی گویا ایک جرم ہے
دربار بغداد کا اسحاق موصلی میرا استاد ہے، اسے اپنے
فن پر ناز تھا
لیکن پھر بھی وہ اپنے شاگرد سے خوفزدہ رہتا تھا
اس کا یہ خوف کچھ غلط بھی نہ تھا کیونکہ اس پر یہ تلخ حقیقت
واضح ہوگئی تھی کہ "میں فن میں اس سے آگے نکل
گیا ہوں۔"
جب کسی طرح بغداد کے تاجدار ہارون کو میرے فن
کا علم ہوا تو اس نے اسحاق موصلی کو حکم دیا کہ زریاب کو دربار
بغداد میں پیش کیا جائے۔
ہارون نے مجھ سے پوچھا، کیا تو موسیقی جانتا ہے؟
میں نے جواب دیا، جس قدر تعریف کی جائے اس
سے بھی زیادہ اور میں آپ کو ایک ایسا گیت سناؤں گا جو
آپ نے پہلے کبھی بھی نہ سنا ہوگا
پھر ہارون کے حکم سے میرے سامنے میرے استاد
اسحاق موصلی کا عود رکھ دیا گیا
لیکن میں نے اپنا عود سنبھالا۔ ہارون نے پوچھا تو
اپنے استاد کا عود کیوں نہیں بجاتا اور تیرا عود بھی تیرے استاد
ہی کے عود جیسا ہے
میں نے جواب دیا میں اپنا گیت اپنے عود پر سناؤں گا
میں نے اپنے ریشمیں پانچ تاروں والے عود پر
ہارون کو ایک
ایسا گیت سنا دیا کہ ہارون کو کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا
بعد میں ہارون نے اسحاق موصلی کو ڈانٹا کہ تو نے اس
باکمال
کو اب تک مجھ سے چھپائے کیوں رکھا؟
جب میں دربار سے استاد کی خدمت میں واپس گیا تو
اس نے میرے ساتھ خود کو بھی ایک کمرے میں بند کرلیا
اس وقت غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں
اور منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔
اس نے مجھ سے کہا۔ زریاب! کیا تو آتشِ حسد پر
یقین رکھتا ہے؟
میں نے جواب دیا، ہاں میں اس آگ پر یقین رکھتا ہوں
اسحاق نے جوش میں کہا۔ تو سمجھ لے کہ اس وقت میں
اسی آگ میں جل رہا ہوں
اس نے کہا۔ زریاب! تو نے اپنے استاد کے ساتھ مکر
کیا۔ اگر تو میرا بیٹا ہوتا تب بھی میں تجھ سے یہی کہتا کہ ہم
دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اب تک تو میرے ہاتھوں پہنچنے
والے کسی ضرر سے اس لیے محفوظ ہے کہ تو میرا شاگرد ہے
پھر اسحاق نے میرے دونوں شانے پکڑ لیے
اور انہیں ہلاتے ہوئے بولا۔ زریاب! اب تیرے سامنے
دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ تو بغداد چھوڑ دے اور یہاں سے

اتنی دور چلا جا کہ امیر المومنین (ہارون) کو تیرا نشان تک نہ ملے۔ اگر تو یہ صورت پسند کرے گا تو میں مال و دولت سے اتنا نوازدوں گا کہ تیری طبیعت سیر ہوجائے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ تو میری مرضی کے خلاف یہیں بغداد میں ڈٹا رہے۔ اگر تجھے یہ صورت پسند ہے تو بغداد میں بصد شوق رہ جا لیکن ہر وقت میری دشمنی سے ڈرتا رہ۔ واللہ زریاب! تو یقین رکھ، میں ہمیشہ اپنی جان و مال سے تیری جڑیں کھودتا رہوں گا۔" آہ اے زمانے، مجھے بتا کہ میں نے کیا جرم کیا تھا۔ بے شک صاحب کمال ہونا بھی ایک جرم ہے۔ میں نے بغداد کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ کہتے ہیں میرے بعد ہارون کو یہ کہہ کر چپ کردیا گیا کہ زریاب ناشکرا تھا اور اس نے ہارون کے انعام و اکرام کو اپنے شایان شان نہ سمجھ کر حقیر قرار دیا حالانکہ میں ناشکرا نہیں ہوں استاد کے حسد نے مجھ سے بغداد چھڑوادیا۔ میں مغرب میں چلا آیا۔ امیر المومنین عبدالرحمٰن کے خلد مکانی باپ حکم نے میری سرپرستی کا وعدہ فرمایا تھا لیکن وہ مجھے اپنے نیک دل اور فن شناس بیٹے کے حوالے کرگئے۔

اے بادشاہ! میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ میں ناشکرا ہرگز نہیں ہوں، میں حسد کا شکار ہوں۔

آہ! مشرق میں ہمیشہ گمنام رہوں گا لیکن مغرب مجھے یاد رکھے گا۔

میں نافع کا بیٹا ابوالحسن علی ہوں۔ میرا رنگ سیاہ ہے اور میری آواز دلکش، اسی وجہ سے لوگ مجھے زریاب کہتے ہیں کیونکہ زریاب نامی سیاہ رنگت کا پرندہ میرے ہی جیسی دلکش آواز رکھتا ہے

خدا امیر المومنین کو تاقیامت سلامت اور انہیں میرے حال پر مہربان رکھے۔"

بادشاہ نبیذ پینا بھول گیا۔ امرائے دربار ستونوں کے سہارے مدہوش سے ہوگئے۔ زرتار پردوں کے پیچھے قبرستان جیسی خاموشی طاری ہوگئی۔ زریاب کے خاموش ہوتے ہی پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔

"سبحان اللہ! کیا آواز ہے، کیا فن ہے اور کیا روداد۔" یہ طروب کی آواز تھی۔

مدثرہ کیوں پیچھے رہتی، بولی۔ "اب دربار میں کسی اور مغنی یا مغنیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔"

کنیز حکم سمجھ گئی کہ اس بات کا رخ کس طرف تھا، چہک کر بولی۔ "چمن میں مینا بھی ہوتی ہے بلبل اور قمری بھی۔ ان میں کسی کو کسی پر ترجیح تو دی جاسکتی ہے لیکن کسی کو کسی کی موجودگی میں بے کار اور فضول نہیں قرار دیا جاسکتا۔" پھر اس نے چند شعر پڑھے۔ "دنیا کا حسن اختلاف میں ہے۔ یکسانیت حسن کی قاتل ہے۔ دربار میں بادشاہ کی تنہا موجودگی اس ویرانے جیسی محسوس ہوگی جہاں کسی باز کو اکتانے اور اونگھنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہو۔ دربار کی شان بادشاہ کی موجودگی کے ساتھ امرائے دربار کی صف آرائی پر قائم ہوتی ہے۔"

بادشاہ کی چوتھی کنیز شفا کھلکھلا کر ہنس دی، بولی۔ "حسن کہیں بھی ہو اور کسی بھی شکل میں ہو، دوست اور دشمن سبھی کو یکساں متاثر کرتا ہے۔"

بادشاہ اپنے حرم کی اس دلچسپ نوک جھوک سے خوش ہورہا تھا۔ اس نے اپنے غلام نصر سے کہا۔ "زریاب کے لیے خلعت لائی جائے۔"

خلعت حاضر کردی گئی۔ بادشاہ نے یہ خلعت اپنے ہاتھوں سے زریاب کے جسم پر ڈال دی اور اسے دو سو دینار ماہانہ دیے جانے کا اعلان کیا۔

اس کے بعد بادشاہ نے زریاب کے چاروں بیٹوں کو اپنے قریب بلایا۔ یہ عبدالرحمٰن، جعفر، عبداللہ اور یحییٰ تھے۔ بادشاہ نے اعلان کیا۔ "زریاب کے ہر بیٹے کو بیس بیس دینار ماہانہ مقرر کیے جاتے ہیں۔"

چاروں بیٹے بادشاہ کے روبرو جھک گئے۔ بادشاہ اب بھی مطمئن نہیں تھا۔ اس نے مزید اعلان کیا۔ "زریاب کو ہر تہوار پر تین ہزار دینار انعام میں دیے جائیں گے۔ عید پر ایک ہزار دینار خصوصی انعام اور مہرجات (خزال) اور نوروز کے موقعوں پر پانچ پانچ سو دینار مزید۔ چار باغ، چھ قطعات، آٹھ مکان جو اور گیہوں کا ذخیرہ حکومت کی طرف سے۔"

زریاب اور اس کے بیٹوں پر شادیٔ مرگ طاری تھی۔ امرائے دربار زریاب کو رشک و حسد سے دیکھ رہے تھے۔

زریاب نے فرطِ خوشی میں کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ "کچھ اور؟"

زریاب نے جواب دیا۔ "امیر المومنین، جتنا مجھے اور میرے بیٹوں کو عطا کیا گیا ہے وہ میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ مجھ پر اب تک جو ظلم ہوئے تھے ان سب کی تلافی ہوگئی۔"

بعد میں جب زریاب نے باغات اور مکانات کی سالانہ آمدنی کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ان سے چالیس

ہزار دینار کی آمدنی ہوگی۔

امام یحییٰ کو جب اس انعام واکرام کی خبر ملی تو انہوں نے بادشاہ کو ایک بار پھر سرزنش کی۔

”بادشاہ کو اپنے خرچ کی ایک ایک پائی کا خدا کے سامنے حساب پیش کرنا ہوگا۔ میں حیران ہوں کہ بادشاہ اس حساب سے کس طرح گلوخلاصی حاصل کرے گا۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔”میں نے زریاب اور اس کے بیٹوں کو جو کچھ بھی دیا ہے ان کے اس غیر معمولی فن اور صلاحیتوں کو دیا ہے جنہیں خود خدا نے ان کی ذات میں ودیعت فرمادیا ہے۔ خدا نے ان خوبیوں سے دوسروں کو نہیں نوازا۔ چنانچہ میں نے زریاب کو جو کچھ دیا ہے وہ اس کی خدائی صلاحیتوں کو دیا ہے۔ خدا کی صلاحیتوں کو غیر معمولی اور داد ودہش سے نواز دینے کا یہ مطلب ہے کہ میں نے خدا کی ایک بڑی صناعی کا اعتراف کیا اور شکرانے میں داد ودہش کے ذریعے اپنے عجز و بے بسی کا ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔“

امام یحییٰ نے ان موشگافیوں سے کافی مزہ لیا، بولے۔”بادشاہ کی دلیلیں مجھے چپ تو ضرور کردیں گی لیکن میں ان کا قائل نہیں ہوسکتا۔ یہ بے جا اسراف ہے اور بادشاہ کی کوئی بھی دلیل اس صداقت کو بدل نہیں سکتی۔“

☆☆☆

زریاب پر جو نوازشیں کی گئی تھیں، ان سے طروب کو سخت دھچکا لگا۔ وہ بادشاہ کے الطاف وعنایات کا مستحق اپنے سوا کسی اور کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ بادشاہ سے روٹھ گئی اور اس وقت راضی ہوئی جب بادشاہ نے اسے بھی بہت کچھ عطا کردیا۔ بادشاہ کو طروب کا یہ انداز پسند نہیں آیا لیکن وہ اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس لیے اس تکلیف دہ روش کو بھی چپ چاپ برداشت کرگیا۔ بادشاہ طروب کے پاس کچھ دیر رک کر اپنی کنیز حکم کے پاس چلا گیا۔ کنیز حکم نے کھلی آغوش سے بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے بھی اپنی آغوش وا کردی۔ وہیں سبزہ زار پر بادشاہ نے ایک محفل سجائی، ریشمیں بڑے بڑے تکیوں کے سہارے دونوں ایک دوسرے سے مل کر بیٹھ گئے۔ بادشاہ نے حکم سے کہا۔

”آج میں بہت اداس ہوں اس لیے اس وقت تو میری خاطر ایک مختصر سی ضیافت اور تقریب کا انتظام کر۔“

کنیز حکم نے تالی بجائی، چند خواصیں ہاتھ باندھ کر حاضر ہوگئیں۔ حکم نے بادشاہ سے پوچھا۔”امیر المومنین! نبیذ سے شوق فرمائیں گے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔”ضرور۔ اور رقص وموسیقی سے؟“

”ہاں، ان سے بھی۔“

کنیز حکم نے خواصوں کو اس تقریب اور ضیافت کے اہتمام کا حکم دیا اور یہ سارا انتظام دم کے دم میں کردیا گیا۔ کنیز حکم اپنی جگہ سے اٹھ کر بادشاہ کے پہلو میں آبیٹھی۔ اب اس کا تکیہ بادشاہ کا پیٹ تھا یا اس کی دونوں رانیں۔ حکم کا بایاں ہاتھ بادشاہ کے شانے اور گدی سے گزر کر دوسرے شانے پر ظاہر ہوا۔ حکم کے دوسرے ہاتھ میں نبیذ کا پیالہ تھا۔ اس نے پیالہ بادشاہ کے منہ سے لگا دیا۔ بادشاہ چسکی لے کر پینے لگا۔

رقاصاؤں نے رقص کرنا شروع کردیا۔ آلات موسیقی نے فضا کو نغمہ زار بنادیا۔ گانے والیوں نے جو گیت سنائے وہ سارے ہی حزنیہ تھے۔ بادشاہ کی طبیعت اور زیادہ اداس ہوگئی، چیخ کر بولا۔

”کوئی طربیہ گیت سناؤ۔“

طربیہ گیت گائے جانے لگے یہ گیت بھی ایسے تھے کہ ان کا خاتمہ حزن وملال پر ہوتا تھا۔ بادشاہ نے حکم کو ایک طرف ہٹادیا اور بولا۔”حکم! ان لوگوں نے تو مجھے کچھ زیادہ ہی اداس اور ملول کردیا۔“

حکم ادب سے کھڑی ہوگئی، بولی۔”اگر امیر المومنین کا حکم ہو تو میں اداسی اور افسردگی کو دور کرنے کی کوشش کروں۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔”جو مناسب سمجھ، کر۔“

حکم نے رقاصاؤں اور مغنیاؤں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا۔ بس دو عورتیں باقی رہ گئیں جن کے ذمے یا تو محض خدمت گاری تھی یا انہیں آلات موسیقی کو چھیڑنے کا فن آتا تھا۔

حکم نے بادشاہ کو مطلع کیا۔”امیر المومنین جب سے تشریف لائے ہیں میں حسب حال کچھ شعر موزوں کررہی ہوں اگر اجازت ہو تو وہ سنا دیے جائیں؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔”ہاں اجازت ہے لیکن اتنا خیال رہے کہ ان شعروں میں حزن وملال کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو۔“

حکم نے عرض کیا۔”اس میں حزن وملال نہیں تاسف ہے، دنیائے دوں پر عبر وملامت کا پہلو ہے۔“

بادشاہ نے افسوس سے کہا۔”سنا، اگر تو بھی یہی چاہتی ہے کہ میں اداس اور افسردہ ہی رہوں تو یہی سہی۔“

حکم نے کھڑے ہوکر اپنا گانا شروع کرنا چاہا لیکن بادشاہ نے کہا۔”میں چاہتا ہوں کہ تو میرے پہلو سے جدا نہ ہو کیونکہ اس طرح میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرنے لگتا ہوں۔“

حکم دوبارہ اس کے پہلو میں بیٹھ گئی اور بادشاہ کے گلے میں باہیں ڈال کر گانے لگی۔

”تیری اداسی مناسب ہے، تو ملول ہوجانے میں حق بجانب ہے
حالانکہ تو ایک ایسا شخص ہے جس سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی
تو بادل کی طرح غیر جانب دار فیاض ہے
تو ہوا کی طرح فیض رساں ہے اور تجھ میں دھوپ جیسا جذبۂ سرپرستی اور بخشش عام ہے لیکن تیرے لیے یہ کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ جب تو کسی کو نوازتا ہے تو ایک طرف اس سے فقیہان شہر کو دکھ ہوتا ہے تو دوسری طرف ایک وہ ذات شاکی ہوجاتی ہے جسے تو سب سے زیادہ چاہتا ہے جسے سب سے زیادہ نوازتا ہے اور جس پر تو دوسروں سے زیادہ مہربان ہے
لیکن اے دنیا کے سب سے زیادہ مہربان انسان! تو ملول نہ ہو
اس دنیائے دوں کی یہی ریت ہے، یہی روش یہی فطرت ہے
یہ ہمیشہ سے ظالموں کی شکرگزار اور محسنوں کی شاکی رہی ہے
جب دوسروں کو کچھ دیا جاتا ہے تو یہ اس پر حسد کرتی ہے کہ وہ سب کچھ اسے کیوں نہیں دیا گیا
اور جب اسے دیا جاتا ہے تو شکرگزار ہونے کے بجائے کم دیے جانے کا گلہ کرتی ہے
اے شریف انسان! تو اسے مطمئن نہیں کرسکتا
تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تو نبیوں کی طرح صبر ورضا کی راہ اختیار کر
دنیائے دوں اپنی فطرت نہیں بدل سکتی اور تو اپنی سرشت نہیں چھوڑ سکتا، تم دونوں ہی مجبور ہو
حکم کے پاس اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ یہ تم دونوں سے عبرت اور تاسف حاصل کرے۔“

عبدالرحمٰن نے کنیز کا یہ گیت بہت پسند کیا۔ بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا، بولا۔”حکم! تُو نے تو میرے دل سے ملال اور کدورت کی گرد دھو ڈالی۔ اب میں بہت خوش ہوں۔“

حکم نے نبیذ کا ایک پیالہ بادشاہ کے ہونٹوں سے لگانا چاہا لیکن بادشاہ نے یہ پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے نہایت محبت سے اپنے ہاتھوں سے خود اس کو پلایا۔ بادشاہ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا۔

”میں کتنا خوش قسمت انسان ہوں کہ مجھے فقیہوں میں امام یحییٰ، عورتوں میں تو اور گانے والوں میں زریاب جیسی نادرۂ روزگار شخصیت حاصل ہوگئی ہے۔“

بادشاہ نے غم غلط کرنے کی خاطر حکم سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وہاں سے حکم کے سوا سبھی کو رخصت کردیا گیا اور کافی دیر بعد بادشاہ جب حکم کے پاس سے خود بھی رخصت ہونے لگا تو اسے شدت سے یہ محسوس ہوا کہ اس نے حکم سے جو کچھ بھی کہا تھا، غلط تھا، وہ اب بھی افسردہ تھا۔ حکم کے گیت اور گیت کے مفہوم نے ذرا سی دیر کے لیے اسے مطمئن اور خوش ضرور کردیا تھا لیکن اب یہ زخم پھر ہرا ہوگیا تھا۔ اب اسے کسی اور کی آغوش کی ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ وہ حکم کے پاس سے سیدھا مدثرہ کے پاس پہنچا۔ مدثرہ نے بادشاہ کی راہ میں اپنی آنکھیں بچھادیں۔ بادشاہ نے بچوں کی طرح بلک کر کہا۔

”مدثرہ! میں بہت پریشان ہوں۔ میرا دل اندر سے بکھرا جارہا ہے اس سے طمانیت چھن گئی ہے، اسے سکون پہنچاؤ، اسے اپنی آغوش میں چھپالو۔“

مدثرہ نے بادشاہ کو سکون پہنچانے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا لیکن کچھ دیر بعد جب وہ مدثرہ کے پاس سے بھی رخصت ہوا تو وہ اسی طرح افسردہ وملول تھا۔ وہ مدثرہ کے پاس سے شفا کے پاس پہنچا۔ یہ حسین وجمیل کنیز اپنے حسن کے سوا کوئی دوسری بڑی خوبی نہیں رکھتی تھی۔ بادشاہ یہاں بھی کافی دیر تک رہا لیکن دل بہ دستور مضطرب اور بے چین ہی رہا۔ شفا بھی شفا نہ دے سکی۔ محل سرا میں اور کنیزیں بھی تھیں لیکن بادشاہ جانتا تھا کہ اس کے دکھ کا علاج ان میں سے کسی ایک کے پاس بھی نہیں۔ وہ شفا کی آغوش میں دبکا ہوا کسی اور آغوش کی فکر میں کھویا رہا۔ اس نے نہایت کرب سے شفا کو مخاطب کیا۔”شفا! کیا تو بتا سکتی ہے کہ بائیں جانب پسلیوں کے پیچھے دھڑکنے والا سیماب صفت گوشت کا لوتھڑا کن کن چیزوں سے سکون پاتا ہے؟“

شفا نے جواب دیا۔”امیر المومنین! یہ ایک دشوار سوال ہے اور اس کا صحیح جواب تو وہی لوگ دے سکیں گے جو دن رات کسی نہ کسی گتھی کو سلجھاتے رہتے ہیں لیکن اگر میں اس کا جواب دوں گی تو یہی کہوں گی کہ دنیا کے سارے ہنگامے عقل وخرد کے دم سے ہیں۔ ہوش وحواس کے ہیں، فکر واحساس کے ہیں۔ اس لیے ایک پریشان انسان اگر سکون کا متلاشی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے ان اسباب پریشاں سے نجات حاصل کرلے۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے؟“ بادشاہ نے کہا۔”اس کا تو

یہ مطلب ہوا کہ میں سکون کی خاطر خودکشی کرلوں کیونکہ کوئی انسان جیتے جی تو عقل وخرد، ہوش وحواس اور فکر واحساس سے پیچھا چھڑا نہیں سکتا یا پھر یہ ہو کہ انسان دیوانہ بن جائے۔"

شفا کانپنے لگی، بولی۔ "میں نے جو کچھ کہا ہے اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ اس مطلب سے میں پناہ مانگتی ہوں، توبہ کرتی ہوں اور معافی کی طلب گار ہوں۔"

بادشاہ ہنس دیا۔ "شفا! تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ تو نے جو جواب دیا وہ نہایت عاقلانہ ہے اور اس کے جواب میں میں نے جو کچھ کہا اس میں میری مجبوری اور بے بسی کا احساس کارفرما ہے، میں تجھ سے ناخوش نہیں ہوں۔"

شفا نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔

بادشاہ دیر تک شفا کی آغوش میں آنکھیں بند کیے پڑا سوچتا رہا۔ یہاں اسے طروب کی یاد نے آگھیرا، وہی طروب جس نے اسے دل برداشتہ کردیا تھا، اب اپنی جملہ رعنائیوں اور سرمستیوں کے ساتھ عالم تصور میں اس کے روبرو کھڑی تھی اور مسکرا مسکرا کر اسے اپنی آغوش میں بلا رہی تھی۔ اس آغوش میں بات ہی کچھ اور تھی۔ بادشاہ کی رگ رگ اور نس نس میں طروب بسی ہوئی تھی۔ اس نے شفا سے پوچھا۔ "شفا! تو نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ ایک صاحب اختیار بھی کبھی کبھی بے بس اور مجبور ہوجاتا ہے، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

شفا نے جواب دیا۔ "امیرالمومنین! صاحب اختیار تو بس خدا ہوتا ہے۔ ہم انسانوں میں کوئی کتنا بڑا انسان ہی کیوں نہ ہو وہ کسی نہ کسی کے سامنے، کسی نہ کسی معاملے میں اور کبھی نہ کبھی بے بس ضرور ہوجاتا ہے۔ اسی لیے عقل مندوں کا قول ہے کہ خدا کی برتری اور انسان کی کمتری کے درمیان جو خلا پایا جاتا ہے یہی خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان حد فاصل اور خط امتیاز ہے۔"

بادشاہ شفا کی آغوش سے بھی اکتا گیا۔ وہ اپنے محل میں چلا گیا اور وہاں اپنے غلام نصر کو طلب کیا۔ جب نصر آگیا تو اس نے حکم دیا۔ "میں سیر وشکار کو جانا چاہتا ہوں، اس کا انتظام کیا جائے۔"

نصر نے دریافت کیا۔ "امیرالمومنین اپنے ساتھ کس کس کو لے جائیں گے؟"

بادشاہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ "تقریباً سو سوا سو افراد کی فہرست تم خود تیار کروگے لیکن ان میں میری طروب ضرور شامل ہوگی۔"

نصر چلا گیا اور بادشاہ یہ سوچتا رہ گیا کہ غیرارادی طور پر طروب کا نام اس کی زبان سے کیوں نکل گیا۔

☆☆☆

سیر وشکار کے انتظامات ہوچکے تھے۔ بادشاہ نے ایک کنیز کو طروب کی خدمت میں روانہ کیا لیکن کچھ دیر بعد یہ کنیز تنہا واپس آگئی۔ کنیز کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ طروب کہاں ہے، اس نے کیا کہا؟ وہ کیوں نہیں آئی؟ تو خوف زدہ کیوں ہے؟"

کنیز نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ بادشاہ نے بے تاب ہوکر کنیز کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا، پوچھا۔ "تو بولتی کیوں نہیں؟ طروب خیریت سے تو ہے؟ خدانخواستہ اسے کچھ ہو تو نہیں گیا؟"

کنیز نے اٹک اٹک کر عرض کیا۔ "اس کنیز میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ اصل واقعے اور جواب کو امیرالمومنین کے گوش گزار کرسکے۔ بہتر یہی ہے کہ امیرالمومنین ملکۂ عالیہ کے محل میں خود تشریف لے جائیں اور وہاں کی صورت حال کا خود مشاہدہ فرمائیں۔"

بادشاہ نے مزید کوئی سوال نہ کیا اور بھاگ کر طروب کے محل میں داخل ہوگیا۔ وہاں طروب کی خواب گاہ کے دروازے اندر سے بند تھے۔ بادشاہ نے دروازے پر دستک کی اور گھبرائی ہوئی آواز میں طروب کو آواز دی۔ "طروب! تم اندر کیا کررہی ہو دروازے کھولو۔"

اندر سے طروب کی آواز آئی۔ "امیرالمومنین واپس تشریف لے جائیں، میں دروازے نہیں کھولوں گی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

طروب نے کہا۔ "میں نے ایک بار کہہ دیا کہ میں دروازے نہیں کھولوں گی۔"

"میں سیر وشکار کو جارہا ہوں اور اپنے ساتھ تجھے بھی لے جانا چاہتا ہوں۔"

طروب نے بے مروتی سے جواب دیا۔ "آپ اپنے امرا کو ساتھ لے جائیں۔ مدثرہ کو لے جائیں، حکم اور شفا کو لے جائیں، زریاب اور اس کے بیٹوں کو لے جائیں۔ امیرالمومنین کے ساتھ جانے میں کس کو عار ہوگا۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "لیکن میں تجھے اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔"

طروب نے غصے میں کہا۔ "لیکن میں بار بار یہی کہوں گی کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

بادشاہ نے بھی غصے میں کہا۔ "لیکن میں تجھے اپنے ساتھ ہر قیمت لے جاؤں گا اور تیری خواب گاہ کے

دروازے تڑوادوں گا۔"

"بہ شوق تڑوا دیجیے۔" طروب نے اسی طرح جواب دیا۔ "آپ دروازے تڑوا دیجیے، فوج لے آئیے، خون خرابا کرائیے جو جی میں آئے کرگزریے لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ میں دروازے نہیں کھولوں گی اور دروازوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی آپ کے ہاتھ نہیں آؤں گی۔"

بادشاہ نے بے بسی سے کہا۔ "طروب! مجھے زیادہ مت پریشان کر، دروازے کھول دے۔"

اب طروب نے خاموشی اختیار کرلی۔ بادشاہ نے ایک بار پھر زور زور سے دستک دی اور پوچھا۔ "آخر تو مجھے اپنی وہ شرائط بتا جنہیں پوری کرکے میں دروازے کھلوا سکتا ہوں۔"

طروب نے جواب دیا۔ "یہ ترکیب اور شرائط آپ مدثرہ، حکم اور شفا سے جاکر معلوم کریں، میں نہیں جانتی۔"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تو تجھے میری اس محبت کا بھی خیال نہیں جو میرے دل میں ہر وقت شمع کی طرح روشن رہتی ہے اور جس کی آنچ میں، میں شب وروز جلتا رہتا ہوں۔"

طروب نے ترشی سے جواب دیا۔ "امیرالمومنین! آپ کی جملہ باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے، وہ یہ کہ میں دروازے نہیں کھولوں گی۔"

بادشاہ وہاں سے چلا آیا۔ اس نے امام یحییٰ کو بلا کر اصل واقعہ بیان کیا اور پوچھا۔ "اب آپ ہی بتائیں میں کیا طریقہ اختیار کروں کہ طروب دروازے کھول دے۔"

امام یحییٰ نے پوچھا۔ "خواب گاہ میں کھانے پینے کا کس قدر سامان موجود ہوگا؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "غالباً ایک دن کا بھی نہیں۔"

امام یحییٰ نے جواب دیا۔ "تب پھر اس سرکش اور خودسر عورت کو قابو میں لے آنا مشکل کام نہیں ہے۔"

بادشاہ اور اس کا غلام امام یحییٰ کی تجویز سننے کے لیے بے چین نظر آرہے تھے۔

امام یحییٰ نے جواباً کچھ کہا جسے کوئی بھی نہ سن سکا۔

بادشاہ نے کہا۔ "آپ کو زبان کھولنے میں آخر تامل کیوں ہے؟"

امام یحییٰ نے کہا۔ "طروب کی خواب گاہ کو باہر سے مستقلاً بند کروادو اور اس سلسلے میں کسی کی بھی سفارش قبول نہ کرو، تقریباً ایک ماہ تک ان دروازوں کو بند رکھو پھر جب تم ایک ماہ بعد خواب گاہ کے دروازے کھلواؤ گے تو اندر سے طروب کا خشک مجسمہ ملے گا۔ گویا وہ اپنی بے جان ضد کی سزا پا چکی ہوگی۔"

بادشاہ نے غلام نصر کی طرف دیکھا۔ گویا پوچھ رہا ہو کہ "تم کیا چاہتے ہو نصر؟"

ذہین نصر نے سوال سنے بغیر ہی جواب دیا۔ "ملکہ عالیہ کی خواہشات کی کوئی حد نہیں ہے اس لیے اس مرض کا علاج تو امیرالمومنین کو کرنا ہی پڑے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر اس مرض کا علاج ہے کیا؟"

نصر نے جواب دیا۔ "امام یحییٰ نے جو علاج تجویز کیا ہے وہ بہتر ہے۔"

بادشاہ نے امام یحییٰ سے کہا۔ "آپ کے مشورے کا میں شکرگزار ہوں۔ آپ جاسکتے ہیں۔"

امام یحییٰ اسی وقت وہاں سے چلے گئے۔ ان کے ہٹتے ہی بادشاہ نصر پر گرم ہوگیا، بولا۔ "تو نے یہ مشورہ دیا کیسے کہ میں طروب کی خواب گاہ کو باہر سے بند کروادوں۔"

نصر نے خوف زدہ ہوکر جواب دیا۔ "میں نے وہ مشورہ نہیں دیا تھا بلکہ امام یحییٰ کی عظمت اور بزرگی کے پیش نظر میں نے ان کی تائید کردی تھی۔"

بادشاہ نے ڈانٹا۔ "تجھے ان کی تائید بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

نصر نے آہستہ سے کہا۔ "آئندہ میں اس کا خیال رکھوں گا۔"

بادشاہ نے نصر کو برا بھلا سناتے ہوئے کہا۔ "تجھے میری اس محبت کا ضرور خیال کرنا چاہیے تھا جو مجھے طروب سے ہے لیکن تو نے اس کا کبھی کوئی خیال نہیں کیا۔" اس کے بعد افسوس سے بولا۔ "طروب کے بارے میں تیرے احساسات کے علم نے مجھے بہت غم زدہ کردیا ہے۔ مجھے کم از کم تجھ سے ایسی امید نہیں تھی۔"

نصر بادشاہ کے قدموں میں گرگیا۔ عاجزی سے بولا۔ "امیرالمومنین! میں اپنے مشورے پر شرمندہ ہوں، مجھے معاف کردیجیے۔"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "خزانچی کو بلاؤ۔"

نصر نے فوراً ہی شاہی خزانے کے نگراں کو حاضر کردیا۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا۔ "خزانے سے دیناروں کی اتنی تھیلیاں لائی جائیں کہ اگر انہیں طروب کی خواب گاہ کے دریچے پر رکھا جائے تو خواب گاہ کا دروازہ اس میں چھپ جائے۔"

خزانے کے نگراں نے ذرا سی دیر میں، طروب کے در پر دیناروں کی تھیلیوں کا ڈھیر لگا دیا۔ تھیلیوں میں خواب گاہ کا دروازہ روپوش ہوگیا۔

بادشاہ نے ایک بار پھر طروب کو مخاطب کیا۔ ’’طروب! دروازہ کھول اور دیکھ کہ تیرے در پر دیناروں کی کتنی تھیلیاں رکھ دی گئی ہیں۔‘‘

اندر سے طروب نے سوال کیا۔ ’’لیکن یہ تھیلیاں میرے کس کام کی؟‘‘

بادشاہ نے کہا۔ ’’اگر تو دروازہ کھول دے تو یہ ساری تھیلیاں تیری ہو جائیں گی۔‘‘

طروب کا لہجہ ہی بدل گیا۔ پرمسرت لہجے میں پوچھا۔ ’’سچ؟ کیا میں امیر المومنین کے قول پر یقین کرلوں؟‘‘

بادشاہ نے جواب دیا۔ ’’طروب! کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ ایک بادشاہ تجھ سے وعدہ خلافی کرے گا؟‘‘

’’نہیں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔‘‘ طروب نے کہا۔ ’’لیکن اب بھی دروازے کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔‘‘

بادشاہ نے کہا۔ ’’طروب! اب تنگ نہ کر۔‘‘

طروب نے پوچھا۔ ’’اگر میں دروازے کھول بھی دوں تو اس سے امیر المومنین کو کیا ملے گا؟‘‘

بادشاہ نے جواب دیا۔ ’’میری آنکھیں تیری دید کو ترس گئی ہیں۔ اس وقت تو تیری دید ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔‘‘

طروب نے شوخی سے کہا۔ ’’میری دید میں آپ کو ایک شے نذر کرنا پڑے گی۔‘‘

’’کون سی شے؟‘‘

’’شاہی خزانے کا وہ ہار جس کی قیمت کا آج تک تعین ہی نہیں کیا جاسکا۔‘‘

شاہی خزانے کے نگراں نے دبے لفظوں میں بادشاہ کو خبردار کیا۔ ’’امیر المومنین کی مرضی اور ان کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس حقیر کی رائے میں یہ ہار خزانے سے نہیں نکلے گا۔‘‘

بادشاہ نے خشمگیں لہجے میں پوچھا۔ ’’وہ کیوں؟‘‘

خزانے کے نگراں نے کہا۔ ’’اس لیے کہ یہ ہار نہایت بیش قیمت ہے اور اسے شاہی خزانے کی زینت رہنا چاہیے۔‘‘

بادشاہ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ’’ہار کتنا ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو لیکن وہ طروب سے زیادہ قیمتی نہیں ہوسکتا۔ رہا شاہی خزانے کی زینت بننے کا سوال تو ہار خزانے کی نہیں گردن کی زینت ہوتا ہے اور طروب کے گلے سے زیادہ مقام زینت اور کیا ہوسکتا ہے۔‘‘

خزانے کے نگراں نے کہا۔ ’’امیر المومنین کی یہی مرضی ہے کہ وہ ہار ملکۂ عالیہ کے گلے کی زینت بنے تو اس غلام کی کیا مجال ہے کہ حیل وحجت سے کام لے۔‘‘

وہ ہار لینے چلے گئے اور بادشاہ نے طروب کو مخاطب کیا۔ ’’طروب! میں نے وہ ہار بھی منگوالیا ہے اب تو دروازے کھول دے۔‘‘

طروب نے آہستہ سے کہا۔ ’’یہ امیر المومنین سے محبت کا اثر ہے کہ میں دروازے کھولے دے رہی ہوں ورنہ میں نے تو آج یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مر کے ہی اپنی خواب گاہ سے نکلوں گی۔‘‘

بادشاہ نے کہا۔ ’’طروب! اگر تو نہ رہی تو میں کب زندہ رہوں گا، میں بھی مر جاؤں گا۔‘‘

بادشاہ نے دروازہ کھولے جانے کی آہٹ سنی اور بے تابانہ آگے بڑھا۔ دروازہ آہستہ آہستہ اندر کی طرف کھلنے لگا اور دیناروں کی تھیلیاں بھی دروازے کے ساتھ ہی اندر کی طرف کھسکنے لگیں۔ بادشاہ نے پوری طرح دروازہ کھلنے کا انتظار بھی نہیں کیا، پوری قوت سے دھکا دے کر اندر داخل ہوگیا۔ طروب بادشاہ کے قدموں میں گر گئی اور سسک سسک کر رونے لگی۔ بادشاہ نے اسے قدموں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگالیا اور لب و رخساروں پر بوسوں کی بارش کردی، بولا۔ ’’تو کیوں رو رہی ہے؟ تجھے کیا ہوا، رونا تو مجھے چاہیے تو مت رو۔‘‘

طروب نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ’’میں اپنی غلطی پر نادم ہوں کہ میں نے امیر المومنین کو بڑی تکلیف دی میں نے آپ کا دل دکھایا ہے اور اب میں وہ ہر سزا جھیلنے کو تیار ہوں جو امیر المومنین مجھے دے سکتے ہیں۔‘‘

بادشاہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل پڑے، بولا۔ ’’میں اور تجھے سزا دوں؟ طروب، تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ تجھے سزا دینے کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنے آپ کو سزا دے لوں۔‘‘

طروب روتی رہی اور بادشاہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔

شاہی خزانے سے ہار بھی آگیا۔ بادشاہ نے ہار لے کر خزانے کے نگراں کو واپس بھیج دیا لیکن وہاں نصر بھی موجود تھا۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا۔ ’’نصر! تجدید تعلق کی خوشی میں فقرا اور غربا کو نوازدینے کا میری طرف سے حکم صادر کردو۔‘‘

نصر نے سر جھکا دیا اور عاجزی سے بولا۔ ’’بہت بہتر ہے امیر المومنین۔‘‘

نصر بھی وہاں سے چلا گیا۔ بادشاہ نے طروب کو پوری قوت سے چمٹا لیا، پوچھا۔ ’’آخر تو مجھ سے بدگمان کیوں ہوگئی تھی؟‘‘

طروب نے جواب دیا۔ ’’میں یہ نہیں برداشت کرسکتی کہ مدثرہ، حکم اور شفا کو بھی اسی پلڑے میں بٹھایا جائے جس میں، میں پہلے سے موجود ہوں۔‘‘

بادشاہ نے جواب دیا۔ ’’طروب! تو یقین کر میرے دل میں جو تیرا مقام ہے کسی اور کا ہرگز نہیں ہوسکتا۔‘‘

بادشاہ نے بیش قیمت ہار طروب کے گلے میں ڈال دیا اور بولا۔ ’’یہ دیناروں کی تھیلیاں بھی اب تیری ہیں انہیں لے جا اور اپنے مستقبل کی طرف سے بے نیاز اور بے فکر ہوجا۔‘‘

طروب، بادشاہ کو چھوڑ کر ان تھیلیوں کی طرف راغب ہوئی اور انہیں اٹھا اٹھا کر ایک کونے میں جمع کرنے لگی۔ بادشاہ اس کے اس فعل کو شوق اور دلچسپی سے کچھ دیر دیکھتا رہا، اس کے بعد خود بھی ان تھیلیوں کے پاس پہنچ گیا، بولا۔ ’’یہ کام تیرا نہیں اپنی کنیزوں کو حکم دے، وہ انہیں اٹھا کر جہاں تو کہے گی رکھ دیں گی۔‘‘

طروب نے جواب دیا۔ ’’یہ کام میں خود کروں گی، مجھے خود کرتے بہت اچھا لگ رہا ہے۔‘‘

بادشاہ نے کہا۔ ’’تب پھر تیری خاطر مجھے بھی تیری مدد کرنی ہوگی۔‘‘ اور پھر وہ خود بھی تھیلیاں اٹھا اٹھا کر طروب کا شریک کار ہوگیا۔ بادشاہ نے سیر و شکار کا منصوبہ ملتوی کردیا۔

☆☆☆

بادشاہ نے ایک بار پھر طروب کی بارگاہ نیاز میں نیازمندی دکھانا شروع کردی۔ یحییٰ فقیہہ کو بادشاہ کی روش ذرا بھی پسند نہیں آرہی تھی لیکن وہ بادشاہ کی کھلم کھلا مخالفت نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں بادشاہ کی ذات میں کچھ غیر معمولی خوبیاں بھی نظر آتی تھیں۔ طروب اس فکر میں تھی کہ وہ بادشاہ کو ان سب کی طرف سے بدظن کردے۔ اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ حکم نے بادشاہ کو ایک ایسا گیت سنایا تھا جس کا روئے سخن خود طروب کی طرف تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں بادشاہ سے اس سلسلے میں پوچھا بھی لیکن بادشاہ ٹال گیا۔

انہی دنوں ملک میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بادشاہ ادھر مشغول ہوگیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجنے لگا۔ ان نوجوانوں نے ہر جگہ کامیابی حاصل کی۔ ان مشغولیات نے بادشاہ کو ہر طرف سے غافل کردیا تھا۔ ایک عرصے بعد جب بادشاہ کو باغیوں کی سرکوبی سے کچھ

ذلیل

چھ آدمی خود ذلیل ہوتے ہیں

☆ بغیر بلائے دعوت پہ جانے والا۔

☆ میزبان پر حکم چلانے والا۔

☆ دشمن سے نیکی کی امید رکھنے والا۔

☆ کمینوں سے احسان کی توقع رکھنے والا۔

☆ دو آدمیوں کے راز میں دخل دینے والا۔

☆ ایسی جگہ پر بیٹھنے والا جس کا وہ اہل نہیں۔

دوست

☆ دوست پر اندھا اعتماد نہ کرو، کیونکہ اس کا وار دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

☆ بہترین دوست وہ ہوتا ہے جو خوشی کے لمحات کے ساتھ ساتھ دکھ کے لمحات میں بھی بھرپور ساتھ دے۔

☆ جو اپنے دوست کو برے کام سے باز نہیں رکھ سکتا وہ دوستی کے قابل نہیں۔

☆ اس شخص کو برا سمجھو جس کا کوئی دوست نہ ہو اور اسے اس سے بھی زیادہ برا سمجھو جسے ایک اچھا دوست ملا ہو اور وہ اسے کھو دے۔

انسان

جب انسان دولت کھو دے تو کچھ نہیں کھوتا، اگر حوصلہ کھو دے تو بہت کچھ کھو دیتا ہے۔ اگر آبرو چلی جائے تو قریب قریب سب کچھ کھو جاتا ہے۔ لیکن اگر روح مر جائے تو سب کچھ مٹ جاتا ہے۔

تھکن

ایک دعوت میں بہت سے سردار کھانا کھا رہے تھے۔

سردار بوٹا سنگھ جلدی جلدی کھانا کھا رہا تھا جبکہ باقی سب لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

آخر سردار بوٹا سنگھ نے ہاتھ روک لیے۔

سردار رنجیت سنگھ۔ ’’سردار جی رج گئے او؟‘‘

سردار بوٹا سنگھ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ’’نہیں یار تھک گیا ہوں۔‘‘

مرسلہ: اعجاز احمد راحیل، مہرین ناز۔ ساہیوال

فرصت ملی تو اس نے طروب کی بارگاہ میں جا کر غمِ زمانہ سے نجات حاصل کی، اس موقع پر طروب نے حکم سے بدلہ لینے کی ایک عجیب ترکیب سوچی۔ اس نے حکم کی ذہانت، حاضر جوابی اور گانے کی بڑی تعریف کی اور بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ ایک محفلِ موسیقی منعقد کرے اور اس میں طروب کو حکم کا گانا سنائے۔

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''ایسا ممکن تو ہے لیکن کیا اس طرح تو حکم کی نفرت اور بغض و عناد کا شکار نہ ہو جائے گی؟''

طروب نے پوچھا۔ ''کیسی نفرت، کس بات کا بغض وعناد؟''

بادشاہ نے کہا۔ ''وہ یہ کس طرح گوارا کرلے گی کہ تیری موجودگی میں ایک عام مغنیہ کی طرح گا کر تیرا دل بہلائے۔''

طروب روٹھ گئی، بولی۔ ''کیا بادشاہ کے محل سرا اور حرم میں مجھے امتیازی حیثیت نہیں حاصل ہے؟''

''ہے اور بالکل ہے لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ حکم یا کسی اور کو بلاوجہ ذلیل یا شرمسار کروں۔''

طروب اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ''مجھے اجازت دیجیے۔ آج مجھے اپنی حیثیت کا پتا چل گیا ہے۔''

بادشاہ نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے جھٹک دیا۔ بادشاہ کو اس کی یہ ادا پسند تو نہیں آئی لیکن پھر بھی وہ اٹھا اور طروب کو روک لیا، بولا۔ ''طروب! تو ناراض کیوں ہوتی ہے۔ میں تیرے لیے یہ تقریب بھی منعقد کروں گا تو فکر مند نہ ہو اور خود کو ملول نہ کر۔''

طروب نے افسردگی سے کہا۔ ''بادشاہ کو میری عادت اور مزاج کا خوب علم ہے۔ میری نازک مزاجی ایسی باتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی جن میں، میں دوسروں کے مساوی قرار دی جاؤں اور دوسرے بھی میرے ہمسر ہو جائیں۔''

بادشاہ نے طروب کو منانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور اسے بڑی مشکلوں سے راضی کیا گو کہ اس کوشش میں اسے طروب کی خدمت میں دو نہایت بیش قیمت انگوٹھیاں پیش کرنی پڑیں۔

بادشاہ نے اس تقریب کا یوں اہتمام کیا کہ اس میں زریاب کی دونوں لڑکیاں، علیہ اور حمدونہ اور زریاب کی خاتون شاگرد بھی بلائی گئیں۔ انہی میں حکم کو بھی شامل کر دیا گیا اور اس تقریب کو کچھ ایسا رنگ دیا گیا گویا باکمال مغنیاؤں کا ایک مقابلہ منعقد کر دیا گیا ہے لیکن اس مقابلے میں حکم کو نہیں شامل کیا جائے گا بلکہ وہ جو کچھ بھی سنائے گی مقابلے سے مستثنیٰ ہو کر سنائے گی۔

یہ بات چھپنے والی نہیں تھی کہ اس تقریبِ موسیقی کے پیچھے کون سے اسباب اور عوامل کار فرما ہیں اور اس کا انعقاد کس کی خواہش پر ہو رہا ہے۔ مدثرہ اور شفا حکم کی طرف دار ہو گئیں اور ان دونوں نے حکم کو خوب خوب سکھایا پڑھایا کہ جس طرح بھی ممکن ہو طروب کو شرمسار ضرور کیا جائے۔ غلام نصر نے بھی کسی کے ذریعے حکم کو یہ پیغام بھیجا کہ اس کی ہمدردیاں حکم کے ساتھ ہیں۔

قصرِ دمشق میں اس تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ آلِ مروان نے دمشق کی یاد میں یہ قصر تعمیر کروایا تھا۔ یہاں دور کے پہاڑوں سے، زمیں دوز راستوں سے چشموں کا پانی لایا گیا تھا۔ چاندی، جست اور دوسری دھاتوں کے نلوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان نلوں کے منہ بھی عجیب عجیب شکلوں کے تھے کہیں بلی کی شکل تھی کہیں بطخ کی چونچ کی طرح، کہیں کسی دوسرے خوشنما پرند کی طرح۔

چودھویں کے چاند نے قصرِ دمشق کے اس سبزہ زار کو اپنی دھیمی دھیمی سرد و نرم چاندنی سے منور کر رکھا تھا جس پر دور دور تک ایک مینا بازار سا لگا ہوا تھا۔ اس تقریب میں محل سرا کی معزز خواتین کے علاوہ نامی گرامی امرا کی بیویاں بھی شریک ہوئی تھیں۔

پورا سبزہ زار پھولوں اور لباسوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ خوشبو کی تیزی اور شدت نے بعض نازک مزاج خواتین کو زکام میں مبتلا کر دیا۔

قصر کے صدر دروازے سے زریاب اور اس کی بیٹیوں کی سواری داخل ہوئی تو بیگمات اور خواتین میں غیر معمولی جوش و خروش پیدا ہو گیا اور گلوں سے بے معنی آوازیں نکلنے لگیں۔ سبزہ زار پر ان کے لیے ایک مخصوص جگہ مقرر تھی۔ زریاب کی سواری کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی اس میں زریاب کا ساز و سامان رکھا تھا۔ اس گاڑی کے پیچھے چند اور گاڑیاں تھیں ان میں زریاب کی شاگرد مغنیائیں بیٹھی تھیں۔

سب کے آخر میں قصر ہی کے ایک گوشے سے بادشاہ اپنی بیگمات اور حرم کے ساتھ نمودار ہوا۔ طروب نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور یہ بادشاہ کے دائیں جانب تھی۔ بائیں طرف مدثرہ تھی لیکن یہ بادشاہ سے ایک قدم پیچھے تھی۔ مدثرہ کے پیچھے حکم اور شفا تھیں اور یہ دونوں مدثرہ سے بھی ایک ایک قدم پیچھے تھیں۔ ساری محفل مودب کھڑی ہو گئی۔ محفل کی خواتین اور دوسرے لوگ آمنے سامنے دو قطاروں میں کھڑے تھے۔ بادشاہ اور اس کی حرم ان کے درمیان سے

گزر رہے تھے۔

بادشاہ نے زریاب کی مزاج پرسی کی اور اسے زحمتِ استقبال سے معاف فرما دیا۔ بادشاہ کی نظریں بار بار زریاب کے بالوں پر پڑ رہی تھیں۔ زریاب نے سر کے بال چھوٹے کروا رکھے تھے اور مانگ ترچھی نکلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے چلتے چلتے زریاب سے سوال کیا۔ ''زریاب! لوگوں کے بال تو گدیوں تک اس طرح بڑھے اور پھیلے ہوئے ہیں کہ گردن کا پچھلا حصہ اس میں چھپ جاتا ہے اس کے علاوہ اب تک مانگ بھی سیدھی ہی نکالی جاتی رہی ہے لیکن تم نے تو اپنے بال بھی چھوٹے کروا لیے ہیں اور مانگ بھی ترچھی نکالی ہے۔ آخر یہ کس کے طور طریقے تم نے اپنائے ہیں؟''

زریاب نے جواب دیا۔ ''محترم امیر! یہ میرا خود ساختہ طریقہ ہے، میرے اس طریقے میں ایک حسن ہے جسے آپ بھی محسوس فرما سکتے ہیں۔''

بادشاہ نے محسوس کیا کہ زریاب درست کہہ رہا ہے۔ ترچھی مانگ اور بالوں کی کمی نے اس میں دلکشی پیدا کر دی تھی۔ زریاب کی اس تمدنی تبدیلی کو ہر ایک دلچسپی اور شوق سے دیکھ رہا تھا۔

گانے سے پہلے آنے والوں کی کھانے سے ضیافت کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک شامیانے کے پیچھے سونے اور چاندی کے برتنوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ زریاب نے بادشاہ سے درخواست کی۔ ''حضور! میں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا نہیں کھاتا کیونکہ کوئی بھی دھات ہو اس میں میل ضرور جم جاتا ہے۔ میں نے شیشے کے برتنوں میں کھانا شروع کر دیا ہے۔ اس کے کئی فائدے ہیں ایک تو یہ کہ ان کی صفائی ستھرائی بہ آسانی ہو جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ شیشے کے شفاف برتن میں کھانا دیکھ کر طبیعت کھانے پر راغب ہو جاتی ہے اور جب کھانے کی طرف طبیعت راغب ہو جاتی ہے تو ایسا کھانا ہضم بھی جلد ہو جاتا ہے۔''

بادشاہ نے ہنس کر طنزیہ پوچھا۔ ''زریاب! تم موسیقار ہو یا ماہرِ تمدن، میں تو ابھی تک تمہیں نہیں پہچان سکا۔''

زریاب نے جواب دیا۔ ''حضور والا! باتیں تو بہت سی ایسی ہیں جن پر لوگ چونک چونک جائیں گے لیکن یہ محفل موسیقی کی ہے اس لیے بہتر ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہو اس کا کسی نہ کسی طور موسیقی ہی سے تعلق ہونا چاہیے۔''

بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ ''بہت خوب! میں اس کا خیال رکھوں گا۔''

کھانے پینے کا زوردار دور چلا۔ زریاب اور اس سے متعلق مہمان شیشے کے برتنوں میں کھاتے پیتے رہے۔ ساری محفل زریاب اور اس کی اختراعات کو حیرت و تعجب اور شوق و اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ بادشاہ نے جس موٹے اور دبیز ریشمی تکیے کا سہارا لے رکھا تھا اس کا رنگ گہرا نیلا تھا جس پر زرد اور سرخ باریک باریک پٹیاں پڑی ہوئی تھیں اور ان پٹیوں پر ابھری ہوئی شبیہیں تھیں۔ بادشاہ کے سامنے نہایت ٹھسے سے طروب نیم دراز تھی۔ اس کی ایک کہنی بادشاہ کی ران میں پیوست تھی۔ طروب سے ذرا دور مدثرہ، حکم اور شفا بیٹھی تھیں۔

کافی رات گئے موسیقی کا آغاز ہوا۔ پہلے زریاب کی شاگرد لڑکیوں اور عورتوں نے گیت گائے۔ ان کے بعد مہمان خواتین میں سے چند نے اپنے اپنے گیت سنائے۔

آخر زریاب کی بیٹی علیہ کی باری آ گئی۔ جب یہ گانے والیوں کی مقررہ جگہ پر جا کر بیٹھ گئی تو بادشاہ اور طروب کی ایما پر حاضرینِ محفل نے شورِ استقبال بلند کیا۔

علیہ نے گانا شروع کیا۔ خود اس نے اپنے باپ کا عود پکڑ رکھا تھا اور گانے کے ساتھ ساتھ سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی میں پھنسی ہوئی عقاب کی ہڈی کی مضراب سے عود کے رنگ برنگے تاروں کو چھیڑتی جا رہی تھی۔ پیچھے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سازندے اپنے اپنے سازوں میں الجھے ہوئے تھے۔ سامعین کو اپنے تن من کا ہوش نہ تھا۔ طروب خوش ہو رہی تھی کہ آج یہ باکمال مغنیائیں حکم کو شرمندہ و ذلیل کر کے رکھ دیں گی۔ اس نے کئی بار حکم کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا اور اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن بہ ظاہر وہ بالکل مطمئن تھی۔

جب علیہ گا چکی تو بادشاہ کی ایما پر تائید میں ایک بار پھر پوری محفل نے صدائے داد و تحسین بلند کی۔

اب حمدونہ کی باری تھی اور یہ زریاب کی نہایت باکمال بیٹی تھی۔ اس کے آتے ہی پوری محفل ہمہ تن گوش ہو گئی۔ حمدونہ نے ایک پُردرد گیت شروع کیا۔ اس نے اپنے باپ کی آوارہ گردی اور سفری مصائب کا اتنا پُردرد نقشہ کھینچا کہ لوگوں کی آہیں نکل گئیں۔ اس نے اپنے گیت میں یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے باپ کو ان تمام بادشاہوں تک پر فوقیت حاصل ہے جو حکومتیں اپنے باپ یا چچا سے ورثے میں پا جاتے ہیں۔ اس نے اپنے باپ کے فن اور کمال کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ جب موسیقی اور مغنیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے گی اور ماضی سے مستقبل تک

ہزاروں سال پر مشتمل ایک جامع فہرست تیار ہوگی تو اس میں بھی جو نام سر فہرست ہوگا وہ رئیس المغنین ابوالحسن علی بن نافع الملقب بہ زریاب ہوگا۔"

آخر میں حمدونہ نے اسحاق موصلی کو برا بھلا کہا۔

"برا ہو اس حسد کا جس نے استاد زمانہ اسحاق موصلی کو بھی برا کردیا۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ اسحاق موصلی کا نام مستقبل میں حرفِ غلط کی طرح مٹ چکا ہوگا لیکن علی بن نافع کا نام زندہ و پائندہ رہے گا۔

مجھ سے زمانے نے پوچھا تیرے باپ کی سب سے بڑی بدقسمتی کیا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ اس کے دامن کمال پر اسحاق موصلی کی شاگردی کا بدنما داغ۔

مجھ سے زمانے نے پوچھا۔ اسحاق موصلی کی خوش قسمتی اور شرف و عزت کا سبب؟

میں نے جواب دیا میرے باپ کے استاد ہونے کا درخشاں جھومر۔" محفل کا برا حال تھا، وفور غم سے بعض کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

جب حمدونہ اپنے باپ کے پاس واپس آگئی تو اس نے بیٹی کو ڈانٹا۔ "تجھے میرے استاد کو برا بھلا کہنے کا حق کس نے دیا۔"

حمدونہ نے جواب دیا۔ "اس کے حسد نے، اس کی پیشہ ورانہ رقابت نے، اس کی معاصرانہ دشمنی نے۔"

زریاب نے کہا۔ "جب میں نے اسے معاف کردیا تو تو اب لب کشائی کیوں کررہی ہے؟"

حمدونہ خاموش ہوگئی۔ زریاب نے کہا۔ "تو نے اپنے گیت میں اپنے محسن بادشاہ کا کوئی ذکر نہیں کیا؟"

حمدونہ نے جواب دیا۔ "محض اس خیال سے کہ ممدوح کے سامنے مدح کرنے سے سچ کا خون ہوجاتا ہے اور مدح سرائی میں درباری قصیدہ گوئی کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے، ایک ایسی قصیدہ گوئی جس میں ممدوح کی ان تمام صفات کا ذکر آجاتا ہے جو اس میں سرے سے ہوتیں ہی نہیں۔"

بادشاہ نے زریاب کو مزید جرح اور سرزنش سے روک دیا۔ "زریاب! اب بس بھی کر۔ تیری بیٹی بڑی حاضر جواب ہے اور اس لائق ہے کہ اسے کسی امیر یا وزیر سے منسوب کیا جائے۔"

زریاب چپ ہوگیا۔ اب بادشاہ کی کنیز حکم کی باری تھی جب وہ گانے والیوں کی مقررہ جگہ پر پہنچی تو ہلکا ہلکا شور استقبال کے لیے بلند ہوا، طروب سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مدثرہ اور شفا کے دلوں کی دھڑکن ذرا تیز ہوگئی کیونکہ یہ بڑی آزمائش کا وقت تھا۔

حکم نے تمہیداً عرض کیا۔ "علیہ اور حمدونہ کے بعد اپنا رنگ جمانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ اس عہد کے سب سے بڑے مغنی کی باکمال بیٹیاں ہیں۔ حمدونہ نے اپنے پردرد گیت سے سامعین کو رلادیا ہے میں کوشش کروں گی کہ روتے چہروں کو ہنسادوں۔"

طروب کا چہرہ طنز و استہزا کی شرارت سے مسکرانے لگا۔ بادشاہ حکم کو محبت سے دیکھنے لگا۔ حکم نے اپنا گیت شروع کردیا۔

"کہتے ہیں جب قسام ازل نے انسانی ارواح کو
لباس جسمانی بخشنا چاہا تو اس نے ان سے پوچھا، بتاؤ تمہیں
اس پیکر جسمانی میں اور کیا کیا درکار ہے؟
ارواح نے عجیب و غریب خواہشات کا اظہار کیا۔
کسی نے شرارت مانگی، کسی نے سیرت چاہی، کسی نے
صورت چاہی، کسی نے جلال طلب کیا،
کسی نے جمال طلب کیا، کچھ نے کمال کی خواہش کی،
کسی نے ان سب کا امتزاج طلب کیا
میں نے اپنے رب سے کہا۔ مجھے سیرت، صورت، ذہانت،
کمال، شوخی اور بذلہ سنجی کا آمیزہ دو گے۔
میرے قریب ہی کچھ ایسی ارواح بھی تھیں جو میری
اس طلب پر طنزاً مسکرا رہی تھیں۔
انہوں نے مجھ سے کہا، تو ہر چیز ذرا ذرا سی طلب
کرکے خود کو ضائع کیوں کررہی ہے؟
کوئی ایک ہی چیز کیوں نہیں مانگ لیتی۔
میں نے انہیں جواب دیا۔ اسے میں نے تمہارے
لیے چھوڑ دیا ہے۔
چنانچہ انہوں نے اپنے رب سے بے پناہ حسن طلب
کرلیا۔
انہوں نے اپنے رب سے کہا۔ اس حسن کے ساتھ
ہمیں ایک ایسا ظرف بھی عطا فرمادے جو کبھی سیر ہی نہ ہو،
جو ہمیشہ مزید کی طلب میں رہے۔
رب نے انہیں یہ سب عطا فرمادیا اور افسوس سے
کہا۔ زمانہ کی
قسم انسان بڑے خسارے میں ہے اور وہ ارواح
آج ہم سب کے سامنے بڑے تماشے دکھا رہی ہیں۔
ان کے حسن نے انہیں سب سے اونچے مقام پر
پہنچادیا ہے لیکن ان کی حرص و آز نے انہیں سب سے نیچے
گرادیا ہے۔

میں اپنے رب کی شکر گزار ہوں کہ میں افراط و تفریط کی شکار نہیں۔"

پوری محفل کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ خود بادشاہ بھی ہنسی روکنے کی کوشش میں طروب کی گھنی زلفوں میں اپنا چہرہ چھپائے لے رہا تھا۔ طروب غصے میں پاگل ہورہی تھی۔ بادشاہ نے اس کے کان میں کہا۔

"طروب! خود کو قابو میں رکھ ورنہ محفل کے لوگ تجھے پہچان لیں گے۔"

طروب نے طیش میں کہا۔ "تو آپ بھی یہی سمجھتے ہیں؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "میں تجھے یہ تو نہیں سمجھتا لیکن حکم کے مزاح نے مستقلاً میرے پیٹ میں گدگدی کررکھی ہے۔"

طروب نے کہا۔ "مجھے اس محفل میں لاکر ذلیل کیا گیا ہے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "اس محفل کا انعقاد تیری مرضی اور تیری خواہش پر ہوا ہے۔ اگر تو پسند کرے تو تو بھی حکم کی جگہ پر جا بیٹھ اور اسی طرح اسے تو بھی ذلیل کردے۔"

طروب نے تیسے میں کہا۔ "میں ملکہ ہوں، کوئی مسخری یا پھکو باز نہیں۔"

"تب پھر چپ رہ۔" بادشاہ نے کہا۔

طروب چپ ہوگئی لیکن حسد اور انتقام کی آگ سینے میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھی اور یہ انتقام کسی سے بھی لیا جاسکتا تھا۔ اس کا شکار حکم بھی ہوسکتی تھی اور خود بادشاہ بھی۔

اس موقع پر انعام و اکرام کی تقسیم میں بادشاہ نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا لیکن سب سے زیادہ انعام زریاب کی بیٹیوں کو عطا کیا گیا۔ بادشاہ نے انعامی رقم کا ایک شقہ شیخ الخزان (خزانے کا افسر اعلیٰ) موسیٰ بن حدیر کے نام لکھ دیا۔ بعد میں خزانے کے افسر اعلیٰ نے زریاب کو یہ رقم نہیں دی اور نہایت خوب صورتی سے ٹال دیا لیکن بادشاہ نے یہ رقم اپنے پاس سے دے دی۔

☆☆☆

اُندلس کی شمال مغربی ریاست جلیقیہ نے معاہدات کی خلاف ورزی کرکے بادشاہ کو بہت تنگ کررکھا تھا۔ بادشاہ نے اس پر فوج کشی کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے حرم سرا اور قرطبہ کی مجلسی زندگی کو خیرباد کہا اور دریائے منہو اور ایلہ کی سرزمین میں داخل ہوگیا۔ یہاں جابجا پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے تھے اور یہاں کی زمین اور پہاڑی نوکیں مغرب کے سمندر میں داخل ہوگئی تھیں۔ بادشاہ دشمنوں کے لیے سرکش لیکن اپنی وفادار فوجوں کو لے کر جلیقیہ کی سرزمین کو روندتا ہوا دور تک چلا گیا۔

دریائے ایلہ کے کنارے مسطح زمین پر شاہی افواج کے خیمے اس طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے گول، چوکور اور تکون کپڑوں کے درختوں کا جنگل زمین سے اگ آیا ہو اور انہیں دور سے دیکھنے سے ایسا لگتا گویا زمین پر شہد کی مکھیوں نے چھتا لگا رکھا ہے۔ شاہی خیمہ اپنی وسعت اور کشادگی میں سب سے نمایاں تھا۔ بادشاہ کو اس دور افتادہ سرزمین میں طروب کی یاد ستاتی رہتی۔ وہ اپنے فرصت کے لمحات میں طروب کو ہجر و مفارقت کی وارداتیں لکھتا رہتا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اس طرح کے اشتیاق نامے اور مفارقت کے مکتوب طروب کو اور زیادہ سرکش اور خود بین و خود آرا بنادیں گے لیکن وہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور تھا۔

جلیقیہ کی مہم سے فارغ ہوکر جب وہ قرطبہ کی طرف واپس ہوا تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ جلد از جلد طروب کی بانہوں میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ راستے کے سرسبز مناظر اور دلکش نظارے اس کو اپنی طرف نہیں متوجہ کرسکے۔ جب دور سے اسے جبال قرطبہ نظر آنے لگے تو وہ گھوڑے کی پشت پر ہی از خود رفتہ ہوگیا اور قرطبہ کی طرف منہ کرکے گھوڑے کی پشت ہی پر سربسجود ہوگیا اور خدا کا شکر ادا کیا جس نے اسے جلیقیہ کی کامیاب مہم سے واپس لاکر قرطبہ کی جاں فزا سرزمین پر پہنچادیا تھا۔

رمضان شروع ہوچکے تھے بادشاہ سیدھا طروب کے پاس پہنچا اور ایک عرصے کی جدائی کا غم غلط کرنے لگا۔ حرم سرا کی دوسری خواتین کو طروب سے اور زیادہ رشک و حسد ہوگیا۔ بادشاہ صوم صلوٰۃ کا پابند تھا لیکن طروب کے اصرار اور بے اعتدالی نے بادشاہ کا ایک روزہ قضا کروادیا۔ یہ خبر ایسی نہ تھی کہ راز رہ جاتی۔ محل سرا سے نکل کر امام یحییٰ تک پہنچ گئی اور امام یحییٰ نے جواب دہی کے لیے بادشاہ کو مذہبی عدالت میں طلب کرلیا۔

امام یحییٰ بادشاہ کو اپنے سامنے دیکھ کر ادب سے کھڑے بھی نہیں ہوئے اور بیٹھے ہی بیٹھے بولے۔ "کیا یہ درست ہے کہ بادشاہ کا ایک روزہ کسی عذر شرعی کے بغیر قضا ہوگیا ہے؟"

بادشاہ نے گردن جھکالی اور جواب دیا۔ "ہاں یہ خبر درست ہے اور میں شرمندہ ہوں اور اس کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔"

اس مقدمہ کی روداد کچھ اور لوگ بھی سن رہے تھے انہیں امام یحییٰ کے مرتبے اور مقام کا اس وقت صحیح اندازہ ہورہا تھا۔ امام یحییٰ نے جواب دیا۔ ”آپ کو اس ایک روزے کے بدلے ساٹھ روزے رکھنا پڑیں گے۔“

ایک امیر نے امام یحییٰ سے پوچھا۔ ”کفارے میں ساٹھ روزے داروں کو افطار بھی تو کروائی جاسکتی ہے پھر یہ ساٹھ روزے رکھنے کی سزا کیوں؟“

امام یحییٰ نے جواب دیا۔ ”ساٹھ روزے داروں کو افطار کروانے کا کفارہ ان پر واجب ہے جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہوتی لیکن بادشاہ ساٹھ تو کیا ساٹھ ہزار روزے داروں کو افطار کرواسکتا ہے۔ وہ کفارہ جس میں مکلف کو کسی قسم کا ذہنی، مالی اور جسمانی دکھ نہ برداشت کرنا پڑے وہ کفارہ قابلِ قبول نہیں۔“

بادشاہ نے بسروچشم امام یحییٰ کی یہ سزا قبول کرلی لیکن طروب سے وہ ذرا بھی بدظن نہ ہوا اور اس معاملے میں وہ خود ہی کو خطاکار ٹھہراتا رہا۔

رمضان کے بعد بادشاہ نے متواتر ساٹھ روزے رکھ کر ایک قضا روزے کا کفارہ ادا کردیا۔

☆☆☆

انہی دنوں قرطبہ میں ایک نیا فتنہ جاگ اٹھا۔ قرطبہ کے یولاجیس نامی مذہبی پیشوا نے احیائے دینِ مسیحی کا آغاز ایک عجیب وغریب طریقے سے کیا۔ اپنی تحریروں اور تقریروں سے اس نے عیسائیوں میں جوش وخروش کی ایک روح پھونک دی۔ اس نے عیسائیوں میں شوقِ شہادت پیدا کردیا۔ شوقِ شہادت کو پورا کرنے کا جو طریقہ اس نے نکالا وہ مسلمانوں کے لیے بہت پریشان کن اور تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہرزہ سرائی کو عین ثواب قرار دیا اور اس کی پاداش میں قتل کیے جانے والوں کو شہید کے مرتبے کی بشارت دی۔

امام یحییٰ اور دوسرے فقیہان اسلام نے ان دریدہ دہنوں کے لیے موت کی سزا تجویز کی۔ بادشاہ کے لیے یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ قرطبہ اور اس کے قرب وجوار میں ہر طرف مسیحی آباد تھے اور یہ زندگی کے تمام شعبوں میں موجود تھے۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمتوں میں بھی مسیحی موجود تھے۔ بادشاہ نے فقیہوں کو سمجھایا کہ اس سلسلے میں زیادہ جوش وخروش سے کام نہ لیا جائے اور جس طرح بھی ممکن ہو ان مذہبی دیوانوں کو سمجھا بجھا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جائے اور اگر کوئی واقعی اپنے اس مذموم فعل سے باز نہ آئے تو اس پر حدِ شرعی جاری کردی جائے۔

بادشاہ کے لیے یہ بہت برا زمانہ تھا۔ وہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ پرجوش پادری برملا بازاروں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اہانت آمیز زبان استعمال کرتے اور کیفر کردار کو پہنچ جاتے۔ اس تحریک میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شامل ہوگئیں۔ ایک طرف یہ ہنگامے تھے دوسری طرف بادشاہ کی صحت جواب دے رہی تھی۔ شاہی اطبا اپنی کوششوں میں لگے تھے۔ وہ بادشاہ کو صحت مند رکھنا چاہتے تھے لیکن بادشاہ اندر ہی اندر گھلتا جارہا تھا۔

اس کا غلام نصر خود بھی کبھی عیسائی تھا لیکن بعد میں مسلمان ہوگیا اور مسلمان ہوکر اس نے عیسائیوں کے خلاف جو اقدامات کیے وہ حد درجہ متعصبانہ تھے۔ وہ عیسائیوں سے مسلمانوں کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ جلتا تھا، بادشاہ کی طرف سے اسے یہ اختیار حاصل ہوچکا تھا کہ وہ جنونی پادریوں اور مسیحیوں کے لیے موت کا دن متعین کرے۔

بادشاہ نے وادی الکبیر پر ایک شاندار پل تعمیر کروایا تھا بادل ناخواستہ اسے دیکھنے گیا۔ پل کے نیچے دریا کی پرسکون روانی نے اس کے دل پر بڑا اثر کیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہی دریا جب اشبیلیہ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی روانی میں قیامت کی شدت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسے ایسا لگا جیسے وادی الکبیر کی روانی میں اس کی اپنی زندگی کی مطابقت پائی جاتی ہے۔ سست، مضمحل، اداس، تھکی ہوئی، غموں سے چور۔ وہ جب واپس ہوا تو اسے خنکی سی محسوس ہوئی اس کے ساتھ اس کا سب سے بڑا بیٹا محمد بھی تھا۔ بادشاہ نے بیٹے سے پوچھا۔ ”محمد! میرے چہرے کو غور سے دیکھ اور سچ سچ بتا، اس میں تجھے کیا محسوس ہوتا ہے؟“

بیٹے نے جواب دیا۔ ”مجھے تو آپ کے رخساروں میں زندگی کی شگفتگی، آنکھوں میں ارادوں کی مضبوطی اور پیشانی پر طول وطویل تجربات اور کامرانیوں کی روشن لکیریں صاف نظر آرہی ہیں۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”تو مجھے بہلا رہا ہے حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میرے دل کی طرح میرا چہرہ بھی بجھ چلا ہے۔“

بیٹے نے کہا۔ ”خدا نہ کرے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”یہ خدا نہیں کررہا۔ خدا اپنے کلام میں فرماتا ہے کہ تم سنتِ الٰہی کو بدلا ہوا نہیں پاؤ گے۔ دنیا کی ہر شے پرانی ہورہی ہے۔ یہاں کے موجودات کو عمل

فرسودگی گھن کی طرح کھاجاتا ہے۔ وقت اور زمانہ اور زمانے کے چھوٹے چھوٹے لمحات جو ہمیں نظر نہیں آتے، دنیا کی ہر شے کو دیمک کی طرح چاٹتے جارہے ہیں۔ سنتِ الٰہی کے اسی عمل کا میں بھی شکار ہورہا ہوں۔“

بیٹے کو باپ کی پردرد باتوں پر رونا آگیا۔ اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی آستین سے آنسو پونچھ ڈالے، بولا۔ ”میں یہ ساری باتیں نہیں سننا چاہتا خدا کے لیے چپ ہوجائیے۔“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”میری جگہ سنبھالنے کے لیے تیار رہ اور جہاں کہیں بھی رہ، تیرے دونوں کان قصر الکبیر کے اس گوشے سے لگے رہیں جہاں ایک بوڑھا آدمی آخر کار دم توڑ دے گا۔“ بیٹا آہستہ آہستہ رونے لگا۔

راستے میں ایک جگہ بڑی بھیڑ لگی تھی۔ بادشاہ کی آمد سے مجمع چھٹ گیا لیکن ان میں چند ایسے بھی تھے جو وہیں کھڑے رہے اور بادشاہ کی سواری دیکھنے لگے۔ بادشاہ نے ان کے قریب پہنچ کر اپنا گھوڑا روک دیا اور مجمع کے ایک عمر رسیدہ شخص سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟ تم لوگ یہاں کیوں جمع ہو؟“

بوڑھے نے جواب دیا۔ ”یہ مسیحی دکان دار گستاخِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، ہم نے اسے پکڑلیا اور اب اسے قاضی کے پاس لے جارہے تھے کہ آپ تشریف لے آئے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”اسے میرے قریب لاؤ، میں اس سے چند باتیں کروں گا۔“

ادھیڑ عمر پادری بادشاہ کی خدمت میں پیش کردیا گیا۔ بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا تو حضرت مسیح پر صدقِ دل سے یقین رکھتا ہے؟“

”ہاں، مجھے ان کی نبوت پر پورا یقین اور بھروسا ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”کیا مسیح نے کہیں یہ کہا ہے کہ تو دوسرے ہادیانِ دین کے ساتھ گستاخی کرے؟“

پادری نے دلیری سے جواب دیا۔ ”ہاں مسیح نے یہ فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کے سامنے میرا منکر ہوگا کل روز قیامت میں اپنے آسمانی باپ کے حضور میں اس کا منکر ہوجاؤں گا۔“

بادشاہ نے تحمل سے کہا۔ ”لیکن حضرت مسیح نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ اپنے دشمن سے محبت اور نفرت کرنے والوں سے نیک سلوک کرو اور یہ بھی فرمایا ہے کہ حقیر جاننے اور تکلیف دینے والوں کے حق میں دعائے خیر کرو۔“

پادری نے شوق شہادت میں ہرزہ سرائی شروع کردی۔ شہزادہ محمد نے ایک دم گھوڑے سے چھلانگ لگادی اور پادری کو زمین پر گرا کر اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ خود بادشاہ کا غصے سے بہت برا حال تھا لیکن اس نے شہزادے محمد کو منع کیا۔ ”محمد! تو اسے چھوڑ دے۔ کل اسے مذہبی عدالت میں پیش کردیا جائے گا اور وہاں سے سزا پالے گا۔“

شہزادہ محمد نے اسے چھوڑ دیا لیکن چھوڑتے چھوڑتے کئی تھپڑ ضرور رسید کردیے۔

بادشاہ ایک تو یوں ہی اداس اور مضمحل تھا اس پر اس پادری کی دریدہ دہنی، بادشاہ کے قویٰ خود کو کمزور محسوس کرنے لگے۔ اس کی پنڈلیوں سے جان کھنچنے لگی۔ وہ محل سرا میں داخل ہوتے ہی طروب کے پاس پہنچا اور نہایت رقت سے کہا۔ ”طروب! مجھے سکون دے، میں بہت پریشان ہوں۔“

طروب نے بادشاہ کا سر اپنی آغوش میں رکھ لیا اور بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیوں سے خلال کرنے لگی۔ اس موقع پر طروب نے شاید پہلی بار بادشاہ کے چہرے پر کمزوری اور بڑھاپے کے شدید آثار محسوس کیے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ ”طروب! کیا میں سچ مچ بوڑھا نظر آنے لگا ہوں؟“

طروب نے جواب دیا۔ ”بادشاہ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔“

اس جواب سے بادشاہ خوش نہیں ہوا، بولا۔ ”طروب! مجھے اس وقت شاعرانہ باتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تھکتا جارہا ہوں۔ میں اندر سے برف کی طرح پگھل رہا ہوں طروب۔ میں بھربھری، دیمک زدہ دیوار کی طرح خاک میں ملتا جارہا ہوں۔“

طروب نے رونے کی اداکاری کی، بولی۔ ”میں بادشاہ کی ان باتوں کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مایوسی کفر ہے، حضور والا اس کفر سے بچنے کی کوشش کریں۔“

بادشاہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور طروب اسے اپنی آغوش کی گرمی سے سکون پہنچاتی رہی۔

اس دن ذرا تاخیر سے طروب کو وہ بات بھی معلوم ہوگئی جو بادشاہ نے اپنے بیٹے محمد سے کی تھی، ولی عہدی والی بات۔ طروب کو محمد کی ولی عہدی میں اپنے لیے سیاہی اور تاریکی محسوس ہوئی۔ اس کا بھی ایک بیٹا عبداللہ تھا، طروب کے تیز ذہن نے فوراً یہ فیصلہ کرلیا کہ اسے بہر قیمت عبداللہ کو برسرِاقتدار لانا ہے، محمد کو نہیں۔

طروب نے بادشاہ کی عدم موجودگی اور لاعلمی میں غلام نصر کو بلایا۔ جب وہ آگیا تو طروب نے پوچھا۔ ”تجھے میرے پاس آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”ہاں، محل سرا کے چند محافظوں

نے مجھے دیکھ لیا ہے۔"

"تب تو بہت برا ہوا۔" طروب فکر مند ہو گئی۔ "میں تجھ سے چند اہم باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کیجیے، میں آ گیا ہوں۔"

"نہیں، ابھی نہیں۔" طروب نے کہا۔ "تو میرے پاس ایک بار پھر آئے گا۔ وہ باتیں بہت تفصیلی ہیں بس یہ سمجھ لے کہ وزارتِ عظمیٰ تیرا انتظار کر رہی ہے۔"

"سچ؟" نصر بھونچکا رہ گیا۔ "نصر اور وزارتِ عظمیٰ! خداداد بات ہو گی۔"

"اس وقت تو، تو واپس جا۔" طروب نے کہا۔ "میں کل سے پرسوں تک تیرا انتظار کروں گی۔"

نصر ذرا دیر کھڑا طروب کو دیکھتا رہا، بولا۔ "ملکہ عالیہ! میں چلا تو جاؤں گا لیکن اس رمز و کنائے کی گفتگو سے میں پریشان رہوں گا کہ ملکۂ عالیہ معلوم نہیں، کس قسم کی باتیں کرنا چاہتی تھیں۔"

طروب نے کہا۔ "پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں بس یہ سمجھ لے کہ تیری قسمت پلٹ رہی ہے۔"

نصر نے کچھ سوچتے ہوئے منہ بنا کے گردن ہلائی، بولا۔ "آپ نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے، معلوم نہیں کیا بات ہے؟"

نصر چلا گیا لیکن اس کا چین و سکون غارت ہو گیا۔ اس نے پوری رات کروٹیں بدل کر کاٹ دی۔

صبح بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ طروب کی طبیعت خراب ہے تو شاہی طبیب حرانی کو اسی وقت ساتھ لے کر ملکہ کے پاس جا اور اسے دکھلا کر دوائیں پہنچا کے وہیں موجود رہ کیونکہ معلوم نہیں ملکہ کو تیری کب ضرورت پیش آ جائے۔"

نصر سمجھ گیا کہ اسے اپنے پاس بلانے کی ترکیب بھی ملکہ طروب ہی کی سوچی ہوئی ہے۔ اس نے اسی وقت شاہی طبیب حرانی کو ساتھ لیا اور ملکہ کے پاس پہنچ گیا۔

طبیب نے اس کا خوب اچھی طرح حال پوچھا اور دوائیں دینے کی غرض سے نصر کو دواخانے لے آیا۔ دوائیں دیں، دواؤں کی ترکیب استعمال بتائی اور نصر دوائیں لے کر دوبارہ طروب کے پاس پہنچ گیا۔

طروب نے مسکرا کر سوال کیا۔ "بول، تجھے یہاں بلانے کی کیسی ترکیب رہی؟"

نصر نے جواب دیا۔ "ملکۂ عالیہ کی عقل کا جواب نہیں، اس عقل ہی نے تو بادشاہ کو آپ کا گرویدہ بنا رکھا ہے۔"

طروب آس پاس کا جائزہ لینے ادھر ادھر ٹہل آئی پھر پاس آ کر نصر سے پوچھا۔ "تو نے بادشاہ کی صحت پر بھی کبھی غور کیا؟ میرا خیال ہے وہ اب مستقلاً بیمار رہنے لگے ہیں۔"

نصر نے کہا۔ "ہاں، شاید بڑھاپا بہت تیزی سے انہیں اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔"

طروب نے پوچھا۔ "بادشاہ نے اب تک ہم سب کا بے حد خیال رکھا ہے لیکن پھر بھی میرے حاسدوں نے مجھے ایسی بہت سی چیزوں سے محروم رکھا ہے جس کی میں مستحق تھی۔ تیرا حال مجھے معلوم نہیں۔"

نصر نے دبے لفظوں میں شکایت کی۔ "ملکۂ عالیہ! میں بھی اپنے حاسدوں کا شاکی ہوں۔ میں صلاحیتوں کے اعتبار سے کسی بہت بڑے منصب کا مستحق تھا لیکن اس سے محروم رہا۔"

طروب نے کہا۔ "تو یہ ثابت ہوا کہ ہم دونوں ہی ناانصافیوں کا شکار رہے ہیں۔" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ حلق میں پھنس رہے تھے۔ نصر مظلوم بنا فدویت سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

"پرسوں میں نے بادشاہ کی حالت پر غور کیا تو بہت دکھ ہوا۔ بادشاہ چراغِ سحری ہیں کسی وقت بھی بجھ سکتے ہیں۔ بادشاہ کے بعد ہمارا کیا حشر ہو گا؟ کسی کو بھی نہیں معلوم۔ میں چاہتی ہوں کہ اپنے مستقبل کا تحفظ تیری مدد سے کروں۔ اگر تو نے میرا ساتھ دے دیا تو تیرے دن بھی پھر جائیں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ وزارتِ عظمیٰ تیرے علاوہ کسی کو بھی نہیں ملے گی۔"

نصر کے منہ میں پانی بھر آیا، بولا۔ "میں آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں۔"

ملکہ نے کہا۔ "میں تفصیل بعد میں بتاؤں گی کہ ہم دونوں کو کیا کرنا ہو گا لیکن پہلے تو خود اچھی طرح غور و خوض کر لے کہ اس راہ میں اگر تجھے میرے ساتھ کوئی ناجائز قدم اٹھانا پڑے تو تو خوفزدہ ہو کر پیچھے تو نہیں ہٹ جائے گا؟"

نصر نے جواب دیا۔ "ملکۂ عالیہ! مجھے کچھ بھی نہیں سوچنا۔ میں ہر وہ کام کر سکتا ہوں جس میں مجھے آپ کی سرپرستی اور مدد حاصل ہو گی۔ میں آپ کی حکم عدولی کر ہی نہیں سکتا۔"

طروب نے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ بادشاہ کے بعد میرا بیٹا عبداللہ جانشین ہو، بادشاہ کا رجحان محمد کی طرف ہے۔"

نصر نے کہا۔ "لیکن جانشینی کا مسئلہ تو بادشاہ کے بعد کھڑا ہو گا۔ ابھی سے آپ کیوں فکر مند ہیں؟"

"نصر! تو میری بات نہیں سمجھ رہا۔ ہمیں بادشاہ کی

موت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر تو ہمت کر جائے تو یہ کام بھی انہی دو چار دنوں میں ہو سکتا ہے۔"

"وہ کس طرح؟"

طروب نے نصر کی آنکھوں میں ڈوب کر دیکھا پھر ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی میں بولی۔ "تجھے بادشاہ کی طبعی موت کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔"

نصر کے خون میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے دل و دماغ جھنجھنا اٹھے۔ خوابیدہ لہجے میں پوچھا۔ "یعنی کیا بادشاہ کو......"

طروب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ قیمتی ہاتھ جنہیں بادشاہ کے علاوہ کوئی نہیں چھو سکتا تھا۔ آج نصر کے منہ پر رکھا تھا۔ نصر نے دونوں ہاتھوں سے اسے ہونٹوں پر دبائے رکھا اور زبان سے چھو کر اس کے بوسے لینے لگا۔ اس نے مخمور نظروں سے ملکہ کو دیکھا۔ ان نظروں میں خواہشیں تھیں، پیغام تھا، طلب تھی، مطالبے تھے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے ملکہ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں، میں جانتا ہوں لیکن اس کا صلہ، عوض، معاوضہ؟"

"وزارتِ عظمیٰ اور اس کے سوا بھی بہت کچھ۔"

نصر نے ملکہ کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا، پوچھا۔ "کیا یہ بھی؟"

ملکہ نے ہاتھ چھڑا لیا، بولی۔ "قبل از وقت کچھ بھی نہیں لیکن اگر میرا بیٹا عبداللہ برسرِاقتدار آ گیا تو میں تجھے تیری حیثیت سے زیادہ دوں گی۔"

نصر نے زیادہ جسارت سے کام لینا چاہا۔ اس نے ملکہ کو بھینچ کر اپنی آغوش میں چھپا لینا چاہا لیکن ملکہ تلملا کر مچھلی کی طرح نکل گئی اور بولی۔ "ابھی نہیں، ابھی کچھ نہیں، ابھی کچھ بھی نہیں۔"

نصر کی آتشِ شوق کچھ زیادہ ہی بھڑک گئی۔ اس نے قسم کھائی۔ "ملکۂ عالیہ! واللہ اگر آپ اپنے وعدوں کی سچی ہیں تو یقین رکھیے آپ کے بیٹے عبداللہ کے علاوہ کوئی شہزادہ بھی برسرِاقتدار نہیں آ سکتا۔"

ملکہ نے کہا۔ "تب پھر میرے اس وعدے پر بھی یقین رکھ کہ اس کے صلے میں تجھے جو کچھ دیا جائے گا اس کا تو ابھی گمان بھی نہیں کر سکتا۔"

یہاں سے نصر بادشاہ کے پاس پہنچا اور اسے ملکہ کی خیریت سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا۔ "رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرنے والے پادری کو عدالت نے سزائے موت کا حکم سنا دیا ہے۔ موت

روشن اقوال

سیدنا عمر فاروقؓ کا قول ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ چار سمندروں کا تعلق ہے۔

- خواہشات گناہوں کا سمندر ہے اس انسان کے حق میں جس کو آخرت کی جوابدہی کا احساس نہ ہو۔
- نفس دنیاوی لذتوں کا سمندر ہے اس انسان کے حق میں جس کو اللہ کا خوف نہ ہو۔
- موت خطرات کا سمندر ہے اس انسان کے حق میں جو بداعمالیوں سے باز نہ آیا ہو۔
- قبر حسرتوں کا سمندر ہے اس انسان کے حق میں جس کی زندگی عمل سے خالی ہو۔

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

کی سزا کا دن تو مقرر کرے گا۔"

نصر نے جواب دیا۔ "ظلِ اللہ! رمضان کے دن ہیں اس لیے رمضان میں تو اس ناہنجار کو سزائے موت دی ہی نہیں جا سکتی۔ رمضان کے بعد عید منائی جائے گی اس لیے یہ عید کا دن پادری کی سزائے موت کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہو گا۔"

بادشاہ نے مسکرا کر کہا۔ "خوب، گویا جب سارے مسلمان عید کی خوشیاں منا رہے ہوں گے تو اس بدبخت کو اپنی زندگی کا سیاہ ترین دن دیکھنا نصیب ہو گا۔ گویا عید کی خوشیوں میں مسلمانوں کے لیے ایک اور خوشی کا اضافہ ہو گا۔"

نصر نے ادب سے عرض کیا۔ "جی بندہ پرور۔ اس بدبخت کو مرنے سے پہلے جتنا بھی جلایا جا سکے جلا لیا جائے۔"

بادشاہ نے کہا۔ "لیکن میں خود اس سے خوش نہیں ہوں، خدا ہمیں اور اس جاہل پادری کو معاف کرے۔ میں اسے سولی دینا پسند نہیں کرتا لیکن اس کا جرم ہی ایسا ہے کہ اسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

☆☆☆

بادشاہ کی صحت جواب دے رہی تھی۔ شاہی طبیب حرانی بادشاہ کو جو دوائیں دے رہا تھا اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا۔ بادشاہ کی دوائیں بھی نصر ہی لاتا اور تیار کرتا تھا۔

رمضان ختم ہو رہے تھے۔ شاہی طبیب حرانی نصر کو دوائیں دینے اٹھا تو نصر نے راز داری سے

پوچھا۔ ”کیا تمہارے دواخانے میں زہر بھی ہوتا ہے؟“

طبیب حرانی چونک پڑا۔ وہ ایک لمحے کے لیے مڑا اور تعجب سے پوچھا۔ ”کیسا زہر؟“

نصر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”ایسا زہر جو بہت زیادہ مہلک ہو اور جسے آج تک استعمال نہ کیا گیا ہو۔“

طبیب نے پوچھا۔ ”اس کا مصرف؟ اس کا کیا کرو گے؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”میں اس زہر کو ان مذہبی دیوانوں پر استعمال کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کر رہے ہیں۔“

طبیب نے کہا۔ ”لیکن انہیں تو سولیوں پر چڑھایا جا رہا ہے اور ان کے لیے یہ سزا مناسب ہے۔“

نصر نے زچ ہو کر کہا۔ ”میں بلاوجہ کی بحث میں اپنا وقت نہیں ضائع کروں گا۔ اگر تم یہ زہر دے سکو تو دے دو، میں تمہیں اس کا بہت معقول معاوضہ دوں گا۔“

طبیب چپ ہو گیا لیکن وہ سوچ میں پڑ گیا کہ نصر یہ زہر کس کے لیے طلب کر رہا ہے۔ نصر کے جواب سے وہ بالکل مطمئن نہ ہوا تھا۔

نصر جب دوبارہ حرانی سے ملا تو اپنے ساتھ دو ہزار دینار بھی لے گیا، بولا۔ ”یہ اس زہر کا معمولی سا نذرانہ ہے لیکن اگر تم نے میرا یہ کام کر دیا تو میں تمہیں اور بہت کچھ بھی دوں گا۔“

دو ہزار دینار کی طمع طبیب حرانی پر غالب آ گئی اور اس نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ رقم لے لی۔

دیناروں کا قبول کرنا تھا کہ نصر کا انداز ہی بدل گیا، بولا۔ ”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا، ابھی تمہیں اور بہت کچھ بھی ملے گا لیکن اس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ بات صیغۂ راز میں رہے گی۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو پھر سمجھ لینا کہ ہمیں ہماری بدبختیوں نے گھیر لیا ہے۔“

طبیب حرانی نے پوچھا۔ ”کیا مجھے اپنی موت بلانی ہے جو میں بادشاہ کے مقربِ خاص کے راز کو افشا کروں گا۔“

نصر کے دل میں طروب نے جو آتش شوق بھڑکائی تھی وہ لحہ بہ لحہ بھڑکتی ہی رہی۔ اس کے شعلے یہاں تک اٹھے کہ نصر سے بے احتیاطیاں سرزد ہونے لگیں۔ وہ کسی قسم کا ادب لحاظ کیے بغیر ہی طروب کے پاس پہنچنے لگا، ملکہ کو یہ بے احتیاطی پسند نہ آئی۔ اس نے نصر کو سمجھایا۔ ”نصر! ابھی سے تیرا یہ حال ہے، میں تو ڈرنے لگی ہوں کہ کہیں یہ سارا منصوبہ کسی ذرا سی بے احتیاطی یا بے پروائی سے خاک میں نہ مل جائے۔“

نصر نے جواب دیا۔ ”ملکۂ عالیہ! مجھے میری حد سے زیادہ خوش نصیبی نے ماؤف الدماغ کر دیا ہے۔ اس میں کچھ غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں لیکن میں آپ کو پھر بھی یہ یقین دلاؤں گا کہ منصوبہ پر پوری ہوش مندی سے عمل کیا جائے گا آپ یہ سن کر ضرور خوش ہوں گی کہ طبیب حرانی نے دو ہزار دیناروں کے عوض سم قاتل کی فراہمی کا وعدہ کر لیا ہے۔“

”سچ؟“ ملکہ نے خوش ہو کر سوال کیا۔

”بالکل سچ ہے ملکۂ عالیہ، آپ فکر نہ کریں۔“

طروب نے کہا۔ ”تب پھر تو بھی یقین کر لے کہ تو بہت جلد فرش سے عرش پر پہنچ جائے گا۔“

نصر نے شیخی سے کہا۔ ”اس وقت میں بادشاہ کا سب سے زیادہ معتمد ہوں، بادشاہ نشانے سے نہیں بچ سکتا۔“

ملکہ مسکرانے لگی لیکن گفتگو ایسے لہجے میں کی جس میں خوشی کے ساتھ ساتھ خوف کا عنصر بھی شامل تھا، بولی۔ ”نصر! تو میری ایک بات بطور خاص ذہن میں محفوظ رکھ۔ بادشاہ پھر بادشاہ ہے اور تو ایک غلام ہے۔ ان دونوں مراتب کا فرق تو خوب جانتا ہے۔ بادشاہ ایک بڑے ملک پر حکمرانی کرتا ہے اور تو محض حکم کا بندہ ہے، بادشاہ مرتے مرتے بھی کوئی ایسا داؤ ضرور کر سکتا ہے کہ وہ تجھے مات دیدے۔“

نصر کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار تھا، جوش سے بولا۔ ”بادشاہ پورے ملک پر حکومت کرتا ہے اور میں بادشاہ کے دل پر حکومت کرتا ہوں۔ دھوکا کھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

ملکہ چپ ہو گئی اور نصر خیالوں ہی میں ملکۂ عالیہ کے حسن پر نثار ہونے لگا۔

☆☆☆

قصر الکبیر کی شاہی خلوت گاہ میں بیمار بادشاہ کے قدموں میں غلام نصر کھڑا تشویش ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”حضور! اس طبیب کے چکر میں زیادہ نہ پڑیے، میرے خاندان میں ایک پرانا نسخہ چلا آ رہا ہے ہم لوگ اس پر نہایت پراسرار انداز میں عمل کرتے چلے آ رہے ہیں، اگر حضور فرمائیں تو یہ مقوی اعضائے رئیسہ نسخہ میں تیار کروں۔“

بادشاہ نے کمزور آواز میں کہا۔ ”میرے جوش اور ولولے تقریباً ختم ہو چلے ہیں، کیا انہیں ایک بار پھر بیدار کیا جا سکتا ہے؟ کیا میں ایک بار پھر جوانوں جیسی چستی اور اشتعال حاصل کر سکتا ہوں؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”حضورِ والا! دنیا میں کوئی بات بھی ناممکن نہیں، جس دوا کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ سو سالہ بوڑھے کو بھی جوان بنا دیتی ہے۔“ بادشاہ نے خاموشی اختیار کی۔

نصر نے پوچھا۔ ”حضور حکم دیں تو میں اپنی مقوی اعضاو اعصاب دوا تیار کروں؟“

بادشاہ نے آہستہ سے کہا۔ ”تیار کر۔“

نصر خوش خوش وہاں سے نکلا اور گھر پہنچ کر دوا تیار کرنے لگا۔

رمضان ختم ہوئے شام کو چاند دیکھنے کے لیے نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ نصر روزہ افطار کر کے پادری کی کوٹھری میں پہنچا، وہ اس وقت انجیل کے چند ٹکڑے ادا کر رہا تھا۔ نصر کو دیکھتے ہی چپ ہو گیا۔ نصر نے کہا۔ ”چپ کیوں ہو گئے؟ اپنے خدا سے دعائے مغفرت کر لو۔“

پادری نے کہا۔ ”نصر، تو بھی اسی ملک کا باشندہ ہے، تیرے باپ دادا بھی مسیحی تھے لیکن تو جاہ و منصب کے لالچ میں مسلمان ہو گیا لیکن ایک بات مجھے سچ سچ بتا دے۔“

نصر نے کہا۔ ”پوچھو۔“

پادری نے کہا۔ ”کیا تو ہم مسیحیوں کے ساتھ جو کچھ بھی کرتا ہے جاہ و منصب کی خاطر کرتا ہے یا واقعی دل سے کرتا ہے؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”احمق! میرے اسلام کو تو ابھی تک شک و شبے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ میں سچا مسلمان ہوں اور مرتے دم تک مسلمان رہوں گا۔ مسیح کا فلسفۂ حیات کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”توبہ کر توبہ۔“ پادری نے غصے میں کہا۔ ”کیوں کفر بکتا ہے۔“ اس کے بعد اس نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارے میں ہرزہ سرائی کی تو نصر نے پوری قوت سے اس کے منہ پر مکا رسید کر دیا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔

پادری نے اپنی آستین سے خون پونچھا اور منہ میں بھرے ہوئے خون کی کلی کر دی، بولا۔ ”تم لوگ مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

نصر نے جواب دیا۔ ”کل عید ہے، میں نے تیری موت کو عید تک کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ کل جب تمام مسلمان عید کی خوشیاں منا رہے ہوں گے تو انہیں ایک خوشی تیری موت سے بھی حاصل ہو گی۔“

پادری جھلا اٹھا، بولا۔ ”او کمین انسان! تو واقعی شیطان کا چیلا ہے۔ افسوس کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے ورنہ میں مسلمانوں کو اس خوشی سے محروم رکھتا۔“ نصر وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن نمازِ عید کے بعد پادری کو سولی پر چڑھانے کے لیے عید گاہ لے جایا گیا۔ ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہزاروں آدمیوں کے مجمع میں پادری یکہ و تنہا تماشا بنا کھڑا تھا۔ مسلمان اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ پادری اپنی بے بسی اور تنہائی پر کڑھ رہا تھا۔ سولی پر چڑھنے سے پہلے مسلمانوں سے انتقام لینے یا انہیں روحانی صدمہ پہنچانے کا ایک ہی طریقہ اس کے اختیار میں تھا اور وہ تھا رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا۔ چنانچہ اس نے چلا چلا کر ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ مسلمانوں نے اس کی زبان بندی کے لیے فوراً ہی سولی پر چڑھا دیا۔ سولی پر چڑھنے سے پہلے پادری نے نصر کو بددعا دی۔ ”نصر! خداوند مسیح تجھے ہلاک کریں۔ میں تو جا رہا ہوں لیکن وہاں تیرا انتظار کروں گا۔“

نصر نے پادری کے منہ پر نفرت سے تھوک دیا۔

پادری کے سولی پر چڑھائے جانے کی خوش خبری لے کر نصر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اس وقت وہ زریاب سے باتیں کر رہا تھا پھر یحییٰ فقیہہ بھی مزاج پرسی کو پہنچ گئے۔ نصر نے جب پادری کے مرنے کی خبر سنائی تو باشاہ کے سوا سبھی نے سبحان اللہ کہا۔ بادشاہ نے افسوس سے کہا۔ ”مجھے اس دیوانگی سے جان دینے کا افسوس ہے۔ ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ اس احمقانہ موت کو شہادت سمجھتے ہیں۔“

یکے بعد دیگرے سبھی چلے گئے تو نصر نے عرض کیا۔ ”حضور! وہ دوا تیار ہو چکی ہے جب فرمائیں حاضر کر دی جائے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”چند دن ٹھہر جا، میں کچھ اور دوائیں کھا رہا ہوں۔ ان کے بعد میں خود طلب کر لوں گا۔“

نصر نے بادشاہ کے چہرے کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن رعبِ شاہی سے نہ دیکھ سکا پھر بھی کہنے لگا۔ ”حضور والا کو اپنی صحت پر خاص توجہ دینی چاہیے۔ اس غلام سے تو حضور کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔“

بادشاہ اس کی باتوں سے عاجز آ چکا تھا۔ بے زاری سے بولا۔ ”اب تو جا سکتا ہے۔“

یہ یہاں سے سیدھا ملکۂ عالیہ کو سلام کرنے پہنچ گیا اور تخلیہ میں یہ خوش خبری سنائی کہ بس دو چار دن کی اور بات ہے، بادشاہ نے اس کی مقوی اعضائے رئیسہ دوا کھانا قبول فرما لیا ہے۔

ملکہ نے کہا۔ ”جس دن تو مجھے یہ خوش خبری سنائے گا میں تیرا منہ موتیوں سے بھر دوں گی۔“

نصر بولا۔ ”بس اپنے بیٹے عبداللہ کو تیار رکھیے، جیسے ہی محل سرا سے صدائے نالہ و شیون بلند ہو، عبداللہ کو تاج و تخت سنبھال لینا چاہیے۔“

طروب نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔“

جب نصر ملکہ سے باتیں کر رہا تھا، شاہی طبیب حرانی بادشاہ کی خدمت میں موجود نہایت پراسرار باتیں کر رہا تھا۔ وہ بادشاہ سے سرگوشی میں پوچھ رہا تھا۔ ”خدا بادشاہ کو تاقیامت سلامت رکھے۔ اس دوران غلام نصر نے حضور کو کوئی مقوی دوا تو نہیں کھلائی؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”ابھی تک کھلائی تو نہیں کھلانے پر مصر ضرور ہے۔“

طبیب نے دو ہزار دینار بادشاہ کے سامنے ڈھیر کر دیے اور پورا قصہ سنا کے عرض کیا۔ ”وہ زہر مجھ سے لیا گیا ہے اور جہاں تک میری ناقص عقل کام کر رہی ہے میں یہی سمجھنے پر مجبور ہوں کہ وہ زہر خدانخواستہ حضور ہی کے لیے حاصل کیا گیا ہے۔“

بادشاہ سناٹے میں آ گیا۔ حیرت سے پوچھا۔ ”یہ کام نصر نے کیا ہے؟“

”جی حضور!“ طبیب سینے پر ہاتھ باندھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔

بادشاہ نے ایک لمبی ہنکاری بھری اور طبیب سے کہا۔ ”تو یہاں سے چپ چاپ نکل جا، خبردار جو کسی اور سے اس کا ذکر کیا۔“

طبیب نے دیناروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”انہیں شاہی خزانے میں داخل کر دیجیے گا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”نہیں انہیں اپنے ساتھ لے جا۔ میں تجھے اور انعام بھی دوں گا۔“ طبیب حرانی چلا گیا۔

اس وقت تو بادشاہ کی حالت بڑی افسوس ناک تھی، اسے نصر پر غصہ آ رہا تھا اور افسوس بھی ہو رہا تھا۔ وہ دیر تک ادھر ادھر ٹہلتا رہا لیکن کہیں سکون نہ تھا۔ آخر تنگ آ کر وہ طروب کے پاس چلا گیا۔ ملکہ نے بادشاہ کو خلافِ معمول اپنے سامنے دیکھ کر بناوٹی خوشی کا اظہار کیا۔ ”زہے نصیب کہ حضور نے قدم رنجہ فرما کر عید کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا۔“

بادشاہ کچھ دیر تک محویت سے ملکہ کو دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”طروب! مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اب زیادہ نہیں جیوں گا۔ مرنے سے پہلے میں چند اہم فیصلے ضرور کر دینا چاہتا ہوں۔“

طروب نے بادشاہ کو اپنی آغوش میں لے لیا، بولی۔ ”کھڑے کھڑے تھک جائیں گے، میری آغوش میں دبک کر، پہلو میں بیٹھ جایئے۔ اس طرح باتوں میں بھی مزہ آئے گا۔“

بادشاہ معمول بن گیا اور طروب کے پہلو میں بیٹھ گیا، بولا۔ ”میرے بعد سب سے اہم مسئلہ ولی عہد کا ہے، تو کیا کہتی ہے، میں کسے ولی عہد بنا دوں؟“

طروب نے جواب دیا۔ ”محمد ٹھیک رہے گا۔“

بادشاہ نے اس عیار عورت کا چہرہ دیکھنا چاہا لیکن وہ اپنا منہ دوسری طرف کر چکی تھی۔

بادشاہ نے کہا۔ ”پہلے میرا بھی یہی خیال تھا لیکن کچھ دنوں سے میں عبداللہ کی سعادت مندی اور خردمندی کا مشاہدہ بھی کر رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے بعد اگر کوئی ملک کا نظم و نسق چلا سکتا ہے تو وہ یہی عبداللہ ہے، تب پھر عبداللہ کو ولی عہد کیوں نہ قرار دے دیا جائے۔“

طروب نے انکساری سے عرض کیا۔ ”میں کیا کہہ سکتی ہوں، بادشاہ کی نظریں جوہر شناس ہیں۔ ان کے فیصلے ہمیشہ صحیح ہوتے رہے ہیں اور یہ فیصلہ بھی غالباً درست ہی ہوگا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں عنقریب اس کا اعلان کر دوں گا لیکن تو اپنی زبان بند رکھے گی کیونکہ قبل از وقت تیری لب کشائی مجھے مصیبت میں مبتلا کر دے گی۔“

طروب نے جواب دیا۔ ”میں لب کشائی کیوں کروں گی؟ میں امورِ مملکت میں دخل اندازی بالکل پسند نہیں کرتی۔“

بادشاہ نے ہنس کر کہا۔ ”اس خوش خبری کے بعد تم مجھے کس طرح خوش کرو گی۔ میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

طروب نے سرتاپا نیازمندی سے کہا۔ ”میں تو بادشاہ کی ادنیٰ کنیز ہوں۔ یہ میری مجال کہ میں بادشاہ کو خوش کرنے کا دعویٰ کروں۔ بادشاہ خود ہی خوش ہو لیتے ہیں یہی میرے لیے وجہ افتخار ہے۔“

بادشاہ نے طروب کی گردن میں دونوں ہاتھ حمائل کر دیے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”طروب! تیس اکتیس سال حکومت کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کشور کشائی دردِ سر کے سوا کچھ بھی نہیں، اس راہ میں کیسے کیسے زخم کھانے پڑتے ہیں۔ بہ ظاہر تو ایک بادشاہ کے گرد و پیش ہزاروں لاکھوں جاں نثار جمع ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً ان میں ایک بھی جاں نثار نہیں ہوتا۔ ایک حساس بادشاہ کے لیے اگر کوئی جان لیوا احساس ہو سکتا ہے تو وہ یہ

ہے کہ وہ اپنی بادشاہت کی وجہ سے کسی سے سچی محبت نہیں حاصل کر سکتا۔ بہ ظاہر عورتیں اس پر جان چھڑکتی ہیں لیکن ان عورتوں کے دلوں میں کیا ہوتا ہے، یہ وہی جان سکتی ہیں یا پھر خدا جانتا ہے۔“

طروب کے کان کھڑے ہوئے کہ آج یہ بادشاہ کیسی باتیں کر رہا ہے۔ کہیں اسے سازش کا علم تو نہیں ہو گیا۔ ٹوہ لینے کے لیے بولی۔ ”آخر یہ یک بیک بادشاہ پر قنوطیت کا دورہ کیوں پڑ گیا؟ کیا بادشاہ کو ہماری محبت کا یقین نہیں ہے؟“

بادشاہ نے آنکھیں بند کر لیں، بولا۔ ”طروب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ اب میں اگر اس سال کو گزار لوں تو بڑی بات ہے۔ میرے بعد تیرا بیٹا حکومت کرے گا۔ اس کی بدقسمتی پر میں آنسو بہانے پر مجبور ہوں اگر تو میرا مشورہ قبول کرے تو اپنے بیٹے کو حکومت قبول کرنے سے منع کر دے۔“

طروب نے جلدی سے جواب دیا۔ ”بادشاہ باپ کا بیٹا، باپ کا ورثہ قبول کرنے کا پابند ہوتا ہے اور میرے خیال میں اگر باپ نے مصیبتیں جھیلی ہیں اور کارزارِ حیات میں سکون کی سانس نہیں لی ہے تو ایک فرمانبردار بیٹے کو اس کی اتباع ضرور کرنا چاہیے۔“

”تیری مرضی۔“ بادشاہ نے افسوس سے کہا۔ ”میں تجھے سب سے زیادہ چاہتا ہوں اس لیے تیرے بیٹے کی جاں نشینی پر مجبور ہوں۔“

☆☆☆

شہر میں مذہبی دیوانوں کی وبا پھوٹ پڑی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر کے سولی پر چڑھ جانا فیشن میں داخل ہو گیا۔ ان میں مرد اور عورتیں دونوں ہی شامل تھے۔ ان دیوانوں میں فلورا نامی ایک نہایت حسین و جمیل لڑکی بھی شامل تھی۔ فلورا کا باپ مسلمان تھا لیکن ماں عیسائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد ماں نے فلورا کو مسیحیت کا گہرا درس دیا جس کے نتیجے میں وہ کٹر مسیحی بن گئی۔ اس کے بھائی کٹر مسلمان تھے۔ یہ بھائیوں کے پاس سے نکل بھاگی لیکن پکڑ کے پھر بھائیوں کے حوالے کر دی گئی۔ یہ کھیل آنکھ مچولی کی طرح کچھ دن کھیلا جاتا رہا۔ آخر فلورا نے بھی مذہبی دیوانوں کی روش اختیار کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت پر اتر آئی، اسے گرفتار کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ قاضی نے اس کی کم سنی اور حسن سے متاثر ہو کر سمجھانے کی کوشش کی لیکن یہ باز نہیں آئی، آخر سولی پر چڑھا دیے جانے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ بادشاہ یہ ساری خبریں سن رہا تھا اور ہر خبر ہی اس کے دل پر ایک گھاؤ ڈال رہی تھی۔

بادشاہ اداس اور ملول بیٹھا کسی فکر میں غلطاں تھا۔ چند گانے والیاں طربیہ نغمات سے بادشاہ کے مرجھائے دل کو تر و تازہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ یہیں بادشاہ نے حکم کو طلب کیا۔ جب وہ آ گئی تو بادشاہ نے کہا۔ ”حکم! دنیا کی بے ثباتی اور انسانوں کی بے وفائی نے میرے دل کو داغ دار کر رکھا ہے۔ گھڑی دو گھڑی میرے قریب رہ کر تو ہی میرا دل بہلا۔“

حکم نے بادشاہ کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا، بولی۔ ”بادشاہ کو یہ گھاؤ تو ہر دل میں ملے گا۔ یہاں جس کا مرتبہ جتنا بڑا ہے اس کے دل میں یہ گھاؤ بھی اتنے زیادہ ملیں گے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”حکم! سچ بتا کیا تجھے بھی اس نوع کے غم ستاتے ہیں؟“

حکم نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ ”بادشاہ کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان کی محبوب ترین ملکہ بادشاہ کے علاوہ کسی اور سے محبت کرتی ہے تو اس کا بادشاہ کے دل پر کیا اثر ہوگا؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”کچھ ایسے ہی غم تو میرے دل کو چاٹے جا رہے ہیں۔“

حکم نے کہا۔ ”اور یہ غم میں ایک عرصے سے جھیل رہی ہوں۔ بادشاہ کو میرے علاوہ بھی خواتین پسند ہیں۔ بادشاہ کو اس کا حق بھی پہنچتا ہے۔“

بادشاہ اس کی باتیں نہایت غور سے سنتا رہا، حکم بولتی رہی۔ ”لیکن ان معاملات میں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں، اس دنیا کی عجیب ریت ہے اور انسان کی جس خمیر سے تعمیر ہوئی ہے خرابی وہیں سے چلی آ رہی ہے جس بات سے کسی ایک کو خوشی حاصل ہوتی ہے اس سے دوسرے کو دکھ پہنچ جاتا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”حکم! خدا نے تجھے بڑی عقل دی ہے انسان میں اتنا شعور ہو جتنا تجھ میں ہے تو شاید خوش رہ سکتا ہے۔“

حکم نے کہا۔ ”نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس شعور سے انسان خوش نہیں رہ سکتا بلکہ زندگی کی تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کر سکتا ہے یا حالات سے سمجھوتا کر کے کسی حد تک مطمئن ہو سکتا ہے۔“ بادشاہ کے دل سے بوجھ اترنے لگا، اسے ذرا سکون ملنے لگا۔

☆☆☆

بادشاہ نے نصر کو طلب کر لیا اور یہ بھی کہلایا کہ وہ اب تک جس مقوی اعصاب دوا کا ذکر کرتا رہا ہے اسے اپنے

ساتھ لیتا آئے، بادشاہ اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔

بادشاہ کا یہ پیغام جب نصر کو ملا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنی مسموم دوا لے کر فوراً بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا، بادشاہ نے مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا، بولا۔ ”آج میرے دل پر کچھ زیادہ گرانی محسوس ہو رہی ہے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ میں طبیب حرانی کی مقویات کے بجائے تیرے خاندان کی دوا استعمال کروں کیونکہ تو اس کی ایک مدت سے تعریف کرتا چلا آرہا ہے۔“

نصر خوشی سے باغ باغ ہوگیا، بولا۔ ”یہ اس غلام کے حق میں مایہ ناز اور باعث افتخار ہے کہ حضور میرے خاندانی نسخے کو شاہی طبیب کے نسخے پر فوقیت دے رہے ہیں۔“

بادشاہ اس وقت بہت خوش تھا، پوچھا۔ ”وہ دوا ساتھ لایا ہے؟“

نصر نے ایک نقرئی ڈبیا بادشاہ کے روبرو کردی بولا۔ ”یہ رہی وہ دوا۔ میں اسے حسب فرمانِ شاہی اپنے ساتھ لیتا آیا ہوں۔“

بادشاہ نے ہاتھ بڑھا کر یہ ڈبیا نصر سے لے لی اور اسے کھول کر دیکھنے لگا۔ نصر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بادشاہ نے ڈبیا کھول کر ناک سے لگائی۔ سونگھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں تو بڑی خوشبو پائی جاتی ہے کیا اس میں زعفران بھی شامل ہے؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”جی حضور، حضور کی قوتِ شامہ اور حس متمیزہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ زعفران تو اس میں جزوِ غالب ہے۔“

بادشاہ نے پوچھا۔ ”اس دوا کے فائدے کیا کیا ہیں؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”مفرح قلب و دماغ، ذہنی انتشار کی دشمن، فکر و تشویش کی قاتل، اعصاب کو توانائی بخشنے والی، اعضا کے لیے آبِ حیات اور ان خفتہ قوتوں کے حق میں تریاق جو عمر کے ساتھ ساتھ زوال پذیر ہوتی رہتی ہیں اور جن کی کمی یا محرومی سے انسان کا دل زندگی اور دنیا سے بےزار ہوجاتا ہے۔“

بادشاہ نے نصر کو غور سے دیکھا، پوچھا۔ ”تیری عمر کیا ہے؟“

نصر نے جواب دیا۔ ”پچاس پچپن سال۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تیرے اعصاب اور اعضا بھی انحطاط اور کمزوری کا شکار ہو چکے ہیں۔“

نصر گھبرایا۔ وہ بادشاہ کا کچھ کچھ مطلب سمجھ رہا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ہاں، بڑھاپے نے مجھے بھی پکڑ لیا ہے۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں اس دوا کو پہلے تو استعمال کر۔ میں اس دوا کے مفید اثرات تجھ میں مرتب ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔“

نصر نے چکرا کر بادشاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ سب کچھ سچ سچ بادشاہ کو بتا دے اور اپنے ساتھ ملکہ طروب کو بھی کھینچ لے لیکن وہ ایسا نہیں کرسکا۔ وہ ملکہ طروب کو اس مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔

بادشاہ نے چاندی کے چمچے میں ڈبیا کی دوا نکالی اور نصر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے اسے کھالے۔“

نصر انکار نہیں کرسکتا تھا۔ بدرجہ مجبوری وہ دوا حلق سے اتار گیا۔ فوراً ہی بولا۔ ”حضور مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں کیونکہ اس دوا کو کھانے کے بعد عرقِ گلاب کا پینا بہت ضروری ہے۔“

بادشاہ ہنس دیا، بولا۔ ”اب تم جاسکتے ہو۔“

نصر محل سرا سے نکلتے ہی سیدھا طبیب حرانی کے پاس پہنچا اور اسے پورا واقعہ بتا کے اس سے اس زہر کا تریاق دریافت کیا۔ طبیب نے جواب دیا۔ ”تو نے دیر کردی اگر تو فوراً ہی آجاتا تو میں تجھے بکری کا دودھ پینے کو دیتا۔“

نصر کی نسوں میں روح کھنچ رہی تھی، اس کی جان نکلی جارہی تھی۔ حرانی کو ڈانٹ کر کہنے لگا۔ ”اگر میں اب بکری کا دودھ پی لوں تو؟“

طبیب نے جواب دیا۔ ”زہر تیری نس نس میں داخل ہو چکا ہے اس لیے اب اس کا کوئی علاج نہیں۔ قسمت کے لکھے کو خوش دلی، ہمت اور استقلال سے قبول کر اور خدا کی مشیت پر قانع رہ۔“

نصر نے طبیب پر حملہ کرنا چاہا لیکن اب زہر ہاتھوں میں بھی پہنچ چکا تھا۔ ہاتھوں نے نصر کے ارادوں کا ساتھ نہیں دیا دونوں ہاتھ کچھ دور تک اٹھے پھر اس کی اپنی رانوں پر گر گئے۔

طبیب ہنسنے لگا، بولا۔ ”کیا تو یہ بھول گیا تھا کہ ایک بادشاہ اور غلام کی عقل میں کتنا فرق ہوتا ہے؟“

نصر کے ڈوبتے ہوئے حواس میں طروب کا دھندلا دھندلا چہرہ ابھرا ابھر کر غائب ہونے لگا۔ اس عالم میں بھی بےربطی سے یاد آیا کہ یہی بات ایک بار طروب بھی کہہ چکی ہے۔

نصر لڑکھڑاتے قدموں سے بہ دقت تمام اپنے گھر روانہ ہوا لیکن راستے ہی میں گر کر مر گیا۔

☆☆☆

نصر کی موت کی خبر آناً فاناً مشہور ہوگئی۔ جب یہ خبر

طروب کے کانوں تک پہنچی تو وہ بہت گھبرائی لیکن بادشاہ نے اسے کچھ بھی نہیں کہا مگر بادشاہ کی اندرونی پریشانی کوئی بھی محسوس کرسکتا تھا، اسے اندر ہی اندر یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اس نے جنہیں مال و دولت اور اپنے لطف و کرم سے نوازا آج وہی اس کی جان کے درپے ہیں۔ اس نے زریاب کو بلایا محفل رقص و سرود منعقد کی۔ بادشاہ کسی بھی طرح دل کی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا لیکن دل پر جو گھٹا سی چھا گئی تھی وہ نہ کھلتی تھی، نہ برستی تھی۔

قصر الکبیر کے ایک گل بار حصے میں محفل منعقد کی گئی اور بادشاہ کے ایما پر یہاں جو گیت گائے گئے وہ سارے حزینہ تھے۔ بادشاہ نے زریاب سے بطور خاص کہا۔ ”زریاب! میں رونا چاہتا ہوں۔ میرے دل پر غم و اندوہ کی ایک بھاری سل رکھی ہوئی ہے اگر یہ سل اپنی جگہ سے نہ ہٹی تو میں اس بوجھ تلے دب کر ہلاک ہوجاؤں گا۔ خدا کے لیے تم سب مجھے ایسے گیت سناؤ جن میں دنیا کی بےثباتی اور اپنوں کی بےوفائی کا ذکر کیا گیا ہو۔“

زریاب نے ادب سے سوال کیا۔ ”کیا ظل اللہ کا لوگوں کے سامنے آنسو بہانا مناسب ہے؟“

بادشاہ نے جواب دیا۔ ”گریہ کو میں اپنے علاج کے طور پر قبول کر رہا ہوں اور اس عالم میں جبکہ حزینہ نغمات پوری محفل کو رلا رہے ہوں، بادشاہ کا رو دینا عین فطری عمل ہوگا اور محفل کے لوگ اسے عیب نہیں سمجھیں گے۔“

بادشاہ آج بھی طروب کو اپنے پہلو میں بٹھائے تھا لیکن طروب کے چہرے پر آج ہمیشہ جیسا تفاخر اور بڑائی کی چمک نہیں تھی، اس کے دل کا چور بار بار چٹکیاں لے رہا تھا اور غالباً یہ بہت بڑی سزا تھی جو بادشاہ اسے دے رہا تھا۔

مدثرہ، حکم اور شفا بھی موجود تھیں لیکن بادشاہ کی اداسی نے ان سب کو اداس کر رکھا تھا۔

گانے کا آغاز ہوا، سازوں کے سُر بھی حزینہ تھے۔ مغنیائیں بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر اپنا سارا زور صرف کیے دے رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ محفل سوز و درد میں ڈوبنے لگی۔ حرمان اور مایوسی کی کوئی غیر مرئی چادر پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لیتی جارہی تھی۔ ان گیتوں میں طرح طرح سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ دنیا کچھ بھی نہیں۔ یہاں دکھوں کے سوا کچھ بھی نہیں، یہاں دنیا کی طرح کوئی بھی قابل اعتبار نہیں۔

محفل آہستہ آہستہ آنسو بہاتی رہی، بادشاہ اب بھی چُپ تھا اور اس کی آنکھوں کے گوشے اب بھی خشک تھے۔

سب سے آخر میں بادشاہ کی ایما پر حکم نے گانا شروع کردیا۔ کسی اندلسی شاعر کا یہ کلام حزن و ملال اور قنوطیت کا اعلیٰ شاہکار تھا۔

”میں جب قبرستان کی طرف سے گزرا تو یہ دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا کہ
منوں مٹی کے نیچے وہ لوگ دبے پڑے تھے جن کی
ناز برداریاں محبوبوں کی طرح کی گئی تھیں
شہر کا وہ عطر فروش، جو ہماری فضاؤں کو معطر کردیا کرتا تھا
آج قبر کے حقیر کیڑوں کی غذا بنا ہوا تھا
وہ رئیس جو سخت گیری میں مشہور تھا، آج اسے مٹی چاٹ رہی تھی
اور وہ بخیل، جس نے حقوق العباد کے بےپناہ تلاف کے بعد
دولت کا سب سے زیادہ ذخیرہ کرلیا تھا، آج اپنے
جسم کے اعضا کی حفاظت تک سے قاصر تھا
اس کی ناک، کان، آنکھوں اور منہ کی جگہ بڑے بڑے سوراخ
باقی رہ گئے ہیں یا پھر وہ پنجرہ جس کے اندر حریص
اور لالچی دل قید تھا
میں نے ان سے پوچھا، مرنے والو! ذرا بتاؤ تم کس حال میں ہو؟
لیکن وہ جواب کیا دیتے، ان کی زبانیں تو مٹی کھا چکی تھی
میں نے ان سے کہا، اگر تم مجھ سے پوچھو کہ تمہارے بعد دنیا
کا کیا حال ہے تو میں تمہیں بتاؤں کہ تمہاری خون پسینے کی کمائی
کو تمہاری نالائق اولادوں نے جوئے اور شراب میں اڑا دیا
تمہاری بیویوں نے دوسرے شوہر کرلیے
تمہاری محبوبائیں دوسرے نوجوانوں کی آغوشیں گرم کر رہی ہیں
اے دنیا! تجھ پر تف ہے کہ تو کسی کی بھی نہیں
تیرا وہ ثمر شیریں جو لذت میں روح افزا ہوتا ہے اور
جس کے مزے میں شیرینی ہی شیرینی ہوتی ہے اگر
اس کے باطن کو
چکھ سکو تو وہاں تمہیں تلخی کے سوا کچھ بھی نہ ملے گا
ہر مٹھاس کے نیچے تلخی چھپی ہے مٹھاس تو محض ایک فریب ہے

میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ شہر کا سب سے بڑا
مخیر اور فیض رساں
جس نے ہزاروں کے دکھوں کا علاج کیا تھا، پرورش اور
کفالت کی تھی بالآخر اپنے ایک سب سے زیادہ
پیارے کے ہاتھوں ہلاک ہوا
اے شاعر! اگر خدا نے تجھے ذرا سی بھی عقل دی ہے تو
میرا یہ قول گرہ میں باندھ لے
دوسروں پر اعتماد کرنا بڑی اچھی بات ہے
لیکن کسی پر اعتماد نہ کرنا اس سے بھی اچھی بات ہے۔"

بادشاہ نے ملکہ طروب کو جس کرب ناک نظر سے دیکھا، ملکہ اس کی تاب نہ لا سکی۔ اس نے سر جھکا لیا۔

بادشاہ نے طروب سے کہا۔ "طروب! پہلے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تیری خاطر عبداللہ کو اپنا جاں نشیں بنا دوں لیکن نصر کے عبرت ناک انجام کے بعد میں نے اپنا فیصلہ بدل دیا ہے۔"

ملکہ طروب بادشاہ کی باتیں سر جھکائے سنتی رہی۔

بادشاہ کہتا رہا۔ "تیری محبت کے پیش نظر میں چاہتا تھا کہ میرے بعد میرے ساتھ زیادتیاں نہ ہوں اور جس کی میں زندگی بھر ناز برداریاں کرتا رہا ہوں، میرے بعد اس کا حکمران بیٹا اپنی ماں کی اسی طرح دل جوئی اور ناز برداری کر سکے لیکن نصر والے واقعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تیرے شر سے جب میں نہیں بچا تو دوسروں کا خدا جانے کیا حشر ہو۔"

طروب چیخ مار کر رو دی اور بادشاہ کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ بادشاہ نے اسے اٹھا کر ایک بار پھر اپنی آغوش میں لیا اور کہا۔ "تو میری زندگی میں ذلیل نہیں ہوگی۔ تیری جگہ میرے قدموں میں نہیں دل میں ہے۔" اس محفل حزن وملال میں بھی بادشاہ نہیں رویا۔

کچھ دیر بعد بادشاہ نے محفل برخاست کردی۔ وہ خلوت چاہتا تھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ یہاں سے اٹھ کر قصر کی بالکونی میں چلا گیا۔ بالکونی سے باہر کا منظر بہت صاف نظر آرہا تھا۔ قصر کے باہر سڑک کے آس پاس سولیوں پر انسانی لاشے لٹکے ہوئے تھے اور ان کی گردنیں ایک طرف ڈھلک گئی تھیں۔

بادشاہ نے ایک خدمت گار سے پوچھا۔ "یہ لاشیں کن کی ہیں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "دشمنانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ انہیں بہت سمجھایا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی نہ کریں لیکن یہ نہیں مانے اور خاموش رہنے کے بجائے سولی پر چڑھ جانا گوارا کرلیا۔"

بادشاہ کے منہ سے چیخ نکل گئی، وہ رونے لگا۔ "خدا کے لیے ان لاشوں کو سولیوں سے اتار دو۔ انہیں یا تو دفن کروا دیا جائے یا پھر جلا دیا جائے۔ میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا۔"

بادشاہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا، وہ کپکپاتا ہوا بالکونی سے نیچے آگیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا، آنکھیں بصارت سے محروم ہوتی جا رہی تھیں۔ دورانِ خون میں فتور پیدا ہو رہا تھا، دماغ سنسنا رہا تھا۔ اس نے اپنی عمر کے اکتیسویں سال بادشاہت سنبھالی تھی اور اب اکتیس سال حکومت کرنے کے بعد وہ پہلی بار اس شدید جان لیوا کیفیت میں مبتلا ہوا تھا۔

دوسرے دن صبح جب بادشاہ کے حکم کی تعمیل میں مذہبی دیوانوں کی لاشیں سولیوں پر سے اتاری گئیں اور انہیں جلانے کے لیے ایک جگہ رکھا گیا، اسی وقت قصر الکبیر میں بادشاہ نے ہمیشہ کے لیے چپ اختیار کرلی تھی۔ اس کا جسم ایک قیمتی چادر میں ڈھکا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف سوگوار خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ شاہی خدمت گار عود، لوبان اور دیگر جل کر دھواں اور خوشبو دینے والی چیزیں وقفے وقفے سے اگر دانوں میں ڈال رہے تھے۔ محل میں موجود بادشاہ کے اعزا اور معزز امرا بادشاہ کی میت کو نہلانے کفنانے کے انتظام میں لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ کے ایک سو پچاس بیٹے اور پچاس بیٹیاں اپنے جلیل القدر باپ کی موت پر کچھ زیادہ سوگوار نہیں تھیں۔ بادشاہ کی بیگمات اس کی موت کے غم میں رونے دھونے کے بجائے اپنے مستقبل کی فکر میں آنسو بہا رہی تھیں اور طروب کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ دربار کے بااختیار اور بااثر امرا اور دوسری کلیدی شخصیتیں اس کے بیٹے عبداللہ کے بجائے شہزادہ محمد کی جانشینی پر متفق ہو چکی ہیں۔

ماخذات

نفح الطیب، علامہ مقری۔ مسلمان اندلس میں، لین پول۔
اندلس کا تاریخی جغرافیہ، محمد عنایت اللہ۔ مسلم اسپین، آئی ایچ برنی۔ تاریخ ابن خلدون، ابن خلدون۔ تاریخ اندلس، عبدالقوی ضیا



ذرا ہٹ کے

کاشف زبیر

جب سیدھی انگلیاں حسبِ منشا کام نہ کریں تو ان میں لاشعوری طور پر آپ ہی ٹیڑھا پن آجاتا ہے... اور جب کسی کو انصاف بھیک کی طرح مانگنے پر بھی نہ ملے اور کشکول خالی رہ جائے تو یہ خالی کاسہ الٹا کرکے ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے کیونکہ چھیننے اور جھپٹنے کے لیے ہاتھوں کو خالی چھوڑنا پڑتا ہے... یہی فارمولا جب اس نے بھی آزمایا تو احساس ہوا کہ ضمیر کی خاموش رہنمائی میں نہ صرف انصاف کو چھین لیا جائے بلکہ اپنی میزان، اپنا قانون اور اپنی سزا قائم کرکے غیر منصفوں کو آئینہ دکھانے میں بھی کوئی حرج نہیں اور اس نے یہ سب کر دکھایا۔

ایک ایسی بستی جہاں انصاف اور قانون

کا انوکھا میزان قائم تھا

وہ دونوں نائٹ کلب کے بار کاؤنٹر پر تھے۔ ان کے سامنے گلاس رکھے ہوئے تھے مگر وہ ان میں برائے نام دلچسپی لے رہے تھے۔ صبح کے چار بج رہے تھے۔ بارٹینڈر فارغ تھا اس لیے گلاس کاؤنٹر چمکا رہا تھا جب کہ چند گاہکوں کے سامنے تین اسٹریپ گرلز بے دلی سے خود کو مشینی انداز میں حرکت دے رہی تھیں۔ گاہک نشے میں دھت ہو چکے تھے اور غالباً ان کو اپنا ہوش تک نہیں تھا، لڑکیوں کا ہوش کہاں سے ہوتا۔ ان میں سے ایک اسٹریپ گرل دونوں آدمیوں میں

سے نسبتاً جوان آدمی کو دیکھ کر چونکی۔ مگر آدمی نے اسے نظر انداز کر دیا۔ وہ تقریباً تیس بتیس سال کا سادہ نقوش، سادہ حلیے اور چھوٹے بالوں والا شخص تھا۔ صرف اس کی آنکھوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ اتنا بھی سادہ نہیں ہے جتنا نظر آرہا ہے۔ دوسرا زیادہ عمر کا تھا مگر اس کے نوکیلے نقوش اور مرغے کی طرح کھڑے ہوئے بال اس کی شخصیت کی وضاحت کر رہے تھے۔ البتہ اس کی آنکھوں سے نشے اور اضطراب کی کیفیت جھلک رہی تھی۔

''اے، مجھے پی آئی ہے۔'' اچانک سادہ شخص نے بارٹینڈر سے کہا۔ اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا کہ کلب کے واش روم اس طرف تھے۔ سادہ شخص اٹھ کر اس طرف بڑھا لیکن جیسے ہی وہ کلب کے دفتر کے پاس پہنچا اچانک دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بارٹینڈر مضطرب ہو گیا، اس نے پکار کر کہا۔

''رکو، واپس آؤ۔''

اسی اثنا میں چالاک نظر آنے والے شخص نے پستول کو بارٹینڈر کی طرف کیا تو اس نے بے ساختہ ہاتھ اوپر کر لیے۔ چالاک شخص نے کہا۔ ''شاباش بس اسی طرح کھڑے رہو۔''

دونوں گاہک پیے ہوئے تھے لیکن اتنے مدہوش بھی نہیں تھے کہ صورت حال نہ سمجھ پاتے۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے تھے کہ چالاک شخص نے ان پر فائر کیے اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ جب چالاک شخص دونوں گاہکوں کو شوٹ کر رہا تھا تب بارٹینڈر نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس نے کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈالا تھا کہ ایک فائر ہوا اور وہ سینہ تھام کر پیچھے لڑھک گیا مگر یہ فائر چالاک آدمی نے نہیں بلکہ ایک اسٹریپ گرل نے کیا تھا۔ چالاک آدمی نے اسٹریپ گرل کو اشارہ کیا اور خود آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو کلب کا منیجر کرسی پر ساکت بیٹھا ہوا تھا، سادہ آدمی کا پستول اس کی طرف تھا اور وہ کھلی تجوری سے نوٹوں کی گڈیاں اٹھا اٹھا کر بیگ میں رکھ رہا تھا۔ صورت حال قابو میں تھی مگر چالاک آدمی نے منیجر کو بھی شوٹ کر دیا۔ سادہ آدمی چونکا اور پھر اس نے غصے سے کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

منیجر کا سر پیچھے تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ چالاک شخص نے وضاحت کی۔ ''یہ ہم دونوں کو پہچانتا ہے اور اگر اس نے رک کو بتا دیا تو وہ ہمارے پیچھے لگ جائے گا۔''

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔'' سادہ آدمی نے آخری گڈیاں بھی اٹھا کر بیگ میں ڈالیں اور اس کی زپ بند کر کے اسے شانے پر لٹکا لیا۔ ''اب نکلو یہاں سے...''

چالاک آدمی آگے آیا، اس نے کھلی تجوری میں جھانکا اور اندر ہاتھ ڈال کر ایک پلاسٹک شاپر نکال لیا اس میں سفید پاؤڈر کی صورت میں خالص کوکین بھری تھی اس کا وزن ایک کلوگرام تھا اور اس کوکین کی مالیت کم سے کم دو لاکھ ڈالرز تھی۔ سادہ آدمی نے اسے خبردار کیا۔ ''یہ رکھ دو، یہ ہمیں مصیبت میں پھنسا دے گی۔''

چالاک آدمی نے بہ ظاہر اس کی تجویز مانتے ہوئے تھیلی تجوری کے اندر کی لیکن جیسے ہی سادہ آدمی باہر نکلا اس نے تھیلی نکال کر اپنی جیکٹ میں رکھ لی۔ وہ باہر آئے جہاں مزید تین لاشیں موجود تھیں مگر اس بار سادہ آدمی نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ دو اسٹریپ گرلز لباس پہن چکی تھیں، ان میں بارٹینڈر کو شوٹ کرنے والی بھی تھی۔ البتہ تیسری ایک کونے میں دبکی تھرتھر کانپ رہی تھی اور اس کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ لوگ اسے بھی مار دیں گے۔ چالاک شخص نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا تھا کہ سادہ آدمی نے اسے روک دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے رونی۔''

''یہ پھوٹ دے گی جان؟''

''نہیں، یہ چپ رہے گی۔'' جان نے کہا اور لڑکی کی طرف بڑھا وہ اسے پاس پا کر بھڑک گئی تھی۔

''آرام سے، آرام سے لیونا۔'' جان نے نرمی سے کہا اور پھر بیگ سے دو گڈیاں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھیں۔ ''یہ لو اور یہاں سے نکل جاؤ... کل رک پوچھے تو اسے یہی بتانا کہ تم تین بجے چلی گئی تھیں اور تمہیں نہیں معلوم کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ دوسرا کوئی فرد بتانے کے لیے زندہ نہیں ہے میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

لیونا نے سر ہلایا۔ ''میں رک کو نہیں بتاؤں گی۔''

''اگر بتاؤ گی تب بھی تمہیں نقصان ہو گا، رک جانتا ہے تم میری فرینڈ رہ چکی ہو اس لیے اس کے انتقام کا آغاز تم سے ہو گا۔'' جان نے کہا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا وہ کلب سے باہر نکل گئے جہاں ایک بہتر ماڈل کی شیورلیٹ کھڑی تھی۔ تقریباً تیس سال پرانی یہ کار آج بھی بہترین حالت میں تھی اور مضبوطی میں صرف مرسڈیز اس کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ وہ چاروں کار میں آ گئے۔ ڈرائیونگ رونی کر رہا تھا، کلب سے ذرا دور نکلتے ہی اس نے قہقہہ مارا۔ جان نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا۔ ''اس میں زیادہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ رک خطرناک اور ذہین شخص ہے جب تک ہم

اس کے گمان کی حد سے نہیں نکل جاتے ہم خطرے کی حد میں ہوں گے، میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ہم نے تقریباً ایک ملین ڈالرز چرا لیے ہیں۔'' رونی نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر کہا۔ ''رک اور اس کی ذہانت دونوں جہنم میں جائیں۔''

''یہ مت بھولو کہ ہم نے چار افراد کو قتل کیا ہے صرف رک نہیں بلکہ پولیس کو بھی ہماری تلاش ہو گی۔'' جان نے سرد لہجے میں کہا اور پلٹ کر دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں یہاں سے بہت دور جانا ہو گا کیا تم دونوں تیار ہو؟''

''میں تیار ہوں۔'' بارٹینڈر کو شوٹ کرنے والی لڑکی نے کہا۔ اس کا نام جینی تھا۔ دوسری لڑکی ایرل تھی۔ اس نے صرف سر ہلایا۔

''گڈ! ہم واپس نہیں آئیں گے۔''

''رقم کی تقسیم کب ہو گی؟'' جینی نے پوچھا۔

''شہر سے نکلتے ہی۔'' جان نے کہا۔ ''طے شدہ پروگرام کے طور پر چالیس فیصد حصہ میرا ہو گا باقی ساٹھ فیصد تم تینوں میں مساوی تقسیم ہو گا۔''

جینی نے شکوہ کیا۔ ''ٹھیک ہے لیکن تم نے ہماری وجہ سے درست وقت پر ڈاکا مارا، جب سیف میں رقم تھی ورنہ کلب کے سیف میں لاکھ ڈالرز سے بھی کم ہوتے ہیں۔''

جان نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو تم نے مخبری کی لیکن اصل کام ہم نے کیا، میں باس ہوں اس لیے زیادہ حصہ میرا ہو گا۔''

رونی بہت زیادہ خوش تھا، اس نے کہا۔ ''یہ منشیات کی کمائی ہے اور اس میں یقیناً میرا حصہ بھی ہو گا۔''

''ہاں۔'' جینی نے طنز کیا۔ ''تم پچھلے دس سالوں میں اس سے زیادہ مالیت کی منشیات استعمال کر چکے ہو۔''

یہ سچ تھا لیکن رونی نے برا نہیں منایا کیونکہ وہ جتنی منشیات استعمال کر چکا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی اس وقت اس کے پاس تھی۔ کار میں تاریکی تھی اس لیے جان یا کوئی اور نہیں دیکھ سکا کہ رونی کی جیکٹ لٹک رہی تھی اس میں ایک کلوگرام وزنی کوکین تھی۔ ایرل خاموش تھی اس نے اپنا سر کار کی بڑی سی پشت سے ٹکا لیا اور نیم دراز ہو گئی۔ اس کار کی نشستیں اتنی بڑی تھیں کہ وہ آرام سے سفر کر سکتے تھے۔ رک کا کلب فورٹ ورتھ میں تھا۔ یہ شہر شمالی ٹیکساس میں ہے۔ اب وہ مغرب کی طرف جا رہے تھے، ان کا ارادہ تو شمالی ٹیکساس کی طرف جانے کا تھا مگر اس وقت وہ ہائی وے ٹوئنٹی پر سفر کرنے والے تھے جو مغرب کی طرف جاتی تھی اور یہ ٹیکساس کو ایریزونا اور کیلی فورنیا سے ملاتی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شہر سے نکل کر ہائی وے پر آئے تو سب نے سکون کا سانس لیا تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ کلب میں ہونے والی ڈکیتی کی اطلاع پولیس تک پہنچ گئی ہو گی اور انہیں تلاش کیا جا رہا ہو گا۔ ان کا جلد از جلد شہر سے نکل جانا مناسب تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ شہر سے باہر تھے۔ ہائی وے پر ایک جگہ رک کر انہوں نے چھوٹا سا جشن منایا اور رقم کی تقسیم کی۔ کل رقم دس لاکھ اسی ہزار ڈالرز کی تھی۔ اس میں سے چار لاکھ ڈالرز جان نے لیے، باقی سب کو دو دو لاکھ ڈالرز ملے اور اسی ہزار ڈالرز جان نے اخراجات کے لیے رکھ لیے۔ ان تینوں نے احتجاج کیا تو اس نے کہا۔

''سفر میں بھی اخراجات ہوں گے۔ جب ہم الگ ہوں گے تو یہ رقم بھی تقسیم ہو جائے گی۔ اب سب اپنی اپنی رقم سنبھال لیں، وہ اس کی حفاظت کے خود ذمے دار ہوں گے۔''

جینی اور ایرل نے اپنی رقم اپنے ہینڈ بیگز میں رکھ لی۔ جان کے پاس شولڈر بیگ تھا اور ایسا ہی ایک شولڈر بیگ رونی کے پاس تھا۔ جس بیگ میں وہ رقم لائے تھے اسے انہوں نے وہیں پھینک دیا۔ رونی شمپین کی بوتل لایا تھا۔ وہ سب موڈ میں آ گئے تھے لیکن جان نے انہیں روک دیا۔ ''حد سے زیادہ مت پینا ابھی ہم زیادہ دور نہیں آئے ہیں پھر پولیس کا مسئلہ بھی ہو سکتا ہے۔''

مجبوراً رونی نے بوتل بند کی اور وہ روانہ ہوئے تھے۔ رات سرد تھی اور انہوں نے شیشے چڑھا لیے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر سمٹ کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر میں سوائے رونی کے سب سو چکے تھے۔ جب رونی نے دیکھا کہ سب سو گئے ہیں تو اس نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی اور اس میں موجود تقریباً نصف درجن گولیاں ایک ساتھ حلق میں انڈیل لیں اور پھر شمپین کا بڑا سا گھونٹ لیا۔ یہ نشے کی گولیاں تھیں اگر وہ جان کے سامنے کھاتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ سات بجے سورج نمودار ہوا تو سردی ذرا کم ہوئی تھی۔ رونی ڈرائیو کر رہا تھا اور وہ تینوں سو رہے تھے۔ بارہ بجے جان کی آنکھ کھلی تو رونی اسٹیئرنگ پر سر رکھے خراٹے لے رہا تھا اور کار ایک ویرانے میں کھڑی تھی۔ یہ چھوٹی سڑک تھی اور یہاں دور دور تک کوئی سائن یا کسی دوسری گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ جان نے رونی کو جھنجوڑا۔ وہ بڑی مشکل سے جاگا تھا۔ جان نے پوچھا۔

''ہم کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں۔'' رونی نے غنودہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو مغرب کی طرف ڈرائیو کر رہا تھا۔''

"ذرا غور کرو۔" جان نے کار کے کمپاس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بتا رہا ہے ہمارا رخ شمال کی طرف ہے اور یہ ہائی وے نہیں ہے، تم کہاں سے اس سڑک پر مڑے؟"

رونی الجھن میں پڑ گیا۔ اسے خود بھی یاد نہیں تھا کہ وہ اس سڑک پر کیسے آیا اور کب کار روک کر سو گیا تھا۔ اس نے بہانہ کیا۔ "شاید میں تھک گیا تھا اس لیے مجھے خیال نہیں رہا۔"

"تم نے گولیاں تو نہیں کھائی تھیں؟" جان نے مشکوک لہجے میں پوچھا، اس پر رونی قسمیں کھانے لگا کہ اس نے نہیں کھائیں۔ پیچھے سے جینی ہنسی۔

"اس سے پوچھو کہ اس نے ساری شیشی تو نہیں کھالی تھی؟"

"کتیا۔۔۔" رونی پلٹ کر غرایا۔ "اپنا منہ بند رکھو۔"

"بھونک تو تم رہے ہو۔" جینی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اپنا منہ بند رکھنے کی ضرورت تم کو ہے۔"

"پلیز تم دونوں اپنا منہ بند رکھو۔" جان نے کہا اور کار سے نیچے اتر آیا۔ وہ سب بھی اتر آئے، رات سے ایک ہی پوز میں لیٹے بیٹھے ان کے جسم اکڑ گئے تھے وہ دھوپ میں جسم کھولنے لگے۔ یہ ایک طویل صحرائی سڑک تھی۔ اس کے دائیں بائیں دور تک چھوٹی جھاڑیوں اور کیکٹس سے بھرے میدان تھے دور کہیں پہاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایرل نے جان سے کہا۔ "اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

"ہمیں واپس جانا چاہیے۔" جان نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے آگے جانا چاہیے۔" رونی بولا۔ "اگر ہم اس سڑک پر بہت آگے آ چکے ہیں تو واپسی میں بہت دیر لگ سکتی ہے۔ دوسرے گیس بھی ختم ہونے والی ہے۔"

جان نے جھانک کر فیول گیج دیکھا اور کراہا۔ "لعنت ہو۔۔۔ تم ہائی وے سے گیس نہیں لے سکتے تھے؟"

"مجھے خیال نہیں رہا۔"

جان کے پاس ایک نقشہ تھا اس نے وہ بونٹ پر پھیلایا اور جاننے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کہاں ہو سکتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ فورٹ ورتھ سے بہت دور نکل آئے تھے۔ جان نے ہائی وے بیس پر فورٹ ورتھ سے کوئی سو میل دور ایک چھوٹے شہر ابی لینے پر انگلی رکھی۔ "اگر تم یہاں سے مڑے تھے تو ہم اس جگہ ہیں۔۔۔" اس نے نقشے پر ایک ویران جگہ پر انگلی رکھی۔ "اگر تم نے اس سڑک پر ایک گھنٹے سے زیادہ سفر کیا ہوگا تو ہم کوئی پچاس میل دور نکل آئے ہیں۔"

"اس لیے بہتر ہے ہم آگے سفر کریں۔" جینی نے نقشہ دیکھتے ہوئے رونی کی تائید کی اور نقشے پر انگلی رکھی۔ "میرا خیال ہے ہم ہائی وے ستائیس پر نکلیں گے اور یہاں سے ہم آگے کیلی فورنیا کی طرف جا سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ ہمیں گیس مل جائے۔" جان نے تلخی سے کہا۔ "تم اندھوں کی طرح ڈرائیو کرتے رہے۔"

"یہ میری ذمے داری نہیں تھی، تم لوگ کیوں سو گئے تھے۔" رونی بولا۔

"لڑنے کے بجائے آگے چلنے کی فکر کرو۔" جینی نے کہا۔ "ہم واپس نہیں جا سکتے، گیس اتنی نہیں ہے۔"

اس بار جان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ اس نے رفتار تیز رکھی تھی تاکہ کم ایندھن خرچ کر کے وہ زیادہ فاصلہ طے کر سکیں۔ مگر ایک گھنٹے بعد جب ٹینک تقریباً خالی ہونے والا تھا وہ بہ دستور ویرانے میں سفر کر رہے تھے۔ جان نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ "ہم کس جہنم میں پھنس گئے ہیں؟"

"یہ ٹیکساس ہے۔" جینی نے اسے یاد دلایا۔ "یہاں بعض اوقات سو پچاس میل تک کوئی آبادی نہیں ملتی ہے۔"

"کچھ دیر میں کار رک جائے گی۔" جان نے اعلان کیا۔ "اس کے بعد سب کو اپنا اپنا بوجھ خود ڈھونا پڑے گا۔"

ایرل پریشان ہو گئی۔ "اس ویران علاقے میں؟"

"ہاں اس علاقے میں۔" جان نے کہا، اس وقت وہ ایک ڈھلان پر چڑھ رہے تھے اور جیسے ہی کار ڈھلان کے دوسری طرف پہنچی سامنے انہیں دور چند پہاڑوں کے دامن میں پھیلا ہوا ایک صحرائی قصبہ نظر آیا۔ وہ چاروں خوش ہو گئے تھے۔ مگر فوراً ہی جینی فکر مند ہو گئی۔

"یہاں کچھ زیادہ ہی ویرانی نظر نہیں آ رہی ہے؟"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ قصبہ الگ الگ گھروں پر مشتمل تھا، زیادہ تر مکانات پرانے طرز کے اور خستہ حال تھے۔ ٹین کی زنگ آلود شیٹوں اور ٹوٹی لکڑی سے بنے ہوئے۔ چند ایک اچھی حالت میں بھی نظر آ رہے تھے۔ جا بہ جا کچرے کا انبار تھا۔ شاپرز اور اخبارات اڑتے پھر رہے تھے۔ ایرل نے آہستہ سے کہا۔ "یہ تو کوئی گھوسٹ ٹاؤن لگ رہا ہے۔"

امریکا میں گھوسٹ ٹاؤن کی اصطلاح ایسے قصبوں اور شہروں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی وجہ سے ویران ہو جاتے ہیں اور وہاں صرف عمارتیں اور مکانات باقی رہ جاتے ہیں۔ پورے امریکا میں ایسے گھوسٹ ٹاؤنز کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مگر یہ گھوسٹ ٹاؤن نہیں تھا کیونکہ وہاں گاڑیاں بھی تھیں جو اگرچہ گرد آلود تھیں مگر صاف لگ رہا تھا وہ چلتی ہیں۔ اسی طرح دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ خوش تھے کہ انہیں یہاں سے گیس، کھانا پینا اور آگے کے لیے رہنمائی مل جائے گی۔ جان نے کہا۔ "یہاں گاڑیاں ہیں تو اس کا مطلب ہے یہاں گیس اسٹیشن بھی ہوگا۔"

وہ قصبے کے نزدیک پہنچے تو انہیں ایک خستہ حال بورڈ پر شیرف ٹاؤن لکھا نظر آیا۔ جینی نے حیرت سے کہا۔ "شیرف ٹاؤن کیسا نام ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے اسے کسی مجرم کے نام پر ہونا چاہیے تھا؟" رونی نے طنز کیا۔

"ہو سکتا ہے یہاں کا شیرف اچھا ہو اور لوگ اس سے محبت کرتے ہوں۔" ایرل نے کہا تو تینوں نے اسے گھورا۔ وہ مجرم تھے اور بہت بڑا جرم کر کے آئے تھے، اس لیے اچھے شیرف کی موجودگی ان کے لیے اچھی خبر نہیں تھی۔ ایرل خفیف ہو گئی۔ وہ قصبے میں داخل ہوئے تو جینی کچھ بے چین تھی۔ وہ مرکزی سڑک سے گزر رہے تھے۔ انہیں کچھ گھروں اور دکانوں کے سامنے لوگ نظر آئے اور وہ انہیں گھور رہے تھے۔ یقیناً انہیں اجنبیوں کی آمد پسند نہیں تھی۔ ایرل نے جھرجھری لی۔ "یہ لوگ کیسے دیکھ رہے ہیں۔"

"دوستو، ہمیں اپنا کام کر کے فوری طور پر یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔" جان نے کہا، اس کی نظر کسی فیول پمپ کو تلاش کر رہی تھی بالآخر ایک اسٹور کے سامنے اسے دو فیول پمپ نظر آئے۔ اس نے کار کا رخ اس طرف کر دیا۔ کار رکتے ہی جینی نیچے اتر آئی، اس نے کہا۔

"مجھے واش روم جانا ہے۔"

"میرا خیال ہے اندر کوئی واش روم ہوگا۔" جان نے کہا اور رونی سے کہا۔ "ٹینک فل کر لو میں اندر ادائیگی کرتا ہوں۔"

جان اور جینی اندر آئے۔ یہ ایک کار شاپ تھی اور یہاں گاڑیوں کے پارٹس دستیاب تھے۔ دیواروں اور ریکس پر پارٹس سجے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ایک بہت بوڑھا آدمی تھا اس کے سینے کے بال تک سفید تھے جو اس کی بنیان سے جھانک رہے تھے۔ وہ بوتل سے بیئر پی رہا تھا اور یہ یقیناً اس کی پہلی بوتل نہیں تھی کیونکہ وہ نشے میں لگ رہا تھا۔ جان کو حیرت ہوئی کہ اس دور دراز ویران علاقے میں مہنگی گاڑیوں کے اتنے قیمتی پارٹس دستیاب تھے، اس کا مطلب تھا یہاں کے لوگوں کے پاس خاصی دولت تھی۔ اگرچہ قصبے سے غربت اور کسمپرسی ٹپک رہی تھی لیکن امکان تھا کہ آس پاس دولت مند کسان یا مویشی پالنے والے رہتے ہوں گے اور وہی اس بوڑھے کے اصل گاہک ہوں گے۔ جان کو قصبے میں ایسی گاڑیاں نظر نہیں آئی تھیں جن میں یہ قیمتی پارٹس استعمال ہوتے ہوں گے۔ جینی نے بوڑھے سے کہا۔

"مجھے واش روم جانا ہے۔"

بوڑھے نے انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ جینی کو اس کے پاس سے گزر کر جانا پڑا تھا، بوڑھے کے پاس سے نہایت ناگوار بو آ رہی تھی۔ واش روم ایک دیوار کے پیچھے تھا اور جب وہ اندر داخل ہوئی تو اسے بے ساختہ ابکائی آگئی۔ وہاں انتہا درجے کی غلاظت اور بدبو تھی۔ جینی تیزی سے واپس آئی اور اس نے بوڑھے کو بے نقط سنائی تھیں کہ اس نے واش روم اتنا غلیظ رکھا ہوا تھا۔ مگر وہ مسکراتا اور بیئر پیتا رہا۔ اس پر جینی کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے برا بھلا کہتی باہر چلی گئی۔ جان کو غصہ آگیا اس نے پستول نکال کر بوڑھے پر تان لیا۔ مگر اس پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا البتہ اس نے غیر محسوس انداز میں کاؤنٹر کے ساتھ لگا ایک سرخ بٹن دبا دیا۔ جان کو اس کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔ جان نے غصے میں آ کر پستول نکالا تھا پھر اسے احساس ہوا کہ وہ ایک اجنبی جگہ تھی اور یہاں کوئی غلط حرکت انہیں مشکل میں ڈال سکتی تھی۔ وہ ایک بڑی کامیابی حاصل کر کے آ رہے تھے یہ کامیابی خاک میں مل جاتی۔ اس نے پستول واپس رکھ لیا۔

"سوری، مجھے غصہ آگیا تھا۔" اس نے کہتے ہوئے بیس ڈالرز کے دو نوٹ کاؤنٹر پر رکھے۔ "میرا خیال ہے یہ گیس کے لیے کافی ہوں گے۔"

رونی کار میں پیٹرول بھر رہا تھا کہ اندر سے جینی نکلی۔ اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اب اس سے برداشت کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اسٹور کے ساتھ ایک چھوٹی سی دیوار تھی وہ اس کے عقب میں گئی اور ابھی وہ بیٹھ رہی تھی کہ سڑک پر پولیس کار نمودار ہوئی، وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی تیزی سے کار کی طرف آئی۔ پولیس کار دیکھ کر رونی کی بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ اس کی جیکٹ ایک کلوگرام کوکین کے بوجھ سے لٹک رہی تھی اور اگر یہ اس کے پاس سے برآمد ہو جاتی تو اسے کم سے کم پانچ سال کی سزا ہوتی۔ جینی کار میں گھس گئی۔ اسی لمحے جان باہر آیا اور پولیس کار دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ رونی نے ٹینک فل ہوتے ہی پائپ واپس پمپ سے لگا دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آیا، جان اس کے برابر آگیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے آرام سے چلو۔"

"یہ پولیس کار دیکھ رہے ہو یہ ہمارے لیے آئی ہے۔" رونی نے کہا اور ایک جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی فوراً ہی پولیس کار پیچھے آنے لگی۔ جینی اور ایرل مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھیں۔ جان نے پھر سخت لہجے میں کہا۔

"پلیز سب پرسکون رہیں پولیس کو خود دعوت دینے کی

ضرورت نہیں ہے۔"

"دعوت۔" رونی کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ "وہ بلی کی طرح پیچھے لگ چکی ہے تاکہ ہمیں دبوچ لے۔"

"ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" ایرل بولی۔

"یہ۔" رونی نے کہتے ہوئے ایکسی لریٹر دبایا اور کار جست لگا کر آگے بڑھی تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ قصبے سے باہر نکل آئے تھے۔ عقب میں دھول اڑ رہی تھی اس لیے وہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتے تھے مگر قصبے سے باہر آتے ہی دھول سے پولیس کار نمودار ہوئی اور تقریباً ان کی کار کے بمپر سے بمپر ملا کر چلنے لگی۔ جان چلا رہا تھا اور رونی کو گالیاں دے رہا تھا جس نے یہ مصیبت پیچھے لگائی تھی۔ اچانک پولیس کار غائب ہو گئی۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے اس لیے انہیں پتا نہیں چلا۔ رونی نے قہقہہ مارا۔

"وہ پیچھے رہ گئی۔"

جینی اور ایرل نے سکون کا سانس لیا۔ مگر جان فکر مند تھا، یہ کچا راستہ تھا اور وہ اب تک باقاعدہ سڑک پر سفر کرتے رہے تھے۔ اچانک راستہ ختم ہو گیا اور اس کے آخری حصے میں خلا تھا۔ رونی نے بروقت بریک لگائی اور وہ سب لڑھک گئے۔ جان دہاڑا۔ "یہ کیا تھا؟"

"ہم بچ گئے۔" رونی نے لرزتی آواز میں کہا، اسی لمحے دائیں طرف سے پولیس کار نمودار ہوئی اور اس نے شیورلیٹ کو ٹکر ماری وہ سب پھر لڑھک گئے تھے۔ رونی پہلے کار سے اترا پھر اسی طرف سے جان بھی اتر آیا۔ ان دونوں نے پولیس کار پر فائرنگ شروع کر دی۔ دوسری طرف ایرل چیخ چلا رہی تھی دروازہ اندر دبا تو اس کا پاؤں دروازے اور سیٹ کے درمیان آ گیا تھا۔ جینی اسے تسلی دیتے ہوئے اس کا پاؤں چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے ایرل کا پاؤں نکالا وہ شدید زخمی تھا پنڈلی کا گوشت پھاڑ کر ہڈی باہر نکل آئی تھی۔ رونی اور جان کی فائرنگ کا پولیس کار پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا وہ بلٹ پروف تھی۔ پھر کار حرکت میں آئی تو وہ دونوں بھاگے۔ جان نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"باہر نکلو ورنہ ماری جاؤ گی۔"

"اس کا پاؤں..." جینی نے کہا مگر جان نے اسے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ اسی لمحے ایرل کی طرف والا دروازہ ٹوٹ کر گرا اور ایک دیو قامت شخص نے اسے پکڑ کر کھینچ لیا ایرل چلائی اور وہ تینوں مخالف سمت میں بھاگے۔ رونی سب سے آگے تھا اور سب سے بری حالت اسی کی تھی۔ جان اس کے پیچھے تھا اور سب سے پیچھے جینی تھی۔ ان تینوں نے اپنے اپنے بیگ سنبھال رکھے تھے۔ ان میں وہ دولت تھی جس کے لیے انہوں نے سارے خطرات مول لیے تھے۔ اچانک رونی ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کا ٹخنہ مڑ گیا۔ اس نے دہاڑ ماری اور اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گر گیا۔ جان اس کے پاس سے دوڑتا ہوا آگے نکل گیا، اس نے رونی کے پاس رکنے یا اسے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ البتہ جینی رک گئی اور اس نے چلا کر جان کو آواز دی وہ رکا۔ اس نے مڑتے ہوئے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"رونی...؟"

"کیا میں اس کی تیمار داری کروں۔" جان کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

"یہ ہمارا ساتھی ہے کیا ہم اسے ایسے ہی چھوڑ جائیں۔" جینی غصے سے بولی۔ حالانکہ راستے میں اس کی رونی سے لڑائی ہوئی تھی مگر اس وقت وہ اسے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"تب تم مدد کرو۔" جان نے کہا اور بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً جینی نے سہارا دے کر رونی کو اٹھایا۔ ان چاروں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا صرف اس واردات کے لیے وہ ساتھی بنے تھے۔ ایک بار وہ خطرے کی حدود سے نکل جاتے تو دوبارہ لاتعلق ہو جاتے۔

☆☆☆

رک کلارنس فورٹ ورتھ کا ایک طاقتور شخص تھا، شہر میں اس کے کئی نائٹ کلبس تھے جو اصل میں منشیات اور عیاشی کے اڈے تھے۔ یہاں دولت مند آ کر اپنے شوق پورے کرتے تھے۔ رک کا کوئی مدمقابل نہیں تھا، پولیس میں اس کے وظیفہ خور موجود تھے اس لیے اسے کسی کی طرف سے خطرہ نہیں تھا اور یہی وجہ تھی اس نے اپنے نائٹ کلبس کی حفاظت کا خاص بندوبست نہیں کیا تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ اس کی دہشت ہی کافی تھی۔ مگر اس وقت آنے والی کال نے اسے بتایا کہ اس کی دہشت نے کام نہیں کیا تھا۔ اس کے ساؤتھ پارک والے نائٹ کلب پر ڈاکا پڑا تھا اور ڈاکو تین افراد کو قتل کرنے کے ساتھ منیجر جوزف کو زخمی کر گئے تھے۔ اطلاع ملتے ہی رک روانہ ہو گیا تھا، اس کے ساتھ اس کے دو خاص آدمی مارٹی اور بیکر بھی تھے۔ یہ اس کے دو بازو تھے اور اس کی فورس کے کمانڈرز بھی تھے۔ وہ کلب کے سامنے پہنچا تو پیرا میڈک منیجر کو ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے، رک ایمبولینس کی طرف بڑھا اور وہاں موجود پیرا میڈک سے کہا۔

"یہاں کوئی نہ آئے میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

خوفزدہ پیرا میڈک نے سر ہلایا اور ایمبولینس کے سامنے سے ہٹ گیا، رک اندر داخل ہوا۔ منیجر کے سر پر پٹی بندھی تھی اور اس کے منہ پر آکسیجن ماسک تھا، رک نے بلا تکلف ماسک ہٹا دیا اور منیجر سانس لینے کے لیے کسمسانے لگا وہ ہوش میں تھا۔ رک نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟"

"جان اور اس کا ساتھی رونی آئے تھے۔" وہ بولا۔ "جان نے مجھ سے سیف کھلوایا اور رونی نے مجھے شوٹ کیا۔"

"تم نے سیف کھول دیا۔" رک کا لہجہ خوفناک ہو گیا۔ "یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں ایک ملین ڈالرز سے زیادہ کی رقم تھی اور ایک کلو گرام کوکین تھی۔"

زخمی ہونے کے باوجود منیجر لرزنے لگا۔ "باس... باس میں بے قصور ہوں، میں انکار کرتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا۔"

"تو اب اس نے کیا کیا۔" رک کا لہجہ مزید خوفناک ہو گیا۔ "یہ جان اور رونی کون ہیں؟"

"کلب کی ایک لڑکی لیونا سے جان کی دوستی تھی۔"

"ٹھیک ہے تمہارا شکریہ۔" رک نے کہتے ہوئے اچانک منیجر کے منہ پر اپنا چوڑا ہاتھ رکھ دیا، وہ پہلے ہی مشکل سے سانس لے رہا تھا اب ہاتھ تلے اس کی سانس بالکل رک گئی اور چند لمحے تڑپنے کے بعد وہ ساکت ہو گیا دل کی دھڑکن بتانے والے آلے پر لکیر سیدھی ہو گئی تھی۔ رک نے آکسیجن ماسک اس کے منہ پر کیا اور نیچے اتر آیا۔ اس نے مارٹی اور بیکر سے پوچھا۔ "تم دونوں میں سے کوئی جانتا ہے لیونا کہاں رہتی ہے؟"

"یس باس میں جانتا ہوں۔" بیکر نے کہا۔

"ہمیں اس کے گھر جانا ہے۔" رک نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

جان آگے تھا اور جینی رونی کو سہارا دیے پیچھے آ رہی تھی۔ رونی کا ٹخنہ ٹوٹا نہیں تھا مگر موچ آ گئی تھی۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ پہلے وہ خوفزدہ تھے کہ پولیس پیچھے آئے گی مگر اب پولیس کا دور دور تک پتا نہیں تھا اس لیے وہ مطمئن تھے۔ البتہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ رونی جینی سے کہہ رہا تھا۔ "ایرل پکڑی گئی ہے اور وہ سب بک دے گی اس کے بعد ہم کہیں بھی جائیں، پولیس سے نہیں بچ سکتے۔"

"اپنی زبان بند رکھو۔" جان نے دور سے کہا۔ "ہم میکسیکو جا سکتے ہیں۔"

"ضرور۔" رونی نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "تمہارے خیال میں میکسیکو جانا اتنا ہی آسان ہے؟"

"میں سب کی نہیں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔" جان نے کہا۔ "ہمارا ساتھ بس یہاں سے نکلنے تک کا ہے اس کے بعد ہماری راہیں جدا ہوں گی۔"

وہ ایک چھوٹی سی وادی سے گزر رہے تھے۔ یہاں جا بہ جا چھوٹی خشک جھاڑیاں تھیں۔ انہیں کچھ دور خالی ہوم ٹریلر دکھائی دیے۔ دور سے پتا چل رہا تھا کہ ان کی حالت خستہ ہے۔ دروازے کھڑکیاں ٹوٹ گئی تھیں اور ان کے پہیوں کی جگہ اینٹیں رکھی تھیں۔ جان نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔"

"ہمیں پناہ کی نہیں کسی گاڑی کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس لعنتی جگہ سے نکل سکیں۔" جینی بولی۔

"گاڑی ایسے نہیں ملے گی۔" جان بولا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں یہاں سے کوئی گاڑی ملے گی لیکن میں منگوا سکتا ہوں۔"

"کس سے؟"

"لیونا سے۔" جان نے رونی کے سوال کا جواب دیا۔

"وہ کیوں آئے گی؟" جینی بولی۔

"جب میں اسے رک کی دھمکی دوں گا تو وہ سر کے بل دوڑی آئے گی۔" جان مسکرایا۔ "میں اندھیرا ہوتے ہی قصبے کی طرف جاؤں گا اور وہاں سے کال کروں گا۔ یہ جگہ فورٹ ورتھ سے زیادہ دور نہیں ہے وہ چند گھنٹے میں آ سکتی ہے اور ہم رات کی تاریکی میں یہاں سے دور نکل جائیں گے۔"

2002ء میں امریکا میں سیل فون اور اس کی سروس بہت عام نہیں تھی اور دور دراز قصبے اس سے محروم تھے۔ جان اور جینی کے پاس سیل فون تھے لیکن یہاں ان کے سگنل غائب تھے۔ انہیں ایک لینڈ لائن فون کی ضرورت تھی۔ وہ ہوم ٹریلرز کے پاس پہنچے تو سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ جان نے انہیں ایک ٹریلر میں جانے کا اشارہ کیا۔ "اس میں رہو جب تک میں نہ آ جاؤں۔"

"یہ نہیں آئے گا۔" رونی نے جان کے جانے کے بعد کہا، وہ ٹریلر میں آ گئے تھے۔ یہاں فرش پر گھسا پٹا قالین تھا اور تمام فرنیچر اور فکسچر ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ رونی کراہتے ہوئے قالین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے اس حالت میں بھی اپنی بوتل نہیں چھوڑی تھی اور تکلیف کم کرنے کے لیے اس سے گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔

’’ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد رکھنا چاہیے۔‘‘ جینی نے نرمی سے کہا اور اس کے ٹخنے کا معائنہ کرنے لگی۔

☆☆☆

ایرل کو ہوش آیا تو وہ ایک کرسی پر بندھی بیٹھی تھی۔ اس نے کسمسا کر اٹھنے کی کوشش کی تب اسے پتا چلا کہ وہ بندھی ہوئی ہے اس کے پیر میں شدید تکلیف تھی۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ ایک دیو قامت شخص جس نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی اسے کھینچ کر کار سے نکالا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی کراہیں ضبط کر رہی تھی اچانک وہی دیو قامت آدمی اس کے سامنے آگیا، اس نے ایرل کا بیگ اٹھا رکھا تھا۔ ایرل لرز گئی۔ آدمی نے شیرف کی وردی پہن رکھی تھی۔ ’’تت... تم شیرف ہو؟‘‘

اس نے سر ہلایا اور اس کے بیگ سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دکھائیں۔ ’’یہ رقم تمہارے پاس کہاں سے آئی؟‘‘

’’یہ میری رقم ہے۔‘‘ ایرل بولی۔

ایرل برسوں سے رک کے نائٹ کلب میں اسٹریپ گرل کے طور پر کام کر رہی تھی اسے کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا بلکہ اسے لوگوں سے جو ملتا تھا اس کا چالیس فیصد اسے رک کو دینا پڑتا تھا پھر اس کی اور اس کے آدمیوں کی حیوانی خواہشات بھی پوری کرنا پڑتی تھیں۔ ایرل رک سے نفرت کرنے لگی تھی اور جب جینی نے اسے اس منصوبے کے بارے میں بتایا تو کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ راضی ہو گئی۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ بات قتل و خون تک جا پہنچے گی۔ جب جینی نے بارٹینڈر کو شوٹ کیا تو وہ دہل گئی تھی پھر وہ ان کے ساتھ نکل آئی اور اب اس کے پاس واپسی کا راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیرف اس کی حالت دیکھ کر سختی سے گریز کرے گا مگر فوراً ہی اس کی یہ خوش فہمی دور ہو گئی۔ شیرف نے جھک کر اس کی پنڈلی سے جھانکتی ٹوٹی ہڈی پکڑ کر ہلائی تو وہ بے ساختہ چلا اٹھی اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ شیرف نے دوبارہ سوال کیا تو اس بار اس نے فرفر جواب دیا اور سارا قصہ بیان کر دیا۔

’’اوہ تو تم لوگ چار افراد کے قاتل ہو۔‘‘ شیرف نے آہستہ سے کہا۔

’’میں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ میں جانتی تھی کہ یہ لوگوں کو ماریں گے۔ پلیز مجھے جانے دو میں وعدہ کرتی ہوں آئندہ کسی جرم میں شریک نہیں ہوں گی۔‘‘

’’یہ شیرف ٹاؤن ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’میرا قصبہ ہے اور یہاں میرا قانون چلتا ہے، مجرموں کے لیے میرا اپنا قانون ہے میں ان کو عدالت میں پیش نہیں کرتا۔ جلد تمہیں پتا چل جائے گا کہ میں مجرموں کے ساتھ کیا کرتا ہوں لیکن پہلے تمہارے ساتھیوں کو تلاش کرلوں۔‘‘

یہ کہتے ہوئے شیرف دو لکڑیاں لے کر آیا اور اس نے مہارت سے ایرل کا پاؤں کھینچ کر سیدھا کیا اور اس پر لکڑیاں رکھ کر اوپر سے بینڈیج کر دی تھی۔ ایرل کی چیخ نکلی تھی مگر فوراً ہی اسے سکون ملا تھا۔ شیرف اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

لیونا میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھے بار بار انہیں دیکھ رہی تھی اس نے آج تک اتنی رقم ایک ساتھ نہیں دیکھی تھی۔ یہ بیس ہزار ڈالرز کی رقم تھی۔ وہ ہر رات اور خاص طور سے ویک اینڈ پر اچھا کماتی تھی لیکن اس میں سے چالیس فیصد رک لے جاتا تھا پھر اس کے اخراجات اور اس کے بوائے فرینڈ مانی سادھو کے اخراجات بھی تھے۔ مانی کا اصل نام جون فریڈرک تھا لیکن وہ ایک ہندو سادھو مانی ٹھکر سے بہت متاثر تھا اور اس نے اس کا مسلک اپناتے ہوئے اپنا نام مانی سادھو رکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے بالوں اور ڈاڑھی کو سیاہ رنگ سے کلر کر رکھا تھا اور ایک لمبا سا چوغہ پہنے رہتا تھا۔ اس کی گلے میں رنگ برنگے منکوں والی کوئی درجن بھر مالائیں تھیں۔ اس نے اپنے طور پر دنیا تیاگ دی۔ اسے پورے دن میں چرس کی ایک درجن سگریٹ، ایک لیٹر دودھ اور ایک درجن چپاتیاں درکار ہوتی تھیں۔ چپاتیاں وہ خود تیار کرتا تھا۔ یہ واحد کام تھا جو وہ کرتا تھا کیونکہ اس نے دنیا چھوڑ دی تھی اس لیے کوئی کام نہیں کرتا تھا اس کا جو وقت چرس اور چپاتیوں سے بچ جاتا اس میں وہ یوگا کی مشقیں کرتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ آدھے منٹ سے زیادہ سانس نہیں روک سکتا تھا، چرس نے اسے اس قابل نہیں چھوڑا تھا۔

جب لیونا نے نوٹوں کی گڈیاں پرس سے نکال کر میز پر رکھیں تو مانی نے سرسری نظروں سے انہیں دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے دھیان گیان میں گم ہو گیا تھا۔ لیونا ان چاروں کے کلب سے نکلتے ہی اپنے کپڑے اور رقم سمیٹ کر وہاں سے نکل آئی تھی۔ اسے امید تھی کہ رک اس سے زیادہ جرح نہیں کرے گا اور اس کی بات پر یقین کرلے گا کہ وہ تین بجے کلب سے نکل آئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ پیٹ کے درد کا بہانہ کرے گی۔ گزشتہ سال اس کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا جس کے بعد کبھی کبھی اس کے پیٹ میں درد ہوتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس رقم سے زبردست شاپنگ کرے گی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور وہ چونکی۔ وہ ایک متوسط طبقے کی آبادی میں اس چھوٹے سے کیبن میں رہتی تھی اس کا خیال تھا کہ شاید کوئی پڑوسی ہو لیکن جیسے ہی اس نے دروازہ ان لاک کیا وہ جھٹکے سے کھل کر اس کے منہ پر لگا اور وہ پلٹ کر گر پڑی۔ اس نے بے ساختہ منہ کو ہاتھ لگایا تو اس کا ہاتھ خون سے بھر گیا تھا۔ ناک پر لگنے والی ضرب شدید تھی شاید اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آنے والے رک اور اس کے تائیین مارٹی اور بیکر تھے۔ رک اس کے پاس آبیٹھا، اس نے جیب سے رومال نکال کر لیونا کی ناک سے لگایا۔

’’سوری، دروازہ ذرا زور سے کھل گیا...‘‘ اس نے کہتے ہوئے میز پر پڑی گڈیوں کی طرف دیکھا۔ ’’یہ غالباً تمہاری بچت ہے۔‘‘

’’ہاں...‘‘ لیونا نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ جواب میں اچانک رک نے اسے گھونسا مارا اس بار اس کی ناک کا بانسا یقیناً ٹوٹ گیا تھا اور وہ کراہنے کے انداز میں رونے لگی۔ تکلیف سے زیادہ اسے اپنے متوقع انجام کا سوچ کر رونا آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا رک معاف کرنے والا شخص نہیں تھا۔ مانی جواب تک خاموش بیٹھا تھا اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’مسٹر رک، ایک عورت پر تشدد مناسب نہیں ہے۔‘‘

رک نے اس کی طرف دیکھے بغیر پستول سیدھا کیا اور اس کے گھٹنے میں گولی اتار دی وہ دہاڑ مار کر نیچے گرا اور گھٹنا تھام کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ لیونا لرزنے لگی، اس نے کہا۔ ’’میں سچ کہہ...‘‘

ایک مزید گھونسے نے اس کا جملہ نہیں سامنے کا دانت بھی توڑ دیا۔ وہ جھٹکے سے گری تو رک نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔ ’’مجھے جان کا پتا چاہیے۔‘‘

’’مجھے نہیں معلوم۔‘‘ وہ کراہی۔ ’’وہ کلب سے نکل کر کہیں چلا گیا تھا۔‘‘

☆☆☆

جان ان لوگوں کو چھوڑ کر خود قصبے کی طرف آیا تھا۔ پہلے اسے خیال آیا کہ وہ ان پر لعنت بھیج کر خود یہاں سے نکل جائے مگر اسے خطرہ محسوس ہوا کہ وہ پکڑے گئے تو اس کی نشان دہی بھی کر دیں گے۔ دوسرے پیدل اس علاقے سے نکلنے میں بہت وقت لگتا اور یہاں چند سڑکیں تھیں جن پر کسی کو تلاش کرنا بہت آسان کام تھا۔ اس کے لیے گاڑی ضروری تھی اور اسے معلوم تھا کہ لیونا کے پاس ایک اچھی فورڈ وین ہے جو طویل فاصلوں کے لیے نہایت موزوں ہے۔ وہ یہاں آکر انہیں نکال کر لے جا سکتی تھی۔ وہ ایرل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے پاس رقم تھی لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی؟ امید تھی پولیس اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی، اس کے بعد وہ بھی جا سکتی تھی۔ وہ زبان کھولنے کی حماقت کرتی تو سب سے پہلے خود گرفت میں آتی اس لیے جان کو امید تھی وہ زبان بند رکھے گی۔

وہ قصبے کے نزدیک پہنچا، یہ ذرا فاصلوں پر بنے ہوئے کیبن جیسے مکانات تھے۔ وہاں روشنی تھی اور جان کو خوف تھا کہ کسی نے دیکھ لیا تو پولیس کو اطلاع کر سکتا تھا لیکن اسے لازمی کسی فون تک رسائی حاصل کرنی تھی۔ وہ دبے قدموں ایک مکان کے پاس پہنچا تو اچانک اس کا دروازہ کھل گیا اور ایک عورت نے باہر جھانکا۔ جان نے جلدی سے جیکٹ ٹھیک کی تاکہ اس کے نیچے لگا پستول نظر نہ آئے اور مسکرایا۔ ’’ہائے مام... مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے، کیا تمہارے گھر فون ہے؟‘‘

عورت کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے سر ہلایا اور راستہ چھوڑ دیا۔ عورت اسے اندر لائی۔ ایک تاریک کمرے میں کونے میں فون میز پر رکھا تھا۔ عورت نے اشارہ کیا۔ ’’تم کال کر سکتے ہو، کیا میں تمہارے لیے پینے کو کچھ لاؤں؟‘‘

’’میں شکر گزار ہوں گا۔‘‘ جان نے کہا اور عورت کے جاتے ہی جلدی سے فون اٹھا کر لیونا کا نمبر ملایا۔ بیل جا رہی تھی، اس نے خاصی دیر بعد کال ریسیو کی اور نزلے زدہ آواز میں بولی۔

’’ہیلو کون ہے؟‘‘

’’لیونا میں جان ہوں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔‘‘

لیونا نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ’’تم کہاں ہو؟‘‘

’’میں ہائی وے بیس کے شمال میں کسی شیرف ٹاؤن میں ہوں۔ تم ابھی لینے سے مڑ جاؤ گی تو سیدھی یہیں آؤ گی۔‘‘ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ کال ڈس کنکٹ ہو گئی۔ جان نے دوبارہ کال ملائی مگر اس بار لیونا کا نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا اسی لمحے اس کی نظر آتشدان کے اوپر رکھے ایک سنہری پتھر کی طرف گئی، اس نے اٹھایا تو اس کے وزن اور چمک نے بتا دیا کہ وہ سونے کا ڈلا تھا اور اس کا وزن کسی صورت ڈیڑھ کلوگرام سے کم نہیں تھا۔ وہ حیران رہ گیا کہ سونے کا اتنا بڑا اور خالص ڈلا یوں بے پروائی سے یہاں پڑا تھا۔ اسی لمحے عورت گلاس لیے وہاں آئی اور اس کے ہاتھ میں سونے کا ڈلا دیکھ کر اس نے چلا کر کہا۔

’’یہ کیا کر رہے ہو؟‘‘

’’سوری... میں...‘‘ جان نے کہنا چاہا لیکن عورت گلاس پھینک کر بھاگ گئی تھی۔ جان نے ڈلا واپس رکھنا چاہا

لیکن پھر اسے اپنے بیگ میں ڈال لیا اور باہر کی طرف لپکا عورت پتا نہیں کہاں چلی گئی تھی۔ اب اسے دوبارہ کسی فون کی تلاش کرنی تھی جہاں سے وہ لیونا کو کال کر سکے۔ اب وہ گلیوں سے گزر رہا تھا بالآخر اسے ایک جگہ فون بوتھ نظر آیا اس نے ریسیور اٹھا کر چیک کیا اور پھر سکہ ڈالا، ٹون آنے لگی چند سکے ڈال کر اس نے لیونا کا نمبر ملایا مگر اس بار بھی نمبر بند جا رہا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی مگر ناکام رہا اسی لمحے اس پر تیز روشنی آئی، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ پولیس کار تھی جس کی سرچ لائٹ اس پر پڑی تھی وہ پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ پولیس کار اس کے پیچھے آنے لگی اور یہاں گلیوں میں بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اچانک کار نے اسے ٹکر ماری اور وہ اچھل کر فٹ پاتھ پر گرا تھا، اس کا سر بہت زور سے فٹ پاتھ پر لگا اور پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

☆☆☆

رک نے مطلب کی بات جانتے ہی لیونا کا موبائل لے کر کال کاٹ دی اور پھر اسے آف کر کے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کر کے ایک طرف پھینک دیا۔ اس نے لیونا سے کہا۔ ”سیدھی ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

وہ کانپتے بدن کے ساتھ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ رک نے مارٹی کی طرف دیکھا۔ وہ کسی قدر طویل قامت سیاہ فام تھا، وہ باس کا اشارہ سمجھ گیا۔ رک اور بیکر باہر نکل گئے۔ مارٹی نے اپنا پستول سیدھا کیا اور لیونا کو شوٹ کر دیا۔ مانی اپنی تکلیف بھول کر اٹھنے لگا تھا کہ دوسری گولی اسے لگی اور وہ بھی گر گیا۔ مارٹی نے دونوں کی نبض چیک کر کے اپنا اطمینان کیا اور باہر آ گیا جہاں رک اور بیکر اس کا انتظار کر رہے تھے، مارٹی کے بیٹھتے ہی رک نے بیکر سے کہا۔ ”ہمیں شیرف ٹاؤن پہنچنا ہے جلد از جلد۔“

بیکر نے سر ہلایا اور گاڑی آگے بڑھا دی چند منٹ بعد وہ تقریباً سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے ہائی وے پر اڑی جا رہی تھی۔

☆☆☆

جان کو ہوش آیا تو وہ ایرل کے برابر میں کرسی پر بندھا بیٹھا تھا اور سامنے شیرف موجود تھا۔ جان کے سر سے خون بہہ کر اس کی شرٹ میں خشک ہو گیا تھا۔ جان نے اندازہ لگایا کہ وہ کم سے کم دو گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ اس نے ایرل کی طرف دیکھا اور شیرف سے کہا۔ ”شیرف، ہمیں اس طرح کیوں باندھا ہوا ہے، ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے؟“

”تم نے یہاں آنے سے پہلے ایک نائٹ کلب لوٹا اور وہاں موجود تین افراد کو قتل کر دیا۔“

جان تین افراد کا سن کر چونکا انہوں نے چار افراد کو قتل کیا تھا مگر اس نے اقرار سے گریز کیا۔ ”ہم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔“

”اس نے سب بتا دیا ہے۔“ شیرف نے ایرل کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کے اقرار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ جان نے ڈھٹائی سے کہا۔

شیرف اس کے پاس آیا۔ ”مجھے کسی کا اقرار نہیں چاہیے۔“

”یہ کہہ رہا ہے یہ مجرموں کو خود سزا دیتا ہے۔“ ایرل نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

”خود سزا دے گا؟“ جان نے بے یقینی سے کہا۔ ”کس قانون کے تحت؟“

”میرے قانون کے تحت۔“ شیرف نے سینہ تان کر کہا۔ ”یہ میرا قصبہ ہے، یہاں میرا قانون چلتا ہے۔ مجرموں نے میرے قصبے کو تباہ کر دیا تب میں نے عہد کیا کہ میں ان لوگوں کو خود سزا دوں گا۔“

”یہ غیر قانونی ہے۔“ جان کسمسایا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اسے بہت مضبوطی سے باندھا گیا ہے۔ ”اگر ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو وہ شیرف ٹاؤن سے باہر کیا ہے۔“

”تم نے یہاں ایک شاپ کیپر پر گن نکالی اور تم نے ایک گھر سے یہ چوری کیا۔“ شیرف نے سونے کا پتھر اس کے سامنے کیا۔ ”یہ دو جرائم کافی ہیں۔“

جان پہلی بار خوفزدہ ہوا تھا۔ ”تم کیا کرو گے؟“

شیرف مسکرایا۔ ”تم جلد جان جاؤ گے بس اتنا سمجھ لو کہ تم آئندہ جرم نہیں کر سکو گے۔“

”تم ہمیں قتل کر دو گے؟“ جان بولا۔

”میں نے کہا نا تم جلد جان جاؤ گے۔“ اسی لمحے کمرے میں موجود بورڈ پر لگا ہوا ایک بلب جلنے بجھنے لگا۔ اس بورڈ پر کم و بیش سو کے قریب بلب لگے ہوئے تھے۔ شیرف چونکا۔ اس نے اپنی پستول کی بیلٹ اٹھا کر باندھتے ہوئے کہا۔ ”دوستو میرا بلاوا آ گیا ہے، میں ابھی آتا ہوں۔“

شیرف باہر نکل گیا اور وہ دونوں وہاں رہ گئے۔

☆☆☆

رک اینڈ پارٹی قصبے میں داخل ہوئے تو وہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ بیشتر مکانوں کی روشنیاں بھی بند تھیں۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں، اتفاق سے واحد کھلی رہ جانے والی دکان کار شاپ تھی جس کے آگے پیٹرول پمپ تھے۔ رک نے بیکر کو

وہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ اندر آئے۔ بوڑھا اب بیئر پیتے ہوئے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر آئے تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ رک کی بھویں تن گئی تھیں، وہ عدم توجہی برداشت کرنے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے کاؤنٹر کے پاس جا کر بوڑھے سے کہا۔ ”مسٹر... ذرا ادھر دیکھو۔“

بوڑھا ایک کامیڈی پروگرام دیکھ رہا تھا، اس نے ہنستے ہوئے رک کی طرف دیکھا تھا کہ اس کا گھونسا بوڑھے کے چہرے پر پڑا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے ریک سے جا ٹکرایا۔ مارٹی نے کاؤنٹر کے پیچھے جا کر اسے گردن سے پکڑا اور کھینچ کر باہر لے آیا۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ رک نے سرد لہجے میں کہا۔ ”امید ہے اب تم میری بات غور سے سنو گے۔ مجھے چار افراد کی تلاش ہے ان میں دو مرد اور دو لڑکیاں ہیں۔“

جواب میں بوڑھا خاموش رہا، وہ بار بار اپنی ہتھیلی کی پشت سے خون صاف کر رہا تھا۔ رک نے اچانک اس کے پیٹ میں گھٹنا مارا اور وہ دہرا ہوا تو یہی گھٹنا اس کے منہ پر مارا اور وہ فرش پر جا گرا۔ رک کو ذرا رحم نہیں آیا تھا کہ وہ بہت بوڑھا شخص ہے اور بہت ہمت سے اس کا تشدد برداشت کر رہا ہے۔ اس کے اشارے پر بیکر نے بوڑھے کو بازوؤں سے تھام کر سیدھا کر دیا اور رک نے اسے پنچنگ بیگ کی طرح استعمال کیا۔ ذرا سی دیر میں وہ لہولہان ہو گیا تھا۔ بیکر نے اسے چھوڑا تو وہ لڑکھڑاتا ہوا کاؤنٹر تک گیا اور اس نے بہ ظاہر سہارا لیتے ہوئے اندر ہاتھ ڈال کر سرخ بٹن دبا دیا۔ اسی لمحے مارٹی نے اسے کھینچ کر فرش پر دے مارا۔ رک نے اس کے سینے پر جوتا رکھا اور پستول نکال کر اس کے چہرے کی طرف کر دیا۔ ”میں آخری بار پوچھ رہا ہوں اب میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔“

”بتا دو وہ چاروں کہاں ہیں۔“ مارٹی نے ہمدردی سے کہا۔ ”ورنہ باس کا غصہ بہت برا ہے۔“

”جواب دو اور طبعی عمر تک زندہ رہو۔“ بیکر نے بھی مشورہ دیا۔

”میں بس اتنا جانتا ہوں وہ میری شاپ میں آئے تھے اس کے بعد کہاں گئے مجھے نہیں معلوم۔“

”یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“

”شاید چار گھنٹے پہلے کی۔“ بوڑھے نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”ان میں سے ایک آدمی نے مجھ پر پستول نکالا تھا۔ وہ نہیں بچا ہوگا، تم نے مجھ پر تشدد کیا ہے تم بھی نہیں بچو گے۔“

”میں نے تم پر صرف تشدد نہیں کیا ہے۔“ رک نے کہا۔ ”میں تمہیں قتل بھی کروں گا۔“

رک نے پستول کا ٹریگر دبانا چاہا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ وہ تینوں چونک گئے، رک نے غرا کر کہا۔ ”دیکھو یہ کیا ہے؟“

اسی لمحے باہر کی طرف سے بہت تیز روشنی اندر آئی ایک لمحے کو ان کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ رک نے ہاتھ آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے پستول کا رخ روشنی کی طرف کر کے کئی فائر کیے۔ مارٹی اور بیکر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ان کی فائرنگ سے دکان کے سامنے کے سارے شیشے بکھر گئے مگر روشنیوں کو کوئی فرق نہیں پڑا تھا پھر باہر سے رائفل گرجی اور مارٹی اچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور ڈھیر ہو گیا، اس کے سینے میں بڑا سا سوراخ ہو گیا تھا۔ رک اور بیکر افراتفری میں آڑ میں ہو گئے۔ بوڑھا پتا نہیں کہاں گیا تھا۔ وہ پھر اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ باہر سے دوبارہ فائر نہیں ہوا تھا۔ بیکر کا پستول خالی ہوا تو وہ اسے لوڈ کر رہا تھا۔ رائفل پھر گرجی اور اس بار بیکر کا سر اڑ گیا۔ اپنے دو ساتھیوں کے مرنے پر رک خوفزدہ ہو کر پیچھے سرکا اور پھر کاؤنٹر کے عقب سے ہوتا ہوا واش روم کی طرف آیا اور وہاں گندگی اور بدبو کی پروا کیے بغیر اس نے عقبی شیشہ توڑا اور اس راستے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

شیرف کے جاتے ہی جان نے خود کو آزاد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ پتلی رسی تھی اور اسے کرسی سے بھی باندھا تھا اور اس کے ہاتھ الگ سے باندھے تھے۔ وہ کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اپنے ہاتھ آزاد کر لے۔ اس کا بیگ اور ایرل کا بیگ سامنے رکھے تھے حتیٰ کہ شیرف سونے کا ڈلا بھی سامنے رکھ گیا تھا۔ رسی کلائیوں میں گڑ رہی تھی مگر وہ مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد اسے لگا کہ رسی کسی قدر ڈھیلی پڑ گئی ہے اس لیے شدید تکلیف کے باوجود اس نے کوشش جاری رکھی اور بالآخر وہ ایک ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب رہا، اسی کی مدد سے اس نے دوسرا ہاتھ آزاد کرایا۔ پھر اسے سینے سے بندھی رسی کھولنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ ایرل سر جھکائے بیٹھی تھی اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ جان آزاد ہو گیا ہے۔ جب وہ کرسی سے اٹھ کر میز کی طرف بڑھا تو وہ چونکی۔ اس نے خوشی سے کہا۔

”جان تم آزاد ہو گئے... مجھے بھی کھولو۔“

مگر جان نے اس کی التجا پر توجہ دیے بغیر اپنا بیگ اٹھا کر اس میں سونے کا ڈلا ڈالا پھر اس نے ایرل کا بیگ کھول کر اس میں سے بھی رقم نکال کر اپنے بیگ میں ڈال

لی۔ ایرل نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ کیا، تم میری رقم کیوں لے جا رہے ہو... مجھے کیوں نہیں کھول رہے؟“

”کیونکہ اب تمہیں یہیں رہنا ہے۔“ جان اس کی طرف آیا اور اس نے اچانک ایرل کے سر پر گھونسا مارا، وہ بے ہوش ہو کر جھول گئی۔ جان نے بیگ اٹھایا اور وہاں سے نکل گیا۔ اس کے پاس نہ صرف ایرل کا حصہ آ گیا تھا بلکہ اسے یقین تھا کہ سونے کا یہ ڈلا بھی تقریباً ایک لاکھ ڈالرز میں بک جائے گا۔ اسّی ہزار ڈالر اس کے پاس اخراجات والے بھی تھے۔ پونے آٹھ لاکھ ڈالرز کے ساتھ وہ کہیں بھی مزے سے رہ سکتا تھا، بس اسے یہاں سے نکلنا تھا، اس کے بعد وہ آزاد ہوتا۔

☆☆☆

رِک بھول گیا تھا کہ وہ کس درجے کا شخص تھا اور بے شمار انسانوں کا خون اس کے ہاتھ پر تھا، وہ اس وقت کسی بزدل چوہے کی طرح اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ اپنے دو تجربے کار گرگوں کی موت نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ بیکر اور مارٹی دس افراد پر بھاری تھے اور باہر موجود شخص نے صرف دو فائر کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پیچھے پولیس کار کی روشنیاں لہرا رہی تھیں اور رک کو لگ رہا تھا کہ ابھی عقب سے ایک فائر ہوگا اور اس کی بھاگ دوڑ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے ذہن سے جان اور اس کے ساتھی نکل گئے تھے، وہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح اپنی جان بچا کر یہاں سے نکل جائے۔ مگر اس کی گاڑی شاپ کے سامنے کھڑی تھی اور اس طرف کا رخ کرنا موت کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ بھاگتے ہوئے اچانک رک کو احساس ہوا کہ اب پولیس کار کی روشنیاں پیچھے نہیں تھیں۔

اس نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے مکان ایک دوسرے سے ذرا فاصلے پر بنے ہوئے تھے۔ کہیں روشنی تھی اور کہیں تاریکی تھی۔ وہ روشنی والے حصوں سے بچ کر آگے بڑھنے لگا اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا خودکار اسلحہ گاڑی میں کیوں چھوڑ دیا، اگر ان کے پاس رائفلیں اور مشین گن ہوتی تو اس کے دو اہم ترین ساتھی یوں نہ مارے جاتے، اس کی گاڑی میں اتنا اسلحہ تھا کہ وہ اس پورے قصبے کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ مگر اب اس کے پاس صرف ایک پستول تھا اور اس میں صرف چند گولیاں رہ گئی تھیں۔ اسے کسی گاڑی کی تلاش تھی جس میں وہ یہاں سے نکل سکے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہوا تو اسے کچھ دور ایک ڈاج پک اپ نظر آئی یہ خاصی پرانی اور خستہ حال گاڑی تھی لیکن لگ رہا تھا کہ وہ چلتی ہے۔

رک دبے قدموں دوڑتا ہوا پک اپ کی طرف آیا اسی لمحے ایک اور سایا دیوار سے لگا ہوا پک اپ کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ دونوں کے درمیان میں پک اپ تھی اس لیے وہ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکے تھے۔ دوسرا فرد جان تھا جو دیوار سے لگا ہوا آگے آ رہا تھا۔ دونوں بیک وقت پک اپ تک آئے اور دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوا، دونوں نے بھڑک کر ایک دوسرے پر پستول تان لیے مگر گولی چلانے سے گریز کیا کیونکہ فائر کی آواز پر پولیس سیدھی یہیں آتی۔ رک کا چہرہ روشنی میں تھا اس لیے جان نے اسے شناخت کر لیا خود جان تاریکی میں تھا۔ اس نے آواز بدل کر کہا۔ ”کون ہو تم، کیا چاہتے ہو؟“

”وہی جو تم چاہتے ہو۔“ رک غرایا۔ ”یہ پک اپ...“

”مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔“ جان نے کہا۔ ”یہاں کا پاگل شیرف پیچھے پڑ گیا ہے۔“

رک چونکا۔ ”صرف شیرف...؟“

”ہاں، وہ ایک ہی آدمی ہے اس کے علاوہ یہاں کوئی پولیس والا نہیں دیکھا ہے۔“

رک سوچ میں پڑ گیا' صرف ایک شخص ان تین کے مقابلے میں تھا اور وہ اس سے جان بچاتا پھر رہا ہے' اس کا خیال تھا کہ شیرف کے ساتھ پوری پارٹی ہوگی۔ اس نے پرخیال انداز میں جان سے کہا۔ ”اگر وہ ایک ہے تو اس سے ہم خود نمٹ سکتے ہیں۔“

دونوں نے ابھی تک ایک دوسرے پر پستول تان رکھا تھا۔ جان نے کہا۔ ”ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے، اس لیے پستول نیچے کر لو۔“

”پہلے تم کرو...“

”او کے ہم بیک وقت کرتے ہیں اور زیادہ وقت نہیں ہے، شیرف کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے' اس نے کسی واردات سے خبردار رہنے کا عجیب سسٹم بنایا ہوا ہے اس کے دفتر میں ایک بورڈ پر سو سے زائد بلب لگے ہیں اگر ان میں سے کوئی بلب جلنے بجھنے لگے تو اسے پتا چل جاتا ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔“

”اس بڈھے نے بھی ایسا ہی کچھ کیا ہوگا۔“ رک نے زیر لب کہا' اب اسے پتا چل گیا کہ شیرف وہاں کیسے آیا۔ ”او کے' ہم بیک وقت پستول نیچے کریں گے، ایک دو، تین...“

انہوں نے پستول نیچے کر لیے۔ جان نے کہا۔ ”پک اپ لاک ہے۔“

”ایک منٹ۔“ رک نے کہا اور اپنی جیب سے کثیر المقاصد کی چین نکالی، اس میں کئی طرح کے اوزار' چاقو اور کٹر لگے تھے اس نے ایک اوزار سے کوشش کی اور پک اپ کا دروازہ کھل گیا۔ اس نے اندر داخل ہو کر اگنیشن کے نیچے سے تاروں کا گچھا نکالا اور اس میں سے اگنیشن وائر تلاش کرنے لگا۔ باہر کھڑے جان نے شیشہ بجایا اور دبی آواز میں بولا۔

”دروازہ کھولو، میں باہر کھڑا ہوں۔“

مگر رک اس کی طرف توجہ دیے بغیر اپنے کام میں لگا رہا۔ اس نے بالآخر وائر ملا کر انجن اسٹارٹ کر لیا اور پھر سیدھے ہوتے ہوئے اشارے سے جان کو صبر کرنے کو کہا اور اچانک ہی پک اپ آگے بڑھا دی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ جان اس کے لیے تیار نہیں تھا، پک اپ کا پچھلا ٹائر اس کے جوتوں پر سے گزرا تو وہ چیخ مار کر پیچھے گرا، اس کی انگلیاں کچل گئی تھیں۔ جب تک وہ کھڑا ہوتا پک اپ خاصی آگے جا چکی تھی پھر وہ رکی اور رک نے کھڑکی سے ہاتھ باہر کر کے ایک بے ہودہ اشارہ کیا۔ جان نے گالی دے کر پستول نکالا مگر وہ فائر کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ پک اپ دوبارہ آگے بڑھی لیکن وہ گلی کے کونے تک پہنچی تھی کہ اچانک سامنے سے پولیس کار نمودار ہوئی اور رک نے بدحواس ہو کر بریک لگائے اور پھر تیزی سے پک اپ کو ریورس کرنے لگا، یہاں گھمانے کی گنجائش نہیں تھی۔ جان تکلیف کے باوجود پلٹ کر بھاگا اور ایک مکان کی باڑھ پھلانگ کر اندر داخل ہو گیا، گلی میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

رک پیچھے آتے ہوئے ایک گڑھے کا خیال نہیں رکھ سکا پک اپ کا ٹائر اس میں گیا اور وہیں پھنس کر رہ گیا۔ وہ ایکسی لریٹر دبا رہا تھا، پہیہ گھوم رہا تھا مگر نکل نہیں پا رہا تھا۔ پولیس کار کچھ فاصلے پر آ کر رکی اور اس سے جسیم شیرف اتر کر پک اپ کی طرف بڑھا۔ رک نے بدحواس ہو کر پستول کھڑکی سے نکالا اور شیرف پر اندھا دھند فائر کرنے لگا۔ شیرف کو جھٹکا لگا مگر وہ رکا نہیں تھا۔ اتنی دیر میں رک اپنا پستول خالی کر چکا تھا۔ شیرف نے اپنی شاٹ گن اس کی طرف کی اور پھر ایک دھماکا ہوا۔ رک ڈرائیونگ سیٹ پر جھول کر رہ گیا۔ باڑھ کے عقب میں دبکا ہوا جان کانپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رک کیا بلا تھی، وہ اسی کے خوف سے تو بھاگے تھے اور وہ کتنی آسانی سے یہاں مارا گیا۔ جان کی صحیح معنوں میں گھگی بندھی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ شیرف کیا چیز ہے؟

شیرف نے آ کر رک کو چیک کیا اور پھر واپس اپنی کار کی طرف چلا گیا اس کے جاتے ہی جان باڑھ کے عقب سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا، اس کا رخ ناکارہ ہوم ٹریلر کی طرف تھا جہاں اس کے ساتھی تھے اور اب اسے ان کی مدد کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ پولیس کار اس کے پیچھے تھی اور اب اس کی تمام روشنیاں بند تھیں۔ جان لنگڑاتا ہوا اس طرف جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا اس کی انگلیوں کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں، وہ جب قدم رکھتا تو جان لیوا قسم کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ بعض اوقات تو اس کے لیے چیخ روکنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ مگر وہ رک نہیں سکتا تھا، رکتا تو مارا جاتا اس لیے تکلیف کے باوجود چلتا رہا۔ بالآخر وہ قصبے سے نکل آیا۔ ناکارہ ہوم ٹریلر ایک پہاڑی کے کنارے کھڑے تھے۔ چلتے ہوئے اچانک ایک پتھر اس کے پاؤں کے نیچے آیا تو گرا اور اس بار وہ اپنی چیخ ضبط نہیں کر سکا تھا۔

☆☆☆

رونی اور جینی ٹریلر میں خاموش بیٹھے تھے۔ رونی نے ایک بار چپکے سے کوکین کی تھیلی کا معائنہ کیا اور واپس رکھ رہا تھا کہ جینی نے دیکھ لیا، اس نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''کوکین۔'' رونی نے اعتراف کر لیا۔

''میرے خدا، تم نے کلب سے کوکین بھی چرا لی، جانتے ہو یہ ہمارے پاس سے نکل آئی تو کتنے سال کے لیے جیل جائیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوتا۔'' رونی نے بے پروائی سے کہا۔ آرام کرنے سے اس کے پاؤں کی حالت بہت بہتر ہوئی تھی اور اب ضرورت پڑنے پر وہ بغیر سہارے کے بھی چل سکتا تھا۔ جان کو گئے ہوئے کئی گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ سورج ڈوبنے کے بعد پہلے تاریکی ہوئی تھی پھر چاند نکل آیا تو اب روشنی تھی۔ جینی باہر دیکھ رہی تھی کہ شاید جان آتا دکھائی دے۔ رونی نے کہا۔ ''بیکار ہے، میں نے کہا تھا نا وہ واپس نہیں آئے گا وہ کہیں سے ایک گاڑی لے گا اور یہاں سے چلا جائے گا۔''

''تب ہم کیا کریں؟''

''میرا خیال ہے دو تین بجے ہم بھی نکلتے ہیں اور کوئی گاڑی چرا کر یہاں سے نکل جاتے ہیں۔''

''ایرل کا کیا ہوگا؟''

رونی نے شانے ہلائے۔ ''اس کے لیے ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔''

جینی کا دل دکھ رہا تھا۔ اچانک اسے لگا جیسے کوئی چیخا ہو۔ وہ کھڑی ہو گئی۔ ''باہر کسی کی آواز آئی ہے۔''

وہ ٹریلر سے نیچے اتر آئی۔ بلندی سے اسے کچھ دور ایک کار دکھائی دی تھی مگر وہ کھڑی تھی اور اس کی روشنیاں بھی بند تھیں۔ جینی کو اور کوئی دکھائی نہیں دیا تھا، اس نے چلا کر کہا۔

''جان تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں ہوں، پلیز میری مدد کرو۔'' جان کی آواز آئی تو جینی اس طرف بڑھی۔ جان ایک جھاڑی کے ساتھ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ جینی اس کے پاس آئی۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟''

''یہاں رک آیا تھا، اس نے میرے پیر پر گاڑی چڑھا دی۔''

''رک...'' جینی خوفزدہ ہو گئی۔ ''میرے خدایا...''

''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے شیرف نے اس کو شوٹ کر دیا ہے۔'' جان نے کہا۔ ''میری مدد کرو، ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' جینی نے طنز کیا۔ ''جب تم ٹھیک تھے تب تو نکل نہیں سکے اور اب تم خود نہیں چل سکتے۔ رونی پہلے سے زخمی ہے، ایرل پولیس کے قبضے میں ہے اور تم خوش فہمی میں ہو کہ ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔''

''ایرل کو چھوڑو۔'' جان نے جھوٹ بولا۔ ''وہ یقیناً لاک اپ میں ہوگی۔ مگر یہاں صرف ایک شیرف ہے اس کا کوئی آدمی نہیں ہے۔''

جینی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''صرف ایک شیرف؟ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کے ساتھ کچھ اور پولیس والے بھی ہوں گے؟''

''کوئی نہیں ہے میں نے خود دیکھا ہے وہ ہر جگہ اکیلے ہوتا ہے اور اس نے اکیلے ہی رک جیسے خطرناک آدمی کو ٹھکانے لگایا تھا۔''

''تب وہ ہمیں بھی ٹھکانے لگا سکتا ہے۔'' جینی نے کہا۔ ''اب چلو یہاں سے...'' اس نے سہارا دے کر جان کو اٹھایا۔ اس کا بیگ وزنی ہو رہا تھا۔ وہ جینی نے لینا چاہا تو جان نے منع کر دیا۔

''نہیں میں اٹھا لوں گا۔''

مگر جینی کا ہاتھ بیگ سے لگا اور وہ چونکی کیونکہ بیگ میں نہ صرف رقم زیادہ لگ رہی تھی بلکہ اس میں کوئی ٹھوس چیز بھی تھی۔ اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ ''اس میں کیا ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' جان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''آگے چلو۔''

جینی پیچھے ہٹ گئی۔ ''اب تم مجھ سے اس لہجے میں

بات نہیں کر سکتے۔ پہلے بتاؤ بیگ میں کیا ہے اور مجھے اس میں رقم کی گڈیاں بھی زیادہ لگ رہی ہیں۔ سچ بتاؤ... ایرل کہاں ہے؟"

"جہنم میں۔" جان نے دانت پیس کر کہا۔ "اور تم بھی جہنم میں جاؤ۔" اس نے کہتے ہوئے پستول نکال لیا جینی خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی۔

"پستول پھینک دو۔" پاس سے شیرف کی آواز آئی تو جان نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کچھ دور کھڑا تھا اور اس نے شاٹ گن تان رکھی تھی۔ جینی پیچھے ہٹنے لگی۔ جان نے شیرف سے کہا۔

"اگر تم نے مجھے گولی ماری تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔"

"میرے نزدیک تم دونوں مجرم ہو اس لیے کون مرتا ہے اس سے مجھے فرق نہیں پڑے گا پستول پھینک دو ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔"

جان چالاکی سے کام لے رہا تھا بہ ظاہر وہ جینی کو دھمکی دے رہا تھا، اصل میں وہ شیرف کو شوٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ شیرف نے کتنی آسانی سے رک کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور اگر وہ پستول پھینک دیتا تب بھی اسے شیرف قانون کے مطابق سزا نہیں دیتا، وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ اس کا اپنا انصاف کا نظام ہے۔ جان نے اچانک پستول شیرف کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ گولی شیرف کے وسیع سینے میں لگی، اسے جھٹکا لگا اور شاٹ گن چل گئی۔ گولی جان کے سینے میں سوراخ کرتی ہوئی جینی کی پنڈلی چھوتی گزری، وہ چیخ مار کر گری۔ جان کو چیخ مارنے کا موقع بھی نہیں ملا وہ زمین پر گرنے سے پہلے مر چکا تھا۔ جینی زمین پر پڑی اپنے پاؤں سے بہنے والا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ٹریلر سے رونی نکلا اور ایک طرف بھاگا۔ جینی چلائی۔ "پلیز میری مدد کرو... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ... رونی واپس آؤ۔"

رونی لنگڑاتا ہوا بھاگ رہا تھا، اس حالت میں بھی اس نے اپنا بیگ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ رکا اور پلٹ کر جینی کی طرف آیا۔ جینی سمجھی کہ وہ اس کی مدد کے لیے آ رہا ہے۔ مگر پاس آ کر رونی نے اچانک جھپٹا مارا اور اس سے اس کا ہینڈ بیگ چھین کر بھاگا۔ جینی پہلے تو دنگ رہ گئی پھر اس نے چیخ کر رونی کو گالی دی۔ رونی نے قہقہہ لگایا اور مڑ کر اسے انگلیوں سے بائی بائی کا اشارہ کیا۔ یہ اس کا آخری قہقہہ اور آخری اشارہ تھا۔ شیرف کی شاٹ گن ایک بار پھر گرجی اور رونی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ گولی لگنے کے بعد شیرف نیچے گر گیا تھا اور اس نے وہیں سے رونی پر فائر کیا تھا۔ وہ کچھ دیر سر اٹھائے دیکھتا رہا پھر اس نے نڈھال ہو کر سر زمین پر رکھ دیا۔ جینی بڑی مشکل سے کھڑی ہوئی اور پھر لنگڑاتی ہوئی شیرف کی طرف بڑھی۔ شیرف زخمی تھا، ایک گولی اس کے دائیں سینے میں لگی تھی اور دوسری اس کے بائیں بازو پر لگی تھی، یہ گولی رک نے چلائی تھی۔ اس نے جینی کو دیکھ کر شاٹ گن اوپر کی تو وہ جلدی سے بولی۔

"میں مدد کے لیے آئی ہوں، پلیز گولی مت چلانا۔"

"مجھے مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" شیرف نے غرا کر کہا اور پھر ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جینی سے کہا۔ "ان دونوں کے بیگز لے آؤ جس میں رقم ہے۔"

جینی نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور شیرف اسے کار میں لے کر روانہ ہو گیا، وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ جینی اس کی ہمت پر حیران تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "شیرف کیا یہ درست ہے تم اس ٹاؤن میں واحد پولیس والے ہو؟"

وہ گہری سانسیں لے رہا ہے، اس نے سر ہلایا۔ "یہ درست ہے۔"

"شروع سے؟"

"نہیں، بیس سال پہلے جب میں یہاں پولیس میں آیا تو یہ بہت پر امن اور خوب صورت قصبہ تھا لیکن پھر یہاں مجرموں کا طاعون آ گیا۔ نزدیک ہی سونے کی کان سے لوگ سونا نکالنے لگے یہ کام وہ چوری چھپے کرتے تھے اور کچھ لوگوں نے اچھا خاصا سونا نکال لیا۔ اس سونے کے لالچ میں مجرم یہاں آئے اور گولڈ ٹاؤن قتل و غارت گری کا مرکز بن گیا۔ پولیس والے چند تھے اور مجرم کہیں زیادہ تھے ایک ایک کر کے انہوں نے سارے پولیس والوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ مجھے بھی گولیاں لگی تھیں اور میں شدید زخمی ہو کر دو مہینے اسپتال میں پڑا رہا تھا۔ قصبہ اجڑ گیا، لوگ یہاں سے رہائش چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے بھی نوکری چھوڑ دی تھی لیکن میرا دل مطمئن نہیں تھا پھر قصبے کے لوگوں نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ مجرموں کی گند صاف کرنا چاہتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ مجھے شیرف بنا دیں اور پھر میں جیسے چاہوں مجرموں سے نمٹوں وہ اس میں میرا ساتھ دیں گے۔"

"قصبے کے لوگوں نے تمہارا ساتھ دیا؟"

"ہاں، انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ یہ قصبہ تباہ ہو گیا تھا۔ یہاں عام لوگوں سے زیادہ مجرم تھے جو آس پاس سے بھاگ کر یہاں آ گئے تھے۔ ریاستی حکومت کو ان کی پروا نہیں تھی بلکہ وہ خوش تھی کہ ان کے شہروں سے گند نکل کر یہاں آ رہی ہے۔ مجرموں نے عام لوگوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ بہت ساروں کو لوٹ لیا، انہیں قتل یا زخمی کیا... عورتوں کی

بے حرمتی کی... کئی کمسن لڑکیاں سرے سے غائب ہو گئیں۔ لڑکے خراب ہو رہے تھے۔ اسی لیے لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔"

"تم نے سب کو صاف کر دیا؟"

"میں اکیلے یہ کام نہیں کر سکتا تھا لوگوں نے میرا ساتھ دیا لیکن میں نے بچ جانے والے مجرموں کو اپنے قانون کے تحت سزا دی اور ان کو عبرت کا نشان بنا دیا، اب شیرف ٹاؤن میں کوئی جرم نہیں کرتا، زیادہ تر مارے گئے، باقی پکڑ لیے گئے اور کچھ بچ کر بھاگے تو وہ پلٹ کر نہیں آئے۔"

پولیس کار شیرف کے دفتر کے سامنے رکی، وہ جینی کو لے کر اندر آیا جہاں ایرل کرسی پر بے ہوش پڑی تھی جینی اس کی طرف لپکی اور بیتابی سے اسے ہلانے لگی۔ پھر اس نے شیرف کی طرف دیکھا۔ "پلیز یہ بے ہوش ہے۔"

"میرا خیال ہے تمہارا ساتھی اسے بے ہوش کر گیا ہو گا۔ وہ اس کے بیگ میں موجود رقم بھی لے گیا تھا۔ اسے پانی پلاؤ۔" شیرف نے کہہ کر قصبے کے ڈاکٹر کو کال کی۔ "جیمس، میرے دفتر آ جاؤ مجھے دو گولیاں لگی ہیں۔"

ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر جیمس شیرف کے دفتر میں ہی اس کے جسم میں موجود گولیاں نکال چکا تھا، اس نے ایرل اور جینی کو بھی طبی امداد دی۔ ایرل کی ٹوٹی ہڈی سیٹ کر کے زخم پر ٹانکے لگائے اور اوپر سے پلاسٹر چڑھا دیا تھا۔ جینی کا زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اسے صاف کر کے پٹی کر دی۔ یہ رات ایرل اور جینی نے شیرف آفس کے لاک اپ میں گزاری۔ صبح شیرف نے انہیں بیدار کیا۔ وہ صاف ستھری وردی میں تازہ دم لگ رہا تھا اور پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ اسے گزشتہ رات دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ ان کے لیے ناشتا لایا تھا۔ جینی نے شیرف سے پوچھا۔ "ہمارے ساتھ کیا ہو گا؟"

اس نے کہا۔ "ابھی ہم لاشوں سے نمٹ رہے ہیں اور بہت کچھ ٹھکانے لگانا ہے اس کے بعد تم دونوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے گا۔"

شیرف کی بات سے واضح تھا کہ وہ سب ریکارڈ سے ہٹ کر تلف کرنے جا رہا تھا یعنی لاشوں اور دوسری چیزوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے گا اور قصبے سے باہر کسی کو علم نہیں رہے گا کہ یہاں کچھ لوگ آئے تھے اور وہ مارے گئے۔ جینی اور ایرل دو دن لاک اپ میں رہیں۔ یہاں وہ آرام سے تھیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ جینی کا زخم ٹھیک ہو رہا تھا اور ایرل کی تکلیف بھی خاصی کم ہو گئی تھی، وہ اسٹک کے سہارے کھڑی ہو جاتی تھی، اس کا فریکچر سمپل تھا اور ڈاکٹر جیمس دن میں ایک بار اسے دیکھنے آتا تھا۔ ان دو دنوں میں انہیں شیرف ٹاؤن کے بارے میں اور بھی بہت کچھ پتا چلا تھا۔ قصبے کی معیشت تباہ ہو گئی تھی یہاں جو میونسپل کمیٹی کام کرتی تھی اس کے پاس فنڈز نہیں تھے کہ وہ قصبے کی صفائی اور مرمت کا کام کرتی۔ ریاستی حکومت سے فنڈز کی درخواست نہیں کی گئی تھی اس طرح قصبے میں ریاستی حکام کی دخل اندازی شروع ہو جاتی اور شیرف ٹاؤن کے باسی اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے، انہیں خوف تھا کہ اگر شیرف کو ہٹا دیا یا اس کا طریقہ کار ختم کر دیا تو قصبہ پھر سے مجرموں کی آماجگاہ بن جائے گا۔ اس لیے وہ بدحالی میں رہنے کے لیے تیار تھے مگر اپنے قصبے میں بیرونی مداخلت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

تیسرے دن شیرف اور شیرف ٹاؤن کا میئر چند معزز افراد کے ساتھ وہاں آیا۔ ان میں کار شاپ کا بوڑھا مالک انگل پارکر بھی شامل تھا، اس کا پورا خاندان مجرموں کا شکار ہو گیا تھا اور اس نے دس سال نفسیاتی اسپتال میں گزارے تھے۔ ایرل اور جینی کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ شیرف کا رویہ ان سے نرم تھا۔ اس نے سفارش کی۔ "یہ دونوں ان کے جرم میں شامل تھیں مگر انہوں نے کسی کو قتل نہیں کیا اور پھر یہاں بھی کوئی جرم نہیں کیا۔ اس کے مقابلے میں میری مدد کی اس لیے انہیں معاف کر دینا مناسب ہو گا۔"

"ایک منٹ۔" جینی نے کہا۔ "اس سے پہلے آپ لوگ ہمارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں میں بتا دوں، میں نے اور ایرل نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر ہمیں معافی مل گئی تو ہم اس قصبے میں رہنے کو ترجیح دیں۔ کیونکہ یہاں غربت ہے، پسماندگی ہے لیکن امن و سکون ہے، یہاں شیرف جیسا شخص ہے جو قانون شکنوں سے نمٹنا جانتا ہے مجھے یقین ہے یہاں رہنے والے بہت سکون سے رہتے ہوں گے۔"

وہ سب آپس میں مشورہ کرنے لگے اور کچھ دیر بعد جینی اور ایرل کو بتایا کہ ان کو معافی دے دی گئی ہے لیکن اب وعدے کے مطابق انہیں ساری عمر اسی قصبے میں رہنا ہو گا۔ وہ خوش ہو گئی تھیں اور یہ جان کر مزید خوش ہوئیں کہ ان کے حصے کی رقم انہیں دی جاتی جب کہ باقی رقم قصبے کی ٹاؤن کمیٹی کو دی جاتی تاکہ وہ قصبے میں ترقیاتی کام کرا سکے۔ جینی کو سلائی آتی تھی اور ایرل کپڑوں کی ڈیزائننگ کر سکتی تھی، انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں گارمنٹ شاپ کھولیں گی۔ باعزت طریقے سے کمائیں گی بلکہ شیرف ٹاؤن کی ترقی میں اپنا کردار بھی ادا کریں گی۔



کشکول

انوار صدیقی

آخری قسط

اسرار اور تحیر کے پردے میں لپٹا ایک منفرد طویل سلسلہ

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل وگلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روند کر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی کبھی جھکنے نہیں دی تھی، اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی جبکہ لیاقت حسین نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے باپ کی مخالفت کی اور ماں کی دعائیں لے کر فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پرتاب بھوشن کو برہنہ حالت میں کوئی پراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک لیموں ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر لیموں سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں اور پریشانیوں میں گھر گیا۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو پیچھے ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ محفوظ رہتا ہے اسی دوران ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ وسلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازم رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم بھلے ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ لیکن براہ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تعلق

خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعے میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخرب اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں پر افضل خان بھی زیر عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابل اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج بھی بہ ظاہر شیخ حامد کا دوست بن کر اسے خوش فہمی میں مبتلا کر دیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے علم میں لے آتا حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے مہو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر رحمانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہو جاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دھچکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کے حوالے سے خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا بیٹا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کرتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی جاتی ہے۔ لیاقت حسین فرحین کو اس کے ایک رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورت حال سے آگاہ کرتا ہے مگر امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اورنگزیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی سزا میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگزیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگزیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگزیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے۔ لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر اورنگزیب نے لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابل اعتماد افسر کو ہدایات دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگزیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی تابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگزیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیر داخلہ سے کرتا ہے۔ اس پر اورنگزیب معذرت کر کے اس سے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے۔ لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کی آمادگی پر منتج ہوتی ہے۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگزیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے

عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہو سکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیر نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا جہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف دشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں کو اس کی ماں نے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا۔ شیخ حامد کے خلاف برسرپیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہو گیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب دشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہو گئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیر سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس خوشی میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہو جاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں۔ میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہو گئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد تھا لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک لیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بدستور ایک معما بنی ہوئی تھی جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ منگنی کی رسم تو ادا کر دی گئی لیکن شادی کا اعلان نہیں کیا گیا اور اسے آکٹوپس کی موت کی تصدیق سے مشروط کر دیا گیا۔ شیخ حامد نے کنول کو طلاق دے کر اسے بری حالت میں ویران جگہ پھنکوا دیا، جگا کے فرنیچر کے شوروم کو بگ باس کے غنڈوں نے تباہ کر دیا۔ دشنو کو فون کے ذریعے بگ باس کی جانب سے چند شخصیات کو قتل کرنے کی ہدایت دی گئی جس کی اطلاع لوچن نے اورنگ زیب کو دے دی۔ لیاقت حسین کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہوا مگر اس کی ماں کے دیے ہوئے نگینے نے اس کی رہنمائی اور حفاظت کی اور پرتاب کو پسپا ہونا پڑا۔ کنول نیند کی گولیاں کھا کر پہلے اخبار کے آفس پھر ملٹری آفس گئی اور انہیں بگ باس کے زندہ ہونے کی اطلاع دی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو گئی۔ لیاقت حسین کو رات میں آہٹ محسوس ہوئی چند حملہ آوروں نے اس کے گھر پر نقب لگائی تھی۔ فرحین کے اغوا کے لیے آئے ہوئے دشمنوں کو لیاقت حسین نے جہنم واصل کیا فرحین تھوڑی زخمی ہوئی اسے اسپتال داخل کرا دیا گیا جہاں ایک جعلی میل نرس نے اسے زہر آلود انجکشن لگانے کی کوشش کی جو لیاقت حسین نے اپنی ماں کی دی ہوئی انگوٹھی کی نشاندہی کی بدولت ناکام بنا دی۔ دشنو انٹیلی جنس کی قید سے فرار ہو گیا۔ میڈم روبی کی سیکریٹری ثریا کو تنبیہ کے طور پر اغوا کر کے دھمکی کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اورنگ زیب اور سراج ایک نئے کردار سکندر علی شاہ کی فائل حاصل کر کے اس کے متعلق معلومات اکٹھی کرتے ہیں جس کی بیوی نگینہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں جاتی رہی ہے اور شہلا ورما اور جوئی نوجوان لڑکیوں کی اسمگلنگ میں ملوث ہیں۔ دوسری جانب جگا اور لوچن شیخ حامد کی کوٹھی کو دھماکوں سے تباہ کر دیتے ہیں۔ آئی جی کا استعفیٰ منظور نہیں ہو رہا تھا۔ اسے "کوبرا" کے نام سے ایک کال موصول ہوئی جس میں اسے دھمکی دی گئی کہ وہ لیاقت حسین کا معاملہ حل کرے یا اورنگ زیب کا تبادلہ کرے، بصورت دیگر اسے اور اس کی مرحوم بیوی کی خفیہ تصاویر کے ذریعے اخبارات میں بدنام کر دیا جائے گا۔ لہٰذا وہ جو پہلے اورنگ زیب کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلا چکا تھا اس کا تبادلہ منظور کرا لیا اورنگ زیب اس کی مجبوری بھانپ گیا لیکن بظاہر دونوں کے درمیان تلخی قائم ہو گئی۔ دشنو کو افضل خان کے ذریعے پکڑ لیا گیا۔ اورنگ زیب نے اپنی جگہ سراج کو تعینات کر کے سکندر علی شاہ کی فائل اس کے حوالے کی جس میں انسپکٹر رانا حمید نے اس کے متعلق تفصیلات جمع کی تھیں۔ اورنگ زیب کی رہائش گاہ جسے وہ پہلے ہی چھوڑ چکا تھا تباہ کر دیا گیا۔ بینا نامی لڑکی کے اغوا کو ناکام بنا کر ملٹری ایجنسی نے مزید معلومات حاصل کیں۔ سکندر علی شاہ کو "مشکرہ" کے نام سے کال موصول ہوئی جس میں اس ناکامی کے بعد محتاط رہنے کا مشورہ دیا گیا۔ سکندر کے ڈیرے پر ایک لڑکی ماروی لائی گئی جسے رات کی تاریکی میں جنوبی محل سے گزارا گیا۔ اورنگزیب، سراج اور کرنل احتشام مل کر آکٹوپس کے خلاف تحقیقات کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں اورنگزیب بینا سے پوچھ گچھ کرتا ہے کرنل احتشام دشنو سے تفتیش کر رہا ہے دوسری جانب شیخ حامد آئی جی کو کوبرا اور سکندر علی شاہ کو مشکرہ کے نام سے بلیک میلنگ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ سکندر علی شاہ ماروی کے ساتھ سلوک کی انکوائری کراتا ہے اسی دوران اسے اطلاع دی جاتی ہے کہ شہلا ورما کے بیوٹی پارلر میں توڑ پھوڑ کی گئی ہے۔ یہ لوچن اور جگا کی کارروائی تھی۔ لیاقت حسین کے حملہ آوروں کو زخمی کرنے کے بعد گرفتاری دینے کے بعد اسے بری کرنے والے مجسٹریٹ کی پراسرار موت واقع ہوتی ہے۔ دارا کی بیوی روشانہ کو اغوا کر کے بے عزت کیا جاتا ہے اور سابق چیف پولیس علیم احمد کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب ماروی سے پوچھ گچھ کرتا ہے۔ دوسری جانب دشنو ملٹری کسٹڈی میں تفتیش کے دوران مارا جاتا ہے۔ دشنو کی لاش کو ایک ہندو سماجی تنظیم کے ذریعے جلا دیا جاتا ہے۔ لوچن اور جگا سکندر علی شاہ کی بیوی نگینہ کو پھانس کر اسے قابل اعتراض حالت میں واپس کرتے ہیں یہ سکندر کے لیے دھمکی ہے۔ دوسری جانب سکندر بگ باس سے حاصل شدہ اطلاعات کی روشنی میں اورنگ زیب کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ سکندر کی دست راست دلربا کے ٹھکانے پر ایک اجنبی اس کی چند ہوشربا تصاویر اتار کر غائب ہو جاتا ہے۔ دشنو جو حبس دم کا ماہر تھا اور سانس روک کر کرنل کو دھوکا دے کر شمشان گھاٹ سے فرار ہو گیا اور افضل خان کے ٹھکانے پر فائرنگ کی لیکن اورنگزیب نے افضل خان کے ذریعے ہی اسے جہنم واصل کیا۔ دوسری جانب میڈم روبی کے گھر شیخ احمد نے پہنچ کر اسے دھمکایا اور بے ہوش کر کے فرار ہو گیا۔ لوچن نے نگینہ کو فون کر کے اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور سکندر علی شاہ کے حصار میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیاقت حسین کو حالت خواب میں چند مناظر دکھائے گئے اور خبردار کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا سامنا پرتاب بھوشن سے ہو گیا۔ پرتاب بھوشن سخت مقابلے کے بعد جہنم واصل ہو گیا۔ نگینہ سکندر علی شاہ کی قید سے فرار ہو گئی دلربا کو بھی اغوا کر لیا گیا۔ اورنگزیب اور اس کے ساتھی شیخ حامد اور سکندر علی شاہ کے آپس کے تعلق اور ان کی چھان بین کر کے ان کے گرد گھیرا ڈالنے میں مصروف ہیں۔ دوسری جانب سیٹھ عثمان کے آفس کے سامنے دھماکا ہوتا ہے۔ یہ حملہ بھی شیخ حامد نے کرایا تھا۔ مگر سیٹھ عثمان اور لیاقت حسین محفوظ رہے۔ نگینہ کو پاگل میں قید کر دیا گیا۔ دلربا اغوا ہونے کے بعد دوبارہ سکندر علی شاہ کے پاس پہنچ گئی۔ شبنم اور افضل کی شادی کرا دی گئی۔ شیخ حامد نے رستم علی آغا خانی کو ختم کر دیا۔ افضل کو تاگی کا قصہ تمام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ وہ تاگی کے ٹھکانے پر پہنچا تو وہاں اسے گھیر لیا گیا۔

افضل خان کی نظریں پستول پر مرکوز تھیں۔ ناگی کی انگلی کے دباؤ کے ساتھ ہی موت اور زندگی کا فاصلہ بھی گھٹتا جا رہا تھا پھر ناگی کی انگلی ٹریگر سے دور ہوگئی۔ اس نے بڑے سرد لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں واپس جانے کا موقع دے سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر......''

''وہ بھی بتا دو۔''

''تم آئندہ میرے سائے سے بھی دور رہو گے، کیوں منظور ہے؟''

''اس کا جواب میں دوبارہ کسی ملاقات پر ہی دے سکوں گا۔''

''اس وقت کیوں نہیں؟''

''میں بزدلی کا مظاہرہ کرنے کا عادی نہیں رہا۔'' افضل خان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''جانتا ہوں اس لیے ایک اور موقع دے رہا ہوں۔'' ناگی نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے ایک ایسے لمحے کی تلاش تھی جب وہ پھرتی کا مظاہرہ کر کے بازی پلٹ سکتا۔

''کس بات پر غور کر رہے ہو؟'' ناگی نے زہر میں بجھے انداز میں مسکرا کر سوال کیا۔ شاید وہ اس کی خاموشی کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

''میں تمہارے شکاری کتوں کی نظروں میں اپنی حیثیت کم نہیں کر سکتا۔''

''اوہ۔'' ناگی پھر سنجیدہ ہوگیا۔ ''جواب معقول ہے لیکن ایک دوسری صورت بھی ہے۔ میں اپنے آدمیوں کو بلا کر ان کے سامنے دوستی کا ہاتھ ملا سکتا ہوں مگر شرط وہی ہوگی۔ تم دوست بن کر رہو گے، ہم ایک اور ایک مل کر گیارہ بھی ہو سکتے ہیں، کیوں؟''

''تمہیں یہ آفر دینے میں دیر ہوگئی اس لیے میں دوستی کے رشتے پر غور نہیں کر سکتا۔''

''اب کیا مشکل درپیش ہے؟''

''ہم تم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جس کا نمک کھا لیتے ہیں اسی کے اشارے پر چلنا ہم دونوں کا شیوہ بھی ہے۔'' افضل خان نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''تم سکندر علی شاہ کے خاص آدمی ہو اور میں جس کے اشارے پر یہاں آیا ہوں اس کا نام بھی کئی مصلحتوں کی وجہ سے زبان تک نہیں لا سکتا۔''

''ایس پی اورنگ زیب؟''

''اس کے بھی کئی احسان ہیں لیکن اس وقت مجھے کسی اور نے یہاں بھیجا ہے۔''

ناگی کی پیشانی پر آڑھی ترچھی شکنیں ابھرنے لگیں۔ اس کی گرفت پستول پر مضبوط ہونے لگی۔ قدرے درشت لہجے میں بولا۔ ''افضل خان یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم یہاں سے میری اجازت کے بغیر زندہ جا سکو گے۔ یہ بھی معلوم ہوگا تمہیں کہ قریب ہی ایک پرانا قبرستان بھی ہے۔ یہاں نئی قبر کھودنے کا رسک ہمارے آدمی بھی نہیں لیتے۔ کسی بوسیدہ قبر میں ایک اور لاش دفن کرنے کی گنجائش بھی آسانی سے نکل آتی ہے۔''

''ہو سکتا ہے تم سچ کہہ رہے ہو لیکن مجھے شعر و شاعری سننے کا کبھی شوق نہیں رہا۔''

''کیا یہ تمہارا آخری جواب ہے؟'' ناگی کے چہرے پر سرخی کی لہر گہری ہونے لگی۔

''ہاں، یہی سمجھ لو۔'' افضل خان نے شانے اچکا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

ناگی نے اپنا پستول دوبارہ بلند کیا لیکن اس سے قبل کہ وہ اپنے خطرناک ارادے کی تکمیل کرتا، ایک بوڑھا میلے کپڑوں میں، سر پر مچھلی پکڑنے کا جال ڈالے دروازے پر آگیا۔ ناگی کی تیز نظریں اس پر جم گئیں۔ ایک لمحے اسے گھورنے کے بعد اس نے قدرے ترش انداز میں سوال کیا۔

''سردار اس وقت تم ادھر کیا لینے آگئے؟''

''یہ...... اجنبی کون ہے؟'' سردار نے کھانستے ہوئے افضل خان پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر دریافت کیا۔

''یہ...... موت کی تلاش میں آگیا ہے اور میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔''

''نہیں ناگی، میں تجھے اس کی اجازت نہیں دوں گا۔'' آنے والے نے کہا۔ ''تو بے شک اسے مار دے لیکن ہماری بستی سے دور لے جا کر، یہی میرا حکم ہے۔''

''یہ حکم تم کس حیثیت سے دے رہے ہو؟'' ناگی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''سردار کی......''

''بکواس بند کرو پستہ قد بدیسی کتے۔'' ناگی نے گرج

کر کہا۔ ''میں تمہاری اصلیت جان چکا ہوں۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔'' اس بار سردار نے جو لوچن کے سوا کوئی اور نہیں تھا، بے جگری سے کہا۔ ''میں بدیسی کتا ہی ہوں لیکن اعلیٰ نسل کا، تمہاری طرح کا لینڈی ڈاگ نہیں ہوں جو سیٹھ حمدان کی کوٹھی پر شمرہ کو پیاسا چھوڑ کر فرار ہوگیا تھا۔ اب پستول نیچے کر لو اس لیے کہ تمہارا مقامی باپ جگا بھی میرے ساتھ ہے۔'' پھر لوچن کا جملہ ختم ہونے سے پیشتر جگا بھی ہلکے میک اپ میں سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول تھا۔ افضل خان بھی جگا کو دیکھ کر چونکا۔

ناگی نے اپنا پستول فرش پر اچھال دیا پھر بہ دستور دبنگ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں مگر یہ سوچ لو کہ ناگی تمہاری قید میں زیادہ دیر نہیں رہے گا۔ میرے گرگے بھی انتقام لینا جانتے ہیں۔''

''اتنی جلدی کوئی آخری فیصلہ نہ کرو۔'' لوچن کی نگاہوں میں چنگاریاں لپکنے لگیں۔

''افضل خان۔'' جگا نے افضل خان کو چبھتے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ''تم اب نکل لو، جاؤ باہر کرنل کے سادہ لباس والے موجود ہیں۔ جاتے جاتے ایک بات اور سن لو...... ایک بار تم نے کسی کے اشارے پر مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن قدرت کے کسی غیبی ہاتھ نے مجھے زندگی عطا کر دی تھی۔ آج میں ایک مسلمان کی حیثیت سے تم کو معاف کر رہا ہوں۔'' افضل خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''پارٹنر تم نے کیا سوچا ہے؟'' جگا نے اس بار لوچن سے پوچھا۔

''میں کٹھر اگ پالنے کا عادی نہیں ہوں، کونک ڈسپوزل کا نسخہ سب سے آسان بھی ہوتا ہے۔'' اپنے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی لوچن کے اشارے پر جگا کے پستول سے دو بار ٹچ ٹچ کی مدھم آواز ابھری۔ ناگی کسی کٹے ہوئے شہتیر کے مانند فرش پر ڈھیر ہوگیا پھر جگا اور لوچن نے بھی باہر کی سمت قدم بڑھائے جہاں ناگی کے دو ساتھیوں کی لاشیں بھی موجود تھیں۔

☆☆☆

اس روز اتوار کی چھٹی تھی اس لیے جونی حسب معمول اس وقت بھی شیلا ورما کی خواب گاہ میں اس کے بستر پر موجود تھا۔ اس نے ایک نظر شیلا ورما پر ڈالی جو ابھی تک شب خوابی کے لباس میں بستر پر کسی مدہوش شرابی کی طرح بکھری پڑی تھی۔ جونی نے اس کے نیم عریاں جسم کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی تو اسے خود اپنی قسمت پر رشک آنے لگا پھر اس کی نظر سائڈ ٹیبل پر موجود کیلنڈر پر پڑی تو یکلخت اسے مستقبل شناس مس ڈکسن یاد آگئی جس نے تیرہ کے ہندسے کو اس کی زندگی کا سب سے منحوس دن قرار دیا تھا۔ جونی کے ماضی کی کتاب کو اس نے جس انداز سے دُہرایا تھا وہ جونی کے لیے حیران کن ہی تھا۔ مس ڈکسن کے کہے ہوئے جملے جونی کے ذہن میں گونجنے لگے، اس نے کہا تھا۔

''تمہارا باپ ایک عیاش اور فریبی شخص تھا۔ اس نے فریب کی بنیاد پر ہی تمہاری ماں سے رشتہ جوڑا تھا لیکن تمہاری پیدائش کے بعد اس کی نگاہوں کے زاویے بدل گئے، وہ دوسری عورتوں کے ساتھ دل بہلانے لگا پھر تمہاری ماں کو تین سال تک تنہائی کے فریب سے دوچار رکھنے کے بعد اسے طلاق دے کر گھر سے نکال دیا۔ تمہاری ماں نہایت پاکباز عورت تھی۔ تمہاری پرورش کی خاطر اس نے ایک گھر میں ملازمت کر لی۔ وہاں بھی وہ نظریں جھکا کر کام کرتی رہی۔ خود کو ہوس پرست مردوں کی بھوکی نظروں سے دس سال تک کسی نہ کسی طرح بچاتی رہی لیکن ایک دن جب گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اسی گھر میں آنے جانے والے ایک مرد کے ہاتھوں درندگی کا شکار ہوگئی۔ وہ پاکباز عورت تھی کسی رسوائی سے بچنے کی خاطر اس نے خودکشی کر لی۔ تم بے سہارا ہوگئے۔ لوگوں نے ترس کھا کر تمہیں ایک یتیم خانے کے سپرد کر دیا۔

جب تمہاری عمر تیرہ کے بدقسمت ہندسوں میں تھی اس وقت پولیس کی ریڈ کے دوران تم بھی کچھ دوسرے لڑکوں کی طرح یتیم خانے سے بھاگ نکلے پھر ایک شادی شدہ عورت نے تمہیں زبردستی اپنے شکنجوں میں جکڑ کر ایک انوکھی لذت کا ذائقہ چکھا دیا۔ اس کے عوض اس نے خاصی معقول رقم بھی دی۔ تمہاری پرورش چونکہ اچھے ماحول میں نہیں ہوئی تھی اس لیے وقت نے تمہیں بہت جلد میل پروسٹی ٹیوٹ (Male prostitute) بنا دیا۔ اس کے بعد تم کس طرح شیلا ورما تک پہنچے اور اس نے اپنے شوہر سے کیوں چھٹکارا حاصل کیا اس کی وجہ بھی تمہیں معلوم ہے۔'' پھر مس ڈکسن کے آخری جملے جونی کے کانوں میں گونجنے لگے۔

''جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورما کی دنیا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ۔ کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو۔''

جونی کی نظریں شیلا ورما کے گداز جسم پر ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جب جونی کا موبائل وائبریٹ کرنے لگا۔ موبائل آن کر کے جونی نے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو۔''

''ساحلی علاقے سے اکبر ماچھی بول رہا ہوں۔تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔'' بولنے والے نے بات جاری رکھی۔ ''استاد کو کسی نے گولی داغ کر اوپر پہنچا دیا ہے۔ہمارے دو ساتھی اور بھی مارے گئے ہیں۔''

''تمہارا شبہ کس پر ہے؟'' جونی، ناگی کے قتل ہونے کی اطلاع پر اس طرح چونکا جیسے اس کے ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے ہوں۔

''ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس مرڈر کے پیچھے کوئی بڑا ہاتھ ضرور شامل ہے۔تم کو اس لیے اطلاع دے رہا ہوں کہ اب دائیں بائیں دیکھ کر ہی قدم اٹھانا۔'' دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

جونی کے ذہن میں ایک بار پھر مس ڈکسن کے آخری جملوں کی گونج ہو رہی تھی جب شیلا ورما نے خوابیدہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''جو...... جونی تم اتنی دور کیوں ہو؟''

''ابھی میرے موبائل پر ایک کال آئی تھی۔''

''نان سنس۔'' شیلا ورما نے نشیلی آنکھیں کھول کر جونی کو دیکھا پھر قریب ہو کر اس کو اپنے ہاتھوں کے حصار میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے جھنجلا کر بولی۔ ''اس وقت کوئی اور بات مت کرو۔''

''اکبر ماچھی کا فون آیا تھا۔ ناگی اور اس کے دو ساتھیوں کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''کیا!'' شیلا ورما نے بھی ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''تم مذاق تو نہیں کر رہے؟''

''تم چاہو تو اپنے شاہ جی کو فون کر کے حقیقت معلوم کر لو۔''

''نہیں...... میں اس وقت سکندر علی شاہ کو فون نہیں کروں گی لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ناگی کی پشت پر اسی کا مضبوط ہاتھ تھا پھر...... قتل کرنے والے کون تھے؟''

''میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اس وقت تمہیں سنجیدگی سے ایک مشورہ ضرور دوں گا۔''

''کیا؟''

''ماہر ترین ملاح بھی ہوا کا رخ بھانپ کر اپنی کشتی کنارے کے قریب لے آتے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''مستقل نہ سہی لیکن وقتی طور پر تم بھی صرف بیوٹی پارلر کی حد تک محدود ہو جاؤ۔''

شیلا ورما نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن چہرے کے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ ناگی کے قتل کی اطلاع نے اسے بھی اندر سے جھنجوڑ دیا ہے۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' جونی نے دبی زبان میں اسے کریدنے کی کوشش کی۔

''ناگی کا قتل سکندر علی شاہ کے لیے بھی ایک کھلا چیلنج ہے۔''

''ہاں۔'' جونی کچھ توقف سے بولا۔ ''اگر اس قتل کے پیچھے شاہ جی کا ذاتی ہاتھ......''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' شیلا ورما نے جونی کی بات درمیان سے اچک کر کہا۔ ''وہ شاہ جی کا خاص مہرہ تھا۔''

''یہ بھی جانتا ہوں لیکن شطرنج کا ماہر کھلاڑی کبھی کبھی ڈھائی گھر چلنے والے گھوڑے کو بچانے کی خاطر وزیر کو پٹوا دیتا ہے۔ سیاست کے میدان میں بھی اسی اصول کو اپنانے والا کامیاب رہتا ہے۔''

''آں...... ہاں۔'' جواب ہچکچا کر دیا گیا۔ ''یہ بھی ممکن ہے لیکن اس کا تعلق بیوٹی پارلر کے دوسرے دھندوں سے کیا ہو سکتا ہے؟''

''ہر فساد کے پیچھے زر، زن اور زمین میں سے کسی نہ کسی کا تعلق بھی ضرور ہوتا ہے۔'' جونی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم نگینہ کی موت کو کیوں بھول رہی ہو؟ ریمبو کلب سے اغوا کیے جانے کے بعد وہ جس حالت میں گھر واپس آئی تھی اس کی تفصیل بھی تم ہی نے بتائی تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن نگینہ اور ناگی کی حیثیتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔''

''کبھی کبھی انسانی خواہشات بھی اس فرق کو مٹا دیتی ہیں۔'' جونی نے کھنچاؤ کی فضا کو دور کرنے کی خاطر مسکرا کر جواب دیا پھر اس نے شیلا ورما کو جن نظروں سے دیکھا اس نے اس کی بات کا مفہوم بھی واضح کر دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' شیلا نے ادائے خاص سے اسے گھورا۔ ''کیا تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو؟''

''صرف خوش نہیں...... بہت زیادہ مطمئن بھی ہوں۔'' جونی کی نظریں شیلا ورما کے گداز جسم پر بھٹکنے لگیں۔

''پھر بھی اتنی دور بیٹھے ہو۔'' شیلا ورما نے ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر نشیلی نظروں سے جونی کو دیکھا تو جونی نے بے اختیار ہو کر پھر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

وقت کے بہاؤ میں ڈوب کر جونی مس ڈکسن کے ایک آخری مشورے کو پھر بھول گیا۔

☆☆☆

سکندر علی شاہ خاصی دیر تک اپنی خواب گاہ میں ٹہلتا رہا۔ بار بار اس کی نظریں خالی بستر کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ اسے نگینہ کی موت کا غم نہیں بلکہ خوشی ہوئی تھی مگر وہ بستر پر تنہا سونے کا عادی نہیں تھا۔ چاہتا تو دلربا کے پاس چلا جاتا جسے ہوٹل سے ایک علیحدہ رہائش گاہ پر منتقل کر دیا تھا۔ اس کے لیے دو تین گارڈز کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ یہ سب کام اس نے بہت رازداری سے کیے تھے تاکہ کسی کو اس کی بھنک تک نہ ملے۔ رات گئے وہاں جانے اور علی الصباح واپسی کی صورت میں گارڈ کو بھی دلربا اور اس کے تعلقات پر شبہ ہو سکتا تھا۔ بہت دیر تک وہ ذہنی طور پر الجھتا رہا پھر پہلی بیوی کے کمرے کی جانب چلا گیا۔

گل اپنے بستر پر لیٹ چکی تھی لیکن شوہر کو آتا دیکھ کر مشینی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ سکندر علی شاہ نے گل کو ایک نظر دیکھا پھر آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ گل قریب آ کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

''تم......'' سکندر علی شاہ نے مدھم لہجے میں پوچھا۔ ''نیچے کیوں بیٹھ گئیں؟''

''مجھے آپ کے قدموں میں زیادہ سکون ملتا ہے۔'' گل نے بڑی عقیدت سے جواب دیا پھر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''گھر سے رخصتی کے وقت ماں نے جو جملے کہے تھے وہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس نے کہا تھا تم ڈولی میں بیٹھ کر اپنے گھر جا رہی ہو وہاں سے تابوت میں لیٹ کر ہی واپس نکلنا۔''

''گل......!'' سکندر علی شاہ نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

''پلیز...... ایسا نہ کہیں۔'' وہ تیزی سے اٹھ کر شوہر کے برابر بیٹھ گئی۔ پہلی بار خود اس کے شانوں سے لگ کر بڑی حسرت سے بولی۔ ''آپ کی کوٹھی میں تنہا بستر پر لیٹ کر بھی مجھے جو سکون ملتا ہے دنیا میں کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس سکون پر صرف اور صرف میرا حق ہے جو میں کسی اور کو نہیں دے سکتی۔''

سکندر علی شاہ ان پُرخلوص جملوں کی گرمی سے کسی موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اس نے گل کو ایک نظر بھر کر دیکھا پھر اسے لے کر بستر پر آ گیا۔ بانہوں میں لٹا کر بڑی دیر تک محبت بھری باتیں کرتا رہا۔ گل کو ان قیمتی لمحات پر رشک آ رہا تھا جب موبائل پر سگنل ملا۔ سکندر علی شاہ نے اسے آن کر کے سنجیدگی سے کہا۔

''ہیلو...... میں......''

محبت

یہ جون 1999ء کا واقعہ ہے۔ برطانیہ کے شہر مانچسٹر میں واقع لڑکیوں کے ایک اسکول میں تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ موضوع تھا ''مشہور مذہبی شخصیت'' اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک بچی نے حضور ﷺ کی شخصیت کو اپنی تقریر کا موضوع بنایا۔ اپنی تقریر کے دوران یہ بچی جب بھی لفظ ''محمد'' ادا کرتی تو غیر ارادی طور پر ﷺ نہ کہتی۔ کلاس میں بیٹھی ایک بچی کو یہ حرکت نہایت ہی ناگوار گزری۔

اس لڑکی کی اس حرکت کو ایک دفعہ برداشت کرنے کے بعد اس بچی سے رہا نہ گیا۔ وہ اچانک اپنی نشست سے اٹھی اور زوردار آواز میں بے اختیار پکارا۔

صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم، صلی اللہ علیہ وسلم ...

ہال میں سناٹا چھا گیا۔ اسکول کی تاریخ میں پہلی بار کسی نے نظم و ضبط کی خلاف ورزی کی تھی۔ بچی کو فوری طور پر ہال سے نکال دیا گیا۔ یہودی و عیسائی اساتذہ اور ماہرین نفسیات پر مشتمل بورڈ نے بچی سے متعدد سوالات کیے اور اس سے اس بے ساختہ حرکت کے بارے میں پوچھا۔ بچی نے ہچکیوں اور سسکیوں میں ایمان افروز جواب دیا۔

''جب کوئی ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا اسم گرامی استعمال کرتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ﷺ ادا کرے۔ میں اس پر سمجھوتا نہیں کر سکتی۔ حضور ﷺ کا اسم گرامی سن کر ﷺ کہنا میرا ایمانی و دینی حق اور فریضہ ہے۔ اس فریضے کی ادائیگی سے مجھے ڈسپلن کے نام پر نہیں روکا جا سکتا۔''

یوں روح کی تسکین کا سامان کریں گے
ایمان کے لیے جان کو قربان کریں گے

مرسلہ: طالب حسین طلحہ، نیو سینٹرل جیل، ملتان

"جانتا ہوں کہ تم سکندر علی شاہ بول رہے ہو۔" دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔ "تم نے دلربا کو ہوٹل سے کہاں منتقل کیا ہے؟"

"کسی ایسی جگہ جہاں کوئی دوسرا اس پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔"

"شکرہ کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں سے بھی اپنے شکار پر مرکوز رہتی ہیں۔ میں اس بات سے بھی واقف ہوں کہ دلربا کو تم نے اب کہاں رکھا ہے۔" سکندر علی شاہ نے جواب نہیں دیا دانت پیستا رہا۔

"میں نے ناگی کے سلسلے میں بھی تم سے کہا تھا کہ اسے محتاط رہنے کی وارننگ دے دو۔"

"میں نے اسے ہدایت کردی تھی۔" جواب بے زاری سے دیا گیا۔

"جانتے ہو کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟" سرد لہجے میں دریافت کیا گیا۔

"نہیں۔"

"اسے بھی نگینہ کے پاس روانہ کردیا گیا ہے۔ بستی والوں کو بھی اس کی اطلاع بعد میں ملی۔"

"ناگی کے قتل میں کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے؟" سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"یقین سے ابھی نہیں بتا سکتا لیکن زیادہ دیر وہ بھی پردے میں نہیں رہ سکے گا۔ میں نے تمہیں یہی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

"کسے قتل کردیا گیا؟" گل نے دبی زبان میں دریافت کیا۔

"تھا میرا ایک خاص بندہ۔" سکندر علی شاہ نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر کچھ توقف کے بعد اس نے اورنگ زیب کے نمبر کو ڈائل کیا۔

"خادم بول رہا ہوں۔" ایک لمحے بعد دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز ابھری۔

"خادم نہیں بھائی۔" سکندر علی شاہ نے اپنایت سے کہا۔

"اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"میرا ایک خاص بندہ کہیں گم ہوگیا ہے۔ سوچا کہ آپ کے ذریعے اسے تلاش کروں۔"

"آپ شاید ناگی کی بات کررہے ہیں؟" دوسری جانب سے بات جاری رکھی گئی۔ "اسے ساحلی علاقے میں مچھیروں کی قدیم بستی میں کسی نے قتل کردیا ہے۔ دو لاشیں اور بھی ملی ہیں۔ بستی کے سردار نے انہیں ناگی کے ساتھی قرار دیا ہے۔"

"آپ میرا ایک کام کرسکیں گے؟"

"حکم دیں، میں انکار نہیں کروں گا۔"

"مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔" سکندر علی شاہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ناگی کے قتل کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟"

"آپ کا شبہ کس پر ہے؟"

"ناگی میرا خاص خادم تھا یہ بات سب جانتے ہیں۔" سکندر علی شاہ نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "اور ناگی کو راستے سے ہٹانے میں بھی کسی آستین کے سانپ کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں علاقے کے تھانے کو ضروری ہدایت دے دیتا ہوں۔ جیسے ہی قاتل بے نقاب ہوا اس کی اطلاع پہلی فرصت میں آپ کو مل جائے گی۔"

"پیشگی شکریہ۔" سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے ساتھ سلسلہ ختم کردیا۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کے بادل منڈلانے لگے تھے۔

"میں آپ کے لیے کافی بنا کر لاتی ہوں۔" گل نے بڑی اپنایت سے کہا۔ "کوئی پریشانی لاحق ہو تو کافی بھی سکون پہنچانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔"

"کافی سے زیادہ عورت کا قرب بھی مرد کے لیے بڑا پرسکون ہوتا ہے۔"

سکندر علی شاہ نے جواب دینے کے ساتھ ہی گل کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ گل کو شوہر کا وہ انداز اپنا نہیں بلکہ اجنبی اجنبی سا محسوس ہوا لیکن اس نے خودسپردگی میں کسی پس و پیش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گل کو آغوش میں لینے کے بعد بھی سکندر علی شاہ کے ذہن میں ایک ہی شبہ کسی بچھو کی طرح ڈنک مارتا رہا۔

"دلربا کے اغوا کی اطلاع بھی پہلے شکرہ نے دی تھی پھر اورنگ زیب نے اس کی تصدیق کی تھی۔ ناگی کے قتل کے بارے میں بھی شکرہ نے ازخود فون کر کے اسے خبر دی۔ جس کے بعد ایس پی اورنگ زیب نے ہی اس کی تصدیق کردی۔ شکرہ اور اورنگ زیب کیا ایک ہی تصویر کے دو مختلف رخ ہیں یا ان کے درمیان کوئی گہرا تعلق بھی ہے؟

☆☆☆

فرحین کا تعلق جہانگیرہ کے ساتھ والے گاؤں "نودیہ نوے کلی" سے تھا جسے جہانگیرہ کا ایک حصہ ہی سمجھا جاتا تھا

اس لیے کہ دونوں کا درمیانی فاصلہ محض ایک کلومیٹر یا اس سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

فرحین ماں باپ کی چہیتی تھی لیکن ماں نے اسے شروع ہی سے کھانا پکانے اور سینے پرونے کی معقول تربیت بھی خصوصی طور پر دی تھی۔ فرحین کو مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بہت پسند تھا جسے وہ بے حد شوق سے پکاتی تھی۔ اس معاملے میں بھی اس کی اور لیاقت حسین کی پسند ایک ہی تھی۔

شہر آنے کے بعد بھی وہ اکثر چھٹی والے دن یہی کھانا پکاتی تھی۔ ایک دن وہ ڈرتے ڈرتے ایک پلیٹ میں ایک روٹی اور ساگ لے کر راحیلہ کے بنگلے میں چلی گئی تھی۔ راحیلہ بیگم کا تعلق جس سوسائٹی سے تھا وہاں گاؤں کی وہ ڈش ایک نئی چیز تھی۔ راحیلہ بیگم نے فرحین کا دل رکھنے کی خاطر اس کے اصرار پر ایک لقمہ بنا کر کھا لیا پھر اس کا ذائقہ جب منہ کو لگا تو وہ آدھی پلیٹ کھا گئیں۔ آدھی شوہر کے لیے رکھ دی۔ اس دن کے بعد سے وہ اکثر فرحین سے فرمائش کر کے اس ڈش کو پکوانے لگیں۔

آج بھی فرحین راحیلہ بیگم کے کچن میں کھڑی سرسوں کا ساگ بنارہی تھی جب اسے لیاقت حسین کی یاد بڑی شدت سے آئی۔ لیاقت حسین کو سراج کی طرف گئے تین چار دن ہی ہوئے تھے۔ اس کے فون برابر آتے رہتے تھے لیکن اس وقت ہانڈی پکاتے ہوئے اسے وہ دن یاد آگئے جب شادی سے پہلے وہ اور لیاقت حسین کہیں چوری چھپے بیٹھ کر اس کھانے کا مزہ لیتے تھے۔

فرحین نے کچن کے دروازے کے قریب آکر باہر جھانکا۔ راحیلہ بیگم شاید اپنے کمرے میں تھیں۔ میدان صاف دیکھ کر فرحین نے موبائل پر لیاقت حسین سے رابطہ کیا۔ جب لیاقت حسین نہیں ہوتا تھا تو راحیلہ بیگم اسے ایکسی کے بجائے اپنے بنگلے پر روک لیتی تھیں۔ لیاقت حسین سے دوری کے یہ دو چار دن بھی فرحین کو زہر لگتے تھے۔ اس کا اندازہ لیاقت حسین کو بھی تھا۔

"خیریت؟" دوسری جانب سے لیاقت حسین کی تعجب بھری آواز ابھری۔ "اس وقت کیسے یاد کیا؟"

"کیا مطلب؟" فرحین نے فرضی ناراضی کا اظہار کیا۔ "کیا اب تجھ سے بات کرنے کے لیے وقت لینا پڑے گا؟"

"ناراض نہ ہو لیاقت کا جان۔" لیاقت حسین نے جواب دیا۔ "تیرے بغیر یہاں میرا دل بھی نہیں لگ رہا لیکن سراج صاحب اور اورنگ زیب صاحب کے جو احسان ہیں میں اس کی وجہ سے ان کے کسی حکم سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔"

"چل چھوڑ ان باتوں کو۔" فرحین نے بڑی لگاوٹ سے کہا۔ "میں اس وقت بیگم صاحبہ کے کچن سے بول رہی ہوں۔ اب تجھے یہ بوجھنا ہے کہ میں کچن میں کیا پکا رہی ہوں؟"

"بیگم صاحبہ کے کچھ مہمان آگئے ہوں گے ان کے لیے ناشتا بنا رہی ہوگی۔"

"نہیں۔" فرحین نے مدھم لہجے میں جواب دیا۔ "ایک اور خاص بات ہے۔"

"سمجھ گیا۔" لیاقت حسین نے بڑے رومانی انداز میں جواب دیا۔ "کچن میں بیٹھ کر تو مجھے یاد کررہی ہوگی۔"

"وہ تو میں ہر وقت، ہر جگہ کرتی ہوں۔"

"پھر......اور کیا خاص بات ہے؟"

"وہ جگہ یاد کر لیاقت حسین جب شادی سے پہلے ہم بڑوں کی نظروں سے چھپ کر دوپہر کو ملتے تھے۔ کبھی کبھی ایک ساتھ دوپہر کا کھانا بھی......"

"مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بنارہی ہے۔" لیاقت حسین نے جملہ کاٹ کر کچھ ایسے انداز میں کہا کہ فرحین کو بھولے بسرے دنوں کی یاد آگئی۔ منہ بنا کر بولی۔

"بیگم صاحبہ کی فرمائش تھی اس لیے مجبوراً بنارہی ہوں لیکن تیرے بنا ایک نوالہ بھی میرے لیے زہر ہوگا۔"

"دیوانی ہوگئی ہے۔" لیاقت حسین نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "بیگم صاحبہ اور صاحب کیا سمجھیں گے۔"

"جو جی میں آئے سمجھیں لیکن میں نے جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔"

اسی وقت باہر سے راحیلہ بیگم کی آواز سنائی دی تو فرحین موبائل بند کر کے باہر آگئی۔ باہر لاؤنج میں راحیلہ بیگم موجود تھیں۔ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

"جانتی ہو فرحین میں نے آج مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ کیوں تیار کروایا ہے؟"

"کوئی خاص بات ہے؟" فرحین نے راحیلہ بیگم کو وضاحتی نظروں سے دیکھا۔

"ہاں آج میری شادی کی سالگرہ کا دن ہے جسے عثمان اکثر بھول جاتے ہیں۔"

"فکر ہی نہ کریں۔" فرحین نے بڑی اپنایت سے کہا۔ "میں کسی نہ کسی بہانے صاحب کو یاد کروا دوں گی۔"

"لیاقت حسین کو یاد رہتا ہے تمہاری سالگرہ کا دن؟"

"وہ......وہ تو دو تین دن پہلے ہی مجھے چھیڑنا شروع کردیتا ہے۔" فرحین نے لجا کر کہا پھر جلدی سے بات گھما کر

بولی۔ ”صاحب تو آپ کو اس موقع پر کوئی قیمتی تحفہ بھی ضرور دیتے ہوں گے؟“

”ہاں ہم دونوں ایک دوسرے کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتے ہیں۔“ راحیلہ بیگم نے کہا۔ ”پہلے باقاعدہ دوستوں کو بھی بلایا کرتے تھے لیکن اب ادھر دو تین سالوں سے یہ سلسلہ بھی بند کردیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ سالگرہ کا دن میاں بیوی کو اکیلے میں منا کر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ بلاوجہ کا ہنگامہ ہوتا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، لیاقت بھی ایسا ہی کرتا ہے۔“

”تم نے لیاقت کا نام اچھا یاد دلایا۔“ راحیلہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔ ”آج مجھے اس وقت اس سے ایک ضروری کام بھی ہے۔“

”آپ یا صاحب فون کریں تو بھاگا چلا آئے گا۔“

”اور اگر تم فون کرو تو انکار کردے گا؟“

”پتا نہیں۔“ فرحین نے معصومیت سے جواب دیا۔

”غلط خیال ہے۔“ راحیلہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے کو کتنا پیار کرتے ہو۔ لیاقت تمہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔“

”آپ نے اسے بھائی بنالیا ہے اس لیے ایسا کہہ رہی ہیں ورنہ سارے مرد ایک جیسے بھی نہیں ہوتے۔“

”یہ بات تم دل سے کہہ رہی ہو؟“

”دل کی بات ہر ایک کو نہیں بتانی چاہیے۔“ فرحین نے شوخی سے کہا۔ ”لیاقت کہتا ہے کہ اس سے دوسروں کی نظر لگ جاتی ہے۔“

”اور اگر کوئی دل کی بات زبان سے سن لے تو؟“ اس بار راحیلہ کا لہجہ معنی خیز تھا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ فرحین نے چونک کر پوچھا۔

”بیگم صاحبہ کی فرمائش تھی اس لیے مجبوراً مکئی کی روٹی اور سرسوں کا ساگ بنارہی ہوں لیکن تیرے بنا ایک نوالہ بھی میرے لیے زہر ہی ہوگا۔“ راحیلہ بیگم نے فرحین کا موبائل پر کہا ہوا جملہ دُہرایا تو فرحین کا چہرہ تپ کر گلنار ہوگیا۔ بے اختیار وہ راحیلہ بیگم کے پہلو ہی میں سمٹ کر رہ گئی۔

☆☆☆

لوچن اس وقت ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے تھرڈ فلور پر صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ٹی اسکرین پر تھیں لیکن ذہن میں ایک ہی نام رہ رہ کر گونج رہا تھا۔ شیخ حامد...... اس نام کے پس منظر میں دو نام اور بھی تھے۔ ڈوما، جس کا تعلق بیروت سے تھا اور ہاشم جو جنوبی افریقا کے ایک قبیلے کا پراسرار فرد تھا۔ لوچن سے ان دونوں کی ملاقات ہوائی جہاز پر ہوئی تھی۔ لوچن کی طرح ان دونوں کا تعلق بھی انڈر ورلڈ کے ان نامی گرامی لوگوں میں سے تھا جن کی لغت میں ناکامی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ان تینوں کو ایک بہت بڑی اور منہ مانگی قیمت پر ہائر کیا گیا تھا۔ کس نے ہائر کیا تھا اس کا علم ان تینوں میں کسی ایک کو بھی نہیں تھا۔ صرف ایک مخصوص کوڈ سیون اسٹار بتایا گیا تھا جس پر ملنے والی ہدایات پر انہیں عمل کرنا تھا۔ ان کو ایک ہی ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ شیخ حامد کو کسی بھی طرح موت کے گھاٹ اتارنا۔ شیخ حامد کوئی عام آدمی نہیں تھا، اس کا شمار بھی ڈان گروپ کے خطرناک ترین افراد میں کیا جاتا تھا۔

پھر اس جنگ میں ڈوما اور ہاشم دونوں ہی کام آگئے تھے لیکن شیخ حامد ایک بار مردہ مشہور ہونے کے بعد پھر زندہ ہوگیا تھا مگر اس طرح انڈر گراؤنڈ ہوکر رہ گیا تھا کہ اس کا سراغ لگانا لوچن کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اس کے معاہدے کی مدت بھی ختم ہورہی تھی جسے سیون اسٹار کی جانب سے بڑھانے کی پیشکش بھی ہوئی تھی مگر لوچن نے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ وہ ذاتی طور پر بھی شیخ حامد یا آکٹوپس کو اپنے لیے چیلنج سمجھتا ہے اور اس مشن کو پورا کیے بغیر واپس نہیں جائے گا۔

اس وقت بھی لوچن کا ذہن شیخ حامد کی موت کی پلاننگ میں مصروف تھا۔ اس کا ذاتی خیال تھا کہ سکندر علی شاہ اور شیخ حامد کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ضرور ملتے ہیں۔ فارم ہاؤس ایسی جگہ تھی جہاں شیخ حامد روپوش ہوسکتا تھا لیکن کس حیثیت میں؟ اس سوال کے جواب کے بغیر لوچن کے لیے ادھر کا رخ کرنا مناسب بھی نہیں تھا۔ وہ مختلف زاویوں پر غور کررہا تھا جب دروازے پر کسی نے دستک دی۔ لوچن کسی آدم خور چیتے کی طرح چونکا شاید اس لیے کہ وہ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنے کا عادی تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کی ہول سے باہر جھانکا۔ دروازے پر ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی۔

”کون ہے؟“ لوچن نے کھردرے لہجے میں سوال کیا۔

”روم ہوسٹیس۔“ مختصر جواب ملا۔

لوچن نے اس حوالے پر دروازہ کھول دیا۔ کمرے کی صفائی اور بیڈ شیٹس کا بدلنا معمول کی بات تھی جس کی خاطر ہوٹل کی لڑکیاں آتی جاتی رہتی تھیں لیکن آنے والی لڑکی کو دیکھ کر لوچن کے ذہن میں ایک شبہ سا ابھرا۔ اس کی وجہ

شاید یہ تھی کہ اس لڑکی کے شانوں پر ہوسٹیس کا مخصوص بیج نہیں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ لڑکی نے اندر آکر لوچن کو بھرپور نظروں سے دیکھا تھا پھر کمر کو بل دیتے ہوئے آگے بڑھ کر خالی صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ لوچن نے حفظِ ماتقدم کے طور پر دروازے کو اندر سے لاک کیا پھر لڑکی کے سامنے آکر خشک لہجے میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”ہوسٹیس ہی سمجھیں۔“ لڑکی بے شرمی سے مسکرائی۔ ”آپ دو روز سے یہاں مقیم ہیں اس لیے میں یہ سوچ کر آگئی کہ شاید آپ کو کسی ساتھی کی ضرورت ہو۔“

”کال گرل ہو؟“ لوچن کی پیشانی شکن آلود ہونے لگی۔

”یہی سمجھ لیں۔“ لڑکی نے اس بار ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر جواب دیا۔

”گیٹ لاسٹ۔“ لوچن نے حقارت سے اسے دھتکارا۔ ”میرا وہ ٹائپ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ میں تمہاری شکایت براہ راست ہوٹل مینجمنٹ سے کروں گا۔“

”اتنی بھی کیا بے مروتی۔“ لڑکی نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہارا ٹائپ کیا ہے میں نے سن لیا مگر کیا ایک کپ کافی کو بھی نہیں پوچھو گے؟“

”نہیں۔“ لوچن کے تیور اور جارحانہ ہوگئے۔ ”وقت مت ضائع کرو ورنہ میں تمہیں بالکونی میں لے جاکر نیچے پھینکنے سے بھی گریز نہیں کروں گا۔ آؤٹ ڈرٹی بِچ۔“ آخری جملہ لڑکی کے لیے کھلا چیلنج تھا مگر وہ اس طرح مسکرائی جیسے اس جملے کا اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

لوچن ایک خوب صورت اور بے غیرت لڑکی کے ساتھ بات بڑھا کر ہوٹل میں تماشا بھی بن سکتا تھا۔ اس نے لڑکی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر بستر کے قریب میز پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر براہ راست منیجر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن فون کی لائن ڈیڈ تھی۔ وہ جھلا کر لڑکی کی طرف پلٹا جو نہایت پھرتی سے خود کو عریاں کرچکی تھی۔ یہ صورت حال دیکھ کر لوچن کا خون کھول اٹھا۔ اس نے لپک کر لڑکی کا ہاتھ تھاما اور گھسیٹ کر دروازے تک لے آیا لیکن پھر جو کچھ ہوا اس نے لوچن کو بھی بوکھلا دیا۔

دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر ہوٹل کے منیجر اور ایک باوردی اے ایس آئی پر پڑی۔ لڑکی نے ایک دم ہی چلّانا شروع کردیا۔ لوچن کی طرف اشارہ کرکے ہذیانی انداز میں بولی۔

”یہ...... یہ جنگلی مجھے زبردستی اپنے کمرے میں گھسیٹ لایا۔ اس کی نیت اچھی نہیں تھی۔“

”شی از...... نان سنس۔“ لوچن نے جھنجلا کر اے ایس آئی سے کہا پھر منیجر سے کچھ کہنا چاہتا تھا جب اے ایس آئی نے انتہائی کرخت انداز میں کہا۔

”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کس جرم میں؟“ لوچن نے تلملا کر سوال کیا۔

”اس لڑکی کی سہیلی نے باقاعدہ تھانے میں رپورٹ درج کروائی ہے کہ تم نے اس وقت اسے پکڑ کر کمرے میں گھسیٹ لیا جب یہ اپنے کسی مہمان سے ملنے آئی تھی۔“

”یہ...... یہ بکواس کرتی ہے۔ شی از اے پراسٹی ٹیوٹ۔“

”پلیز مسٹر لوچن۔“ منیجر شائستہ مگر سرد لہجے میں بولا۔ ”یہ ہمارے ہوٹل کی عزت کا بھی سوال ہے۔ آپ پولیس کے ساتھ تعاون کریں۔ کیا سچ ہے کیا جھوٹ اس کا فیصلہ اب پولیس کرے گی۔“

”ڈونٹ وری منیجر۔“ اے ایس آئی نے منیجر سے کہا۔ ”میں تمہارے ہوٹل کی بدنامی کی وجہ سے وین لایا ہوں۔“

لڑکی بدستور اے ایس آئی کے قریب اس طرح سہمی کھڑی تھی جیسے وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہتی ہو۔ وہ جو بھی تھی پروفیشنل اداکارہ ہی لگ رہی تھی۔

”ٹریپ......!“ لوچن کے ذہن میں ایک فوری شبہے نے سر ابھارا۔ اس کے ساتھ کئی سوال اور بھی گونجنے لگے۔

لڑکی جس انداز میں آئی تھی وہ سو فی صد اس بات کی نشاندہی کررہا تھا کہ وہ کال گرل ہے۔ خود لڑکی نے بھی انتہائی بے شرمی سے اس کا اعتراف کرلیا تھا پھر جتنی دیر میں لوچن منیجر کو فون کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خود کو نیم عریاں بھی کرلیا تھا۔ فون کی لائن بھی خلاف توقع ڈیڈ تھی اور جب لوچن لڑکی کو دھکیلتے ہوئے کمرے سے باہر نکالنے کا ارادہ کرچکا تھا تو ہوٹل کا منیجر اور ایک اے ایس آئی اسے دروازے پر ہی ملے تھے۔ لوچن اتنے سارے اتفاقات کو بیک وقت ہضم کرنے کو تیار نہیں تھا۔

جو صورت حال درپیش تھی اس میں کئی جھول تھے جسے کم از کم لوچن جیسا جہاندیدہ شخص فوراً ہضم کرنے کو تیار نہیں ہوسکا۔ جن حالات سے وہ گزر رہا تھا اس میں بھی ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا اس کے پیشے کا تقاضا بھی تھا۔

”پلیز مسٹر لوچن۔“ منیجر نے اسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا پھر درخواست کی۔ ”آپ کا تعاون ہمارے ہوٹل کی ساکھ کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے میں ذاتی طور پر بھی آپ کا شکر گزار ہوں گا۔“

"یہ لڑکی فراڈ ہے۔" لوچن نے اس بار لڑکی کو خونخوار نظروں سے گھورا۔ "اس نے پولیس کو جو بیان دیا ہے وہ بھی فراڈ ہے۔"

"اس کا فیصلہ تھانے جا کر ہی......"

"نہیں پولیس آفیسر۔" لوچن نے اے ایس آئی کو بھی تیز لہجے میں مخاطب کیا۔ "میں تمہارے ملک کا ایک عام شہری نہیں ہوں جسے تم کسی بناوٹی ڈرامے میں بحیثیت مجرم پھانس لیتے ہو، میرا تعلق ایک غیر ملکی سفارت خانے سے ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں جناب۔" اے ایس آئی کا رویہ یکلخت تبدیل ہو گیا پھر بھی اس نے دبی زبان میں کہا۔ "یہاں بات اگر خراب ہو گئی تو......"

"میں نے بھی آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی سر۔" منیجر بھی سنبھل کر بولا۔ "ورنہ ہمیں بھی آپ کی حیثیت کا احساس ہے۔"

"اس ڈرٹی گرل کی جس فرینڈ نے تھانے میں شکایت کی تھی اسے بھی یہاں لاؤ۔" لوچن نے بہ دستور خفگی کا اظہار کیا۔ "میں اپنے وکیل کو کال کر دیتا ہوں۔ قانونی مشوروں کے بغیر میں کبھی کوئی قدم نہیں اٹھاتا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں مسٹر لوچن لیکن میں بھی اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کا پابند ہوں۔" اے ایس آئی نے معنی خیز انداز میں کہا۔

لوچن نے اس بار جواب دینے کے بجائے لڑکی کو حقارت سے گھورا پھر اس نے کمرے میں آ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ اس کا ذہن اس وقت بھی پیش آنے والی صورت حال کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ جس مشن پر تھا اس میں سرفہرست صرف ایک ہی نام تھا شیخ حامد، دی آکٹوپس۔

پندرہ سے بیس منٹ تک لوچن کا ذہن الجھتا رہا پھر اس نے کچھ سوچ کر جگا کے نمبر ملائے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے کمرے میں آنے والی لڑکی اور بعد کی تمام تفصیل ایک ہی سانس میں دُہرا دی۔

"تم نے ذاتی طور پر کیا اندازہ لگایا ہے؟" جگا نے پوری صورت حال معلوم کرنے کے بعد سوال کیا۔

"کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

"میرا مشورہ مانو تو پہلی فرصت میں اورنگ زیب صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو۔" جگا نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "جو صورت حال تم نے بیان کی ہے اس میں مجھے شروع سے آخر تک بارود ہی کی بو محسوس ہو رہی ہے۔"

"اوہ......تم شاید صحیح کہہ رہے ہو۔" لوچن نے پرخیال انداز میں جواب دیا۔

"یہ معاملہ نمٹ جائے تو موجودہ ہوٹل کی رہائش بھی فوری طور پر ترک کر دینا۔ وش یو آل دا بیسٹ۔" دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ لوچن نے جگا کے مشورے پر دوبارہ موبائل پر ایس پی اورنگ زیب کے نمبر پنچ کیے لیکن نمبر مصروف ہے کا ریکارڈڈ جواب سن کر جھلا گیا پھر اسے رابطہ قائم کرنے کا موقع نہیں ملا۔ دروازے پر ہونے والی دستک سن کر لوچن جھلا کر اٹھا۔ آنے والا وہی اے ایس آئی تھا لیکن اس بار اس کے ساتھ لڑکی یا منیجر کے بجائے ایک سوٹڈ بوٹڈ مرد نظر آیا جس نے آنکھوں پر مرکری گلاسز والا چشمہ لگا رکھا تھا۔ فرنچ کٹ ڈاڑھی اور قدرے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اس کی شخصیت بھی کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"آپ کی تعریف؟" لوچن نے نووارد پر ایک نظر ڈال کر اے ایس آئی سے سوال کیا۔

"یہ میرے بگ باس ہیں۔ منیجر کی درخواست پر آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

لوچن کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب نووارد نے کہا۔ "دروازے پر نہیں، اندر بیٹھ کر اطمینان سے گفتگو کرتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے جس لڑکی نے آپ کو ڈسٹرب کیا اس کا تعلق بھی ریڈ لائٹ ایریا ہی سے ہو گا۔"

کمرے میں داخل ہو کر نووارد بڑے سکون سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لوچن کی نظریں بہ دستور اس کی شخصیت کو کھوج رہی تھیں جب باوردی اے ایس آئی دروازہ بند کر کے نووارد کی پشت پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔" نووارد نے براہ راست لوچن کی پُرتجسس نظروں میں دور تک جھانکتے ہوئے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا، اس کے ساتھ ہی اس کا سیدھا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر آ گیا جس میں سائلنسر لگا ہوا اعشاریہ تین آٹھ کا پستول بھی موجود تھا۔

لوچن کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کسی مطلوبہ شخص کو پہچاننے میں غفلت سے کام لیا تھا۔ اس کے سارے تن بدن میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔

"تم......!" لوچن نے بڑے سکون سے نووارد کو دیکھا جو شیخ حامد کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"میں تم جیسے چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ لگانے کا عادی نہیں ہوں۔" شیخ حامد زہر آلود لہجے میں بولا۔ "ویسے بھی تمہارا وقت اب پورا ہو گیا، اوپر ڈوما اور ہاشم بھی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے......کبھی یاد آتی ہے ان کی؟"

لوچن نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ ہاشم اور ڈوما کے حوالے کے بعد اسے یقین آ گیا تھا کہ خوب صورت لڑکی کو بطور چارا استعمال کیا گیا تھا۔ موت اور زندگی کا کھیل کھیلتے اس کی عمر گزری تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے بھی دشمن کے جال میں پھنس سکتا تھا یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو پروفیسر چنگ لائی فارچون؟" شیخ حامد نے اس کا مذاق اڑایا۔ "اب ستاروں کی چال تمہارے کسی کام نہیں آئے گی۔"

"پستول ہاتھ میں ہو تو ہیجڑا بھی مرد بن جاتا ہے۔" لوچن نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "مرد ہو تو پنجہ لڑا کر دیکھ لو تمہیں بھی لوچن کی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا۔"

"تم ہوٹل سے باہر ہوتے تو تمہیں اس کا موقع بھی ضرور دیتا لیکن فی الحال میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔" شیخ حامد نے مسکرا کر جواب دیا۔ "حالات اور موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس وقت میں بھی تمہارے ہی پسندیدہ فارمولے کو تک ڈسپوزل کے فارمولے کو اپنانا پسند کروں گا، کیا خیال ہے؟"

لوچن نے جواب دینے کے بجائے پنجے کے بل بیٹھ کر کسی پھرکی کی طرح چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن اس کے ستارے گردش میں آ چکے تھے۔ اس کی حسرت دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ پستول سے نکلی ہوئی گولی اس کی گردن میں پیوست ہوئی تو وہ چکرا کر فرش پر لیٹ گیا۔

شیخ حامد سینہ تان کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے یکے بعد دیگرے مزید دو فائر کیے تو لوچن کے کو تک ڈسپوزل میں اسے کوئی دشواری بھی نہیں ہوئی۔

"یہ......یہ آپ نے کیا کیا؟" اے ایس آئی نے شیخ حامد سے کہا۔ "یہاں سے کسی لاش کا چوری چھپے ہوٹل سے باہر نکال کر لے جانا آسان نہیں ہو گا۔ میری آفیشل پوزیشن بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"فکر مت کرو، ہوٹل کے منتظمین تمہیں بھی لاش ہی کی صورت میں کسی نہ کسی طرح ٹھکانے لگانے کا بندوبست کر دیں گے۔ میں باوردی شکاری کتوں کو بھی زیادہ دیر نہیں پالتا۔"

جواب میں اے ایس آئی نے کچھ کہنا چاہا لیکن اسے مہلت نہیں ملی۔ شیخ حامد نے پستول کے میگزین کی باقی گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں پھر اطمینان سے قدم اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ ایک وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اورنگ زیب سے بات کر رہا تھا۔

"کوئی نئی اطلاع؟" دوسری جانب سے ایس پی کی آواز ابھری۔

"ہاں ......تمہارا ایک ٹرینی شکاری کتا مار دیا گیا۔" شیخ حامد نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ "میں لوچن کی بات کر رہا ہوں۔ اس کی اور تمہارے محکمے کے ایک بکاؤ غدار کی لاشیں اس وقت بھی شہر کے واحد فائیو اسٹار ہوٹل میں موجود ہیں۔ تم اپنے ذرائع سے بھی اس کی تصدیق کروا لو۔"

"میں جواب میں صرف ایک ہی بات کہوں گا۔" اورنگ زیب کی طرف سے سپاٹ اور خشک لہجے میں جواب ملا۔ "گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو وہ ہمیشہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔"

"دنیا اب بہت آگے نکل چکی ہے ایس پی اور تم ابھی تک گھسے پٹے محاوروں کو دُہرا رہے ہو۔"

"اس کے علاوہ اور بھی کوئی بکواس کرنی ہے؟" درشت انداز میں پوچھا گیا۔

"کچھ دن اور انتظار کر لو اس کے بعد تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ خشکی کا آکٹوپس سمندری آکٹوپس کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔" شیخ حامد نے بڑے سرد اور سفاک انداز میں جواب دیا پھر رابطہ بھی ختم کر دیا۔ اس وقت اس کی نگاہیں خون آشام درندوں ہی کے مانند چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

شبنم چائے کی ٹرے لیے کمرے میں آئی تو افضل خان اس وقت بھی اپنی کسی سوچ میں غرق تھا۔ شبنم نے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا لیکن وہ ادھر کچھ دنوں سے یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ افضل خان اچھی بھلی باتیں کرتے کرتے کسی سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔

"ہیلو......!" اس نے افضل خان کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ "میں بھی تمہارے ساتھ اس کمرے میں موجود ہوں۔"

جواب میں افضل خان نے معمول کے مطابق شبنم کو پیار بھری نظروں سے دیکھا پھر اس کی نظر ٹرے میں رکھے تازہ تیار کردہ کیک پر پڑی تو اس نے شبنم کو چھیڑنے کی

خاطر پوچھا۔

''آج یہ کس خوشی میں تیار کیا گیا ہے؟''

''بوجھو تو جانیں؟'' شبنم نے مسکرا کر کہا۔

''کوئی نیا مہمان......''

''بلی کو خواب میں چھیچھڑے۔'' شبنم شوخی سے بولی۔ ''تم مردوں کو شادی کے بعد ہمیشہ نئے نئے مہمانوں کے خواب آتے رہتے ہیں۔''

''قدرتی بات ہے۔'' افضل نے شبنم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنایت سے جواب دیا۔ ''انسان جب کوئی خواب دیکھتا ہے تو اس کی تعبیر کے بارے میں ضرور سوچتا ہے۔''

''او کے۔'' شبنم نے پیار سے کہا۔ ''ایک اشارہ دیتی ہوں۔ اس کے ذریعے بوجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کیک بھی کسی ایسے خواب کی تعبیر ہے جو پورا ہو گیا ہے۔''

''کوئی اتا پتا؟'' افضل خان نے بچوں کی طرح دریافت کیا۔

''پہلے کیک کاٹ لو ورنہ چائے بھی ٹھنڈی ہو جائے گی۔'' شبنم نے ٹرے سے چھری اٹھا کر افضل خان کی طرف بڑھائی۔ افضل خان کو اچانک یاد آ گیا کہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ جواب میں اس نے شبنم کا ہاتھ تھام کر کیک کاٹتے ہوئے بڑی رازداری سے کہا۔

''میں ہار گیا تم جیت گئیں لیکن یہ تقریب کیا صرف کیک کاٹنے تک محدود نہیں رہے گی؟''

''ایک شرط پر۔'' شبنم نے شوخی سے جواب دیا پھر چائے بناتے ہوئے اس نے افضل خان سے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ادھر کچھ دنوں سے بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہو جاتے ہو۔ کوئی خاص بات ہے؟''

''ہاں، ناگی کی موت۔'' افضل خان پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔

''ناگی کا شمار ہمارے دوستوں میں نہیں دشمنوں میں تھا۔'' شبنم نے پرتجسس انداز اختیار کیا۔ ''اور پھر ناگی کے لیے کرنل احتشام نے تمہیں آمادہ کیا تھا۔''

''ہاں، لیکن اس دن کسی نے ایک ایسی بات کہی تھی جس نے میری روح کو زخمی کر دیا۔''

''کون تھا وہ؟''

''جہانگیر بٹ عرف جگا۔'' افضل خان نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک موقع پر کسی دشمن نما دوست کے کہنے پر اسے گھیرنے کی کوشش کی تھی لیکن کسی کی مداخلت پر وہ بچ گیا تھا۔ ناگی کی موت سے کچھ دیر پیشتر اس نے اسی بات کا طعنہ دے کر مجھے وہاں سے نکل جانے کا موقع فراہم کیا تھا۔''

''اوہ۔'' شبنم یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ ''جگا کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں لیکن اتنا ضرور پتا ہے کہ وہ بااصول آدمی ہے اور تم جس شخصیت کا حوالہ دے رہے ہو اس نے ایک بار مجھے بھی تمہیں شکار کرنے کو کہا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم اس کے ملازم نہیں تھے۔''

''جانتا ہوں۔'' افضل خان نے سنجیدگی اختیار کر لی۔ ''یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے مجھے شیلٹر فراہم کرنے میں خاصا رسک بھی لیا تھا۔''

''صرف اس لیے کہ میڈم کی طرح مجھے بھی تم سے کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میڈم کے شوہر کے علاوہ اسی کمینے نے میرے سر سے ماں کا سایہ بھی چھین لیا تھا۔'' شبنم سرد آہ بھر کر بولی۔ ''میں نے اس کی فرم میں ملازمت بھی اسی وجہ سے اختیار کی تھی کہ کسی موقع پر ماں کی موت کا قرض چکتا کر دوں مگر مجھے کوئی مناسب موقع ہی نہیں مل سکا۔''

''فکر مت کرو۔'' افضل خان نے شبنم کا ہاتھ تھام کر بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس کے علاوہ مجھے بھی اس کی تلاش ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی ملا، میں اسے موت کے گھاٹ اتارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ بھی قدرت کا کھیل ہے کہ کل تک جو سینہ تان کر دندناتا پھرتا تھا آج چوروں کی طرح کونے کھدروں میں چھپتا پھر رہا ہے۔''

''جلد بازی میں یہ نہ بھول جانا افضل کہ اب تم تنہا نہیں ہو میرا مستقبل بھی تمہارے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔'' جواب میں افضل خان نے قریب کھسک کر شبنم کو اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا اور اس وقت شبنم کو ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے تپتی دھوپ میں اسے کوئی تناور اور سایہ دار درخت مل گیا ہو۔

☆☆☆

پچھلے دس پندرہ دنوں سے آنے والی تمام کالوں کو میڈم روبی کے بجائے لاؤنج میں رکھے ہوئے آپریٹر سیٹ پر براہ راست تھریسا ہی وصول کرتی تھی۔ ضروری کال اندر ملائی جاتی تھی جسے تھریسا مناسب سمجھتی تھی۔ اس نے میڈم سے اس تبدیلی کی وجہ دریافت نہیں کی تھی لیکن بدلتے حالات کے پیش نظر وہ سمجھ سکتی تھی کہ کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور تھی جس کے پیش نظر میڈم نے کرنل احتشام کو فون کر کے گھر کے تحفظ کی درخواست کی تھی۔ کرنل احتشام نے ملٹری کے کچھ کمانڈوز

بھی سادہ لباس میں تعینات کر دیے تھے۔ پولیس کی نفری بھی آنے جانے والوں پر نظر رکھتی تھی، صرف خاص خاص لوگوں کو اندر آنے کی اجازت دی جاتی تھی۔

تھریسا نے کبھی اس بات کی جرأت بھی نہیں کی تھی کہ وہ میڈم سے ان تبدیلیوں کی وجہ دریافت کرتی لیکن اس کے ذہن میں ایک خیال ضرور کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ ایک موقع پر تھریسا بھی اَن جانے دشمنوں کے ہاتھوں میں پھنس گئی تھی۔ جو افراد اس کی نگرانی پر مامور تھے وہ بھی اچھے قماش کے نہیں تھے۔ تھریسا کے سامنے وہ بیہودہ مذاق کیا کرتے، فحش حرکتیں کرتے لیکن وہ شاید گیدڑ تھے۔ اس بات کے منتظر تھے کہ پہلے شیر یا چیتا اسے شکار کر لے پھر وہ بھی اس کی آبرو کی تکا بوٹی کرنے میں دیر نہ کرتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ میڈم کی سفارش پر اسے باعزت طور پر واپس کر دیا گیا تھا۔

''وہ کون لوگ تھے؟ میڈم کی سفارش پر وہ پتھر سے موم کیوں پڑ گئے تھے؟ میڈم کا ان سے کوئی نہ کوئی تعلق تو ضرور ہوگا؟ اس تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ وہ کس بات کی لالچ تھی جس نے انہیں تھریسا کو چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور اب...... کیا مجبوری تھی جس نے میڈم کو صرف گھر تک محدود کر دیا تھا۔ اس نے فون کالز بھی ریسیو کرنی بند کر دی تھیں مکان پر کمانڈوز تعینات کروا دیے تھے!''

ان تمام باتوں کے پس منظر میں تھریسا کے ذہن میں صرف ایک ہی نام ابھرتا تھا، شیخ حامد۔ جو میڈم کے شوہر کا قاتل تھا۔ اسی سے انتقام لینے کی خاطر میڈم نے انڈر ورلڈ کے تین آدمیوں کی خدمات حاصل کی تھیں جنہیں سیون اسٹار کوڈ ورڈ سے احکامات جاری کیے جاتے تھے۔ ان تینوں میں سے دو مارے جا چکے تھے صرف لوچن باقی رہ گیا تھا جس نے معاہدے کی مدت میں توسیع کے لیے رقم لینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ یہ بھی کہا تھا کہ وہ بذات خود بھی اپنے دو ساتھیوں کا انتقام لیے بغیر واپس نہیں جائے گا لیکن اس کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ ضرور ہوا تھا جس نے میڈم کو بھی خود اپنے خول کے اندر بند رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ کیا بات تھی؟ اس وقت بھی تھریسا ان ہی خیالات سے الجھ رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔ تھریسا کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ دوسری گھنٹی کے بعد اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''میڈم سے بات کراؤ۔'' دوسری جانب سے بڑا تحکمانہ لہجہ اختیار کیا گیا۔

''آپ کا نام؟'' تھریسا نے مہذب لہجے میں سوال کیا۔

''وہی جس نے میڈم کی درخواست پر تمہیں برباد کیے بغیر واپس کر دیا تھا۔'' حقارت سے کہا گیا۔ ''کیا یہ حوالہ تمہارے لیے کافی نہ ہوگا؟''

تھریسا کے سارے وجود میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ جو حوالہ دیا گیا تھا وہ نامکمل ہونے کے باوجود بہت واضح تھا۔ تھریسا ہونٹ چبانے لگی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' بہ دستور خشک لہجے میں سوال کیا گیا۔

''میڈم اس وقت آرام کر رہی ہیں۔'' تھریسا نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''بیڈروم کا دروازہ بھی اندر سے بند ہے۔''

''میں جس دن اپنی ضد پر آ گیا اس روز سارے بند دروازے کھل جائیں گے۔'' دوسری جانب سے بیہودہ انداز میں کہا گیا۔ ''فی الحال اپنی میڈم کو ایک ضروری اطلاع دے دینا۔ اس کے آخری شکاری کتے کو بھی میں موت کے گھاٹ اتار چکا ہوں، میں لوچن کی بات کر رہا ہوں۔''

''مم...... میں کسی لوچن کو......''

''کھال سے باہر نکلنے کی کوشش دوبارہ نہ کرنا ورنہ تم بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔'' اس جملے کے اختتام کے ساتھ ہی دوسرے جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

تھریسا نے ایک طویل سانس لے کر فون کا ریسیور کریڈل پر واپس رکھ دیا۔ آنے والی کال اور لوچن کے حوالے سے اس کے ذہن میں پھر ایک ہی نام ابھرا...... شیخ حامد۔ کچھ لمحے وہ گم صم بیٹھی رہی پھر وہ میڈم کو آنے والے فون کے بارے میں بتانے کی خاطر اپنی جگہ سے اٹھی ہی تھی جب اس کی نظر الماس پر پڑی جو اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔

''آپ...... کب آئیں؟''

''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔'' الماس نے مسکرا کر کہا۔ ''تم فون پر باتیں کر رہی تھیں اس لیے میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کس کی کال تھی؟''

''میڈم کی۔'' تھریسا نے مختصر جواب دیا۔ ایک لمحے کو اس کے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ الماس کو آنے والی کال کی تفصیل بتا دے لیکن الماس تیز تیز قدم اٹھاتی میڈم کے کمرے میں چلی گئی جہاں میڈم روبی نے اس کا استقبال بڑے پرجوش انداز میں کیا تھا۔

''آج راستہ کیسے بھول گئیں؟''

''تم تیار ہونے میں کتنی دیر لگاؤ گی؟'' الماس نے

سوال کیا۔
''خیریت؟''
''کچھ شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے۔ سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لوں۔''
''اوہ۔'' میڈم نے شوخی سے پوچھا۔''کیا سراج بھائی نے کہیں لمبا ہاتھ مارا ہے؟''
''ارادہ تو تھا لیکن میرے درمیان میں آجانے سے اب رشتے کی نوعیت بھائی بہن جیسی ہوگئی ہے۔'' اس نے سرد آہ بھر کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔''بہ ظاہر تو یہی نظر آتا ہے، دلوں کا حال اللہ جانے۔''
''خدا ہی سمجھے تم سے۔'' میڈم نے مسکرا کر کہا پھر اس نے تیار ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ دونوں کمرے سے باہر آئیں تو تھریسا نے دبی زبان میں کہا۔
''میڈم، آپ کے لیے ایک کال آئی تھی لیکن میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''
''اچھا کیا۔'' میڈم نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر وہ الماس کے ساتھ باہر آگئی جہاں لیاقت حسین نے ان کو دیکھ کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔
بیس منٹ بعد الماس اور میڈم روبی شہر کے سب سے بڑے سپر اسٹور میں موجود تھیں۔ الماس نے ساتھ لائی فہرست نکال لی تھی۔ میڈم نے بھی دو چار روزمرہ کے استعمال کی چیزیں لے لیں پھر الماس کی نظر کاؤنٹر کی طرف اٹھی تو وہ شیلا ورما کو دیکھ کر چونکی۔ چونکنے کا سبب وہ لڑکی بھی جس کی عمر اٹھارہ سال کے پیٹے میں تھی۔ شیلا ورما اور لڑکی کے سامنے اچھا خاصا سامان جمع تھا۔ وہ پرس کھول کر بڑے بڑے نوٹ نکال رہی تھی۔ الماس نے کہنی مار کر میڈم روبی کو کاؤنٹر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا پھر دبی زبان میں پوچھا۔
''جانتی ہو یہ عورت کون ہے؟''
''ہاں، ہنی مون بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔'' میڈم نے سرسری جواب دیا۔''ایک دوبار میں بھی گئی تھی لیکن تم اسے اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟''
''میں اس کے ساتھ کھڑی اس معصوم لڑکی کے تباہ ہوتے ہوئے مستقبل کے بارے میں غور کررہی ہوں۔''
''کیا مطلب؟ کون ہے یہ لڑکی؟'' میڈم نے چونک کر دریافت کیا۔
''کوئی نیا شکار لگ رہی ہے۔'' الماس نے مدھم لہجے میں شیلا ورما کے مذموم کاروبار کے بارے میں مختصراً بتاتے ہوئے کہا۔''میرا بس چلے تو اس عورت کو پہلی فرصت میں گولی ماردوں۔ نہ جانے کتنی معصوم کلیوں کو پھول بنا چکی ہے۔''
''کیا اورنگ زیب صاحب اور سراج بھائی کو اس کے بارے میں نہیں معلوم؟'' میڈم نے سوال کیا۔
''بہت کچھ معلوم ہے لیکن وہ دونوں جوئے کے اڈوں اور عورت کے کالے کرتوتوں کے دھندوں میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ شاید اس لیے کہ ایسے کاروبار میں ملوث لوگوں کے تعلقات بہت اوپر تک ہوتے ہیں۔''
''پھر ہم تم بھی کیا کرسکتے ہیں۔'' میڈم نے سرسری جواب دیا لیکن اس کی نگاہیں بھی اسی لڑکی پر مرکوز تھیں۔
''جب لڑکیوں کے والدین نے خود انہیں کٹی پتنگ کی طرح ادھر ادھر ڈولنے کی آزادی دے رکھی ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا۔'' الماس نے تلملا کر کہا پھر میڈم کا ہاتھ تھام کر اسٹور کے دوسرے حصے کی طرف چلی گئی لیکن اس کے کچھ دیر بعد جو کچھ ہوا اس نے الماس اور میڈم کو بھی کاؤنٹر کے قریب آنے پر مجبور کردیا جہاں لیاقت حسین نے شیلا ورما کی گردن کو دبوچ رکھا تھا۔ گرفت اتنی مضبوط تھی کہ خود شیلا ورما کو بھی اپنا دم گھٹتا محسوس ہورہا تھا۔
''تم...... تم ادھر سے دفع ہوجاؤ۔'' لیاقت حسین نے لڑکی کو قہر آلود لہجے میں دھمکی دی تو وہ اپنا وینٹی بیگ اٹھا کر جلدی سے ہجوم میں گم ہوکر باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ سپر اسٹور کے دو ملازم لیاقت حسین کی گرفت سے شیلا ورما کو آزاد کروانے کی کوشش کررہے تھے جبکہ ہیڈ کانسٹیبل بھی دو سپاہیوں کے ساتھ ان کے قریب آگیا۔
''چھوڑ دو خاتون کو۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔''ورنہ تمہارا بھی تھانے لے جاکر حشر نشر کردیں گے۔''
''نہیں چھوڑوں گا اس ناگن کو۔'' لیاقت حسین نے چیخ کر کہا۔''یہ بےشرم عورت لڑکیوں کا دھندا اور جعلی کرنسی کا کاروبار کرتی ہے۔ اس وقت بھی اس کے پرس میں جعلی کرنسی ہی موجود ہے۔''
حالات جو صورت اختیار کررہے تھے اس نے الماس کو بھی پریشان کردیا۔ وہ کسی طرح ہیڈ کانسٹیبل سے رابطہ کرکے اسے اپنے اور لیاقت حسین کے بارے میں بتانا چاہتی تھی لیکن ہجوم کی وجہ سے وہاں تک اس کی پہنچ ممکن نہیں تھی لیکن میڈم روبی نے پہلی فرصت میں سراج کو موبائل پر آگاہ کردیا جس کے کچھ دیر بعد سپر اسٹور کی انتظامیہ بھی حرکت میں آگئی۔ لیاقت حسین اور شیلا ورما کو سپر اسٹور کا مالک اپنے آفس میں لے گیا۔ میڈم روبی نے

الماس کو فون کی بابت بتایا تو وہ مطمئن ہو کر باہر آ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے کچھ دیر بعد لیاقت حسین بھی آ گیا جس کے چہرے پر بہ دستور سنجیدگی طاری تھی۔ الماس نے اس وقت اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا لیکن میڈم روبی نے اپنے گھر پر گاڑی سے اترنے سے پہلے لیاقت سے دبی زبان میں پوچھ ہی لیا۔

''لیاقت حسین تم نے شیلا ورما کے بارے میں یہ بات یقین سے کیسے کہی تھی کہ اس کے پرس میں جعلی کرنسی موجود ہوگی؟''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔'' لیاقت حسین نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

''پھر تم نے شیلا ورما کو گلے سے کیوں دبوچ رکھا تھا؟'' الماس نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ جواب میں لیاقت حسین کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے خوابیدہ لہجے میں کہا۔

''یہ وہی بے غیرت عورت ہے جس نے ایک معصوم اور یتیم لڑکی کو بنا سنوار کر زبردستی ایک شیطان فطرت کے حوالے کیا تھا لیکن قدرت نے اسے بے آبرو ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس کی لاش ابھی تک قبر میں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہے۔ جب تک خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں نہیں آتی اس مجبور اور بے کس کی لاش کی بھی فرشتے حفاظت کریں گے۔''

''تم......'' الماس کے علاوہ میڈم روبی بھی لیاقت حسین کا جواب سن کر سکتے میں آ گئی پھر اس نے لیاقت حسین سے پرتجسس لہجے میں سوال کیا۔ ''کون تھی وہ لڑکی، اس کی لاش کہاں دفن ہے؟''

لیاقت حسین جواب میں اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے اس نے میڈم کی آواز سرے سے سنی ہی نہیں۔ وہ پوری توجہ سے گاڑی چلانے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر طاری تناؤ کی کیفیت آہستہ آہستہ معمول پر واپس آ رہی تھی۔

میڈم روبی کو اس کے گھر واپس چھوڑنے کے بعد الماس نے دوبارہ لیاقت حسین سے پوچھا۔

''تم جب اندر گئے تھے تو وہاں کیا ہوا؟ کیا شیلا ورما کے پرس سے جعلی کرنسی ہی برآمد ہوئی تھی؟''

''مجھے خود حیرت ہے کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا!'' لیاقت حسین نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اگر کوئی غیر قانونی حرکت کرتا ہے تو اس سے میرا کیا تعلق۔ وہ لوگ مجھے کاغذی کارروائی پر بطور گواہ دستخط کرنے کو کیوں کہہ رہے تھے؟ میں نے ایس پی صاحب سے شکایت کی تو پھر کسی نے اصرار نہیں کیا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جعلی کرنسی برآمد ہونے کے باوجود انہوں نے شیلا ورما کو کیوں چھوڑ دیا تھا؟'' الماس جواب میں کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے لیاقت حسین سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

☆☆☆

شیخ حامد کی کال نے اورنگ زیب کے دماغ میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ جو صورت حال درپیش تھی اس کی بساط پر لوچن سب سے اہم مہرہ تھا جو پیٹ دیا گیا تھا۔ شیخ حامد نے بانگ دہل اقرار کیا تھا کہ اس نے لوچن اور پولیس کے ایک اے ایس آئی کو فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس کی کال کے کچھ دیر بعد ہی اورنگ زیب کو جگا کی کال بھی موصول ہوئی تھی جس نے باقی کہانی بھی پوری کر دی تھی۔

''لوچن مجھ سے رابطہ قائم نہیں کر سکا تھا۔'' اورنگ زیب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے لیے یہ اطلاع بھی یقیناً اہم ہوگی کہ لوچن اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''یہ......یہ......آپ کیا کہہ رہے ہیں صاحب؟'' جگا نے حیرت کا اظہار کیا۔

''لوچن کی موت کی اطلاع مجھے براہ راست آکٹوپس نے دی تھی۔'' اورنگ زیب نے جگا کو تفصیل بتاتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم پوری کہانی سننے کے بعد کیا نتیجہ اخذ کرو گے؟''

''وہ لنگوٹ کا پکا تھا صاحب۔'' جگا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اب میں صرف ایک ہی بات کہوں گا کہ دال میں کہیں نہ کہیں کچھ کالا ضرور شامل ہے۔''

''وہ کیا؟''

''جو اے ایس آئی مارا گیا اس کے علاوہ ہوٹل کے منیجر پر بھی شبہ کیا جا سکتا ہے۔'' جگا نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ''جو لڑکی سامنے آ کر نکل گئی اگر وہ مل جائے تو ڈور کا دوسرا سرا بھی ہاتھ آ جائے گا۔ بڑے ہوٹلوں میں ایسے کاروبار بھی زیادہ مہنگے داموں میں ہوتے ہیں صاحب۔ ہو سکتا ہے اے ایس آئی کے علاوہ تھانہ انچارج بھی ملوث ہو۔''

''اور بھی بہت کچھ ممکن ہے لیکن اب میں زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کر رہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے کہا۔ ''وقتی طور پر کہیں انڈر گراؤنڈ ہو جاؤ مگر مجھ سے رابطے میں رہنا۔''

''جس نے خم ٹھونک کر لوچن کو شکار کیا ہے اس کے بارے میں مجھے کیا حکم دیں گے؟''

''وقت کا انتظار کرو۔''

اورنگ زیب نے رابطہ ختم کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ حالات کے نشیب و فراز پر غور کرتا رہا پھر اس نے براہ راست متعلقہ تھانے کے ایس ایچ او کو کال کیا۔

''فائیو اسٹار ہوٹل میں کسی رہائشی کے علاوہ پولیس کا ایک اے ایس آئی بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔'' اورنگ زیب نے افسرانہ لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''آپ نے بھی جائے وقوعہ کا معائنہ کیا ہوگا، ہوٹل کے منیجر کا کیا بیان ہے؟''

''وہ......وہ ابھی تک خود کو نیوٹرل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' جواب گول مول انداز میں دیا گیا۔

''جو لڑکی کمرے میں گئی تھی اس کے بارے میں منیجر کا کیا کہنا ہے؟''

''سوری سر۔'' اس بار ایس ایچ او نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ''میں اس واردات کے بارے میں کوئی تفصیلی بات نہیں کر سکتا۔''

''کیا مطلب؟'' اورنگ زیب کی پیشانی پر سلوٹیں ابھرنے لگیں۔

''آئی جی صاحب کی یہی ہدایت ہے کہ ابھی پریس کو بھی اندھیرے میں رکھا جائے ورنہ میں کم از کم آپ سے......''

اورنگ زیب نے جھلا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ آئی جی کا حوالہ درمیان میں آ جانے سے اس کے ذہن میں اور بھی کچھ شبہات ابھر رہے تھے جب سراج نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کے چہرے پر بھی الجھن نظر آ رہی تھی۔

''کیا بات ہے۔ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟'' اورنگ زیب نے سراج کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''اب صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔'' سراج نے سر جھٹک کر جواب دیا۔ ''یا تو آپ مجھے اوپر سے کوئی مخصوص اجازت نامہ، خودمختاری دلوا دیں یا پھر میں ملازمت سے استعفیٰ دے دوں۔''

''ہوا کیا ہے؟''

''آئی جی صاحب آپ کے بعد اب مجھ پر نزلہ گرانے لگے ہیں۔'' سراج نے سپر اسٹور پر لیاقت حسین اور شیلا ورما کے معاملے کی مختصر روداد سناتے ہوئے کہا۔ ''الماس کے کہنے پر میں نے سپر اسٹور کے مالک کو خوش اسلوبی سے معاملہ رفع دفع کرنے کو کہہ دیا تھا جس کی بھنک نہ جانے آئی جی کو کیسے مل گئی۔ انہوں نے براہ راست مجھے فون کر کے ایسے معاملات سے دور رہنے کی سرزنش کی ہے۔''

''آئی جی کی جگہ اگر میں ہوتا تو شاید تمہارے ساتھ زیادہ سختی سے پیش آتا۔'' اورنگ زیب کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں۔'' اورنگ زیب نے بہ دستور چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شیلا ورما جیسی خاتون کے معاملات میں تمہارا دلچسپی لینا مجھے بھی پسند نہیں ہے۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ لیاقت حسین کی زبان سے شیلا ورما کے پاس موجود جعلی کرنسی کی جو بات نکلی وہ غلط بھی نہیں تھی۔ الماس کے بعد لیاقت حسین نے مجھے بھی فون کیا تھا اور میں نے شیلا ورما کو کسی بکھیڑے میں پڑنے سے بچا لیا۔''

''گویا وہ خوب صورت شجر جو میرے لیے ممنوعہ ہے آپ کے لیے جائز ہے۔''

''سیاست اسی کو کہتے ہیں مائی ڈیر۔'' اورنگ زیب نے بات جاری رکھی۔ ''سکندر علی شاہ نے مجھے براہ راست فون کر کے شکریہ بھی ادا کیا ہے۔''

''آئی سی، گویا میرے خلاف آئی جی کے کان بھی سکندر علی شاہ نے بھرے تھے۔''

''ہو بھی سکتا ہے لیکن......'' اورنگ زیب نے موضوع بدل دیا۔ ''اس وقت تمہارے لیے ایک اور اہم خبر موجود ہے۔ آکٹوپس نے تمہاری میڈم کے آخری مہرے لوچن کو بھی بساط سے باہر کر دیا ہے۔'' پھر اورنگ زیب نے آکٹوپس کے فون کی تفصیل بیان کی تو سراج بھی پہلو بدل کر رہ گیا۔

''شیخ حامد کی اس جسارت کو اب آپ کس خانے میں فٹ کریں گے؟''

''حماقت اور بوکھلاہٹ۔'' اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''شیر جب کچھار سے نکل کر باہر آ جائے تو پھر موت اس کا تعاقب شروع کر دیتی ہے۔''

''کچھار سے آپ کی مراد شاہ جی کا فارم ہاؤس تو نہیں ہے؟''

''تم اس کا شبہ متعدد بار کر چکے ہو اور میں نے ہر بار ایک ہی جواب دیا ہے۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب بھی یہی کہوں گا کہ سکندر علی شاہ بھی اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہے۔''

''لوچن کے بعد جگا کا نمبر بھی آ سکتا ہے۔'' سراج نے کہا۔ ''اس کی حفاظت کے لیے ہمیں قبل از وقت کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے۔''

''میں اسے انڈر گراؤنڈ ہو جانے کا مشورہ دے چکا ہوں مگر میرا خیال ہے کہ آکٹوپس اب کوئی زیادہ لمبا ہاتھ

مارنے کی کوشش کرے گا۔"

"لمبے ہاتھ سے آپ کا اشارہ کس کی طرف ہے؟"

اورنگ زیب کچھ جواب دینا چاہتا تھا جب الماس بازار سے واپس آ گئی۔ وہ یقیناً کوئی خاص بات ہی تھی جو اس کا پرس بھی ابھی تک شانے پر موجود تھا۔ اورنگ زیب نے الماس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر دبی زبان میں دریافت کیا۔

"تم اس وقت کچھ الجھی الجھی نظر آ رہی ہو، کوئی خاص بات؟"

"میں میڈم کے ساتھ سپر اسٹور گئی تھی۔ وہاں جو کچھ ہوا اس کا علم آپ دونوں کو بھی ہوگا۔" الماس نے ایک صوفے پر بیٹھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیاقت حسین نے سب کے سامنے برملا کہا تھا کہ شیلا ورما کس قسم کے کاروبار میں ملوث ہے بعد میں لیاقت حسین کی جعلی کرنسی والی بات بھی سچ نکلی تھی مگر آپ لوگوں کے فون پر ہی سارا معاملہ رفع دفع کر دیا گیا تھا۔"

"جو کچھ بھی ہوا وہ اچھا ہی ہوا۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے سکندر علی شاہ کی وجہ سے شیلا ورما کی سفارش کی تھی ورنہ میں ایسے معاملات میں کبھی ملوث ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔"

"تم کس لیے ہلکان ہو رہی ہو؟" سراج نے مسکرا کر کہا۔ "میری اطلاع کے مطابق تمہارا یا میڈم کا نام کہیں درمیان میں نہیں آیا۔"

"مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ لیاقت حسین کو جعلی کرنسی کے بارے میں کیسے علم ہو گیا؟" الماس نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ "اس نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق آپ لوگوں نے بھی کر لی ہوگی لیکن واپسی پر لیاقت حسین نے میڈم کے استفسار پر جو بات کہی وہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"کیا کہا تھا لیاقت حسین نے؟" اورنگ زیب نے سوال کیا۔ "کیا وہ بات بھی شیلا ورما سے متعلق تھی؟"

"جی ہاں۔" الماس نے جواب میں دبی زبان میں جب کسی یتیم لڑکی کا حوالہ دیتے ہوئے اس کے بے آبرو ہونے سے بچنے اور اس کی لاش محفوظ ہونے والی بات کہی تو اورنگ زیب اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جیسے کسی بھولی ہوئی کہانی کا کوئی گمشدہ حصہ دوبارہ ذہن میں تازہ ہو گیا ہو۔ سراج نے الماس کو اشارہ کیا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔ سراج نے اس کے جانے کے بعد اورنگ زیب کے قریب جا کر پوچھا۔

"کیا لڑکی کی کہانی سے پھر کوئی کلیو آپ کے ہاتھ آ گیا؟"

"بکھری ہوئی کڑیاں خود بخود ملتی چلی جا رہی ہیں۔" اورنگ زیب نے دانت پیستے ہوئے جواب دیا۔ "سکندر علی شاہ کے بارے میں بھی لیاقت حسین نے ایسی ہی ایک بات کہی تھی جسے وہ خود بعد میں بھول گیا تھا۔ ویک اینڈ آنے میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے ہیں۔ فارم ہاؤس جانے کے بعد ہو سکتا ہے اصل شکار بھی ہمارے ہاتھ آ جائے۔ لیاقت حسین اب کیا کردار ادا کرے گا یہ قبل از وقت طے نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک بات میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ آکٹوپس جہاں بھی ہے وہ بھی سکون سے نہیں بیٹھے گا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" سراج نے وضاحت چاہی۔ "اسے کس بات کی پریشانی لاحق ہوگی؟"

"لوچن کو راستے سے ہٹا کر اس نے مجھے کیوں اطلاع دی تھی؟" اورنگ زیب نے خلا میں گھورتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "پولیس کو راستے سے بھٹکانے کی خاطر مجرم اسی قسم کے کھیل تماشے کرتے ہیں۔ کچھ افراد لوچن سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ کیا عجب ہے کہ وہ بھی لپیٹ میں آ جائیں۔"

"آپ کا اشارہ کسی خاص سمت ہے؟"

"میڈم کو کیوں فراموش کر رہے ہو۔ لوچن کو اسی نے انگیج کیا تھا۔" اورنگ زیب نے جواب دیا۔ "آکٹوپس کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی خبر نے میڈم اور ڈی آئی جی کی خوشیوں پر بھی پانی پھیر دیا۔ کوئی خاص وجہ رہی ہوگی جو میڈم نے براہ راست کرنل احتشام کو فون کر کے اپنے مکان پر کمانڈوز کو تعینات کروایا ہوگا۔ اس کا سبب بھی آکٹوپس ہو سکتا ہے۔ ناگی کی موت کے بعد افضل خان اور شبنم بھی اس کی ہٹ لسٹ پر آ سکتے ہیں اور خود ہمیں بھی اب محتاط رہنا ہوگا۔"

"پھر...... آپ نے کیا سوچا ہے، ہمیں کس کی حفاظت پر خاص ترجیح دینی ہوگی؟"

"الماس سے کہو کہ میرے لیے بغیر دودھ کی کافی بنا دے۔" اورنگ زیب نے سراج کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت مجھے شدید سکون کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

سراج خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ اورنگ

زیب کی باتوں نے اسے بھی الجھا دیا تھا۔

سراج کے کمرے سے نکلتے ہی اورنگ زیب نے جیب سے اپنا موبائل نکال کر سم بدلی پھر وہ مرکزی حکومت کی اس بڑی شخصیت کے نمبر پنچ کرنے لگا جس کے اشارے پر حکومت نے اورنگ زیب کو مخصوص اجازت نامہ جاری کیا تھا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اسی نے دبی زبانی میں سراج کے حوالے سے آئی جی کی شکایت کی تھی جو کسی خاص وجہ سے اس سیٹ کے مخالف ہو گیا تھا جو پہلے اورنگ زیب کے پاس تھی۔ خاص طور پر یہ درخواست کی تھی کہ آئی جی کو ان افسروں کے معاملات میں مداخلت سے روکا جائے جو صحیح معنوں میں اپنے فرائض کو انجام دیتے ہیں۔

☆☆☆

ساحل سمندر کے کنارے بنی ہوئی نئی عمارت جو بارہ فلور پر مشتمل تھی ہر اعتبار سے اپنی مثال آپ تھی۔ خاص طور پر عمارت کی چھت پر بنا ہوا تین کمروں کا وہ بیضوی شکل کا پینٹ ہاؤس ہر اعتبار سے حسین ترین کہلانے کا مستحق تھا۔ پینٹ ہاؤس کے چاروں طرف کھلی چھت تھی جہاں سے گھوم پھر کر پورے شہر کے طول و عرض کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

اس پینٹ ہاؤس میں داخلے کے لیے علیحدہ آہنی دروازہ تھا جس کو بیٹری آپریٹیڈ ایک ڈیوائس کے ذریعے کھولا اور بند کیا جاتا تھا۔ آہنی دروازے پر سکندر علی شاہ نے اپنا ایک خاص گارڈ بھی سادہ لباس میں تعینات کر دیا تھا۔

دلربا کو رہائش کی یہ جگہ ہر اعتبار سے بے حد پسند آئی تھی۔ سکندر علی شاہ نے اسے پچھلی رات ہی بڑی خاموشی سے اور احتیاط سے وہاں منتقل کیا تھا۔ یہ بھی باور کروا دیا تھا کہ اس کی حفاظت کے لیے کچھ خاص آدمی بھی تعینات کر دیے گئے تھے جس کے بعد اسے کسی قسم کا خطرہ لاحق ہی نہیں تھا۔ کھانے پکانے کے لیے بھی اسے کسی علت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پینٹ ہاؤس کے گراؤنڈ فلور پر ایک جدید طرز کا ہوٹل تھا جس میں روم سروس کے لیے بیرے اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اس سروس کو حاصل کرنے والوں کے لیے ایک مختصر مگر خوب صورت موبائل دیا جاتا تھا جس کا رابطہ براہ راست ہوٹل کی روم سروس سے تھا۔ اس سروس کے ذریعے رات دن کسی وقت بھی آرڈر کی تعمیل کی جاتی تھی۔

دلربا نے وہ رات بڑے سکون سے گزاری۔ صبح بیدار ہو کر وہ کھلی چھت پر آئی تو ساحل کی طرف سے آنے والی ہوا کے خنک جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔ پینٹ ہاؤس کی چھت پر چاروں طرف گھومتی رہی پھر کمرے میں آ کر اس نے روم سروس سے ناشتے کو کہا۔ یہ تاکید بھی کر دی تھی کہ سروس کسی خاتون ہوسٹس کے ذریعے کی جائے۔

جتنی دیر میں وہ باتھ روم سے شاور لے کر ڈریسنگ گاؤن پہنے باہر آئی اتنی دیر میں ہوٹل کا دیا ہوا وہ موبائل بھی گنگنانے لگا جس سے ناشتے کا آرڈر دیا گیا تھا۔ دلربا نے موبائل آن کیا تو دوسری جانب سے ایک سریلی آواز ابھری۔

"آپ کا ناشتا تیار ہے میڈم۔"

"ٹھیک ہے، بھیج دو۔" دلربا نے بڑی تمکنت سے جواب دیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے روم سروس کی کال پر وہ آہنی دروازہ کھول دیا جس سے گزر کر آنے والی خاتون ہوسٹس نے کمرے میں داخل ہو کر ناشتے کو میز پر چن دیا پھر بڑے ادب سے بولی۔

"میرے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"تم جا سکتی ہو۔ ناشتے کے برتن میں گارڈ سے بھجوا دوں گی۔" دلربا نے کھلے بالوں کو ایک خاص ادا سے جھٹک کر جواب دیا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" خاتون ہوسٹس نے کہا۔ "آپ گارڈ سے برتن دروازے کے باہر ہی رکھوا دیں، روم سروس کے بیرے اسے خود ہی سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔"

دلربا نے بڑے اطمینان سے ناشتا کیا۔ دانتوں کو حسب معمول دوبارہ برش کرنے کے بعد وہ بیڈروم کے آرام دہ بستر پر لیٹ گئی۔ پچھلے دنوں وہ جس صورت حال سے دوچار رہی تھی اس نے اس کے ذہن کو خاصا مکدر کر دیا تھا۔ ان ہی خیالوں میں گم ہو کر کسی وقت اس کو نیند نے اپنی آغوش میں لیا، اسے کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ ساحل پر چلنے والی ہوا کے جھونکوں نے اسے اتنی مہلت بھی نہیں دی کہ وہ اٹھ کر لباس پہن سکتی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ دیوار گیر گھڑی پر نظر پڑی تو یہ احساس بھی جاگ اٹھا کہ وہ ملگجا اندھیرا دن ڈوب جانے کے بعد شام آنے کا اعلان کر رہا تھا۔ نیند اتنی گہری تھی کہ اسے دوپہر کے کھانے کا احساس بھی نہیں ہوا۔ بستر سے اٹھ کر وہ سیدھی ملحقہ باتھ روم میں گئی، دوبارہ سے فریش ہو کر باہر آئی تو اسے سردی کا تھوڑا تھوڑا احساس ہوا۔ کمرے اور ڈریسنگ کی لائٹ آن کرنے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کے بارے میں غور کر رہی تھی جب باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ جلدی سے دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی ایک دروازے کی آڑ میں

ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ آنے والا سکندر علی شاہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوگا لیکن اس کا وہ اعتماد زیادہ دیر بحال نہیں رہ سکا۔ جس شخص نے بڑی دل جگری سے اندر قدم رکھا تھا وہ کم از کم سکندر علی شاہ نہیں تھا لیکن جس انداز میں وہ اندر آیا تھا وہ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر وہ اس طرح ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا جیسے وہ پینٹ ہاؤس اس کے باپ دادا کی جاگیر ہو۔ تھری پیس سوٹ میں اس کی شخصیت بھی کسی مالدار کروڑ پتی ہونے کا اعلان کر رہی تھی لیکن چہرے پر خودرو پودوں کی طرح بڑھتی ہوئی بنا تراش خراش کی ڈاڑھی اس کی شخصیت سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" دلربا نے دل ہی دل میں سوچا۔ ایک لمحے میں کئی خیال اس کے ذہن میں گڈمڈ ہوئے لیکن پھر سکندر علی شاہ کی اعلیٰ شخصیت اور دروازے پر موجود گارڈ کا خیال آیا تو اس نے خود کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

"آنے والا سکندر علی شاہ کا کوئی خاص نمائندہ ہی ہوگا جسے اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوگا۔" خود کو اس خیال سے تسلی دینے کے بعد وہ لباس تبدیل کرنے کی خاطر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تھی جب ایک کھنکھارتی ہوئی مردانہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"تم جس لباس میں ہو وہ وقت اور ضرورت کے اعتبار سے زیادہ مناسب ہے۔"

دلربا جھجکی۔ کسی اجنبی کے منہ سے ایک لچر قسم کا جملہ سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی لیکن پھر اس کے ذہن میں ایک اور خیال بھی تیزی سے ابھرا۔ پھاٹک پر سکندر علی شاہ کا مسلح گارڈ بھی سادہ لباس میں موجود تھا۔ پھاٹک کھولنے کی مخصوص ڈیوائس بھی دلربا کی تحویل میں تھی پھر...... اگر آنے والا کوئی اجنبی تھا تو اتنی رکاوٹیں عبور کر کے اندر کس طرح آ گیا؟

"میرے بارے میں اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔" آنے والے نے بے پروائی سے کہا۔ "تمہارا سکندر علی شاہ بھی میرے لیے پالتو کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔"

"کک...... کون ہو تم؟" دلربا نے شاہ جی کے حوالے پر آنے والا رکیک جملہ سن کر دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔ "یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟"

"اس کہانی کو انجام تک پہنچانے آیا ہوں جو فریال نے شروع کی تھی۔"

"تت...... تت......" فریال کے حوالے پر دلربا کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔

"میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں تمہارے بارے میں۔" نووارد تیزی سے اٹھ کر دلربا کے سامنے کھڑا ہو گیا جو اپنے گاؤن کو سینے پر برابر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "پھر یاد ہوگا تمہیں۔ وہی جس سے تم فریال ہی کے ذریعے ملی تھیں۔ اس نے پہلی بار تمہیں کلی سے پھول بنایا تھا پھر...... فریال نے تمہارا تعارف سکندر علی شاہ سے کروا دیا۔ اب تم اس کے لیے کیا خدمت انجام دے رہی ہو یہ بھی جانتا ہوں۔" آنے والا نفرت بھری نظروں سے دلربا کو گھور رہا تھا۔ اس نفرت کی آڑ میں اس کی ہوس کے اشارے بھی شامل تھے۔

"لل...... لیکن...... تت...... تم یہ سب کچھ مجھے کیوں یاد دلا رہے ہو؟" دلربا نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم نے نہ سہی لیکن جن لوگوں نے تمہیں اپنی تحویل میں باعزت طور پر رکھا تھا ان کا کچھ قرض باقی ہے مجھ پر۔" نووارد نے آگے بڑھ کر دلربا کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت مضبوط تھی۔ دلربا کی نظروں میں خوف کے سائے لرزنے لگے۔ آنے والے نے بہ دستور سرد لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے ہی خوب صورت وجود کو اس کے لیے بطور تحفہ پیش کرنا پسند کروں گا۔"

دلربا نے مزاحمت کی ناکام کوشش کی لیکن نووارد اسے گھسیٹ کر اس کے بستر پر لے گیا۔

"مم...... میں...... نہیں سمجھ سکی کہ تم مجھ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہو؟" دلربا نے ہتھیار ڈالتے ہوئے رو دینے والے انداز میں کہا۔ "تم جو چاہتے ہو میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گی۔"

"تم اب انکار کرنے کی پوزیشن میں ہو بھی نہیں۔" نووارد نے ایک جھٹکے سے دلربا کا گاؤن بھی اتار کر ایک طرف پھینک دیا، کچھ دیر وہ اس کے وجود کو سرسرائی نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے جیب سے سائلنسر لگا پستول نکال لیا۔

"مم...... مم...... میں...... تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" دلربا نے رندھی ہوئی آواز میں التجا کی۔ "مجھے جان سے نہ مارو...... میرا جسم تمہارے لیے......"

"کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔" نووارد کا لہجہ سرد تھا۔ "باسی اور جھوٹا کھانا میری فطرت کے خلاف ہے۔" پھر دلربا کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ نووارد کے پستول سے یکے بعد دیگرے دو بار چچ، چچ کی مدھم آواز ابھری اس کے

ساتھ ہی دلربا کا خوب صورت جسم پھڑپھڑا کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

نووارد کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم ایک لمحے کو جاگا پھر اس نے جیب سے موبائل نکال کر ایس پی اور نگ زیب کے نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ قائم ہونے پر اس نے بڑے دبنگ لہجے میں کہا۔

"لوچن کے بعد اب تمہارے اور سکندر علی شاہ کے لیے دلربا کی لاش کی شکل میں ایک مشترکہ تحفہ ساحل سمندر کی نئی تعمیر شدہ عمارت کے پینٹ ہاؤس میں موجود ہے لیکن...... یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، جاری رہے گا۔"

اپنا جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے دوسری جانب سے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ دلربا کے جسم پر ایک آخری نظر ڈال کر وہ پینٹ ہاؤس کے باہر آیا جہاں سکندر علی شاہ کا متعین کردہ سادہ لباس والا گارڈ بھی فرش پر اوندھا پڑا تھا۔

☆☆☆

گل اس وقت اپنی خواب گاہ میں بیٹھی خلا میں اس طرح گھور رہی تھی جیسے کوئی بھولا بسرا خواب یاد آ رہا ہو۔ ایک رات پہلے شوہر کا از خود اس کے پاس آنا ایک خوب صورت خواب ہی تھا ورنہ ایک ہی گھر میں، ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے بھی اس کا شوہر سے آمنا سامنا بہت کم ہی ہوتا تھا۔

گزشتہ روز سکندر علی شاہ نے جس وحشیانہ انداز میں اسے آغوش میں دبوچا تھا وہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔ حق زوجیت ادا کرنے میں اس نے کسی مزاحمت کا اظہار بھی نہیں کیا لیکن یہ احساس بھی بڑا تھا کہ یہ تھا کہ شوہر نے وقتی طور پر دل بہلانے کی خاطر نگینہ جیسی آبرو باختہ عورت کا متبادل سمجھ کر محض ایک وقتی کمی کو پورا کرنے کی خاطر استعمال کیا تھا۔

اس وقت بھی ایک مقدس رشتے کا احساس اس کے ذہن کے گوشوں میں کلبلا رہا تھا جب شوہر کو دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اسی طرح چونکی جیسے جاگتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو لیکن وہ خواب نہیں، حقیقت تھی جسے محسوس کر کے وہ دل کی دھڑکنوں کو سمیٹتی شوہر کی پذیرائی کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

سکندر علی شاہ گل کو دیکھ کر بڑی اپنائیت سے قدم اٹھاتا جب ایک صوفے پر بیٹھ گیا تھا تو گل نے بڑے پیار سے کہا تھا۔ "آپ بیٹھیں میں ملازمہ سے چائے لانے کو کہتی ہوں۔"

''اس کی زحمت تم نہ کرو۔'' سکندر علی شاہ نے اسے قریب آکر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ملازمہ کو ہدایت دے کر آیا ہوں کہ اب روزانہ شام کی چائے میں تمہارے ساتھ اسی کمرے میں پیا کروں گا۔''

سکندر علی شاہ کا محبت بھرا جملہ سن کر گل کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ وہ قدم اٹھاتی شوہر کے پہلو میں جا کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکنیں اس کے اختیار سے باہر ہونے لگیں۔

''گل......!'' سکندر علی شاہ نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام کر مدھم لہجے میں کہا۔ ''مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا۔''

''پلیز...... ایسا نہ کہیں۔'' گل نے دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے بے اختیار جواب دیا۔ ''شادی کے بعد آپ نے کبھی مجھے اپنے قدموں سے دور نہیں کیا میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔''

''یہ تم نہیں تمہارے والدین کی دی ہوئی تربیت بول رہی ہے۔'' سکندر علی شاہ نے اس کے اور قریب ہو کر سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات تم بھی سمجھتی ہو...... منزل کی تلاش میں اکثر مسافر بھٹک جاتے ہیں لیکن کبھی نہ کبھی اپنے گھر ضرور واپس لوٹتے ہیں۔ مرد کی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ عارضی چمک دمک کو بہت جلدی قبول کر لیتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اسے یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ بازار کے کھانے چٹپٹے اور مزیدار ضرور ہوتے ہیں لیکن گھر کے کھانے کے اصلی اور صاف ستھرے مسالوں سے تیار کی ہوئی ڈش کا ذائقہ بہرحال منفرد ہوتا ہے۔''

گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شرما کر گردن جھکالی۔ شوہر کی بات کا اصل مفہوم بھانپ کر اس کے اندر کی مشرقی عورت بھی گنگنانے لگی تھی۔ جب ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے اندر داخل ہوئی۔ اس کے آجانے سے حسین خوابوں کا تسلسل بھی ٹوٹ گیا۔ گل چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔ سکندر علی شاہ اسے والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

چائے کے دوران بھی سکندر علی شاہ گل سے محبت بھری باتیں کرنے میں مصروف تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملا، روشن اسکرین پر نظر آنے والے نمبر اس کے جانے پہچانے تھے اس لیے اس نے موبائل آن کرنے میں دیر نہیں کی۔

''اس وقت کیسے یاد آگئی؟'' اس نے بے تکلفی سے دریافت کیا۔

''سب سے پہلے مجھے ویک اینڈ کا پروگرام کنفرم ہے۔'' دوسری جانب سے ایس پی اورنگ زیب کی آ ابھری۔ ''اس بار تو پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی

''بالکل نہیں۔ میں نے سارے انتظامات بھی کر لیے ہیں۔''

''اور کوئی نئی خبر؟''

''نئی نئی خبریں آپ حضرات کے علاوہ اور کس پاس ہوتی ہیں۔''

''میرے پاس اس وقت آپ کے لیے کوئی اچھی نہیں ہے۔'' سنجیدگی سے جواب ملا تو سکندر علی شاہ نے پروائی سے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں؟''

''آپ سے دلربا کی آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟

''آخری ملاقات......!'' سکندر علی شاہ چونکے بغیر رہ سکا۔ ''آپ کیا بتانا چاہ رہے ہیں؟''

''مجھے افسوس ہے شاہ جی کہ اب وہ اس دنیا میں نہ رہی۔ میری اطلاع کے مطابق قاتل نے وہاں بھی آکٹوپس کا ایک نشان چھوڑ کر پولیس کو اپنی برتری کا احساس دلا کی کوشش کی ہے۔''

''کون ہے یہ آکٹوپس؟'' سکندر علی شاہ تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر آڑھی ترچھی شکنیں ابھرنے لگیں جو اس کے وجود کے اندر ابلنے والے لاوے کی ترجمان تھیں۔

''حوصلے سے کام لیں شاہ جی ورنہ مجرم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔''

''آپ نے دوست کہا ہے تو پھر دوستوں کی طرح کھل کر بات کریں۔'' سکندر علی شاہ نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''آپ کے جواب سے میں یہی اندازہ لگا رہا ہوں کہ شاید کسی نہ کسی زاویے سے آپ مجرم سے واقف ہیں صرف اشارے میں ہی شبہ ظاہر کر دیں وہ جو بھی ہوا میں اسے سمندر کی تہ میں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''میں بھی یہی جواب دوں گا کہ کسی نہ کسی طور پر آپ بھی غائبانہ طور پر اس کو جانتے ہیں لیکن...... اس کی اصلیت سے واقف نہیں ہیں۔''

''آپ کا جواب میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں ہے۔ کیا آپ اس کی وضاحت کھل کر نہیں کریں گے؟''

''فی الحال میں اس کی وضاحت میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجرم مجھے راستے سے ہٹانے کا خواہش مند ہے مگر وہ ایک

تیر سے بیک وقت دو شکار کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔''

''دوسرا شکار کون ہے؟''

''صرف ایک دن اور انتظار کر لیں...... تفصیلی بات فارم ہاؤس پر ہوگی۔'' اورنگ زیب نے افسرانہ انداز میں کہا۔ ''ایک بات اور غور سے سن لیں اس کا ذکر کسی سے نہ کیجیے گا ورنہ پھر سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔'' جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا۔ سکندر علی شاہ اس آخری جملے کی تلخی کو برداشت نہیں کر سکا تو ہونٹ چبانے لگا۔

''کس کی کال تھی؟'' گل نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''ہے ایک نچلے درجے کا افسر جو اس وقت اچانک اونچی آواز میں بول رہا تھا۔'' سکندر علی شاہ نے حقارت سے جواب دیا۔ ''اس کے دن بھی اب گنے چنے رہ گئے ہیں۔''

''آپ کے اور اس کے درمیان کسی مجرم کی بات بھی ہو رہی تھی؟'' گل نے جسارت کر کے پوچھا۔

گل کے سوال پر سکندر علی شاہ کو دلربا کا خیال آیا جسے اورنگ زیب کی اطلاع کے مطابق قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کے وجود کے اندر شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے کچھ سوچ کر دوبارہ اورنگ زیب سے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اسی وقت موبائل پر پھر سگنل ملا، سکندر علی شاہ نے موبائل آن کرنے میں خاصی عجلت سے کام لیا۔

''ہیلو۔''

''تمہارے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔'' دوسری جانب سے شکرہ کی آواز ابھری۔ ''دلربا کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔''

''اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟'' سکندر علی شاہ نے چونکنے کی اداکاری کی لیکن اس کے وجود کے اندر اب چنگاریاں چٹخنے لگی تھیں۔

''اس کے اغوا کے سلسلے میں بھی میں نے ایس پی پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اسی نے کسی مصلحت کی بنا پر ایک انتہائی قدم اور اٹھا لیا ہو لیکن اس واردات میں ناگی کے کسی آدمی کا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''ناگی تو مارا جا چکا۔''

''عقل سے کام لو۔'' دوسری جانب سے سرزنش کرنے والا انداز اختیار کیا گیا۔ ''تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ دو بدمعاشوں نے احمد عدنان کی ایرانی رکھیل ثمرہ شیرازی کے بنگلے پر ناگی کو گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا انتقام لینے کی خاطر ناگی نے اپنے کسی ہم شکل کو میک اپ میں دلربا کے مکان پر بھیجا تھا، ہو سکتا ہے کہ ناگی کے کسی سر پھرے ساتھی نے اس کا انتقام لینے کی خاطر دلربا کو نشانہ بنا دیا ہو۔''

''اور بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن میں دلربا کی موت کو فراموش نہیں کروں گا۔'' سکندر علی شاہ نے کسی ناگ کی طرح پھنکارتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے جس پر شبہ ہوا اس کو کتے سے بدتر موت ماروں گا۔''

''فی الحال میں تمہیں کسی جلد بازی کی اجازت نہیں دوں گا۔'' تحکمانہ انداز میں کہا گیا۔ ''ایس پی کو فارم ہاؤس میں آلینے دو پھر ممکن ہے کہ اس کے مٹھی میں آجانے کے بعد بہت سے اہم رازوں سے پردہ اٹھ جائے۔''

''ایک بات میرے ذہن میں بھی الجھ رہی ہے۔''

''وہ کیا؟''

''میں نے دلربا کو نہایت رازداری سے پینٹ ہاؤس تک پہنچایا تھا۔ وہاں جو آدمی تعینات کیا تھا وہ بھی بکنے والا بندہ نہیں تھا پھر...... قاتل وہاں تک کیسے پہنچ گیا؟''

''پولیس کے شکاری کتے جب کسی کے پیچھے لگ جائیں تو بدن کے لباس کی خوشبو سے بھی اس تک پہنچ جانے کی مہارت رکھتے ہیں۔''

''ایسی صورت میں تو ناگی کا کوئی آدمی خارج از امکان ہو جاتا ہے۔'' سکندر علی شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہمارے ذہن میں صرف ایک ہی نام رہ جاتا ہے...... ایس پی۔''

''فکر مت کرو، بکرے کی ماں اب کتنے دنوں خیر منائے گی۔'' جواب بڑے ٹھوس لہجے میں دیا گیا اور پھر رابطہ بھی ختم ہو گیا۔

گل.... خاموش تماشائی کی حیثیت سے قریب کھڑی سکندر علی شاہ کے بدلتے تاثرات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ دوسری کال کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اس نے دبی زبان میں کہا۔

''نگینہ کے بعد اب دلربا...... کون آپ کی خوشیوں کا دشمن ہو سکتا ہے؟''

''یہی ایک سوال میرے ذہن میں بھی صدائے بازگشت بن کر گونج رہا ہے۔'' سکندر علی شاہ جواب دینے کے بعد جانے کے ارادے سے اٹھا تو گل نے بڑی اپنائیت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اس وقت آپ کو صرف سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔'' گل نے شوہر کی آنکھوں میں دور تک جھانکتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ''میری درخواست ہے کہ آپ کچھ دیر بستر پر آنکھ بند کر کے لیٹے رہیں۔ میں آپ کے سر میں تیل

لگا دیتی ہوں۔ دلربا کی تجہیز و تکفین کا کام آپ کے کارندے بھی انجام دے سکتے ہیں۔''

جواب میں سکندر علی شاہ نے گل کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات کو بہت غور سے دیکھا پھر اس نے گل کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار نہیں کیا لیکن اس وقت بھی اس کے ذہن میں شکرہ اور ایس پی اورنگ زیب کے کہے ہوئے کچھ جملے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

☆☆☆

حسبِ معمول رات ساڑھے نو بجے بیوٹی پارلر کو تالا لگانے کے بعد جونی نے اپنے کمرے میں جا کر لباس تبدیل کیا پھر حسبِ معمول وہ شیلا ورما کے پاس اس کی خواب گاہ میں گیا جہاں وہ خلافِ معمول کسی خیال میں ڈوبی نظر آ رہی تھی۔ شب خوابی کا لباس بھی اس کے جسم پر نہیں تھا۔

جونی دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ سپر اسٹور میں پیش آنے والی کہانی جونی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ شیلا ورما کے تمام راز سے واقف تھا۔ اس کے دھندوں میں بھی برابر کا شریک تھا لیکن جعلی کرنسی والی بات اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ خوب صورت اور نوجوان لڑکیوں کے کاروبار میں اسے جو رقم ملتی تھی وہ بھی ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔ ہنی مون بیوٹی پارلر کا بینک اکاؤنٹ علیحدہ تھا جس میں لاکھوں کا بیلنس موجود تھا پھر شیلا ورما کو جعلی کرنسی کے کام کی کیا ضرورت تھی اور اگر کہانی سچ تھی تو بھی شیلا ورما نے جونی کو کان و کان اس کی بھنک بھی نہیں لگنے دی تھی۔ ذاتی طور پر جونی کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اگر اسے کوئی فکر تھی تو لیڈی ڈکسن کی اس پیشن گوئی کی تھی جس کے مطابق اسے شیلا ورما سے دور چلے جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

دروازے پر کھڑا وہ اپنے خیالوں میں محو تھا جب شیلا ورما نے اس کی طرف دیکھا پھر ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔ ''دروازے پر کیوں جم کر رہ گئے ہو، میرے قریب آؤ۔ آج مجھے شدت سے تمہارا انتظار تھا۔''

''غلط۔'' جونی نے بڑی مہارت سے اسے اپنے چہرے کے تاثرات بدل کر کہا۔ ''انتظار کی صورت میں تمہارے جسم پر ہمیشہ نائٹ گاؤن ہوتا ہے لیکن آج تم نے لباس بھی نہیں تبدیل کیا۔''

''دروازہ بند کر لو پھر میں یہ لباس بھی اتار کر پھینک دوں گی۔''

جونی نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر دیا لیکن وہ اس وقت بھی محسوس کر رہا تھا کہ شیلا ورما بڑی خوب صورتی سے کسی بات کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہ شیلا ورما کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ شیلا ورما نے ایک بار پھر توبہ شکن انگڑائی لے کر اپنے مہکتے وجود کو جونی کی کشادہ سینے میں چھپانے کی کوشش کی۔

''آج کیا صوفے پر رات بسر کرنے کا ارادہ ہے؟'' جونی نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

''میں آج بہت تھکی ہوئی ہوں جونی ڈیر۔ تم مجھے اپنی باہوں میں سمیٹ کر بستر تک لے چلو۔''

''شیلا۔'' جونی نے اس کی زلفوں کو چھیڑتے ہوئے دبی زبان میں پوچھا۔ ''تھکن کی کوئی وجہ بھی ضرور ہوگی؟''

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' شیلا ورما نے جونی کے سوال پر چونک کر اس کی نگاہوں میں جھانکا۔

''کل تک میں فٹ پاتھ پر تھا اور آج تمہاری خواب گاہ میں ہوں۔'' جونی نے سمجھانے والے لہجے میں جواب دیا۔ ''میری جگہ پہلے اس خواب گاہ میں بھی کسی اور کا راج تھا۔ مرد کے مقابلے میں عورت جلدی جلدی لباس تبدیل کرنے کی عادی ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب جونی کی جگہ بھی کوئی اور......''

''شٹ اپ۔'' شیلا ورما جھلا کر اٹھ گئی۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''دوبارہ اپنی زبان پر قابو رکھنا ورنہ......''

''چپ کیوں ہو گئیں؟'' جونی نے دیدہ و دانستہ راکھ میں دبی چنگاری کو ہوا دی۔ ''ورنہ کیا ہوگا؟''

''میں بچوں کی طرح کھلونوں سے دل بھر جانے کے بعد اس کی جگہ دوسرے کی ضد نہیں کرتی۔'' شیلا ورما نے ہونٹ چباتے ہوئے تلملا کر کہا۔ ''انہیں توڑ دینے کی عادی ہوں اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔''

''میں اس کے علاوہ بھی کچھ جاننے کی خواہش کر رہا ہوں۔'' جونی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' شیلا ورما نے بھڑک کر سوال کیا۔

''جعلی کرنسی کے کاروبار والی بات کہاں تک سچ ہے؟'' جونی نے کھل کر سوال کیا۔

شیلا ورما اس طرح چونکی جیسے بارڈر کراس کرتے وقت رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہو۔ ایک لمحے کو اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے جونی کو تیز نظر سے گھورا۔

''میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتی۔ دوبارہ اپنی حدود کو پھلانگنے کی کوشش مت کرنا۔''

"اس وقت میرے لیے کیا حکم ہے؟" جونی نے شیلا ورما کے سخت جواب کو مشکل سے ہضم کیا پھر اس کے سراپے پر ایک نظر ڈال کر چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارا موڈ بدلنے کا انتظار کروں یا......"

"گیٹ لاسٹ۔" شیلا ورما نے بپھر کر کہا پھر ہونٹ چبانے لگی۔

"مس ڈکسن نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔" جونی نے لمبی سانس بھر کر سپاٹ لہجے میں بات جاری رکھی۔ "اس نے کہا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو میں تمہاری دنیا سے کہیں دور چلا جاؤں۔"

"اس کے علاوہ اور کیا بکواس کی تھی اس حرافہ نے؟" شیلا ورما کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ وہ قدم بڑھاتے ہوئے بستر کے قریب چلی گئی۔

"میں نے اس سے پوچھنے کی متعدد کوشش کی تھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔" جونی نے اس بار سرد مہری سے جواب دیا۔

"سچ کہہ رہے ہو یا کسی وجہ سے مجھے ٹالنے کی کوشش کررہے ہو؟" شیلا ورما کا لب ولہجہ بہ دستور تلخ تھا۔

"میں اب کسی ٹال مٹول سے کام لینے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کروں گا۔" جونی نے بے نیازی کی کیفیت میں معنی خیز انداز اختیار کیا۔ "ہمارے راستے بھی الگ الگ ہوں گے۔"

"وہاٹ۔" شیلا ورما کو جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے جونی کو کسی بھوکی شیرنی کی نظروں سے دیکھا۔ چیخ کر ہذیانی انداز میں سوال کیا۔ "راستے الگ الگ ہونے سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"میں کل تمہاری دنیا سے چلا جاؤں گا۔" جونی نے بہ دستور سرد انداز میں کہا۔ "حالات سازگار نہ ہوں تو انسان کو فوری طور پر راستہ بدل دینا چاہیے۔"

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں، اس لیے کہ اب شاید تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔"

"تم ایسا نہیں کرسکو گے جونی۔" شیلا ورما نے بپھر کر جواب دیا پھر اس نے بستر پر رکھے تکیے کے نیچے سے اپنا لیڈیز آٹومیٹک پستول بھی نکال لیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقص کررہے تھے۔

"تم......" جونی نے اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی طرف غور سے دیکھا۔ "تم شاید اس وقت اپنے ہوش میں نہیں ہو۔"

"اپنی اوقات میں رہ کر بات کرو۔" شیلا ورما نے چیخ کر کہا۔ "تمہاری حیثیت میری نظروں میں کسی پالتو کتے سے زیادہ نہیں ہے پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ میرے پاؤں پکڑ کر پرامس کرو جونی کہ تم یہاں سے جانے کا خواب کبھی نہیں دیکھو گے۔"

"کون روکے گا مجھے؟" جونی کے تیور بھی بدلنے لگے۔

"تمہاری موت......" شیلا ورما کی گرفت آٹومیٹک کے دستے پر اور مضبوط ہوگئی۔ "میں نے ابھی تم سے کہا تھا کہ میں کھلونے بدلنے کے بجائے انہیں توڑ دینے کی عادی ہوں۔"

اس کے بعد جونی کو جواب دینے کی مہلت نہیں ملی۔ شیلا ورما کی کپکپاتی انگلی کا دباؤ اس وقت تک ٹریگر پر بڑھتا گیا جب تک گولیوں کا چیمبر خالی نہیں ہوگیا۔ جونی کسی کٹی ہوئی شاخ کے مانند فرش پر گرا پھر اس کی دھڑکنیں ہمیشہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔

شیلا ورما نے مشینی انداز میں آٹومیٹک ایک طرف پھینک دیا۔ خواب گاہ کا دروازہ کھولنے کے بعد اس نے انٹرکام سسٹم کے ذریعے سڑک سے اپنے بیڈ روم تک آنے کے تمام داخلی دروازے یکے بعد دیگرے کھول دیے۔ مشینی انداز میں اس نے فون اٹھا کر پولیس کو جونی کے قتل کی اطلاع دی پھر دیوانوں کی طرح جونی کی لاش سے لپٹ کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس وقت تک وہ اسی ہذیانی کیفیت سے دوچار رہی جب تک پولیس نے آکر اسے زبردستی پکڑ کر جونی کی لاش سے علیحدہ نہیں کیا۔ وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ایک ہی جملہ دُہرا رہی تھی۔

"میرے پاؤں پکڑ کر پرامس کرو جونی تم شیلا ورما کو چھوڑ کر جانے کا خواب کبھی بھول کر بھی نہیں دیکھو گے۔"

☆☆☆

سراج کمرے میں داخل ہوا تو اورنگ زیب کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔

"کیا آج شام کا ناشتا کرنے کا ارادہ نہیں ہے؟" اس نے اورنگ زیب کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "الماس بھی آپ کی منتظر ہے۔"

"سوری۔" اورنگ زیب نے چونک کر دستی گھڑی کی سمت دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ سراج کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکلا تھا۔

"کل کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے؟" سراج نے دبی زبان میں سوال کیا۔ "کیا موجودہ حالات میں بھی آپ پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کریں گے؟"

"تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟"

"پہلے نگینہ پھر دلربا اور اب جونی...... شیلا ورما نے بھی اعتراف جرم کرلیا ہے۔ کیا سکندر علی شاہ پر ان پے در پے ہونے والے حادثات کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا؟"

"یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے۔" اورنگ زیب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "نگینہ اور دلربا کی بات اور تھی لیکن شیلا ورما کے بارے میں میری شروع سے ایک ہی رائے تھی، وہ نیگس سبل تھی۔ تفتیش کرنے والے افسر نے بھی یہی رائے قائم کی ہے۔ اخباری رپورٹرز نے بھی ڈھکے چھپے جملوں میں بیوٹی پارلر کے آڑ میں ہونے والے مذموم کاروبار کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سکندر علی شاہ پر بھی اس حادثے کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ......"

"ڈونٹ بی چائلڈش۔" اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "کرنل احتشام کے سادہ لباس والے بھی آس پاس ہی موجود ہوں گے۔ لیاقت حسین کو بھی میں نے تمہاری خواہش پر ساتھ رکھا ہے۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے نیچے آئے تو الماس نے ملازمہ کو چائے لانے کو کہا پھر براہ راست اورنگ زیب سے بولی۔ "میرا دل کہتا ہے کہ کل آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"سنا تم نے۔" اورنگ زیب نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے سراج سے کہا۔ "الماس پولیس میں نہیں ہے لیکن اس کا جذبہ تمہارے مقابلے میں زیادہ قابل ستائش ہے۔"

"میں اس بات سے بھی انکار نہیں کروں گا کہ گھٹنا ہمیشہ پیٹ ہی کی طرف جھکتا ہے۔" سراج نے برجستہ جواب دیا۔

ناشتے کے دوران اسی قسم کی نوک جھوک جاری تھی جب سراج کے موبائل پر سگنل ہوا۔ دوسری جانب سے جو اطلاع دی گئی اسے سن کر سراج کے چہرے کے تاثرات اچانک بدل گئے۔ موبائل آف کرنے کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اورنگ زیب کو بھی اس اطلاع سے آگاہ کیا۔

"ہمیں فوری طور پر ریڈ کراس اسپتال پہنچنا چاہیے۔ ڈی آئی جی صاحب اس وقت آپریشن تھیٹر میں ہیں۔"

"خیریت؟"

"ان کے آفس میں کوئی بم بلاسٹ ہوا ہے جس کے فوراً بعد انہیں اسپتال منتقل کردیا گیا۔"

سراج کے ساتھ اورنگ زیب نے بھی میز سے اٹھنے میں عجلت کا مظاہرہ کیا۔ بیس پچیس منٹ بعد ہی وہ اسپتال پہنچے جہاں آپریشن تھیٹر کے باہر آئی جی بھی بہ نفس نفیس دوسرے کچھ افسران کے ساتھ موجود تھا۔ اورنگ زیب کو رسمی پروٹوکول کے پیش نظر اس کے قریب جانا پڑا۔

"یہ اچانک کیا ہوگیا سر؟" اس نے آئی جی سے دریافت کیا۔

"اچانک نہیں...... یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی اسکیم اور بڑی پلاننگ سے ہوا ہے۔" آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "پلاسٹک بم کو میز کے داہنی جانب دراز کے نیچے ٹیپ سے چپکایا گیا تھا جسے بعد میں کسی ڈیوائس کے ذریعے عین اس وقت بلاسٹ کیا گیا جب ڈی آئی جی مجھ سے ملاقات کے بعد اپنے دفتر جا کر کرسی پر بیٹھ رہے تھے۔ جس کانسٹیبل پر شبہ کیا جاسکتا تھا، اسے بھی راستے سے ہٹا دیا گیا۔"

"سرجن کی کیا رپورٹ ہے؟"

"ابھی اس نے کوئی یقینی بات نہیں کہی۔"

آپریشن تھیٹر کے باہر موجود دوسرے افسران بھی اس اچانک حادثے کے بارے میں چہ میگوئیاں کررہے تھے۔ آئی جی کی طرح دوسروں کی بھی متفقہ رائے یہی تھی کہ بم بلاسٹ میں ڈی آئی جی کا کوئی دشمن ہی شامل ہوگا۔ مشترکہ شبہ اسی کانسٹیبل پر کیا جارہا تھا جس کے جسم پر موجود لباس سے اس کی موت کے بعد بھاری رقم برآمد ہوئی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد سرجن آپریشن روم سے باہر نکلا پھر وہ آئی جی کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے اپنے دفتر میں چلا گیا۔ اورنگ زیب نے سراج کو رکنے کا اشارہ کیا پھر آئی جی کے پیچھے پیچھے وہ بھی اندر چلا گیا۔ آئی جی کے چہرے کے تاثرات ترجمانی کررہے تھے کہ اسے اورنگ زیب کا اندر آنا اچھا نہیں لگا لیکن وہ اس وقت اس کا برملا اظہار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

سرجن اپنے دفتر کے اٹیچڈ باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر اپنی سیٹ پر بیٹھا تو آئی جی نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"فوری طور پر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" سرجن نے کچھ توقف سے کہا۔ "مریض کے ہوش آنے پر ضروری ٹیسٹ اور بھی ہوں گے۔ ان کا رزلٹ آنے کے بعد ہی صورت حال کا اندازہ ہوگا۔"

"فی الحال مریض کی کیا پوزیشن ہے؟" آئی جی نے سوال کیا۔

''موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے لیکن موجودہ آپریشن کے بعد میرا خیال ہے کہ مریض کو چالیس منٹ سے لے کر ایک گھنٹے تک ہوش آجائے گا مگر......'' سرجن نے جملہ ادھورا چھوڑا تو اورنگ زیب نے دبی زبان میں سوال کیا۔

''آپ کچھ کہتے کہتے رک گئے، کیا مریض کو کوئی اور خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے؟''

''ہاں......آں......اس کے امکانات کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''کوئی خاص بات؟'' آئی جی نے پوچھا۔

''مریض کے جسم کا اوپری حصہ بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن نچلا دھڑ زیادہ متاثر ہوا ہے۔''

''کوئی نہ کوئی رائے تو قائم کی ہوگی آپ نے؟'' آئی جی نے دوبارہ وضاحت چاہی۔

''معجزوں کا ہونا قدرت کے اختیار میں ہے لیکن......'' سرجن نے ذرا رک کر جملہ مکمل کیا۔ ''میرا ذاتی تجربہ اور مریض کی موجودہ کنڈیشن کو دیکھ کر یہی اندازہ ہورہا ہے کہ اس کا نچلا دھڑ مفلوج بھی ہوسکتا ہے۔''

''کیا اس امکان سے بچنے کے لیے کوئی فوری علاج ممکن نہیں ہے؟'' اورنگ زیب نے کرسی پر کسمسا کر دریافت کیا۔

''اس کا انحصار مریض کے ہوش میں آنے کے بعد ہونے والے ضروری ٹیسٹ کے نتائج پر منحصر ہے۔''

''ڈی آئی جی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں سرجن۔'' آئی جی نے کہا۔ ''آپ کوشش کریں کہ وہ صحت مند ہونے کے بعد بھی اپنی ڈیوٹی انجام دے سکیں۔''

''ڈونٹ وری، آئی ول ٹرائی مائی بیسٹ۔''

''مریض کے ہوش میں آنے کے بعد کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟'' اورنگ زیب نے پوچھا۔

''آئی ایم سوری۔'' سرجن نے صاف گوئی سے کہا۔ ''مریض کو ابھی ایک دو دن مکمل آرام کی ضرورت ہے۔''

''آپ کو اس حادثے کی اطلاع کیسے مل گئی؟'' اس بار آئی جی نے اورنگ زیب سے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ ''آپ تو شاید کسی مخصوص اجازت نامہ کی بنیاد پر......''

''مرکزی حکومت کے ایک انتہائی خفیہ مشن پر کام کررہا ہوں۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اس حادثے کی اطلاع مجھے ڈی ایس پی سراج نے فون پر دی تھی۔''

''آکٹوپس کے بارے میں کوئی اطلاع؟''

''سوری سر۔'' اورنگ زیب نے اس بار سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''قبل از وقت میں اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''جو کام آپ آج کل نمٹا رہے ہیں اس میں ابھی اور کتنے دن لگیں گے؟''

''حالات پر منحصر ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' اورنگ زیب جواب دینے کے بعد اٹھا پھر پروٹوکول نبھانے کی خاطر اس نے آئی جی کو سلیوٹ کیا اور باہر آگیا جہاں سراج اس کا منتظر تھا۔

واپسی میں کچھ دیر خاموشی رہی پھر سراج نے گفتگو میں پہل کی۔

''ڈی آئی جی کو پیش آنے والے حادثے کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''جس کانسٹیبل کو راستے سے ہٹا دیا گیا، میری اطلاع کے مطابق وہ بکاؤ نہیں تھا۔''

''پھر......؟'' سراج نے چونک کر وضاحت طلب لہجے میں سوال کیا۔ ''اس کو کس نے ٹھکانے لگا دیا؟''

''کسی کیس میں پیچیدگی پیدا کرنے کی خاطر اسی قسم کے ہتھکنڈے اکثر اختیار کیے جاتے ہیں۔'' اورنگ زیب نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس معاملے میں بھی کسی نہ کسی زاویے سے شیخ حامد ہی کا ہاتھ شامل ہو۔''

''اگر آپ کا اندازہ درست ہے تو میں ڈی آئی جی کے بچ جانے کو ایک معجزہ ہی کہوں گا۔'' سراج نے حیرت کا اظہار کیا۔

''معجزوں کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور کارفرما ہوتی ہے۔'' اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا پھر اس نے موبائل پر آنے والی کال وصول کی۔ معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''کیا پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں کرنی؟''

''یہی سوال میں آپ سے کرنے والا تھا؟'' دوسری جانب سے سکندر علی شاہ کی آواز ابھری۔ ''ڈی آئی جی کو جو حادثہ پیش آیا ہے اس کی اطلاع مجھے بھی مل چکی ہے۔''

''میں اس وقت اسپتال ہی سے آرہا ہوں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''گویا پروگرام پکا ہے؟''

''ہنڈریڈ پرسنٹ۔ میں سورج ڈھلتے ہی پہنچ جاؤں گا لیکن ایک بار پھر وہی پرانی درخواست دُہراؤں گا کہ......''

''ڈونٹ وری۔'' دوسری جانب سے جملہ منقطع کرتے ہوئے کہا گیا۔ ''آپ کو دوست کہا ہے تو آپ کی عزت کا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے۔''

رابطہ ختم ہوا تو اورنگ زیب نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی الجھی ہوئی ڈور سلجھانے کی کوشش کررہا ہو۔

سراج نے اس وقت اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ ڈی آئی جی کو پیش آنے والے حادثے کے بعد اس کے ذہن میں بہت سارے سوالات گونج رہے تھے۔

☆☆☆

آنے والے وقت کے بارے میں کوئی بھی یقین سے ایک حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ امکانات کے بارے میں سوچنا انسان کی سرشت میں داخل ہے چنانچہ اورنگ زیب بھی اس وقت لیاقت حسین کے ساتھ فارم ہاؤس کی سمت جاتے ہوئے امکانات پر بڑی سنجیدگی سے غور کررہا تھا۔

پچھلے دنوں سے جو حادثات تواتر سے پیش آرہے تھے وہ اس بات کی نشاندہی کرنے کے لیے بہت کافی تھے کہ شیخ حامد کسی خاص وجہ سے بوکھلاہٹ کا شکار ہے ورنہ انڈر ورلڈ کے ڈان اس انداز میں کھلے عام نہ تو واردات کرتے ہیں نہ ہی اس کی تشہیر کرنے کی حماقت کرتے ہیں۔ سامنے ہونے کے باوجود سات پردوں میں روپوش رہنا ان کے مشن کا اہم مقصد ہوتا ہے۔ کبھی یہ ساری خاصیتیں شیخ حامد میں بھی تھیں۔ وہ ایک کاروباری شخصیت کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا تھا۔ اس کے گرگے اور زرخرید جرائم پیشہ جو وارداتیں کرتے وہ خود بھی اس بات سے لاعلم ہوتے کہ ان وارداتوں کے پس پردہ کس کا ہاتھ ہوتا تھا۔ معاشرے میں شیخ حامد نے اپنی جو حیثیت منوائی اور جو مقام حاصل کیا تھا اس کے پیش نظر پولیس کو ابھی اس کی اصلیت کا علم نہیں تھا۔ جن افراد کو شبہ بھی ہوتا وہ بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتے تھے لیکن وقت اور معاملات کا گراف ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رخ بھی بدلتا رہتا ہے۔ شیخ حامد سے بھی ماضی میں کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں سرزد ہوئی تھیں جو دبے قدموں اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ جس چیز کو پسند کرلیتا اسے کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا اس کے لیے ایک چیلنج بن جاتا۔ ان خواہشات کی تکمیل کی... راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو ہمیشہ کے لیے دور کردینا اس کی سرشت میں داخل تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صوبے اور مرکز کی تمام بڑی بڑی شخصیتیں اس کے حلقۂ احباب میں شامل تھیں۔

جڑیں مضبوط ہوں تو درخت کے تناور ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن آسمانی بجلی جس شاخ پر ایک نظر غلط انداز ڈال دے وہ زیادہ سرسبز بھی نہیں ہوتی۔ یہ قانون قدرت ہے جس کے آگے انسانی قوتیں ہمیشہ سرنگوں رہی ہیں، خون بھی اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے۔

میڈم روبی کے حصول کی خاطر شیخ حامد نے اس کے مظلوم شوہر کو ٹھکانے لگا کر خدا کے قہر کو للکارا تھا۔ ماں کی موت کے بعد شبنم کی آہ نے بھی دبے قدموں شیخ حامد کا تعاقب شروع کردیا تھا۔ وقت اور حالات نے افضل خان کو بھی اس کا مخالف کردیا لیکن وہ اب بھی برملا اپنی طاقت کا اظہار کرنے کی حماقتیں کررہا تھا۔ ڈی آئی جی کو پیش آنے والا حادثہ بھی ایک اہم کڑی تھی۔

ایک بار مرنے کی اطلاع گرم ہونے کے بعد وہ دوبارہ سامنے آیا تو پہلے سے زیادہ محتاط ہوگیا۔ ایسی کسی جگہ روپوش ہوکر بیٹھا جس کا علم کسی کو نہ چل سکا۔ سب سے پہلے سراج نے سکندر علی شاہ کے فارم ہاؤس پر شبے کا اظہار کیا تھا۔ ایس پی اورنگ زیب نے اس کے شبے کی تردید کھل کر نہیں کی لیکن اتنا ضرور کہا تھا کہ خود سکندر علی شاہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے واقف نہیں ہوگا۔ بہرحال اس نے ڈور کا وہ سرا تھام لیا تھا پھر جب ایک دن سکندر علی شاہ نے اورنگ

حاضر دماغی

☆استانی نے پڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ میں خوب صورت تھی تو یہ ہوا زمانہ ماضی اور اگر کہوں کہ میں خوب صورت ہوں تو یہ کیا ہوا؟''

پیچھے سے آواز آئی۔ ''سفید جھوٹ۔''

☆ایک سردار نے ماچس نکالی اور تیلی جلائی جو نہ جلی۔ دوسری جلائی وہ بھی نہیں جلی، تیسری جلائی وہ جل گئی تو سردار نے جلدی سے بجھادی اور بولا۔ ''یہ کام کی ہے رکھ لیتا ہوں۔''

☆ایک بے وقوف کو پوری رات مچھروں نے کاٹا اس کا دماغ گھوم گیا۔

اس نے زہر پی لیا اور بولا۔ ''لو اب کاٹو سب کے سب مرو گے۔''

مرسلہ: ذیشان طارق، منڈی بہاؤ الدین

زیب سے دوبدو گفتگو کے دوران نہ صرف اس کی سابقہ شادی کے بارے میں حیرت انگیز طور پر زبان کھولی بلکہ کسی کا فون آنے کے بعد اسے فارم ہاؤس آکر کسی لڑکی سے دل بہلانے کی تجویز بھی پیش کی تو اورنگ زیب کا ماتھا آنے والے فون سے ٹھنکا تھا اور اسی ایک شبہے کی بنیاد پر اس نے سکندر علی شاہ کی دعوت کو قبول کرلیا تھا۔ اپنی حفاظت کے لیے اس نے کرنل احتشام کو بھی اعتماد میں لے کر سارے معاملات طے کرلیے تھے۔

اس وقت بھی اورنگ زیب کا ذہن آنے والے لمحات کے بارے میں تانے بانے جوڑنے میں مصروف تھا جب لیاقت حسین کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس نے دبی زبان میں کہا تھا۔

”صاحب، آپ کو فارم ہاؤس میں کیا کام پیش آگیا؟ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جگہ خاصی بدنام ہوچکی ہے۔“

”پولیس ہمیشہ ایسی جگہوں کا کھوج لگاتی ہے لیاقت حسین۔“ اورنگ زیب نے اسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔ ”سکندر علی شاہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ کسی مظلوم اور یتیم لڑکی کا قاتل بھی ہوسکتا ہے؟“

”اس کا علم بھی خدا کو ہوگا صاحب۔“ لیاقت حسین نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ”میں یقین سے کیسے کہہ سکتا ہوں۔“

اورنگ زیب نے دوبارہ لیاقت حسین کو نہیں کریدا اگر اس سے پیشتر اس نے جو جملے سکندر علی شاہ کو پہلی بار دیکھ کر کہے تھے اور سپر اسٹور پر جو واقعہ شیلا ورما کے ساتھ پیش آیا تھا وہ اورنگ زیب کے ذہن میں اس وقت بھی گردش کررہا تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد گاڑی فارم ہاؤس کے دروازے پر پہنچی تو اسے بغیر کسی پوچھ گچھ کے کھول دیا گیا۔ سکندر علی شاہ سامنے ایک تناور درخت کے نیچے پڑی ایزی چیئر پر بیٹھا تھا۔ لیاقت حسین نے نیچے اتر کر گاڑی کا دروازہ کھولا تو سکندر علی شاہ بھی اٹھ کر قریب آگیا۔ فارم ہاؤس کے سارے ملازم روبوٹ ہی کے انداز میں پوری طرح محتاط تھے۔

اورنگ زیب کے ذہن میں ایک لمحے کو یہ خیال آیا کہ کہیں سکندر علی شاہ کو دیکھ کر لیاقت حسین کی خداداد قوتیں دوبارہ اس کی زبان پر نہ آجائیں لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ سکندر علی شاہ کے اشارے پر اس کے آدمی لیاقت حسین کو آرام کرنے کی غرض سے سرونٹ کوارٹر کی طرف لے گئے۔ اورنگ زیب نے سکندر علی شاہ کے گیسٹ روم کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے درخواست کی۔

”میں آپ کے مشورے پر یہاں تک آ تو گیا ہوں شاہ جی لیکن......“

”اب آپ یہاں تک آگئے ہیں تو ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں۔ پوری طرح انجوائے کریں۔“ سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب کا ہاتھ تھام کر بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ کے لیے جو بدیسی تتلی منگوائی ہے اسے دیکھ کر ہی آپ کا آدھا مرض ختم ہوجائے گا۔“

اورنگ زیب مسکرا کر خاموش ہی رہا لیکن اس کی نظریں فارم ہاؤس کے ایک ایک چپے پر بھٹک رہی تھیں۔ ماحول، بناوٹ اور سجاوٹ کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ برقی قمقموں کی روشنی سونے پر سہاگے کا کام انجام دے رہی تھی۔ سکندر علی شاہ نے اس کی محویت بھانپ کر سرسراتے لہجے میں کہا۔

”مجھے خوشی ہے کہ یہ چھوٹا سا فارم ہاؤس آپ کو پسند آگیا۔“

”آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔“ اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جنگل میں منگل منانے والا محاورہ آپ کے فارم ہاؤس کی خوبصورتی کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔“

دونوں قدم اٹھاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس تک آگئے۔ سکندر علی شاہ نے دروازے پر رک کر پھر بے تکلفی سے کہا۔ ”اب آپ آج رات کھل کر انجوائے کریں، کل ملاقات ہوگی۔“

اورنگ زیب نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا پھر سکندر علی شاہ کے جانے کے بعد اس نے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا تو اس خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا جو مختصر لباس میں سامنے کھڑی قدرے جھک کر اس کو خوش آمدید کہنے کی کوشش میں کھلے گلے کی فراک سے اپنے اندرونی جسم کی نمائش بھی کررہی تھی۔ شکل وصورت اور نشست وبرخاست سے وہ غیر ملکی ہی لگ رہی تھی لیکن اس نے گفتگو کی ابتدا بڑی شستہ اردو بولتے ہوئے کی۔

”میں بڑی بے چینی سے آپ کی آمد کا انتظار کررہی تھی۔ شاہ جی نے مجھے جو قیمت ادا کی ہے وہ میرے مطالبے سے کہیں زیادہ ہے۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔“

”گڈ۔“ اورنگ زیب نے بے تکلفی سے کہا پھر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”آپ شاید یہاں پہلے بھی آتی رہی ہیں؟“

”جی نہیں۔“ لڑکی نے قدرے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھی کبھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھی۔“

”پھر شاہ کی دعوت آپ نے کیسے قبول کرلی؟“

”آپ اسے میری مجبوری یا......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر اپنی تہذیب کا برملا مظاہرہ کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ نے جو خشک ٹاپک چھیڑا ہے اگر ہم اس سے ہٹ کر گفتگو کریں تو زیادہ انجوائے کرسکتے ہیں۔“

”ایک ان جانے مرد کے ساتھ کسی گیسٹ ہاؤس کے کمرے میں رات گزارنے کا مطلب سمجھتی ہیں آپ؟“ اورنگ زیب نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”ہمارے معاشرے میں اسے زیادہ معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔“ اس نے اورنگ زیب کے قریب آتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اکثر لڑکیاں شادی کے بعد بھی اپنے شوہر کی موجودگی میں اپنے بوائے فرینڈز سے ملتی جلتی ہیں۔ مرد کو بھی اس کا حق حاصل ہے۔“

”آپ نے ابھی تک اپنا خوب صورت نام نہیں بتایا۔“ اورنگ زیب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”میرے واقف کار مجھے ایمی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ چاہیں تو کسی اور نام سے یاد کرلیں، میں اعتراض نہیں کروں گی۔“ ایمی نے بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اورنگ زیب کا ہاتھ تھام لیا پھر اس میز تک لے گئی جو ایک گوشے میں رکھی تھی۔ میز پر دو تین گلاسوں کے علاوہ اعلیٰ برانڈز کی دو بوتلیں بھی موجود تھیں۔

”آپ کیا پینا پسند کریں گے؟“ ایمی نے کرسی پر بیٹھ کر بڑی اپنائیت سے پوچھا۔

”میں کوکٹیل پینے کا عادی نہیں ہوں۔“ اورنگ زیب نے ایمی کو خوابیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ موجود ہیں تو پھر کسی دوسری شراب کی کیا ضرورت ہے؟“

جواب میں ایمی کھل کر ہنسی پھر وہ اپنے لیے ایک جام تیار کرنے لگی۔ اورنگ زیب کی تجربہ کار نظریں کمرے کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے رہی تھیں پھر وہ چھت کے درمیان لٹکے ہوئے فانوس پر پڑیں جہاں خفیہ کیمروں کے ذریعے پورے کمرے کی تصاویر لینے یا مووی بنانے کی خاصی گنجائش موجود تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ شاید اسے فارم ہاؤس تک لانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ قابل اعتراض تصویریں حاصل کرنے کے بعد اسے بلیک میل کیا جاسکے۔ اس خیال کے ابھرتے ہی شیخ حامد کا نام بھی بجلی بن کر کوندا تھا۔

اورنگ زیب نے غیر ملکی کمسن لڑکی کی جانب دیکھا جسے ایک بڑی مچھلی کو پھانسنے کی خاطر بطور چارے کے استعمال کیا گیا تھا۔ وہ نامعلوم شخص بھی ذہن میں کانٹا بن کر چبھا جس کی کال وصول کرنے کے بعد ہی سکندر علی شاہ نے اورنگ زیب کو اس کے ماضی کے بارے میں بتانے کے ساتھ اس کا وہ علاج بھی تجویز کیا تھا جس کے پیش نظر وہ اس وقت فارم ہاؤس کے گیسٹ روم میں ایک خوب صورت تتلی کے ساتھ موجود تھا۔ سراج کے کچھ شبہات بھی اس کے ذہن میں کلبلانے لگے۔

اورنگ زیب نے سچویشن کے عین مطابق خود کو درپیش صورت حال کے سانچے میں ڈھالنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایمی سے کھل کر لگاوٹ کی باتیں کرنے لگا جو دو پیگ پینے کے بعد ہی نشے کی کیفیت سے دوچار ہوچکی تھی۔

”تم خاموش کیوں ہو ڈارلنگ؟“ اس نے مخمور نظروں سے اورنگ زیب کو گھورتے ہوئے نشیلی آواز میں کہا۔ ”ابھی تو ہمیں اسی چھت کے نیچے پوری رات ایک ساتھ گزارنی ہے۔“

”کیا تم اسے ایک مجبوری سمجھ رہی ہو؟“ اورنگ زیب نے پہلی بار رومانٹک لہجہ اختیار کیا۔

”نہیں۔“ لڑکی نے گلاس میں بچی شراب کو حلق میں انڈیلتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم وہ پہلے مرد ہو جو مجھے ہر اعتبار سے اچھے لگے ہو۔ تمہارے ساتھ رات گزار کر مجھے خوشی ہوگی۔“ ایمی نے کھل کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔

”کیا یہ رات میز کرسی پر بیٹھ کر گزارنے کا ارادہ ہے؟“

جواب میں ایمی نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی پھر وہ اورنگ زیب کا ہاتھ تھام کر اس بستر پر آگئی جو مشرقی کونے میں تھا۔ خاصی دیر تک وہ اورنگ زیب سے لگاوٹ کی باتیں کرتی رہی پھر بڑھتے ہوئے نشے نے اس کو ضرورت سے کچھ زیادہ بے خود بھی کردیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی فراک اتار کر ایک طرف پھینکی پھر کسی جونک ہی کی طرح اورنگ زیب سے چمٹ گئی۔

اورنگ زیب کے لیے وہ لمحات بڑے صبر آزما تھے۔ ایک خوب صورت بدیسی لڑکی کا عریاں جسم اسے گرما رہا تھا لیکن آکٹوپس کا تصور بار بار اس کے آڑے آرہا تھا۔

”تم......تم کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ؟“ ایمی نے مخمور لہجے میں اورنگ زیب کو اکسانے کی کوشش کی۔ ”کم

"آن...... لیٹ اس انجوائے۔" بڑے جذباتی انداز میں اورنگ زیب کے وجود سے نوچ کھسوٹ کرنے لگی۔ اس کی اصلیت بڑی تیزی سے بے نقاب ہو رہی تھی۔ وہ معصوم نہیں پروفیشنل ہی تھی جو اس قدر بے شرمی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

اورنگ زیب نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی جو نصف رات ہونے کا اعلان کر رہی تھی۔ ایمی کی جذباتی کیفیت کے باوجود اورنگ زیب کے ذہن میں وہ مقصد ابھر آیا جو اسے فارم ہاؤس تک لایا تھا۔ اس نے بڑی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے ایمی سے کہا۔

"آئی ایم سوری ہنی، شاہ جی نے تمہیں بک کرتے وقت شاید اس حقیقت سے آگاہ نہیں کیا کہ میں مردانہ صلاحیتوں سے یکسر محروم ہوں۔"

"وہاٹ...... نان سنس۔" ایمی نے اس بار بڑی حقارت سے اورنگ زیب کو گھورا۔ "تم...... میرے ساتھ ایک گھٹیا مذاق کر رہے ہو۔ یو...... شٹ......"

"ڈونٹ شاؤٹ۔" اورنگ زیب نے جھلا کر جواب دیا۔ "تمہیں ایک رات کی ایڈوانس پے منٹ کی جا چکی ہے۔ تم کوئی پروٹیسٹ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"ایس پی مسٹر اورنگ زیب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" کمرے میں دروازے سے دبے قدموں اندر داخل ہو کر سکندر علی شاہ نے سرسراتے انداز میں ایمی سے کہا۔ "تم اپنا کردار نبھا چکیں اس لیے اب جا سکتی ہو۔"

اورنگ زیب نے چونک کر سکندر علی شاہ کو دیکھا جو یقیناً کسی ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا۔ وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ ایک خبط الحواس صورت ملازم بھی موجود تھا۔

"شاہ جی...... آپ......" اس نے حیرت کا اظہار کیا پھر ایک ہی جھٹکے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جو صورت حال درپیش تھی وہ اورنگ زیب کے لیے زیادہ تعجب خیز بھی نہیں تھی۔

"ڈونٹ وری ایس پی۔" سکندر علی شاہ نے بائیں آنکھ جھپکا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری اور ایمی کی جو فلم اور تصاویر بنی ہیں اس کے بعد میں بھی تمہیں دوست ہی کہوں گا البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اب تم پوری طرح میری مٹھی میں آ گئے ہو۔"

"آئی سی۔" اورنگ زیب نے بل کھا کر کہا۔ "گویا تم نے میرے ساتھ دغابازی کی ہے۔"

"دغابازی نہیں...... سیاست کہو۔" سکندر علی شاہ نے فاتحانہ انداز اختیار کیا۔ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے فارمولے کو منوانے کے لیے میں نے جو کچھ کیا، اسے بھی سیاست ہی کا نام دوں گا۔"

"غوں...... غاں...... غاغا......" سکندر علی شاہ کے ساتھ موجود ملازم نے حلق سے آوازیں نکال کر اس کی بات کی تائید کا اعلان غوں غا اور غاغا سے کیا تو اورنگ زیب کے ذہن میں سب انسپکٹر رانا حمید کی اس فائل کے مکمل اندراجات تازہ ہو گئے جو سکندر علی شاہ کی اصلیت اور اس کے گونگے ملازم سے متعلق تھے۔ اس مظلوم ملازم کی کہانی بھی یاد آ گئی جس کی نوبیاہتا بیوی کو پہلی رات کسی اور نے بے آبرو کر کے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس کے قتل کے الزام میں ملازم کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی تھی۔ کمرائے عدالت میں آخری وقت اپنے بے گناہ ہونے کا چیخ چیخ کر اعلان کرتا رہا لیکن اندھے قانون نے اس کی کوئی داد فریاد نہیں سنی۔

اورنگ زیب خاموش کھڑا فائل کے اندراجات کی روشنی میں سکندر علی شاہ کا مکروہ چہرہ گھورتا رہا۔ اس کے اندر نفرت اور حقارت کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا لیکن وہ چہرے کے تاثرات سے اپنی بے بسی کا اظہار ہی کرتا رہا۔

"کیا سوچ رہے ہو ایس پی؟" سکندر علی شاہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ "جو ہونا تھا وہ ہو چکا، گیا وقت واپس بھی نہیں آتا۔ اب صرف ایک صورت ہے، تم میرے معاملات میں زیادہ ہاتھ پیر چلانے کی حماقت کبھی نہ کرنا، اس کے عوض تمہیں زر اور زن دونوں حاصل ہوتے رہیں گے۔"

اورنگ زیب کی قوت برداشت اس کے اختیار سے باہر ہونے لگی۔ اس کے لیے جو ٹریپ تیار کیا گیا تھا اس کی طے شدہ پلاننگ پہلے ہی سے ایک فائل میں درج کر کے ملٹری انٹیلی جنس کے سربراہ کرنل احتشام کے حوالے کی جا چکی تھی۔ اس وقت بھی کرنل احتشام کے سادہ لباس کمانڈوز فارم ہاؤس کے اطراف میں موجود تھے۔ اورنگ زیب جیب میں رکھے ہوئے موبائل کے دو نمبر دباتا تو کمانڈوز اپنا ایکشن کرنے میں دیر نہ کرتے۔ سکندر علی شاہ کی ساری خوش فہمی بھی دور ہو جاتی لیکن اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی جو ہوا وہ بھی کچھ کم تعجب انگیز نہیں تھا۔

لیاقت حسین کسی چھلاوے ہی کی طرح اندر داخل ہوا۔ سکندر علی شاہ کے بجائے اس نے گونگے کی گردن دبوچ لی۔

"غوں...... غاں...... آآں...... غوں......" گونگا ہاتھ پاؤں چلانے لگا، سکندر علی شاہ اچانک اس افتاد سے بوکھلا کر رہ گیا پھر اس نے تحکمانہ انداز میں اورنگ زیب سے کہا۔

"اپنے اس نامعقول ڈرائیور سے کہو کہ یہ میرے ملازم کو چھوڑ دے ورنہ......"

"پلید کا بچہ......" لیاقت حسین نے سکندر علی شاہ کی بات کو نظر انداز کر کے براہ راست گونگے کو خوابیدہ لہجے میں للکارا۔ "غوں...... غاں کا آواز نکالنے کے بجائے اپنی زبان میں مکمل کر بات کرو۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" اس بار سکندر علی شاہ نے لیاقت حسین کو مخاطب کیا۔ "یہ آدمی گونگا ہے۔ ہمارے، تمہارے انداز میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ چھوڑ دو اسے۔"

لیاقت حسین کی نظروں کا زاویہ بدل گیا۔ اس کی نگاہوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ بہ دستور بدلے ہوئے لہجے میں اس نے سکندر علی شاہ کو کرخت آواز میں مخاطب کیا۔

"یہ گونگا نہیں ہے بلکہ تمہارا باپ دلدار علی کا بھی باپ ہے۔ گونگا وہ ہے جس نے تم کو اپنے ملازم کی عورت کے ساتھ پہلی رات بدفعلی کرتے دیکھ لیا تھا۔ تم نے اپنا اس ملازم کو بے گناہ پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے بعد جس گونگے کو کوٹھی سے ہٹا کر ادھر اپنی عیاشی کے اس اڈے پر بھیجا تھا اب وہ غریب اپنا کمرے میں پڑا موت کی آخری سانس لے رہا ہے۔" لیاقت حسین بولتا رہا۔ "یہ ولد الحرام جو غوں غاں کر رہا ہے یہی سارے فساد کا جڑ ہے۔ شکرہ کے نام سے یہ تم کو بھی پالتو کتوں کی طرح اپنے اشاروں پر نچاتا رہا لیکن اب اس کے ساتھ ہی قدرت کا لاٹھی تمہارا لیے بھی حرکت میں آ چکا ہے۔ نیلی چھتری والا نے تم دونوں کے ہاتھ میں جو کشکول دیا تھا وہ بھر چکا ہے...... سنا تم نے ڈپا پیر؟"

سکندر علی شاہ، لیاقت حسین کی بات سن کر حیرت سے آنکھیں پھاڑنے لگا۔ اورنگ زیب بھی اس غیبی قوت کے کرشمے کو دیکھ رہا تھا جو لیاقت حسین کی صورت میں اس کے سامنے موجود تھا۔

ایک لمحے کو گیسٹ روم میں موت کا سکوت طاری ہو گیا لیکن گونگے نے جو شیخ حامد کی بدلی ہوئی شکل تھا، موقع کی نزاکت کو بھانپ لیا۔ اس نے اچانک اپنے الٹے ہاتھ کی کہنی لیاقت حسین کے پیٹ پر پوری شدت سے ماری۔ لیاقت حسین نے کراہ کر پیٹ پر ہاتھ رکھا تو گونگے کے میک اپ میں نظر آنے والا شیخ حامد اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ موقع کی نزاکت کے پیش نظر اورنگ زیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل کے دو مخصوص نمبر پنچ کیے تو کرنل احتشام کے کمانڈوز حرکت میں آ گئے۔

بڑے شور و غل کی آوازیں ابھریں تو شیخ حامد نے گیسٹ روم کے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ سکندر علی شاہ بھی بدلتی صورت حال سے بری طرح بوکھلا گیا تھا۔ لیاقت حسین کے منہ سے نکلے ہوئے جملوں کو ہضم کر لینے کے بعد وہ بھی خوف زدہ نظروں سے شیخ حامد کو دیکھ رہا تھا۔

"میرا مشورہ ہے کہ تم اب خود کو قانون کے حوالے کر دو۔" اورنگ زیب نے بے حد سرد لہجے میں شیخ حامد سے کہا۔ "اس کے سوا تمہارے پاس کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔"

"تم بھول رہے ہو ایس پی کہ میں ڈان بھی ہوں اور ڈان پھانسی کے پھندے تک جانے کی حماقت کبھی نہیں کرتے۔ ذلت آمیز صورت حال سے بچنے کی خاطر ہمیشہ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔" شیخ حامد نے بے پروائی سے جواب دیا پھر اس کے آگے کچھ کہنے کی حسرت اس کے دل میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ لیاقت حسین نے بجلی سے چلنے والے کسی روبوٹ کی طرح چھلانگ لگا کر شیخ حامد کو ہاتھوں کے حلقے میں پوری طرح دبوچ لیا تھا۔ سکندر علی شاہ سکتے کی کیفیت سے دوچار تھا جس کا فائدہ اٹھا کر اورنگ زیب نے حیرت انگیز پھرتی سے کام لے کر گیسٹ روم کا دروازہ کھول دیا جس کے بعد کرنل احتشام کے سادہ لباس کمانڈوز نے صورت حال پر قابو پا لیا لیکن شیخ حامد اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کے منہ سے نکلنے والے جھاگ اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ اس نے اپنے کسی فالس ٹیتھ کے اندر رکھے ہوئے زہریلے کیپسول کو نکال کر چبا لیا تھا۔ موت اور زیست کی کشمکش سے دوچار ہونے کے باوجود اس نے اورنگ زیب پر نظر ڈال کر بڑے فخریہ انداز میں کہا تھا۔

"میں کل بھی ڈان تھا اور آج...... آج بھی...... ڈان...... ڈان......" اس کے آگے وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ کمانڈوز کی گرفت میں جھول گیا۔

اورنگ زیب دانت پیسنے لگا۔ اس کے حکم پر سکندر علی شاہ اور گیسٹ ہاؤس کے تمام ملازموں کو حراست میں لے لیا گیا۔ اصلی گونگا بھی بڑی خستہ حالت میں گیسٹ روم کے ایک زمین دوز کمرے سے برآمد ہو گیا۔ وہاں سے ایک چرمی بیگ بھی ملا جس سے چونکا دینے والی ایسی دستاویز نکلیں جن میں مائکرو فلمیں اور خواتین کی برہنہ تصاویر بھی شامل تھیں جن کے ذریعے انہیں بلیک میل کیا جاتا تھا۔

گرفتاری کے بعد پہلی ہی پیشی پر سکندر علی شاہ نے عدالت کے روبرو سر جھکا کر اپنے تمام جرائم کا اعتراف بھی کر لیا جس کے بعد اسے عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ شیلا ورما کے اوپر اسپتال میں پولیس کا دستہ تعینات کر دیا گیا جہاں وہ بہ دستور بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔ شاید جونی کی موت نے

اس کی ذہنی کیفیت کو معطل کر دیا تھا۔ فاضل جج نے اس کو آٹھ سال قید محض اور دو لاکھ جرمانے کی سزا سنائی تھی۔
عدالت برخاست ہونے کے بعد سکندر علی شاہ نے قیدیوں کی گاڑی میں بیٹھتے وقت اورنگ زیب سے درخواست کی تھی۔
"ہو سکے تو گل بانو کا خیال رکھنا۔ وہ پاکباز عورت میرے کسی جرم میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔" پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر سر جھکا کر قیدیوں کی گاڑی میں سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

ڈی آئی جی کی کوٹھی کے لان میں اس وقت میڈم روبی اور تھریسا، سیٹھ عثمان، راحیلہ بیگم، الماس، سراج اور اورنگ زیب کے علاوہ لیاقت حسین اور فرمین بھی موجود تھے۔ خاص طور پر کرنل احتشام کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ افضل خان اور شبنم کی غیر حاضری کی وجہ یہ تھی کہ کرنل احتشام نے ان کی خدمات کے عوض انہیں ہنی مون کے لیے شمالی علاقہ جات کی طرف بھیج دیا تھا۔ اس پارٹی کا اہتمام دو وجوہات سے کیا گیا تھا۔
اول یہ کہ حکومت نے ڈی آئی جی کا نچلا جسم مفلوج ہونے کے باوجود ملازمت سے علیحدہ نہیں کیا تھا، دوسرے اورنگ زیب کی شیخ حامد کے سلسلے میں کامیابی کو بھی سراہا تھا۔
پارٹی میں حسب سابق راحیلہ بیگم پیش پیش تھیں۔ ان کا ایک ہی مقصد تھا کہ میڈم روبی اور ڈی آئی جی کی شادی ہو جائے۔ سیٹھ عثمان نے اس ضمن میں بیوی کو احتیاط سے کوئی آخری فیصلہ کرنے کی تلقین کی تھی اس لیے کہ ڈی آئی جی کے سلسلے میں پولیس سرجن نے بھی یہ بات کھل کر واضح کر دی تھی کہ اب وہ شادی کے قابل نہیں رہا تھا۔
سارے مہمان جمع ہو گئے تو باوردی بیرے بھی کھانے پینے کی ٹرالیاں لان پر لے آئے۔ ڈی آئی جی مہمانوں کے ساتھ ہی اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا حسب معمول خوش گپیوں میں مصروف تھا جب اچانک آئی جی بھی آ گیا۔ اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے سب ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔
"میرے اس وقت یہاں آنے کے دو مقاصد تھے۔ اول تو یہ کہ میں شہر میں ہونے والے ہنگاموں اور تقریبات کے معاملے میں بے خبر نہیں رہتا اور دوسرے آپ کو شیخ حامد کے سلسلے میں خراج تحسین بھی پیش کرنا تھا۔ آپ نے بہت سی رکاوٹوں کے باوجود جو کارنامہ انجام دیا ہے میں اس پر آپ کو اپنی اور سب کی جانب سے دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یو آر رئیلی گریٹ۔"
آئی جی کے ساتھ سب نے مل کر مخصوص انداز میں تالیاں بجائیں۔ اس کے بعد سراج نے سنجیدگی سے دبی زبان میں آئی جی سے کہا۔ "سر! اگر آپ مسٹر اورنگ زیب کو دوبارہ ان کی سیٹ سونپ دیں تو میں ڈبل ڈیوٹی کی پریشانی سے بھی بچ جاؤں گا۔"
"فی الحال میں اس کی مخالفت کروں گا۔" کرنل احتشام نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "آکٹوپس یا شیخ حامد سے جنگی مہم میں انہوں نے جو گرانقدر کامیابی حاصل کی ہے اس کے بعد ان کو محکمے کی جانب سے انعام کے علاوہ کم از کم دو ماہ کی چھٹی بھی ملنی چاہیے۔ ذاتی طور پر میں مسٹر اورنگ زیب کے لیے اپنے محکمے کی جانب سے گولڈ میڈل کا اعلان کرتا ہوں جس کی تقریب کا اہتمام بھی طے ہو چکا ہے۔"
اس اعلان کے بعد سب نے تالیاں بجا کر اورنگ زیب کو خراج تحسین پیش کیا۔ تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو اورنگ زیب نے سب کا شکریہ ادا کیا پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا۔
"شیخ حامد یا آکٹوپس کے سلسلے میں مجھے جو کامیابی ملی اس میں خدا کی مرضی کے ساتھ کچھ لوگوں کی بددعائیں بھی شامل تھیں۔ میرا اشارہ ان افراد کی طرف ہے جو شیخ حامد سے نفرت کرنے کے باوجود اس کے کسی اشارے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے تھے اس لیے کہ ان کی کوئی نہ کوئی دکھتی رگ اس بے غیرت کے ہاتھ میں تھی جس کا کوئی دین وایمان نہیں تھا لیکن اصلی گوتگے کو گیسٹ روم کے جس زمین دوز کمرے سے برآمد کیا گیا وہاں سے وہ تمام دکھتی رگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں میرے ہاتھ لگ گئیں......"
اورنگ زیب نے کچھ توقف سے کہا۔ "جہنم رسید ہونے والے نے کچھ مخصوص لوگوں کے لیے اپنے نام کو برا اور شکرہ جیسے رکھ لیے تھے۔ ایسی مخرب اخلاق تصاویر بھی ہاتھ آئیں جن کی وجہ سے کوئی اس کے خلاف زبان نہیں کھول سکتا تھا اور حسب حیثیت اپنی عزت بچانے کی خاطر کچھ نہ کچھ دفاعی صورتیں اختیار کرنے پر مجبور تھا مگر میں نے وہ تمام بلیک اسٹف ضائع کر دیا ہے۔ اس لیے اب نہ تو کسی کو اپنی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت ہوگی نہ ہی اپنے تحفظ کے لیے کسی کا محتاج ہونا پڑے گا۔"
اورنگ زیب کے کوبرا اور تحفظ کے حوالے پر آئی جی اور میڈم روبی دونوں ہی اپنی اپنی نشستوں پر کسمسا کر رہ گئے۔
"ایک خاص بات اور کہنا چاہوں گا۔" اس بار اورنگ زیب نے لیاقت حسین کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں اپنی

کامیابی کے سلسلے میں خاص طور پر لیاقت حسین کا شکر گزار ہوں جس نے ہمارے لیے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔"

لیاقت حسین کی تعریف سن کر فرحین بھی کھل اٹھی۔ اس موقع پر الماس نے مسکرا کر شکایتی انداز میں اور نگ زیب سے کہا۔

"آپ نے مجھے بہن بنایا ہے لیکن میرے میاں کی تعریف نہیں کی جو آپ کے آنے سے پہلے ہی شیخ حامد جیسے خطرناک مجرم کو قانون کے شکنجوں میں جکڑنے کی خاطر دن رات ایک کر رہا تھا۔"

"آئی ایگری ود یو۔" کرنل احتشام نے الماس کی حمایت کی۔ "ایسے موقع کے لیے دو محاورے اردو لغت میں بھی موجود ہیں۔ اندھا بانٹے ریوڑیاں اور اپنے اپنوں ہی کو دے اور گھر کی مرغی دال برابر۔"

"میں نے مرغی نہیں اپنے مرغے کی بات کی تھی۔" الماس نے برجستہ کہا تو سب ہی بے اختیار ہنس پڑے۔ خاصی دیر تک سب کے درمیان اسی قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی پھر راحیلہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس موقع پر جب ہم سب اکٹھا ہیں اور یہ بھی طے ہو گیا ہے کہ شیخ حامد اب مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہوگا، میں مس روبی کو ان کا ایک وعدہ یاد دلانے کی کوشش کروں گی۔"

"مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔" میڈم روبی نے کن انکھیوں سے ڈی آئی جی کو دیکھتے ہوئے راحیلہ بیگم سے بے تکلفی سے پوچھا۔ "کیا آپ اس بار بھی انگوٹھی بنوا کر لائی ہیں؟"

جواب میں راحیلہ بیگم نے اپنے بیگ سے سرخ مخملی ڈبیا نکال کر میڈم روبی کے حوالے کی تو ڈی آئی جی نے وہیل چیئر پر پہلو بدل کر میڈم روبی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے بارے میں میڈیکل رپورٹ کا علم سب کو ہے ایسی صورت میں......"

"آئی آبجیکٹ۔" کرنل احتشام نے ڈی آئی جی کو جملہ مکمل کرنے کا موقع نہیں دیا۔ "قربانی کے بکرے کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی اس لیے آپ خاموش ہی رہیں۔"

"آپ سمجھنے کی کوشش کریں کرنل۔" ڈی آئی جی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ ایک دو دن کا نہیں پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"نو آرگیومنٹس۔" کرنل نے فوجی لب و لہجے میں کہا۔ "محاذ جنگ پر لڑنے والے ہمیشہ ڈو اور ڈائی کے فارمولے پر عمل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ب... شعر و شاعری سے بھی کوئی شوق نہیں لیکن اقبال کے بہ... سارے سنے سنائے اشعار ضرور یاد ہیں۔ جنگ کے حوا... سے اقبال کا ایک شعر ابھی تک یاد ہے۔

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی"

کرنل نے روانی میں ایک مصرع پڑھ دیا لیکن اس... محفل میں موجود تقریباً ہر فرد کو معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ... تو خود بھی شرمندگی مٹانے کے لیے زوردار قہقہہ لگانے لگا۔

راحیلہ بیگم، میڈم روبی کا ہاتھ تھام کر ڈی آئی جی ک... طرف بڑھیں تو اس نے پھر ایک بار دبی زبان میں میڈ... روبی سے کہا۔ "آپ ایک وعدے کو پورا کرنے کی خاط... پوری زندگی داؤ پر لگانے کی غلطی کریں گی۔"

"آپ غلط سوچ رہے ہیں۔" میڈم روبی نے بڑ... اعتماد سے جواب دیا۔ "ہم دونوں کو تنہائی دور کرنے ک... خاطر ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔"

پھر میڈم روبی نے بلاجھجک انگوٹھی پہنانے کی رس... پوری کی تو سب ہی اے اور ڈی آئی جی کو مبارک باد دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈی آئی جی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔

راحیلہ بیگم اور الماس کے بعد لیاقت حسین کے اشارے پر فرحین نے بھی اٹھ کر میڈم روبی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ اس کے بعد باوردی بیرے نے سوئٹ ڈش کی سروس بھی شروع کر دی۔ راحیلہ بیگم نے دو روز بعد باقاعدہ نکاح کے اعلان کے ساتھ یہ بھی کہا کہ نکاح کی تقریب ان کے گھر پر ہوگی۔

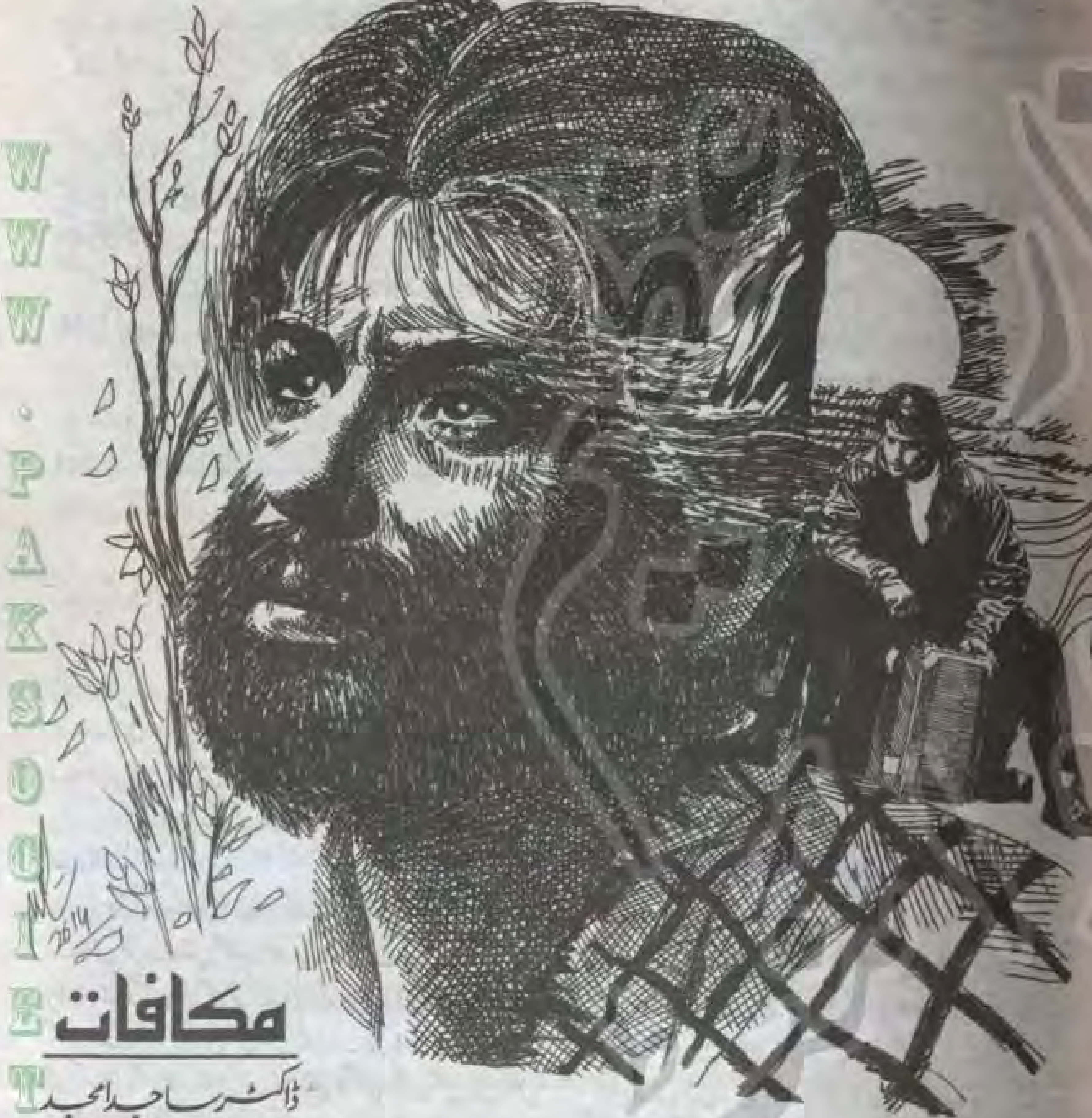
اسی رات گھر پہنچنے پر فرحین نے لیاقت حسین سے پوچھا تھا۔ "کرنل صاحب نے وہ اقبال، مومن اور بے تیغ والا سپاہی کا کیا بات بولا تھا؟"

"وہ......" لیاقت حسین نے فرحین کی نظروں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "وہ بے تیغ والا سپاہی تھا لیکن تیرا لیاقت تیغ والا سپاہی ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ تو اپنے کو درمیان میں کیوں لے آیا؟ میں نے اس شعر کا مطلب پوچھا تھا۔"

"میں تجھے ابھی تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔" لیاقت حسین نے بے اختیار فرحین کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا پھر کمرے کی روشنی بھی بند کر دی۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کی آخری کڑی



مکافات

ڈاکٹر ساجد امجد

زمین زرخیز ہو یا پتھریلی... اس میں جیسا بیج بویا جائے گا فصل ویسی ہی نکلے گی... جانے کیسے احمق لوگ تھے جو ببول بوتے رہے اور گلاب کی امید میں خوابوں کو پریشان کرتے رہے۔ گویا جہاں ہوشیاری کی سرحد ختم ہوتی ہے وہاں سے بے وقوفی کا رستہ شروع ہو جاتا ہے لہٰذا وہ بھی سفر جاری رکھتے ہوئے اسی سمت قدم بڑھاتے رہے... مگر اس لاحاصل سفر کا خمیازہ یہی نکلنا تھا جو نکلا...

کفارہ ادا کرنے والے ایک گناہ گار کا عبرت اثر انجام

وہ چاروں طرف سے گھروں میں گھرا ہوا ایک خالی پلاٹ تھا۔ جب جھاڑیوں نے وہاں رونمائی کی اور کتوں نے بسیرا شروع کر دیا تو پلاٹ کے مالک نے اس پر ایک کمرا، ایک غسل خانہ بنا دیا تا کہ کوئی چوکیدار رکھ دیا جائے۔ کتوں اور انسانوں دونوں سے نجات مل جائے گی کیونکہ کچھ دنوں سے یہ شکایت بھی مل رہی تھی کہ رات کے وقت یہاں ہیروئنچی آ کر بیٹھنے لگے ہیں۔

حاجی نصیر اللہ کا ویلڈنگ کا کارخانہ قریب ہی تھا۔

انہیں جب معلوم ہوا کہ کب سے خالی پڑے پلاٹ پر کمرا بن گیا ہے تو ان کے لیے یہ خبر تاج محل کی تعمیر سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے فوراً عبداللہ کو بلوایا۔

"لے بھئی، میں نے تیرے لیے کمرا بنوا دیا ہے۔ کب تک کارخانے میں پڑا رہے گا۔ آرام سے اپنے گھر میں جا کر رہ۔ پورے چار سو گز کا پلاٹ ہے۔ اتنا بڑا تو میرا گھر بھی نہیں ہے۔"

"استاد کیوں پہیلیاں کہہ رہے ہو۔ کیسا کمرا، کہاں بنوا دیا کمرا۔"

"ابے مرا کیوں جا رہا ہے۔ یہاں سے چوتھی گلی میں سیدھے ہاتھ کو ہے تیرا تاج محل۔ پلاٹ کا مالک تو ملک سے باہر ہے۔ اس کے بھانجے نے کمرا بنوا دیا ہے۔ میرا جاننے والا ہے۔ تو کہے تو بات کروں تیرے لیے؟"

"استاد اتنی تو کم تنخواہ دیتے ہو۔ اب اس میں سے کرایہ بھی نکالوں گا۔"

"کرایہ کوئی مانگ رہا ہے۔ انہیں تو چوکیدار کی ضرورت ہے۔ تیرے وہاں رہنے سے پلاٹ کی حفاظت ہو جائے گی تو، تو وہاں رہ کر ان پر احسان کرے گا۔ وہ تجھ سے کرایہ کیوں مانگیں گے؟"

"اگر ایسا ہے تو بات کر لو۔ میرا کیا ہے وہاں رہ لوں گا۔"

حاجی صاحب نے بات کر لی اور عبداللہ کارخانے سے اس کمرے میں شفٹ ہو گیا۔ اس نے کراچی آنے کے بعد بہت کوشش کی تھی کہ کہیں اسے کمرا کرائے پر مل جائے لیکن اکیلے آدمی کو کوئی بھی کمرا نہیں دے رہا تھا اور اب مفت میں کمرا مل گیا اور کمرے کے پیچھے کا صحن الگ جس میں اس نے خودرو جھاڑیاں کاٹ کر کچھ پودے لگا لیے۔

وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا۔ اس کے ماں باپ ہیں یا آسمان سے گرا ہے، کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ اس نے کسی کو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ دوست نام کی کوئی چیز اس کے پاس تھی ہی نہیں تو بتاتا کس کو۔ حاجی صاحب کو بھی بس اتنا معلوم تھا کہ وہ پچھلے پانچ برسوں سے کراچی میں ہے۔ اس سے پہلے کہاں تھا؟ یہ صرف عبداللہ جانتا تھا۔ اس نے اتنی رازداری کیوں برتی تھی یہ بھی کسی کو معلوم نہیں تھا۔

عبداللہ کا کل سرمایہ روئی کا ایک گدا، سردیوں کے لیے لحاف اور کپڑوں کا ایک چھوٹا سا ٹرنک تھا۔ اتنے سرمائے کے لیے گھر میں تالا کون لگائے۔ وہ یونہی باہر سے کنڈی لگا کر کارخانے چلا جاتا تھا۔ ایک دن وہ گھر آیا تو کپڑوں کا ٹرنک غائب تھا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ کوئی اس سے بھی غریب ہے۔ اس دن کے بعد سے وہ تالا لگا کر جانے لگا تھا۔ جانا کہاں تھا۔ کارخانے سے آنے کے بعد دھو کر فلم کا آخری شو دیکھنے چلا جاتا تھا۔ وہ بھی روزانہ نہیں دوسرے تیسرے دن۔

جس دن سے اس نے گھر میں تالا ڈالا تھا وہ خود کو بھاری بھرکم محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ کسی خزانے کا مالک ہے۔ اس خزانے کی چابیاں اس کی جیب میں ہیں۔ وہ دن میں کئی مرتبہ جیب میں ہاتھ ڈال کر چابیاں دیکھ لیتا تھا۔

⊹⊹⊹

فیروزہ بیس سال کی ہو گئی تھی۔ اس کے خاندان میں عام رواج تھا کہ لڑکیاں پندرہ سولہ کی ہوتے ہوتے اپنے گھر کی ہو جاتی تھیں لیکن وہ کسی صورت شادی پر تیار نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لیے وہ اتنی عمر کر بیٹھی تھی۔

اس کی شادی اس لیے بھی ضروری تھی کہ وہ یتیم تھی۔ چچا چچی کے پاس رہتی تھی۔ کہنے میں یہی بات آتی کہ ماں باپ تو ہیں نہیں چچی کو کیا پڑی ہے جو اس کی شادی کی فکر کرے۔ دور پرے کے رشتہ داروں میں یہ چہ میگوئیاں بھی گردش کرنے لگی تھیں کہ فیروزہ کا باپ ایک مکان چھوڑ کر مرا ہے۔ اگر فیروزہ کی شادی ہو گئی تو وہ مکان فیروزہ کے نام کرنا پڑے گا۔ اس لیے اس کی چچی چاہتی ہی نہیں کہ اس کی شادی ہو۔ چچا بھی اس کے ساتھ مل گیا ہے۔

اس کی چچی جہاں بیٹھتی تھی یہی دکھڑا روتی تھی کہ فیروزہ شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوتی۔ جوان بچی ہے مار پیٹ بھی نہیں سکتے۔ تعویذ گنڈے بھی کرا کے دیکھ لیے مگر کوئی فائدہ نہیں۔ میرا نام تو غیر کا ہے بہن۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ مجھے فکر نہیں۔ قبر کا حال تو مردہ ہی جانتا ہے کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے۔

وہ جہاں بیٹھتی اپنی صفائی پیش کرتی۔ کوئی یقین کرتا کوئی نہیں کرتا۔ زیادہ تر گھروں میں یہ باتیں بن رہی تھیں کہ لڑکی کو بدنام کرنے کے لیے یہ باتیں کی جا رہی ہیں ورنہ ایسی کون لڑکی ہو گی جو شادی کرنا نہ چاہے۔ یہ عورت خود ہی نہیں چاہتی کہ اس کی بھتیجی کی شادی ہو اور وہ مکان سے ہاتھ دھوئے۔

یہ باتیں جب تواتر سے ہونے لگیں اور چچی کے کانوں تک پہنچنے لگیں تو انہوں نے سوچ لیا کہ اب وہ فیروزہ کو شادی پر مجبور کر کے رہیں گی۔ پیار سے بہت کام لے لیا اب سختی سے کام لیں گی۔ شادی وہ نہیں کر رہی ہے، باتیں انہیں سننے کو مل رہی ہیں۔ چودھری سلیم گھر آئے تو انہوں نے

پوری بات میاں کے سامنے رکھ دی۔

"آپ اپنی بھتیجی کو یا تو خود سنبھالیں یا پھر مجھے اجازت دیں۔ میں اس کی ضد نکالوں۔"

"اب کیا ہو گیا؟"

"وہی پرانی ضد کہ شادی نہیں کروں گی۔ طعنے مجھے سننے کو ملتے ہیں۔ لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ پرائی اولاد ہے اس لیے ہمیں کوئی فکر ہی نہیں۔"

"بھئی، تمہارے سامنے کی بات ہے۔ میں بھی سمجھا سمجھا کر تھک گیا۔ اب وہ نہیں مانتی تو میں کیا کروں۔"

"آپ مجھے اجازت دیں۔ میں اسے ٹھیک کرتی ہوں۔"

"اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔ تم اس کی چچی ہو کوئی غیر تو ہو نہیں۔ بچپن سے اسے پالا بھی ہے اور سچی بات یہ ہے کہ یہ باتیں عورتوں کی ہیں، تم ہی نمٹو۔ میرے سامنے تو کچھ بولتی ہی نہیں ہے۔ شاید دل کی بات تم سے کہے۔ نہ جانے کیا بات ہے جب سے اس نے اسکول جانا چھوڑا ہے بالکل چپ ہو گئی ہے۔ دیکھ نہیں رہی ہو کتنی کمزور ہو گئی ہے۔"

چودھری سلیم کے گھر سے نکلتے ہی وہ فیروزہ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔

"تجھے معلوم ہے تیری شادی کے پیچھے محلے میں کتنی باتیں بن رہی ہیں۔ آج تو مجھے صاف صاف بتا دے کہ تو شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی ورنہ تیرا وہ حال کروں گی کہ دنیا دیکھے گی۔"

"وہ حال بنانے سے پہلے ہی میں آپ کو صاف صاف بتائے دیتی ہوں۔ جب میں اسکول جایا کرتی تھی تو ایک لڑکے سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے شادی کا جھانسا دے کر برباد کر دیا۔ میں اب کسی کے قابل نہیں رہی۔ اب میں اپنی بربادی کا اس لڑکے سے انتقام لوں گی یا پھر زندگی بھر شادی نہیں کروں گی۔ سن لیا سچ آپ نے؟"

چچی نے یہ سنتے ہی اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"دیکھ فیروزہ، میری بچی! یہ بات مجھ سے تو کہہ دی ہے کسی اور کے سامنے مت کہنا۔"

"میں تو آپ سے بھی نہ کہتی لیکن آپ نے مجھے مجبور کر دیا۔"

"اگر تو سچ کہہ رہی ہے تو یہ بتا یہ کب کی بات ہے۔"

"میں نے بتایا نا جب میں اسکول جاتی تھی۔"

"بھول جا اس حادثے کو اور اپنا گھر بسا لے۔ تو زبان نہیں کھولے گی تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

"کسی کو نہ معلوم ہو، مجھے تو معلوم ہے۔ جب تک اس دھوکے باز سے انتقام نہیں لے لوں گی میں کچھ اور نہیں سوچوں گی۔ آپ بھی میرا پیچھا چھوڑ دیں۔"

"اچھا یہ بتا وہ کون ہے، کہاں رہتا ہے۔ میں خود اس کے گھر جاؤں گی اور اس کا گریبان پکڑوں گی۔"

"میں نے اس کا گھر نہیں دیکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں رہتا ہے۔"

"تیری بے وقوفی کو میں سلام کرتی ہوں فیروزہ۔ اتنا بڑا کام کر لیا اور اس کا گھر تک نہیں جانتی۔ تو تلاش کرے گی اسے؟"

"آپ کو کیا پتا۔ پانچ سال ہو گئے ہیں اسے ڈھونڈ ہی تو رہی ہوں۔ اس سے ایسا بدلہ لوں گی کہ اس کی روح تک زخمی ہو جائے گی۔"

"پاگل مت بن۔ اس طرح ساری زندگی بھر ڈھونڈتی رہے گی تو وہ تجھے نہیں ملے گا۔ مٹی ڈال اس پر۔ چھوڑ دے بدلے کا خیال، وہ مرد ہے۔ مل بھی گیا تو بدنام تو ہی ہو گی اور تیرے ساتھ ہم بھی۔"

"میں ساری زندگی اسے ڈھونڈتی رہوں گی۔"

"میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ تجھے شادی کرنی ہو گی۔"

"میں نے بتا تو دیا کہ جب تک میں شادی نہیں کر سکتی۔"

"شادی تو تیرا باپ بھی کرے گا۔"

چچی کو نہ جانے کیا جنون سوار ہوا کہ چپل اٹھائی اور تڑاتڑ اس پر برسانے لگیں۔ اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا جیسے اس پر کوئی اثر ہی نہ ہو رہا ہو۔ تھک ہار کر چچی نے خود ہی چپل پھینک دی اور کمرے سے نکل گئیں۔

اس دن کے بعد سے چودھری سلیم کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا۔ چچا اور چچی دونوں مل کر اسے زدوکوب کرتے تھے کہ کسی طرح وہ شادی پر تیار ہو جائے۔ جب وہ بے سدھ ہو کر گر پڑتی تو چچی سرہانے بیٹھ کر سمجھاتی تھیں۔ جس پر مار کا اثر نہ ہو پیار کا اثر کیا ہوتا ایک دن غصے میں آ کر چچا نے اس کی چوٹی کاٹ دی۔

"اب کر لے شادی۔"

وہ بھی پٹتے پٹتے تھک چکی تھی۔ اس نے سوچا کوئی ایسا بہانہ کیا جائے کہ پھر کوئی شادی کا اصرار ہی نہ کرے۔ سوچتے سوچتے اس نے سوچا کہ اگر وہ تھوڑے دنوں کے

لیے پاگل بن جائے تو کسی کو اس گھر میں رشتہ لانے کی جرأت نہ ہوگی۔ اس نے اپنے بال نوچ لیے، کپڑے تار تار کر لیے اور چیختی چلاتی، قہقہے لگاتی اپنے کمرے سے نکلی۔ سامنے چچی بیٹھی تھیں ان کی کرسی الٹ دی اور صحن میں کھڑے ہو کر ڈانس کرنے لگی۔ چچا اس وقت گھر پر ہی تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تو اسے ایک کرسی پر بٹھا کر رسیوں سے جکڑ دیا۔

"کیا ہوا میری بچی کو؟" چچی نے اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"بھاگوں بھری، غضب ہو گیا۔ فیروزہ کا دماغ چل گیا ہے۔ کہتا تھا اس پر اتنا تشدد مت کرو مگر تم نہیں مانیں۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"پہلے تو محلے کی عورتوں کو جا کر بتاؤ تاکہ وہ خود دیکھ لیں اور ہم پر الزام نہ آئے کہ ہم نے اسے خوامخواہ پاگل خانے بھیج دیا۔"

"اے ہے تو کیا تم اسے پاگل خانے میں داخل کراؤ گے۔"

"ابھی چھوڑو اس قصے کو جو مناسب ہوگا وہ کروں گا۔ تم ابھی تو جا کر دو چار عورتوں کو لے کر آؤ۔"

وہ تو بعد میں جاتیں، فیروزہ کی بلند بانگ فحش گالیاں سن کر عورتیں خود ہی دوڑی چلی آئیں۔ دیکھا تو وہ کرسی کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور جو منہ میں آرہا ہے بکے جا رہی ہے۔

"کیا ہوا اسے۔ اس کا تو لگتا ہے دماغ چل گیا ہے۔"

"پاگل ہو گئی بے چاری۔"

"جانے کیا ظلم ٹوٹا ہے کہ بے چاری پاگل ہو گئی۔"

"اب دیکھ کیا رہے ہو کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔"

چودھری سلیم سب کی باتیں سن رہے تھے اور شرمندہ ہو رہے تھے۔ اس لڑکی نے رسوا کر دیا۔ الزام ہم ہی پر آئے گا کہ ہم نے اسے پاگل کر دیا۔

"ہو سکتا ہے یہ پاگل نہ ہوئی ہو کوئی دورہ پڑا ہو۔ خود ہی ٹھیک ہو جائے۔ اگر صبح تک اس کی یہی حالت رہی تو پھر کسی ڈاکٹر کو دکھاؤں گا۔" چودھری سلیم نے کہا۔

رات دیر گئے تک گھر میں عورتیں بھری رہیں اور طرح طرح کے مشوروں سے نوازتی رہیں۔ فیروزہ کو پاگل پن کا روپ دھارنے کے لیے خوب موقع ملا تھا۔ وہ تماشا تھی تماشائی سامنے تھے۔ ایسی ایسی حرکتیں کر رہی تھی کہ کسی کو یقین نہ آتا ہو تو آجائے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔

عورتوں کے چلے جانے کے بعد چودھری سلیم نے ب[یوی] کا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے کمرے میں لے آئے۔

"فیروزہ پاگل ہو گئی ہے۔ پاگل اپنا خیال نہیں ر[کھ] سکتے، جائداد کیا سنبھالیں گے۔"

"یہ جائداد بیچ میں کہاں سے آگئی۔"

"بھائی صاحب نے فیروزہ کے لیے ایک مکان ا[ور] دو دکانیں چھوڑی تھیں۔ مجھے مختار بنایا تھا۔ میں نے سوچا [تھا] بھائی صاحب سے وعدے کے مطابق شادی کے بعد [یہ] جائداد اس کے نام کر دوں گا لیکن اب کچھ اور سوچ [رہا] ہوں۔ اگر وہ ہمیشہ کے لیے پاگل رہے تو یہ جائداد ہمیں [مل] سکتی ہے۔"

"ہمارے نہ بچے کچے، ہم اتنی جائداد کا کیا کر[یں] گے۔ کیوں ایسا ظلم کرتے ہو؟"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ ہمارے بچے ہوتے [تو] بڑھاپے کا سہارا بنتے۔ اب تو یہ ہے کہ دولت ہوگی تو بڑھا[پا] کٹے گا۔"

"تو وہ کیا ہمیشہ پاگل رہے گی؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ سرکاری پاگل خانہ وہ جگہ ہے جہاں اچھا بھلا آدمی جائے تو پاگل ہو جائے۔ فیروزہ تو پاگل ہے۔ وہاں ان کی تو کچھ دیکھ بھال ہو بھی جاتی ہے جن کے وارث خیر خبر لیتے رہتے ہیں۔ ہم تو اسے وہاں ڈال کر بھول جائیں گے، کبھی آئی تو دیکھا جائے گا۔"

"پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی باتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"جیسا میں کہوں ویسا کرتی رہو اور چپ رہو۔"

فیروزہ سوچ رہی تھی کہ پاگل بن کر تو وہ پھنس گئی۔ کوئی پانی کو پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ وہ پانی کے لیے زور زور سے چلائی۔ چچی کو رحم آگیا۔ وہ پانی کا گلاس لے کر آئیں اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے غٹاغٹ پانی پی لیا لیکن پاگل پن جتانے کے لیے یہ حرکت ضروری تھی۔ آخری گھونٹ منہ میں بھرا اور چچی کے منہ پر کلی کر دی اور بچوں کی طرح کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

چچی پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ فیروزہ وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

صبح ہوئی تو چودھری سلیم محلے والوں کو دکھانے کے لیے ایک ڈاکٹر کو بلا لائے۔ فیروزہ نے ڈاکٹر کو دیکھتے ہی گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ کوئی جوان لڑکی کسی غیر مرد کے سامنے ایسی فحش گالیاں بکے تو اسے پاگل نہ کہنے والا پاگل

ہے۔ ڈاکٹر نے معائنے کی ضرورت نہیں محسوس کی اور مشورہ دیا کہ اسے فوراً کسی اچھے دماغی اسپتال میں دکھاؤ۔

ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے محلے کی چند عورتیں بھی گھر میں آئی تھیں۔ انہوں نے بھی سن لیا کہ ڈاکٹر نے فیروزہ کو پاگل خانے بھیجنے کا مشورہ دیا ہے۔

اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ فیروزہ کے چچا نے اسے اسپتال بھیج کر کوئی دشمنی نکالی ہے لیکن انہیں کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ اس کی حالت اتنی بگڑ جائے کہ جب وہ اسے اسپتال لے کر جائیں تو ڈاکٹر اسے داخل کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ انہوں نے اس کا کھانا پینا بند کردیا۔ وہ چیختی تو اسے بری طرح مارتے۔ اب کوئی انہیں روکنے والا بھی نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ چند ہی روز میں اس کی حالت واقعی پاگلوں جیسی ہوگئی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہورہا تھا کہ اس نے پاگل پن کا ڈراما کرکے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ اس نے چیخ چیخ کر کہنا شروع کردیا۔ ''چچی جان! میں پاگل نہیں ہوں۔ میں شادی سے بچنے کے لیے پاگل بنی تھی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔'' اس کی بات کون سنتا۔ پاگل تو یہی کہتا ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔

اپنے پاگل پن سے انکار کرنے پر اور بھی سب لوگوں کو یقین آگیا کہ وہ پاگل ہے۔

اس کے چچا اور بھی پکا کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہیں سے ایک عامل کو پکڑ کر لے آئے۔ اس نے فیروزہ کو دیکھ کر فوراً حکم صادر کردیا کہ لڑکی پر ''جن'' ہیں۔ اس عامل نے اسے ایک کمرے میں بند کردیا اور خود بھی اندر چلا گیا۔ جن نکالنے کے بہانے اس نے کمرا اندر سے بند کرلیا۔ فیروزہ کے چیخنے کی آوازیں باہر تک آرہی تھیں لیکن کسی کو پروا نہیں تھی۔ سب مطمئن تھے کہ جن نکل رہا ہے۔ چودھری سلیم کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

کچھ دیر بعد فیروزہ کی آوازیں آنا بند ہوگئیں اور پھر وہ جعلی عامل باہر آیا۔

''لڑکی بے ہوش ہے۔ جب یہ ہوش میں آجائے تو میرا پڑھا ہوا پانی پلا دینا۔ ابھی جن نکلا نہیں ہے۔ میں کل پھر آؤں گا۔''

وہ دوسرے دن آیا تو فیروزہ اسے دیکھتے ہی چلانے لگی لیکن سب نے مل کر اسے کمرے میں دھکیل دیا۔ عامل بھی اندر چلا گیا۔ فیروزہ کی چیخیں پھر سنائی دینے لگیں۔

عامل باہر آیا تو فیروزہ فرش پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس دن وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

''آپ لوگوں نے دیکھا۔ آج لڑکی بے ہوش نہیں ہوئی۔ کل اس کی حالت مزید بہتر ہوجائے گی اور پھر ''جن'' بھاگنے پر مجبور ہوجائے گا۔''

تیسرے دن عامل آیا تو فیروزہ کا ضبط جواب دے چکا تھا۔

''یہ شیطان ہے۔ مکار ہے، یہ کمرے میں لے جاکر مجھے بے آبرو کرتا رہا ہے۔ اسے پولیس کے حوالے کرو۔ مجھ پر کوئی جن نہیں ہے۔ یہ جھوٹا ہے۔''

وہ کہے جارہی تھی اور عامل بے اختیار ہنس رہا تھا۔

''یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے۔ جنوں کا وہ شہزادہ ہے جو اس پر آگیا ہے۔ مجھے بدنام کرنے کے لیے یہ مجھ پر بہتان باندھ رہا ہے تاکہ آپ لوگ مجھے قصوروار ٹھہرا کر علاج کرانا چھوڑ دیں۔ اب آپ لوگ بتائیں علاج کرانا ہے یا نہیں؟''

محلے کی کچھ عورتیں بھی وہاں موجود تھیں۔ فیروزہ کے چچا اور چچی بھی تھے ان سب نے عامل کو اجازت دی کہ اسے بکنے دیں آپ اپنا کام جاری رکھیں۔

''مجھے ایک سیر مرچیں لا کر دو۔ میں ابھی اس جن کو بھگاتا ہوں۔''

اس نے ایک بڑے برتن میں کوئلے دہکائے اور مرچیں اس پر ڈال دیں۔ فیروزہ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے۔ فیروزہ کی گردن مضبوطی سے پکڑ کر اس کا منہ کوئلوں کے قریب کردیا۔ مرچوں کا دھواں اس کی ناک میں جارہا تھا۔ اس کی چیخیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔

کچھ دیر بعد عامل نے اس سے پوچھنا شروع کیا۔

''بول، میں نے تجھے بے آبرو کیا تھا؟''

فیروزہ کی جان پر بن رہی تھی۔ اب وہ کیسے سچ بولتی۔

''میرا نام گلفام ہے۔ میں نے تجھے بدنام کرنے کے لیے فیروزہ سے یہ کہلوایا تھا۔ تو نے اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی۔''

''تو اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دے۔''

''میں جاتا ہوں۔ میں جاتا ہوں، میں چلا گیا۔''

فیروزہ نے سوچا ہوگا کسی طرح جان تو چھوٹے۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ اس کے اوپر ''جن'' تھا اور وہ اب چلا گیا۔

''اب مجھے ایک مرتبہ پھر لڑکی کو کمرے میں لے جانا ہوگا تاکہ میں اس کے اوپر آئے ہوئے ''جن'' سے عہد لوں کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔''

عامل فیروزہ کو کمرے میں لے گیا۔

واپس آیا تو اس نے خوش خبری سنا دی کہ ''جن'' چلا گیا ہے۔ اب اس کے آنے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی چند روز میں خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔

فیروزہ کے بدن کو جگہ جگہ سے جلایا گیا تھا۔ اسے مرچوں کی دھونی دی گئی تھی۔ اس کی روح کو زخمی کیا گیا تھا۔ اب اس کے ذہن پر واقعی منفی اثرات ہوئے تھے۔ اب تو وہ یہ کہنا بھی بھول گئی تھی کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ بال کٹے ہوئے، کپڑے تار تار، چہرے پر اپنے ہی ناخنوں سے ڈالے ہوئے زخم، اب اس کے پاگل ہونے میں کسی کو شک نہیں تھا۔

چودھری سلیم کی مراد برآئی۔ اس نے اسے پاگل خانے میں داخل کرادیا۔ اپنا نام، پتا سب غلط لکھوایا تاکہ اس کے ٹھیک ہوجانے کے بعد اسپتال والے چودھری سلیم سے رابطہ نہ کرسکیں۔ وہ خود چلتی پھرتی آگئی تو پھر کچھ اور سوچا جائے گا۔

پاگل خانہ جگہ ہی ایسی ہے کہ جو یہاں غلطی سے بھی چلا جائے تو پاگل ہوکر نکلے اور پھر یہ تو ایک سرکاری پاگل خانہ تھا۔ جس طرح سرکاری اسپتالوں میں علاج ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی ہورہا تھا۔ ڈاکٹروں نے بجلی کے جھٹکے دے دے کر اسے ادھ موا کردیا۔

جب اس کے گھر والوں میں سے کوئی پوچھنے تک نہ آیا تو ڈاکٹروں نے اسے لاوارث پاگلوں کے وارڈ میں منتقل کردیا۔ کبھی کبھی کوئی ڈاکٹر اس وارڈ کی طرف آنکلتا تھا ورنہ یہاں بند پاگل عورتیں آپس ہی میں دھما چوکڑی مچاتی رہتی تھیں۔

اس کی جوانی کے کئی سال یہاں گزر گئے تھے۔ وہ پاگل نہیں تھی۔ عامل کے تشدد سے ذہن پر کچھ اثرات ہوئے تھے جو وقت کے ساتھ ساتھ اور تھوڑے بہت علاج کے بعد ختم ہوگئے۔ اب وہ خود کو نارمل محسوس کررہی تھی۔ اس کے اردگرد جو کچھ ہورہا تھا اسے دیکھ سکتی تھی، محسوس کرسکتی تھی لیکن بے خبر پاگلوں کے درمیان رہنے پر مجبور تھی۔ اس نے کئی مرتبہ ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ پاگل نہیں ہے اسے جانے دیا جائے لیکن وہ ہنس کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ غالباً ان سے ہر دوسری عورت یہی کہتی ہوگی کہ وہ پاگل نہیں۔ وہ اس جملے کے عادی ہوچکے تھے۔ جب کہتے رہنے سے کام نہیں چلا تو اس نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرلیا۔ رات کا وقت تھا۔ ایک پاگل عورت پر بڑا سخت دورہ پڑا تھا۔ پہرے دار عورتوں نے بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ پاؤں پکڑے۔ ڈاکٹر دوڑا ہوا آیا۔ اس افراتفری میں وارڈ کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ فیروزہ نے موقع غنیمت جانا اور باہر نکل گئی۔ بھاگنے کے بجائے ٹہلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ مختلف وارڈوں سے ہوتی ہوئی بیرونی دروازے تک آگئی لیکن یہاں تک آکر اس کی امیدیں دم توڑ گئیں، دروازے پر یہ موٹا تالا پڑا تھا۔ دروازہ اتنا اونچا تھا کہ اس پر چڑھ کر دوسری طرف کودنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اندھیرے میں اندھیرا بن کر ایک طرف بیٹھ گئی اور کسی معجزے کا انتظار کرنے لگی۔ خدا نے اس کی دعا سن لی۔ دروازے کی دوسری طرف کوئی گاڑی آئی تھی۔ زور زور سے ہارن کی آوازیں آئیں۔ چوکیدار بھاگتا ہوا آیا اور تالا کھول کر گیٹ کھول دیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے روشنی اندر پھینکی۔ وہ اپنی جگہ سے نکلنے ہی والی تھی کہ پھر دبک گئی۔ اس تیز روشنی میں باہر جانا ممکن نہ تھا۔ گاڑی اندر آئی۔ ابھی چوکیدار نے دروازے کا ایک ہی پٹ بند کیا تھا کہ اسے کوئی بات یاد آئی اور ایک پٹ کھلا چھوڑ کر گاڑی کے پیچھے بھاگا۔ بس یہی موقع تھا۔ وہ تیر کی طرح نکلی اور دروازہ پار کرکے اندھا دھند ایک طرف کو بھاگ کھڑی ہوئی۔ باہر اندھیرا تھا، سناٹا تھا اور سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے پیڑ تھے۔ اس نے اب بھاگنا بند کردیا تھا لیکن رکی نہیں تھی۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف پیدل چلتی چلی جارہی تھی۔ وہ کہاں ہے اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اسے الجھن تھی تو صرف یہ کہ اس کے جسم پر پاگل خانے کے کپڑے تھے۔ اسے کوئی بھی شناخت کرسکتا تھا کہ وہ پاگل خانے سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے۔

پولیس کی ایک گاڑی گشت پر تھی جو اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس نے آٹھویں تک پڑھا تھا۔ اتنا تو جان ہی سکتی تھی کہ یہ پولیس کی گاڑی ہے۔ اس کا خون خشک ہوگیا کہ اب پکڑی گئی۔

''اے لڑکی، کون ہو اور کہاں جارہی ہو۔ پاگل خانے سے بھاگ کر آئی ہو؟'' ایک پولیس والا کود کر آیا اور اس سے پوچھنے لگا۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔ میرے چچا نے مجھے زبردستی داخل کرادیا تھا۔ مجھے موقع ملا اور میں نکل آئی۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں پاگل نہیں ہوں۔''

''یہ تو تیرا چچا ہی بتائے گا۔ چل بیٹھ گاڑی میں۔''

''وہ تو میرپور خاص میں رہتا ہے۔ تم وہاں کیسے

جاؤ گے۔''

''تو ہمارے ساتھ تھانے چل۔ ہم اسے وہیں بلوالیں گے۔''

''میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔''

''ہمیں بھی کون سا شوق ہے تجھے اس کے ساتھ بھیجنے کا مگر تھانے تو تجھے چلنا پڑے گا۔''

ان پولیس والوں نے زبردستی اسے وین میں دھکیل دیا۔ اس نے دیکھا، اس وین میں تین پولیس والے بیٹھے تھے۔ ایک وین چلا رہا تھا۔

یہ پولیس والے اسے تھانے لے جانے کے بجائے ایک خالی مکان میں لے گئے۔

وہ اس خالی مکان سے نکلی تو صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ اس کا بدن بری طرح درد کررہا تھا لیکن اسے سب سے زیادہ فکر یہ تھی کہ وہ اپنے کپڑوں کی وجہ سے پہچانی جارہی تھی۔

وہ شاید ابھی آبادی سے دور تھی۔ اِکّادُکّا مکان بنے ہوئے تھے۔ وہاں بھی لگتا تھا کوئی رہتا نہیں ہے۔ رات کو پولیس والوں نے کچھ کھانے کو دیدیا تھا وہ اب تک پیٹ میں پڑا تھا البتہ نیند بہت آرہی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر اسی مکان پر پہنچ گئی جہاں پولیس والے اسے لے کر گئے تھے۔ مکان پر تالا پڑا تھا۔ قریب ہی نیم کا پیڑ تھا۔ وہ اس کے نیچے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

نہ جانے کب تک سوتی رہی تھی کہ کسی نے اسے ٹھوکر مار کر اٹھایا۔

''اے پگلی! تجھے پاگل خانے والوں نے بلایا ہے۔'' یہ ایک پولیس والا تھا۔ یہ وہی تھا جو رات کو اسے ملا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے پاگل خانے مت بھیجو۔ میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔''

''یہاں پڑی رہے گی تو کوئی بھی تجھے دیکھ لے گا۔ چل گھر میں چل۔'' وہ اس کے ساتھ گھر میں چلی گئی۔

''میری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی ہے۔ کل وہ آجائے گی۔ تو بس ایک رات یہاں رہ سکتی ہے۔ تو جب صبح یہاں سے جائے تو میری بیوی کے کپڑے پہن لینا ورنہ یہاں سے نکلتے ہی پکڑی جائے گی۔''

''صبح کیوں، مجھے ابھی کپڑے دے دو۔ میں چلی جاتی ہوں۔''

''رات کو ہمارے صاحب یہاں آئیں گے۔ انہیں خوش کردے گی تو تجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔''

اس رات کی بھی سحر ہوگئی۔ اس نے غسل کیا۔ پولیس والے کے دیے ہوئے کپڑے پہنے اور گھر سے نکلنے لگی۔

''اے لڑکی! اگر تو نے کسی کو بتایا کہ تو کہاں تھی اور ہم نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے تو سمجھ لے ہم پولیس والے ہیں، تجھے قتل کرکے لاش نالے میں پھینک دیں گے۔''

''میں کیوں کسی کو بتاؤں گی۔ اس میں تو خود میری بدنامی ہے۔''

''شاباش! یہ لے۔ یہ دس روپے رکھ لے تیرے کام آئیں گے۔''

اس نے دس روپے رکھ لیے۔

وہ اس گھر سے نکلی اور جدھر سڑک جاتی تھی ادھر چل دی۔ صبح کا ناشتا کیے ہوئے تھی۔ جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا اور آنکھوں میں آنسو۔

وہ ابھی تک اپنے نامراد عاشق کو نہیں بھولی تھی۔ جب تنہائی ملتی تھی بیٹھ کر سوچتی تھی کہ جو میری عزت سے کھیلا، مجھے برباد کرکے چلا گیا، سزا تو اسے ملنی چاہیے تھی لیکن سزا مجھے مل رہی ہے۔ گھر سے نکالی گئی۔ اب بھیڑیوں کے ہاتھوں میں ہوں؟ اے خدا! یہ کیسا انصاف ہے۔ اگر کبھی وہ مجھے مل گیا تو اس سے ایک ایک زخم کا حساب لوں گی۔ جتنا میں روئی ہوں اس سے زیادہ رلاؤں گی۔ اب اس کے دل میں اپنے بے وفا محبوب کے لیے محبت نہیں نفرت تھی۔ انتقام کا جذبہ تھا۔ انتقام کی صورت اسے یہی نظر آئی کہ وہ خود کو برباد کرتی رہے۔ جو اسے اپنی عزت کہتا تھا، اس کی عزت خاک میں ملادے۔ ہر گھر میں جاکر جھانکے۔ شاید وہ کہیں مل جائے اور اس کا انتقام پورا ہوجائے۔

اس نے خود کو اوباشوں کے حوالے کردیا۔

اس کی ہر رات ایک نئے گھر میں بسر ہو رہی تھی۔

اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ گھر واپس چلی جائے لیکن بھیڑیے تو وہاں بھی موجود تھے۔ نوعیت جدا تھی۔ اسے ایک مرتبہ پھر پاگل خانے بھیج دیا جاتا۔

وہ فٹ پاتھ پر پڑی چوٹی ہوگئی تھی۔ جو چاہتا اٹھا اور لے کر چلتا بنتا۔

پورے شہر کے چوراہے اس سے واقف ہوچکے تھے۔ گشت پر نکلنے والے پولیس والے مفت میں منہ مارنے لگے تو اسے اپنی آمدنی کی فکر ہوئی۔

اب تک اسے یہ تو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ حیدرآباد شہر ہے۔ یہ پہلے سے معلوم تھا کہ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ وہ ٹرین میں بیٹھی اور کراچی آگئی۔

✦✦✦

عبداللہ نو سے بارہ کا شو دیکھ کر سنیما ہال سے باہر آیا تھا۔ اس وقت بس ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ پیدل گھر جانے کے لیے سڑک پار کرنے کا انتظار کررہا تھا کہ ایک چھریرے بدن، معمولی نقوش کی لڑکی اس کے بالکل قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ عبداللہ کو پارسائی کا دعویٰ نہیں تھا۔ دو ایک مرتبہ وہ ایسی لڑکیوں کو گھر لے جانے کا گناہ گار بن چکا تھا اس لیے وہ گھبرایا نہیں صرف اتنا کیا کہ اسے آزمانے کے لیے ذرا الگ ہوکر کھڑا ہوگیا۔ وہ لڑکی بھی اپنی جگہ سے کھسک کر اس کے قریب آگئی۔ عبداللہ نے سڑک پار کی تو وہ بھی اس کے ساتھ سڑک پار کرنے لگی بلکہ سڑک کے درمیان پہنچ کر اس نے عبداللہ کا ہاتھ بھی تھام لیا تاکہ لوگوں کو یہ تاثر ملے کہ وہ اس کے ساتھ ہے۔

''اگر آپ کو دور جانا ہے تو کوئی سواری پکڑ لیں۔''

''یہ مت سمجھنا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پیسے میرے پاس بہت ہیں۔ دراصل میرا گھر قریب ہی ہے اس لیے پیدل جارہا ہوں۔''

''تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گے؟''

''اور نہیں تو کیا۔''

''میرا مطلب ہے تمہاری بیوی......''

''میں نے شادی نہیں کی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ تم نے شادی نہیں کی ہے۔''

''بڑا تجربہ ہے۔''

''کوئی آخری شو اکیلا دیکھنے آئے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ بیوی میکے گئی ہو۔''

''مجھے تو خالی گھر اور بھری جیب سے مطلب ہے۔ ویسے پریشان مت ہونا۔ میری فیس بہت معمولی ہے۔ میں بری عورت ضرور ہوں لیکن غریب ضرورت مندوں کا خیال رکھتی ہوں۔ میں کسی گاڑی والے کو تلاش کرتی مگر تم مجھے اچھے لگے ہو اس لیے تمہارے ساتھ چلی آئی۔''

وہ اس کے زیادہ باتیں کرنے سے گھبرا گیا تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ ایسی عورتیں زیادہ باتیں نہیں کرتیں۔ اپنے کام سے کام رکھتی ہیں مگر وہ تو بولے چلی جارہی تھی جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ اس کے دل میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ آج کل ایسی عورتیں بہت گھوم رہی ہیں جو مردوں کو پھانستی ہیں۔ انہیں ان کے گھر تک لے کر جاتی ہیں۔ پیچھے سے ان کے گروہ میں شامل مرد بھی آجاتے ہیں اور لوٹ مار کرکے چلتے بنتے ہیں۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ اس کے ساتھیوں میں سے کوئی آتو نہیں رہا ہے۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہوگیا۔ پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دی کہ اس کے گھر میں ہے ہی کیا جو یہ لوٹ لے گی۔ اتنے اطمینان کے بعد بھی کوئی خوف تھا جو اس کے دل کے کسی گوشے میں چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے خوف زدہ ہوکر اس لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''استاد، لگتا ہے چھوڑ کر بھاگنے کی تمہاری پرانی عادت ہے۔ ہاتھ کیوں چھوڑ دیا؟'' اس نے بازاری انداز میں کہا۔ عبداللہ نے اس کا ہاتھ پھر تھام لیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

اس نے ایک مرتبہ اس کا ہاتھ پھر چھوڑ دیا کیونکہ گھر قریب آگیا تھا۔

''تم یہیں رک جاؤ۔'' عبداللہ نے اس سے کہا۔ ''میں جاکر تالا کھولتا ہوں۔ جب تالا کھول لوں تو تم جلدی سے آکر گھر میں داخل ہوجانا۔ تالا کھولنے میں دیر لگے گی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہیں میرے ساتھ دیکھ لے۔''

''بہت ڈرتے ہو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا اور گلی کے کونے پر ہی رک گئی۔

عبداللہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے دروازے پر پہنچا۔ ایک مرتبہ پھر اطمینان کرلیا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اتنی رات ہوگئی تھی کہ کوئی باہر نہیں تھا۔ برابر والا مکان بہت دنوں سے خالی پڑا تھا۔ اس نے تالا کھولا اور لڑکی کو اشارہ کردیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی آئی اور جھپاک سے گھر میں داخل ہوگئی۔ عبداللہ نے لائٹ آن کی اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا۔ گھر کی حالت بتا رہی ہے تمہاری شادی ابھی نہیں ہوئی۔''

''شادی ہوجاتی تو تمہیں لاتا؟''

''یہ مت کہو، میں نے شادی شدہ مرد بھی دیکھے ہیں۔'' وہ ابھی بیٹھی نہیں تھی۔ ادھر ادھر گھوم کر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ عبداللہ کے خوف نے پھر سر اٹھایا۔ ہے کیسی چالاک۔ دیکھ رہی ہے کمرے میں شاید کوئی قیمتی چیز ہو۔ اسے بڑی مایوسی ہوگی مگر میری جیب میں کچھ نوٹ تو ہیں۔ اسے اسی دن تنخواہ ملی تھی۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' اس نے جان بوجھ کر اس سے پوچھا۔ دراصل وہ باہر جانے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔

"ہاں، گھر میں کچھ ہے؟ قسم سے بہت بھوک لگ رہی ہے۔"

"گھر میں تو کچھ نہیں ہے۔ باہر سے لانا پڑے گا۔"

"اس وقت؟"

"ہاں قریب میں ہوٹل ہے۔ رات بھر کھلا رہتا ہے۔ میں باہر سے تالا لگا کر جاؤں گا۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔"

"بہت دن بعد تو گھر ملا ہے۔ ڈرنا کیسا۔" اس نے کہا اور آرام سے بستر پر لیٹ گئی۔

عبداللہ ہوٹل پر گیا۔ اس کے لیے کھانا خریدا اور اپنی جیب میں رکھی ہوئی تنخواہ ہوٹل کے مالک کے پاس رکھوا دی۔

"سلامت بھائی۔ یہ میری امانت اپنے پاس رکھ لو۔ صبح آکر لے جاؤں گا۔"

"خیریت تو ہے، اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم پیسے گھر میں رکھتے ہوئے ڈرے ہو۔ اب کیا ہو گیا؟"

"ہے کچھ ایسی بات۔ بعد میں بتاؤں گا۔"

وہ کھانا لے کر آیا تو بہت مطمئن تھا۔ اگر اب اس نے پستول مجھ پر تان بھی لیا تو چند روپوں کے علاوہ میرے پاس سے کچھ نہیں نکلے گا۔ رات بھر رکنے کے وہ جتنے پیسے مانگے گی وہ اس کا حق ہوگا۔ میں ہوٹل آؤں گا اور اس کی فیس اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

"آ گئے آپ کھانا لے کر؟" اس نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو سمجھ رہی تھی آپ مجھ سے ڈر گئے ہیں اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ مجھے دیوار کود کر جانا پڑے گا۔"

"میں مرد ہوں اور تم ایک کمزور لڑکی۔ میں تم سے کیوں ڈروں گا۔"

"اس لیے کہ میں پاگل خانے سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی ہوں۔"

"پاگل خانے سے بھاگی ہوئی؟" وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

"ڈر گئے نا!" وہ ہنسنے لگی۔ "اچھا پہلے کھانا کھا لو، پھر بتاؤں گی میں پاگل خانے کیوں گئی تھی۔"

وہ دونوں کھانا کھانے بیٹھ گئے لیکن عبداللہ کے حلق سے نوالہ نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ بہت سے پاگل ایسے ہوتے ہیں کہ بہ ظاہر پاگل نہیں لگتے۔ کھانا کھاتے ہی کیا خبر میرا گلا دبا دے۔ سنا ہے پاگلوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

وہ مزے سے کھانا کھا رہی تھی جیسے اسے کوئی فکر ہی نہ ہو۔

کھانا کھانے کے بعد لڑکی نے چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دے لیکن عبداللہ نے اسے روک دیا۔

"میں لائٹ میں سونے کا عادی ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ مجھے تو اپنی فیس سے مطلب ہے لائٹ جلتی رہنے دو یا بجھا دو۔" وہ بستر پر لیٹ گئی۔ "آؤ، تم بھی آ جاؤ۔"

عبداللہ اسے لے تو آیا تھا لیکن اب ڈر رہا تھا کہ یہ لڑکی پاگل ہے، کہیں اندھیرا ہوتے ہی اس کا گلا نہ دبا دے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار ہو۔

اس نے سوچ لیا کہ وہ خود بھی جاگتا رہے گا اور اسے بھی جگائے رکھے گا۔ صبح ہوتے ہی اس کے ہاتھ میں کچھ پیسے رکھے گا اور چلتا کرے گا۔ نہ جانے کیوں اسے اس کے قریب جاتے ہوئے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" عبداللہ نے اسے باتوں میں لگانے کے لیے اس کا نام پوچھا۔

"ہم جیسی لڑکیوں کے لوگ نام نہیں پوچھتے اپنا کام نکالتے ہیں۔"

"مجھے دوسروں کی طرح مت سمجھو۔"

"ہو تو ویسے ہی ورنہ مجھے لے کر کیوں آتے۔"

"تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم پاگل کیوں ہو گئی تھیں؟"

"تم نے پوچھا بھی تو نہیں۔"

"اب پوچھ رہا ہوں۔"

"کیوں اپنی رات خراب کرو گے۔"

"ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔"

"سنو گے؟"

"سناؤ۔"

"تو پھر سنو۔ میں شروع سے سناتی ہوں۔ میں جب اپنے شہر میں تھی تو میری ملاقات ایک لڑکے سے ہوئی۔ اس کا نام طارق تھا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا لیکن میں خود پہل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ آپ ہی کی طرح ایسا ڈرپوک تھا کہ میرے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا، کچھ کہتا نہیں تھا۔ یہ سلسلہ ہفتوں چلتا رہا اور پھر ایک دن وہ ہمت کر کے میرے سامنے آ گیا کہنے لگا چلو، وہ جو سامنے باغ ہے وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں تو پہلے ہی اس پر فدا تھی۔ میں اس کے ساتھ وہاں میں چلی گئی۔ باغ میں پہنچتے ہی جتنا ڈرپوک تھا اتنا ہی دلیر بن گیا۔ جھٹ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی محبت کا یقین دلانے لگا۔ میں نے بھی اپنی محبت کا اقرار کیا۔ پھر ہم دونوں باغ میں باقاعدگی سے ملنے لگے۔ ایک دن اس نے کہا

فرمائش کی۔ کہنے لگا، رات میں کسی جگہ ملو۔ میں نے کہا ابھی تو میں اسکول کے بہانے باغ میں آ جاتی ہوں رات کے وقت کیسے آؤں گی۔ وہ ناراض ہو گیا اور مجھے دھمکی دی کہ اگر رات میں نہیں مل سکتی تو دن میں بھی ملنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ مجھ سے ناراض ہو اور دن کی ملاقاتیں بھی ختم ہو جائیں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں کوئی ترکیب سوچوں گی۔

سردیوں کے دن تھے سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں ہوتے تھے۔ میں یہ بتا دوں کہ میرے ماں باپ نہیں تھے۔ میں اپنے چچا اور چچی کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے طارق سے کہا کہ وہ رات کے وقت میرے گھر آ جایا کرے۔ میں دروازہ کھلا رکھوں گی۔ چچا چچی اپنے کمرے میں سوتے ہیں۔ ہم لوگ چھت پر چلے جایا کریں گے۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گیا اور کہنے لگا تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتی ہو۔ میں بھی خوش تھی کہ میں اپنے محبوب کے کسی کام آئی۔ اب وہ مجھ سے ناراض نہیں ہوگا۔ میں اس کی ناراضی برداشت ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت میری عمر پندرہ سال ہوگی۔ دنیا کی اونچ نیچ کو جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ لڑکا بھی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ سال کا ہوگا۔ خیر وہ رات کو آیا، میں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ اندر آیا اور میں اسے لے کر چھت پر چلی گئی۔

اب ہم روز رات کو چھت پر ملا کرتے تھے اور پیار محبت کی باتیں کیا کرتے تھے۔ پھر ایک دن وہ سب کچھ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہیے تھا، میں اتنی نادان تھی کہ اسے بھی اس کا پیار ہی سمجھا اور خود کو اس کے حوالے کرتی رہی۔

میں اتنی ہوشیار تو تھی کہ شادی کے مفہوم کو سمجھتی تھی۔ میں نے اس سے شادی پر اصرار شروع کر دیا۔ اتنا سیدھا وہ بھی نہیں تھا کہ صاف انکار کر دیتا۔ وہ مجھے ٹالتا رہا۔ اپنی مجبوریاں بتاتا رہا۔ میں اس کی باتوں میں آتی رہی۔ پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا کیونکہ میں نے تنگ آکر کہہ دیا تھا کہ اب تک وہ جو کچھ کرتا رہا ہے آئندہ مجھ سے امید نہ رکھے۔ اب یہ رشتہ شادی کے بعد ہی قائم ہو سکتا ہے۔

میں اسے ڈھونڈنے روز باغ میں جاتی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی رہتی تھی۔ مسلسل غیر حاضریوں سے اسکول سے میرا نام بھی کٹ گیا، میری پڑھائی ادھوری رہ گئی۔

"میں اتنی بے وقوف تھی کہ اتنے دنوں میں یہ بھی معلوم نہ کر سکی تھی کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ میں ایک ایک گلی میں اسے ڈھونڈتی پھری لیکن وہ مجھے نہیں ملا۔

میرا نام اس کے ساتھ جڑ چکا تھا۔ اب میں شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میری عمر بیس سال ہو گئی تھی۔ مجھ پر شادی کے لیے زور ڈالا جا رہا تھا۔ میں مصنوعی پاگل بن گئی کہ مجھ سے شادی کے لیے نہ کہا جائے۔ مجھ پر تشدد کیا گیا۔ مارا پیٹا گیا۔ ان لوگوں نے میرے بال کاٹ دیے اور پھر میری جائیداد کے لالچ میں مجھے پاگل خانے بھیج دیا۔ میں سوچا کرتی تھی گناہ تو طارق کا بھی تھا پھر سزا صرف مجھے کیوں مل رہی ہے؟ میری جوانی کے کئی سال پاگل خانے میں گزر گئے حالانکہ میں پاگل نہیں تھی۔ پھر ایک روز مجھے موقع مل گیا میں وہاں سے فرار ہو گئی۔ وہاں سے نکل کر مجھے معلوم ہوا اصل پاگل خانہ تو پاگل خانے کے باہر ہے۔ قانون کے رکھوالوں نے مجھے بے آبرو کر دیا۔ ایک بار نہیں کئی بار، جسے شریف سمجھ کر مدد کے لیے ہاتھ پھیلایا اسی نے میری عزت کا سودا کیا۔

جب ہر رات میرے ساتھ یہی سلوک ہونے لگا تو میں نے اسے پیشہ بنا لیا۔ لوگ تو اپنی ہوس پوری کر لیتے تھے، مجھے تو روٹی چاہیے تھی۔

"تم کوئی کام بھی تو کر سکتی تھیں؟"

"بڑی آسانی سے تم نے یہ کہہ دیا۔ اسے کچھ نہیں کہتے جو مجھے اس کام پر لگا گیا تھا۔ اگر اس نے میرا ہاتھ تھام لیا ہوتا تو مجھے یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ کوئی اور ہاتھ میری طرف کیوں بڑھتا۔ اس بے وفا نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عبداللہ اٹھ کر گیا، ایک گلاس پانی لے کر آ گیا۔

"لو یہ پیو۔"

اس نے پانی پی کر پھر کہنا شروع کیا۔

"حیدرآباد میں پولیس والے میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کراچی چلی جاؤں۔ بڑا شہر ہے گاہک بھی اچھے مل جائیں گے اور بہت دن تک پولیس کو میری حقیقت کا پتا بھی نہیں چلے گا۔ آج ہی پہنچی تھی اور آپ مل گئے۔ اب آپ ہی بتاؤ قصور میرا ہے یا اس لڑکے کا جس نے مجھے دھوکا دیا اور میں اس سے وفاداری نبھانے کے لیے گھر والوں کے سامنے آ گئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے مل جائے گا، اس سے شادی کروں گی۔ وہ تو نہیں ملا اور بہت سے مل گئے۔ میں مجبور ہوتی چلی گئی اور لٹتی چلی گئی۔ ارے باتوں باتوں میں صبح ہو گئی۔ تم نے اپنی فیس تو وصول ہی نہیں کی۔ اب بھی وقت ہے۔"

"اب میرے کارخانے جانے کا وقت ہو گیا۔"

"ایک بات کہوں۔"

''کہو۔''
''تم مجھے اچھے لگے ہو۔ اکیلے بھی ہو۔ میری کہانی سن کر مجھ سے شادی تو نہیں کرو گے۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے تم میرے مستقل گاہک بن جاؤ۔ میں تمہارا زیادہ خرچہ نہیں کراؤں گی۔ بولو، کیا کہتے ہو۔''
''ابھی تو مجھے کارخانے جانا ہے۔''
''تو پھر میری فیس مجھے دے دو۔ میں بھی چلوں۔''
''کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آج رات کے لیے تم یہیں رہ جاؤ۔''
''ہو کیوں نہیں سکتا۔ ڈبل فیس ہوگی۔''
''مجھے منظور ہے۔ آج رات تمہاری دو راتوں کے پیسے مل جائیں گے۔ فی الحال تو میں کارخانے جا رہا ہوں۔ باہر سے تالا لگاتا جاؤں گا۔''
وہ تالا لگا رہا تھا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس لڑکی کی داستان سن کر اس کے دل میں ایک طوفان سا بپا ہوگیا تھا۔ اس کے گناہوں کی سیاہی وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کا کوئی ازالہ ہے؟ وہ یہی سوچتا ہوا کارخانے تک پہنچ گیا۔ حاجی نصیر اللہ ابھی آئے نہیں تھے اور اسے ان کا انتظار کرنا تھا۔ یہ انتظار صدیوں پر پھیل گیا تھا۔ وہ جانے کہاں رہ گئے تھے کہ دوپہر کے قریب وہ کارخانے میں داخل ہوئے۔
''حاجی صاحب، مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''
''نوکری چھوڑ رہا ہے یا تیرے پلاٹ سے خزانہ نکل آیا ہے؟''
''دونوں میں سے کوئی بات بھی نہیں بلکہ نوکری کی تو اب مجھے پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔''
''پھر کیا بات ہے۔'' انہوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''بات یہ ہے، بات یہ ہے کہ میں آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''
''ابے منہ سے کچھ بول تو سہی۔''
''بات یہ ہے حاجی صاحب کہ جب میں اپنے شہر میں تھا تو مجھے وہاں ایک لڑکی ملی تھی۔''
''اچھا پھر؟''
''وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی جبکہ میں اسے صرف پھانسنا چاہتا تھا۔ وہ میری چکنی چپڑی باتوں میں آگئی۔ ہم تنہائی میں ملنے لگے اور پھر میرے اندر چھپے ہوئے شیطان نے اسے لڑکی سے عورت بنا دیا۔ وہ شادی پر اصرار کرنے لگی تو میں ڈر گیا اور گھر سے بھاگ گیا۔ سوتیلے بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں پہلے ہی تنگ تھا۔ یہ ڈر بھی ہوا کہ بھائی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھاتا ہوا کراچی آگیا۔
وہ لڑکی مجھے یاد بھی نہیں تھی۔ وہ دھن کی پکی نکلی۔ مجھے ڈھونڈتی ہوئی پورے پندرہ سال بعد میرے پاس آئی ہے۔ وہ بھی میری طرح گھر سے بے گھر ہو چکی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکی لیکن میں اسے پہچان گیا ہوں۔ آپ سے مشورہ کرنا ہے کہ اب میں کیا کروں؟''
''کرنا کیا ہے بیٹا، قدرت نے تجھے موقع دیا ہے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کردے۔ ایک دن تو نے اسے برباد کیا تھا اب آباد کرلے۔ تیرا گھر بھی آباد ہوجائے گا اسے بھی ٹھکانا مل جائے گا۔''
ہر صاحب دل آدمی یہی کہتا جو حاجی صاحب نے کہا۔ عبداللہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ اسے ایک اور اطمینان بھی تھا جو اسے فیروزہ کے قریب لے جا رہا تھا اور وہ یہ کہ فیروزہ نے اسے پہچانا نہیں تھا۔ وہ اگر اسے پہچان لیتی تو معلوم اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ وہ خود بھی اسے نہیں پہچان سکتا اگر وہ اپنی کہانی نہ سناتی اور اس کا ایک ایک لفظ وہی نہ ہوتا جس سے عبداللہ بھی گزر چکا تھا۔ وہ لڑکا وہی تھا جس نے فیروزہ کو برباد کیا تھا۔ پندرہ سال میں اس کے نقش و نگار بدل گئے تھے۔ حالات کی دھوپ نے اس کے چہرے کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ خود بھی تو کتنا بدل گیا تھا۔ وہ اٹھارہ سال کا تھا اور اب 33 سال کا ہوگیا تھا۔ چہرے پر ہلکی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ اسے کیسے پہچان سکتی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ اپنی شناخت ظاہر نہیں کرے گا تاکہ وہ زندگی بھر میرا احسان سمجھتی رہے کہ میں نے اس سے شادی کی۔ اس کی برائیوں کو نظر انداز کر کے اسے اپنا لیا۔ یہ سچ ہے مگر البتہ اسے کراہیت سی ہو رہی تھی کہ اس نے بہت گندی زندگی گزاری ہے۔ نہ جانے کس کس کے ساتھ راتیں بسر کی ہوں گی۔ ہر آدمی اپنے لیے نیک چلن بیوی ڈھونڈتا ہے۔ میں جان بوجھ کر مکھی نگل رہا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے ڈانواڈول ہوا مگر پھر سنبھل گیا۔ میں نے ہی اسے اذیت سے گزارا ہے۔ میں اس سزا کا مستحق ہوں۔ شاید یہی میری بخشش کا سبب بن جائے۔ حاجی صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، قدرت مجھے موقع دے رہی ہے۔ اس کے دل میں فیروزہ کی طرف سے بے پناہ پیار کا جذبہ امڈ آیا۔
اب وہ گھر کا تالا کھول رہا تھا تو اس کے ہاتھ قابو میں

تھے۔ وہی اعتماد تھا جو اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت ہوتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسے یوں لگا جیسے وہ کسی اور گھر میں آگیا ہو۔ بستر کی چادر تبدیل ہوگئی تھی۔ اس کے میلے کپڑے کہیں چھپ گئے تھے۔ برتن جو ادھر ادھر پڑے رہتے تھے، سلیقے سے رکھے ہوئے تھے۔ فیروزہ آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔
''ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی، آپ جلدی آگئے۔ میرے بغیر دل نہیں لگا ہوگا۔''
''یہی بات تو یہی ہے فیروزہ کہ سارے وقت تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا۔''
''سوچ رہے ہوگے میری ڈبل فیس کہاں سے دو گے؟''
''نہیں، بلکہ یہ سوچ رہا تھا کہ تمہیں مستقل رکھ لوں۔''
''یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔ گھر تو دیکھ ہی لیا ہے۔ دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی رہوں گی یا کہو گے تو یہیں پڑی رہوں گی۔''
''تمہارے لیے کپڑے لایا ہوں۔ نہالو اور جلدی سے یہ کپڑے پہن لو۔ ایک جگہ چلنا ہے۔''
''کسی سے میرا سودا کر کے آئے ہو؟''
''کیا بکواس کر رہی ہو۔ مجھے ایسا سمجھتی ہو۔''
''تم تو ایسا غصہ کر رہے ہو، جیسے میں تمہاری گھر والی ہوں۔''
''معاف کرنا فیروزہ، میرا تم پر کوئی حق نہیں۔ تمہاری کہانی سن کر اتنا متاثر ہوا ہوں کہ تمہارے بارے میں کسی اور انداز سے سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ اس لڑکے پر غصہ آرہا ہے جس نے تمہیں گناہ کی اس دلدل میں اتار دیا۔''
''آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں اسے کہیں نہ کہیں ڈھونڈ ہی لوں گی۔ سزا تو اس کے لیے میں نے وہ سوچ رکھی ہے کہ جب تک زندہ رہے گا اپنا منہ نوچتا رہے گا۔''
''اب وہ تمہیں کہاں ملے گا۔ اتنا عرصہ گزر گیا اگر مل بھی گیا تو تم اسے پہچان کہاں سکو گی۔''
''یہ بات چھوڑو۔ میں تو اسے رات کے اندھیرے میں بھی پہچان لوں۔''
عبداللہ کو دل ہی دل میں ہنسی آگئی۔ میں اس کے سامنے بیٹھا ہوں مگر پہچاننے سے قاصر ہے اور کہتی ہے اندھیرے میں بھی پہچان لے گی۔
فیروزہ غسل خانے میں گئی اور نہا دھو کر نئے کپڑے پہن لیے۔
''ہاں اب بتاؤ کہاں چلنا ہے؟''
''جس کارخانے میں میری نوکری ہے اس کے مالک ہیں حاجی نصیر۔ مجھے بالکل اپنے بیٹوں جیسا سمجھتے ہیں، ان سے ملوانا ہے۔''
''وہ بھی شوقین ہیں کیا؟''
''پھر وہی بات، میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔''
''اچھا دیکھنے کے بعد قیمت لگائیں گے۔''
''فیروزہ ادھر آؤ۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔'' عبداللہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ''مجھ سے شادی کرو گی؟''
''میرے بارے میں جانتے ہوئے بھی تم مجھے شادی کی پیشکش کر رہے ہو؟''
''جس نے تمہیں اس دلدل میں اتارا وہ تو یہاں ہے نہیں ورنہ میں اسے مجبور کرتا کہ تم سے شادی کرلے۔ میں نے سوچا ہے میں تمہیں سہارا دوں بشرطیکہ تم اپنی موجودہ زندگی چھوڑنے پر تیار ہو۔''
''میں تو خود اس زندگی سے تنگ ہوں لیکن میرے دل میں انتقام کی آگ ہمیشہ جلتی رہے گی۔ وہ جب بھی ملا میں اس سے انتقام ضرور لوں گی۔''
''اچھا بابا لے لینا انتقام بلکہ ہم دونوں مل کر اس سے انتقام لیں گے۔''
عبداللہ نے اس کا غصہ کم کرنے کے لیے کہہ دیا اور دل میں یہ بھی طے کرلیا کہ وہ اسے اتنا خوش رکھے گا کہ انتقام کی آگ خود بخود بجھ جائے گی۔
وہ اسے لے کر حاجی صاحب کے گھر چلا گیا۔ اس نے حاجی صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہی ہے۔
حاجی صاحب نے فیروزہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس کی رضامندی اپنے کانوں سے سننے کے لیے انہوں نے عبداللہ کے دل کی بات اسے بتائی۔
''بیٹا، کیا تم عبداللہ سے شادی کے لیے تیار ہو؟''
''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ میں بے سہارا ہوں مجھے سہارا مل جائے گا۔''
''تم آج سے میری بیٹی ہو۔ جب تک یہ مردود برات لے کر نہیں آجاتا تم میرے گھر رہو گی۔ میں اس گھر سے بیٹیوں کی طرح تمہیں رخصت کروں گا۔''

عبداللہ نے ضروری تیاری کی اور کارخانے کے لوگوں کو باراتیوں کے طور پر لے کر حاجی صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ حاجی صاحب نے بھی حق ادا کردیا۔ اسے جہیز کے طور پر چند چیزیں دے کر رخصت کیا۔

عبداللہ کو فیروزہ کیا ملی اس کی زندگی ہی بدل گئی۔ فیروزہ نے ایک سگھڑ عورت کی طرح گھر کو سنبھال لیا تھا۔ دن رات اس کی خدمت میں لگی ہوئی تھی لیکن کبھی کبھی وہ ایسی اداس ہوجاتی تھی کہ اس کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا۔ عبداللہ سے بھی اس بدتمیزی سے بات کرتی کہ کوئی دوسری عورت معلوم ہوتی تھی۔ عبداللہ یہ سوچ کر نظرانداز کررہا تھا کہ اس غریب کو اپنا ماضی یاد آتا ہوگا۔ پچھتاوے کی آگ میں جلتی ہوگی۔

یہ کیفیت مسلسل نہیں تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ اسی طرح عبداللہ کی خدمت میں مصروف ہوجاتی تھی۔ وہ اس کی اس کیفیت کو دور کرنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ حاجی صاحب نے اس کی تنخواہ بھی بڑھادی تھی لہٰذا اب کوئی مالی پریشانی بھی نہیں رہی تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ عبداللہ کو فطری طور پر خواہش تھی کہ جلد سے جلد وہ باپ بن جائے۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ وہم سر اٹھاتا تھا کہ اس قسم کی عورتیں ایسی دوائیں کھالیتی ہیں کہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فیروزہ ماں نہ بن سکے۔

شادی کو تین مہینے گزر گئے تھے کہ اس کی یہ دعا بھی قبول ہوگئی۔ فیروزہ نے اسے خوش خبری سنائی کہ وہ امید سے ہے۔ یہ خبر ہی ایسی تھی کہ اس پر دیوانگی سی طاری ہوگئی۔ اس نے فیروزہ کو گود میں اٹھالیا اور پورے کمرے میں گھومتا رہا۔

''باپ بننے کی بہت خوشی ہورہی ہے؟'' فیروزہ نے کہا۔

''کیا تم خوش نہیں ہو۔''

''مجھ سے زیادہ کس کو خوشی ہوگی۔'' فیروزہ نے کہا۔ ''بس یہ دعا کرو کہ بیٹی پیدا ہو۔ مجھے بیٹیاں اچھی لگتی ہیں، میں بیٹی کی ماں بنوں تو میری سب محرومیاں دور ہوجائیں۔''

''مجھے تو یہ خوشی ہورہی ہے کہ میں باپ بن رہا ہوں۔ بیٹا ہو یا بیٹی مجھے دونوں قبول ہیں۔''

عبداللہ اب اس کی اس طرح حفاظت کررہا تھا جیسے قیمتی سے قیمتی شے کی حفاظت کرتے ہیں۔ اسے ملنے بھی نہیں دے رہا تھا، اس کی دلداری میں دن رات ایک کیے دے رہا تھا۔

''فیروزہ خوش رہا کرو۔ مائیں خوش رہتی ہیں تو بچے پر خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔''

''آج سے ایک سال تک تم گھر کا کوئی کام نہیں کروگی۔ تمام کام میں کروں گا۔''

''ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لیے پابندی سے جانا ہوگا سمجھیں۔''

اسی قسم کی ہدایات وہ روز جاری کیا کرتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ فیروزہ کچھ بجھ سی گئی تھی۔ کھوئی کھوئی رہنے لگی تھی۔ کبھی کبھی تو اردگرد سے ایسی بے خبر ہوجاتی کہ کئی مرتبہ آوازیں دینے کے بعد سنتی تھی۔

فیروزہ کو بیٹی کی خواہش تھی' خدا نے اسے بیٹی دے دی۔ اب وہ ایسی خوش تھی جیسے اس کی ہر الجھن دور ہوگئی ہو۔ جیسے وہ اپنی منزل کے قریب آگئی ہو۔ جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئی ہو۔

گھر جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ وہ کارخانے سے آتے ہی بچی کے پاس بیٹھ جاتا۔ اب اسے یہ گھر چھوٹا معلوم ہونے لگا تھا۔ وہ فیروزہ سے کئی مرتبہ کہہ چکا تھا کہ حاجی صاحب ذرا تنخواہ اور بڑھادیں تو وہ کوئی اچھا مکان کرائے پر لے لے گا، میری بیٹی کیا کہے گی کہ اس کے باپ نے اسے کس گھر میں ٹھہرایا ہوا ہے۔

اس کی بیٹی چھ مہینے کی ہوگئی تھی۔ اسے پہچاننے لگی تھی۔ اسے دیکھ کر ہنسنے لگی تھی۔ بیٹھنے لگی تھی۔ گھٹنوں چلنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کی معصوم حرکتوں نے عبداللہ کو دیوانہ بنالیا تھا۔ کارخانے سے کئی مرتبہ بھاگ بھاگ کر گھر آتا تھا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ کھیلتا تھا پھر کارخانے چلا جاتا تھا۔ اس دن بھی وہ دوپہر کے بعد گھر آیا۔ دروازہ خلاف معمول کھلا ہوا تھا۔ وہ اندر آیا۔ اندر بھی کوئی نہیں تھا۔ ایک ہی تو کمرا تھا۔ وہ اور کہاں دیکھتا۔ باہر صحن میں آیا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ باہر آگیا۔ دو تین گھروں میں جہاں وہ جاتی تھی وہاں معلوم کیا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ وہ پریشان تو ہوا لیکن یہ سوچ کر دوبارہ کارخانے چلا گیا کہ یہیں کہیں ہوگی آجائے گی۔

شام کو وہ کارخانے سے واپس آیا تو بھی گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس کا مطلب ہے وہ ابھی تک نہیں آئی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اب اس کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ اسی وقت اس کی نظر تکیے کے نیچے جھانکتے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھالیا۔ یہ خط تھا جو فیروزہ نے اس کے نام لکھا تھا۔

''ماضی کے طارق اور حال کے عبداللہ!

جب تم مجھے کراچی آنے کے بعد پہلے دن ملے تو میں تمہیں اسی دن پہچان گئی تھی۔ تم اندھے تھے کہ مجھے نہ پہچان سکے۔ میں نے اسی دن طے کرلیا تھا کہ تم سے اپنی بربادی کا بدلہ لوں گی۔ جتنی اذیتیں مجھے اٹھانی پڑی ہیں اس سے زیادہ اذیت تمہیں پہنچاؤں گی' تم وہ شیطان ہو کہ مجھ معصوم کو روند کر بھاگ گئے تھے پھر زمانہ مجھے روندتا رہا۔ اب میں بھاگ رہی ہوں، اب زمانہ تمہیں روندے گا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر وہ بے وفا لڑکا مجھے مل گیا تو ایسا انتقام لوں گی کہ وہ زندگی بھر اپنا منہ نوچتا رہے گا۔ میرا انتقام پورا ہوا تم زندگی بھر اپنا منہ نوچتے رہنا کیونکہ میں تمہاری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔ یہ میرے انتقام کی ایک اور شکل ہے۔ میں اسے وہی زندگی دوں گی جو تم مجھے دے کر گئے تھے۔ کہو اس وقت یہ سوچ کر تمہیں کیسا محسوس ہورہا ہے کہ وہ جوان ہوکر غیر مردوں کے ساتھ راتیں بسر کرے گی۔

میں نے بہت چاہا کہ تم سے یہ بھیانک انتقام نہ لوں لیکن تم اسی قابل ہو۔ میں بہت کوشش کے بعد بھی تمہیں معاف نہ کرسکی اس کے لیے مجھے معاف کردینا۔''

پرچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح باہر بھاگا۔ حاجی صاحب کے دروازے کے باہر جاکر گر پڑا۔

''وہ میری بیٹی کو لے کر بھاگ گئی۔ وہ اس کا سودا کردے گی۔ مجھے میری بیٹی لادو۔''

وہ حاجی صاحب کو اس مرتبہ بھی یہ نہ بتاسکا کہ خود اس نے فیروزہ کی روح پر کتنے زخم لگائے تھے۔ ہر شخص کو اپنے ہی زخم تو دکھائی دیتے ہیں۔

حاجی صاحب نے فیروزہ کی گم شدگی کا اشتہار اخباروں میں شائع کرایا لیکن کہیں سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ عبداللہ کو ایک موہوم سی امید یہ تھی کہ شاید وہ اپنے چچا کے پاس میرپورخاص چلی گئی ہو۔ وہ جب سے وہاں سے آیا تھا ایک مرتبہ بھی لوٹ کر نہیں گیا تھا۔ وہ اس باغ سے ہوکر گزرا جہاں وہ فیروزہ کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ پھر اپنے بھائیوں کے گھر چلا گیا۔ برسوں بعد اس کے بھائیوں اور بھابیوں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے بھائیوں نے سوتیلا پن بھلا کر اس کا استقبال کیا لیکن اس پر جو گزر رہی تھی اس سے کوئی واقف نہیں تھا۔

دوسرے دن وہ فیروزہ کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ فیروزہ کے چچا اور چچی کا انتقال ہوگیا۔ اولاد کوئی تھی نہیں، ان کے رشتہ داروں نے گھر پر قبضہ جمالیا اور پھر اسے اونے پونے بیچ دیا۔ اب وہاں کوئی اور رہتا تھا۔ فیروزہ کے وہاں ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس نے شہر کی ایک ایک گلی میں گھومنا شروع کردیا کہ شاید وہ کوئی مکان کرائے پر لے کر رہنے لگی ہو اور اسے نظر آجائے۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں لیکن وہ نظر نہ آئی۔

اس کا دوسرا ٹھکانا حیدرآباد ہوسکتا تھا۔ فیروزہ نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ حیدرآباد سے کراچی آئی ہے۔ وہ حیدرآباد چلا گیا۔ ایسی عورتوں کے پیچھے بھاگتا رہا جو دھندا کرتی ہیں۔ وہ تو وہ، اس کی شباہت بھی کہیں نظر نہ آئی۔ اس کی حالت پاگلوں جیسی ہورہی تھی۔ رات کو کسی فٹ پاتھ پر پڑ کر سوجاتا تا صبح پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ ریشم گلی، شاہی بازار کے صدہا چکر لگالیے۔ ایک ایک کوٹھا چھان مارا لیکن ناکام رہا۔

یہ سوچ سوچ کر اس کی روح زخمی ہورہی تھی کہ اس کی بیٹی کس ماحول میں پل کر بڑی ہوگی۔ وہ روز مرتا تھا روز جیتا تھا۔ دن بھر کی گشت کے بعد اس کی امیدیں دم توڑ دیتی تھیں۔ رات بھر میں پھر تازہ دم ہوجاتا تھا۔ نئے سرے سے تلاش شروع ہوجاتی تھی۔ اس کے کپڑے تار تار ہوگئے تھے۔ کب سے نہایا نہیں تھا۔ حلیے سے فقیر لگنے لگا تھا۔ لوگ آتے جاتے اس کے ہاتھ پر سکے اور نوٹ رکھنے لگے تھے۔ پھر اس نے اپنی ضرورتوں کے لیے ہاتھ پھیلانا شروع کردیا۔

حیدرآباد میں رہتے کئی سال گزر چکے تھے۔ اس نے سوچا، فیروزہ بھی تو حیدرآباد سے کراچی گئی تھی اور پھر میں اسے مل گیا تھا۔ میں بھی حیدرآباد سے کراچی چلا جاؤں تو شاید وہ مجھے مل جائے۔ وہ کراچی آنے والی ٹرین میں بیٹھ گیا۔

وہ اپنے گھر پہنچا تو وہاں ایک شاندار مکان تعمیر ہوچکا تھا۔

''میں اپنے گھر کو نہ پہچان سکا، اگر وہ کبھی آئی تو گھر نہ بھول جائے۔ مجھے یہیں رہنا چاہیے۔'' وہ اپنے مکان کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھر کے لوگوں کو اعتراض ہوا تو وہ وہاں سے اٹھ کر گلی کے موڑ پر بیٹھ گیا۔

برسوں گزر گئے ہیں، ایک بوڑھا گلی کے موڑ پر بیٹھا ہر آنے جانے والے سے پوچھتا رہتا ہے کہ اس نے فیروزہ کو تو کہیں نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی دورہ پڑتا ہے تو اپنا منہ نوچنے لگتا ہے۔ خون کی دھاریاں اس کے چہرے پر جم جاتی ہیں۔

لوگ اس کے سامنے کھانا رکھ جاتے ہیں۔ بس یہی اس کی زندگی ہے۔

تھرڈ کزن

مرزا امجد بیگ

معتبر رشتے سر کی چادر اور گھر کو عزت بخشنے کا ذریعہ ہوتے ہیں مگر... آج کل رشتوں کا "بیوپار" عام ہوتا جارہا ہے... جذبات و احساسات اپنی قدر کھوتے جارہے ہیں... آخر کیوں... شاید لالچ اور ہوس نے ذہنوں کو اچھی سوچ سے عاری کردیا ہے۔ رشتوں کی پاسداری اب پاس سے بھی نہیں گزرتی۔ ایک ایسی ہی زنجیر انہیں بھی اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھی جس کی ہر کڑی کچھ اکڑی اکڑی تھی، انہیں اپنی منشا کے مطابق جوڑا اور توڑا جاتا تھا مگر آخر کب تک... جب پائیداری ختم ہوجائے تو کڑیاں ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسے ہی تعلقات کا حصار بہت سے جذبات و احساسات اور سازشوں، رنجشوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھا جو... رفتہ رفتہ ایک جرم کی صورت اختیار کرتے جارہے تھے اور جہاں مجرم ہو وہاں قانون کا خاموش رہنا ناقابلِ عمل امر ہے اور بیگ صاحب جیسے لوگوں کے پاس تو جرم اور مجرم دونوں خود چل کر اپنی نشاندہی کراتے ہیں... کیونکہ صداقت جھوٹ کو زیادہ دیر پنپنے نہیں دیتی۔

حسد کی آگ میں جھلسنے والے دلوں کی روداد اور عدالت کا انصاف

اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس زیرِ سماعت نہیں تھا لہٰذا میں صبح ہی سے اپنے آفس میں جم کر بیٹھ گیا۔ میرے ریگولر کلائنٹس کو دفتری اوقات کی خبر ہے اور وہ مجھ سے انہی مخصوص اوقات میں ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ جب بھی میں دن کے پہلے حصے میں آفس کھول کر بیٹھ جاؤں تو بڑی "بے رونقی" کا سماں رہتا ہے۔ کوئی بھولا بھٹکا یا بالکل نیا کلائنٹ تو دفتر میں جھانکنے آجاتا تھا مگر روزمرہ جیسی مصروفیت نہیں ہوتی تھی۔ اس پیشہ وارانہ فراغت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں آفس کے پینڈنگ کام نمٹالیا کرتا تھا۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے ایک خوب صورت اور پرکشش عورت میرے دفتر میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا دراز قامت شخص بھی تھا۔ وہ دونوں چہرے سے کافی پریشان نظر آتے تھے۔

میں نے پیشہ وارانہ مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ کرسیاں کھینچ کر میز کی دوسری جانب بیٹھ گئے تو میں نے باری باری دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"جی فرمائیں...... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

رسمی علیک سلیک کے دوران میں مجھے ان دونوں کے نام معلوم ہوچکے تھے۔ دراز قد شخص کاشف اور اس کے ساتھ آنے والی خاتون کا نام کنول تھا۔ میرے سوال کے جواب میں کاشف نے باقاعدہ گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے بتایا۔

"وکیل صاحب! ہم لوگ ایک مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔"

میں نے رف پیڈ کو سامنے رکھتے ہوئے قلم سنبھال لیا اور بڑی توجہ سے پوچھا۔ "کس قسم کی مصیبت کاشف صاحب؟"

"میرے بڑے بھائی اکبر کو پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اوہ......!" میں نے گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ "پولیس نے اکبر کو کس الزام میں گرفتار کیا ہے؟"

"ان پر ایک شخص کے قتل کا الزام ہے۔"

"یہ شخص کون تھا......" میں نے رف پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے سوالات کا آغاز کر دیا۔ "اور اکبر کی گرفتاری کب عمل میں آئی ہے؟"

"یہ بیس اکتوبر کی رات کا واقعہ ہے وکیل صاحب!" کاشف نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ "مقتول کا نام ہے، مقبول شاہ اور یہ مقبول شاہ بھائی صاحب کا بہت اچھا دوست تھا۔"

میں نے چونک کر باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "قتل کی واردات بیس اکتوبر کو ہوئی اور آج ہے بائیس اکتوبر...... اس کا مطلب ہے، پولیس نے اب تک ملزم کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔" کاشف نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پولیس نے کل یعنی اکیس اکتوبر کو، بھائی صاحب کو عدالت میں پیش کر کے ایک ہفتے کا ریمانڈ لے لیا ہے اور وہ اس وقت پولیس کی کسٹڈی میں ہیں۔"

"آپ کے بھائی اکبر کو کس تھانے میں رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

"آپ کے بھائی صاحب کرتے کیا ہیں؟" میں نے ملزم کے پیشے کے حوالے سے سوال کیا۔

اس مرتبہ کاشف کے بجائے کنول نے جواب دیا۔ "رضوان عراق کی ایک آئل کمپنی میں ملازم ہیں اور آج کل چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے ہیں......"

"آپ ان کی......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو کنول جلدی سے بولی۔ "میں ان کی بیوی ہوں۔ کاشف میرے دیور ہیں۔ ہم سب لوگ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت......"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے ستائشی نظر سے انہیں دیکھا۔

کاشف نے کہا۔ "وکیل صاحب! بھائی صاحب مکینیکل انجینئر ہیں۔ وہ پچھلے تین سال سے عراق میں ہیں۔ ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر وہ ہم لوگوں سے ملنے آتے ہیں مگر اس بار......!"

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ اس وقت کاشف کے ذہن میں کیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ اکبر اس سال جو چھٹی پر آیا تو مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

میں نے حصول معلومات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "ذرا مقتول کے روزگار کے بارے میں بھی بتا دیں؟"

"مقبول شاہ کا ٹائروں کا بزنس ہے۔" کاشف نے جواب دیا۔ "ادھر پلازا کے علاقے میں اس کا بہت شاندار شوروم ہے۔ وہ ٹائرز کا بہت بڑا امپورٹر تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے وہ بستر کا ہو کر رہ گیا تھا۔ جب سے بزنس کے تمام معاملات اس کی بیوی نازش دیکھ رہی تھی۔"

"مقتول کس وجہ سے بستر کا ہو کر رہ گیا تھا؟" میں نے جاننا چاہا۔ "کیا کوئی حادثہ وغیرہ......!"

"جی ہاں...... روڈ ایکسیڈنٹ۔" کنول نے جواب دیا۔ "کوئی دس ماہ پہلے ایک بدمست ٹرک ان کی گاڑی کو بری طرح روندتے ہوئے گزر گیا۔ ان کی جان تو بچ گئی مگر بدن کا نچلا حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ یا تو بستر پر لیٹے رہتے یا زیادہ سے زیادہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر گھر کے اندر تھوڑی بہت "چہل قدمی" کر لیا کرتے تھے۔ گھر سے باہر نکلنا بالکل موقوف ہو کر رہ گیا تھا۔ وہیل چیئر پر بٹھانے اور اتارنے کے لیے بھی دو افراد کی مدد کی ضرورت پیش آتی تھی۔"

میں نے مناسب الفاظ میں افسوس کا اظہار کیا پھر پوچھا۔ "قتل کی یہ واردات کہاں پیش آئی تھی؟"

"مقتول کے گھر پر۔" کاشف نے بتایا۔ "گارڈن ایسٹ کے علاقے میں۔"

اس نے مجھے مقتول کے گھر کی جو لوکیشن بتائی وہ سولجر بازار سے متصل گارڈن ایسٹ کا علاقہ تھا۔ میں نے یہ تمام تر معلومات پیڈ پر نوٹ کرنے کے بعد پوچھا۔ "کاشف صاحب! آپ کے بھائی اکبر کو کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟"

"ہماری رہائش گاہ سے جناب...... شادمان ٹاؤن سے۔"

"کتنے بجے......؟"

"لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے۔" کنول نے جواب دیا۔ "وہ تھوڑی دیر پہلے ہی باہر سے آئے تھے۔"

"باہر کہاں سے......؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"وہ مقتول مقبول شاہ کی خیریت لینے ان کے گھر گئے تھے۔" کنول نے بتایا۔ "جب سے وہ پاکستان آئے ہیں، ہر دوسرے تیسرے دن انہیں دیکھنے چلے جاتے تھے۔ انہیں اس بات کا سخت رنج تھا کہ ان کا دوست ایک خطرناک حادثے میں اپاہج ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ جب بھی وہاں جاتے، وہاں اچھا خاصا وقت گزار کر ان کی دلجوئی کرتے تھے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس نیکی کی اکبر کو اتنی بڑی سزا ملے گی......"

آخری جملہ کنول نے بڑی تلخی سے ادا کیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کسی خاص زاویے پر، مقتول یا اس کی فیملی کے کسی فرد کی طرف سے زبردست شاکی تھی۔ میں نے اس حوالے سے، کنول سے کوئی سوال نہیں کیا اور پوچھا۔

"اکبر کی، وقوعہ کے روز مقتول کے گھر میں، موجودگی کے دوران جو واقعات پیش آئے ان کے بارے میں کچھ بتائیں......!"

"بیگ صاحب!" کاشف نے پہلی مرتبہ مجھے میرے نام کے آخری حصے سے مخاطب کیا۔ "اس بارے میں تو آپ کو بھائی صاحب ہی بتا سکیں گے۔"

"گرفتاری کے بعد سے اب تک آپ لوگوں نے اکبر سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وکیل صاحب! یہ مصیبت اتنی اچانک ہم پر ٹوٹ پڑی ہے کہ کسی چیز کا خیال ہی نہیں رہا۔ ذہن بالکل منتشر ہو کر رہ گیا ہے۔" کنول نے بڑی بے بسی سے کہا۔ "حالانکہ کئی بار میرے دل میں آیا کہ ان سے پوچھوں لیکن کورٹ میں اور تھانے میں ان سے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا......"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "میں آج ہی تھانے جا کر اکبر سے تفصیلی ملاقات کروں گا پھر ساری معلومات مجھے حاصل ہو جائیں گی۔"

"بہت بہت شکریہ وکیل صاحب!" وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری بھائی صاحب سے جتنی بات ہو سکی ہے اس میں انہوں نے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ انہیں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے......" کاشف نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"ٹھیک ہے......!" میں نے کہا۔ "میں سب پتا لگا لوں گا کہ اس لسی میں دہی کتنا ہے، دودھ کتنا ہے اور پانی کتنا ہے۔ آپ لوگ اطمینان سے گھر جائیں اور کل سہ پہر میں یہیں آ کر مجھ سے ملیں۔ پھر میں آپ سے تفصیلی بات کروں گا۔"

کنول نے اپنے ہینڈ بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ اپنی فیس کے بارے میں بھی بتا دیں......؟"

"فیس کے بارے میں بھی میں آپ کو کل ہی بتاؤں گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلے یہ فیصلہ ہو جائے کہ میں آپ کے ہسبینڈ کا کیس لے بھی رہا ہوں یا نہیں۔"

"یعنی آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ابھی یہ کیس آپ نے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا......؟" کاشف نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"جی ہاں، میرے کہنے کا یہی مطلب ہے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "دراصل، یہ میرا اصول ہے کہ جب تک میں اپنے موکل کے حالات سن کر اپنا اطمینان نہ کر لوں اس وقت تک کسی کیس میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "مقتول کے گھر میں جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں آپ لوگ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ یہ تمام تر معلومات مجھے اکبر سے ملاقات کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہیں اس لیے ہم اس معاملے کو کل ہی فائنل کر سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے بیگ صاحب!" کاشف نے تعریفی نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ "آپ نے ایک اصولی بات کی ہے۔ مجھے آپ کا انداز پسند آیا ورنہ یہاں پر ایسے وکلا کی بھی کمی نہیں جو اس اصول پر کام کرتے ہیں...... آتے جاؤ اور پھنستے جاؤ......!"

"جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں ویسے ہی، کسی بھی پیشے سے تعلق رکھنے والے بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے لیے جو اصول بنا رکھے ہیں انہی کو فالو کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"بجا فرما رہے ہیں آپ۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں بیگ صاحب۔" پھر وہ میرے آفس کے مختلف شیلفوں میں سجی درجنوں ضخیم کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "کیا وکیل بننے کے لیے اتنی زیادہ کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں؟"

"اس سے بھی کہیں زیادہ۔" میں نے اس کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل بات یہ ہے کہ وکیل بننے کے لیے تو صرف وہی کتابیں پڑھنا پڑتی ہیں جو سلیبس میں ہوتی ہیں یا پھر چند حوالہ جاتی کتابیں اس کے علاوہ ہیں۔ یہ جو شیلفوں میں سجی ہوئی درجنوں کتابیں آپ کو نظر آ رہی ہیں ایسی ہی سیکڑوں کتابیں میرے گھر میں بھی رکھی ہوئی

ہیں، یہ تمام تر کسی اور مقصد کے لیے ہیں۔"

"کس مقصد کے لیے بیگ صاحب؟" اس کی الجھن دوبالا ہوگئی۔

"وکالت کے پیشے کو چلانے اور چمکانے کے لیے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر کامیاب وکیل کی حیثیت سے باعزت زندگی گزارنا ہو تو ان کتابوں کو گاہے بہ گاہے اپنے مطالعے میں رکھنا پڑتا ہے۔ کسی بھی کیس میں، ان میں سے کوئی ایک، دو، تین یا دس پندرہ کتابوں کو دیکھنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"اوہ......" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "وکالت تو بہت مشکل پروفیشن ہے بیگ صاحب۔"

"ہاں، یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کاشف سے اس کی جاب کے حوالے سے چند سوالات کیے پھر انہیں تسلی دے کر اپنے آفس سے رخصت کردیا۔

⁂

میں دفتری مصروفیات سے نمٹ کر فارغ ہوا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر کی راہ لینے سے پہلے میں اس تھانے میں پہنچ گیا جہاں اکبر کو رکھا گیا تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ریمانڈ پر کسی ملزم سے حوالات میں جاکر ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن میں اکبر سے ایک مختصر سی ملاقات کا موقع حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

اکبر کی عمر چالیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ بھرے بھرے جسم کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ چہرہ گول اور گال معصوم بچوں کی طرح پھولے ہوئے۔ اس کی ٹھوڑی میں ایک خوب صورت ڈمپل بھی دکھائی دے رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی آنکھیں شریر اور مسکراتی ہوئی سی تھیں لیکن مصیبت کے ان لمحات میں وہ خاصا افسردہ اور الجھن زدہ نظر آتا تھا۔

وہ حوالات کے فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو فوراً اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور سوالیہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے آہنی سلاخوں کے پاس جاکر اس سے مصافحہ کیا پھر اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"اکبر صاحب! میرا نام مرزا امجد بیگ ہے۔ میں ایک ایڈووکیٹ ہوں۔ آپ کی بیوی اور چھوٹے بھائی نے مجھے اس کیس میں آپ کا وکیل مقرر کیا ہے۔"

"اوہ......!" اس کی آنکھوں میں اطمینان کی کرن چمکی۔ اس نے گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے دوبارہ مصافحہ کیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی وکیل صاحب......!"

"خوشی تو مجھے بھی ہوئی ہے اکبر صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ جگہ خوشی کے اظہار کے لیے موزوں نہیں لگتی۔ جب آپ کو اس مصیبت سے مکمل نجات مل جائے گی اور آپ آزاد فضا میں اپنی مرضی سے سانس لینے لگیں گے تو اس وقت میں...... بلکہ ہم دونوں اس خوشی کو سیلی بریٹ کریں گے۔"

"بے شک...... ضرور!" وہ یقینی لہجے میں بولا۔ "آپ بڑے صحت افزا وکیل ہیں۔ یقین جانیں، میں اس معاملے میں بالکل بے گناہ ہوں۔ میں نے مقبول شاہ کا خون نہیں کیا......!"

اکبر نے میرے "صحت افزا" ہونے کی بات ایسے انداز میں کی تھی جیسے میں کوئی انسان نہ ہوں بلکہ فرحتِ جاں مشروب ہوں۔ بہرحال اکبر نے دراصل میری حوصلہ افزا باتوں کے جواب میں مجھے سراہنے کی کوشش کی تھی۔

"اکبر صاحب!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "صرف آپ کے کہنے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوجائے گا کہ آپ بے گناہ ہیں۔ آپ کی بے گناہی کو عدالت میں ثابت کرنا ہوگا۔"

"جی...... اس بات کو میں بھی سمجھ رہا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں ایک وکیل کی اشد ضرورت محسوس کررہا تھا۔ اچھا ہوا، کنول اور کاشف نے آپ کو میرا وکیل مقرر کردیا ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ میری بے گناہی کو ثابت بھی کرکے دکھادیں گے۔"

"لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ممکن ہوسکے گا جب آپ مجھ سے تعاون کریں گے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

"آپ کے بھائی اور بیوی سے میری بات ہوئی ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ آپ کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ ان سے حاصل ہونے والی معلومات ناکافی ہیں اسی لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ بتائیں گے کہ وقوعہ کے روز مقتول کے گھر میں کیا ہوا تھا......؟"

"آپ جو بھی جاننا چاہیں گے، میں ضرور بتاؤں گا۔" وہ فرمانبرداری سے بولا پھر پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا دس پندرہ دن میں یہ معاملہ نمٹ جائے گا؟"

"یہ قتل کا کیس ہے اکبر صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "دس پندرہ دن میں اگر اس کیس کی باقاعدہ سماعت ہی شروع ہوجائے تو شکر کی بات ہوگی......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اس سے پوچھ لیا۔ "اکبر صاحب! یہ پندرہ دن کا خیال آپ کے ذہن میں کیسے آگیا؟"

"میں ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آیا ہوا ہوں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "جس میں سے بیس دن گزر گئے ہیں۔ دس دن باقی بچے ہیں۔"

"آپ کی بیوی نے مجھے آپ کی چھٹیوں کے بارے میں بھی بتایا تھا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "لیکن یہ تو کسی بھی صورت ممکن نہیں کہ دس دن میں آپ کو اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ ایک ہفتہ تو ریمانڈ ہی میں نکل جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے، مجھے اپنی چھٹی بڑھانا ہوگی۔" وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے، میں کاشف سے کہوں گا کہ وہ عراق میں میری کمپنی سے رابطہ کرکے انہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کردے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ پھر مجھے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "بیگ صاحب! آپ مجھے اس کیس سے رہا کروانے میں کامیاب تو ہوجائیں گے نا؟"

"کامیابی اور ناکامیابی کے بیچ قدرِ مشترک صرف "کام" ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر اس "کام" کو ڈھنگ سے کرلیا جائے تو فتح یقینی ہوگی اور اگر یہ "کام" بے ڈھنگے انداز میں ہوا تو شکست لازمی ہے۔" میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر ملزم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی جس کام کا ذکر کیا ہے اس کے ڈھنگ یا بے ڈھنگ سے ہونے کا انحصار صرف اور صرف آپ پر ہے۔"

"مجھ پر......؟" وہ چونک کر بولا۔ "وہ کس طرح بیگ صاحب؟"

"آپ مجھے جو بھی معلومات فراہم کریں گے وہ جس قدر درست ہوں گی، میں اتنے ہی اعتماد کے ساتھ آپ کا کیس لڑسکوں گا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے حقائق سے آگاہ کرکے اپنے حق میں اچھا کریں گے۔"

"میں بھی چاہوں گا کہ میرے حق میں اچھا ہو۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس لیے آپ جو بھی پوچھیں گے، میں اس کا سچا اور کھرا جواب دوں گا۔"

"یہ بات تو طے ہے کہ آپ نے اپنے دوست مقبول شاہ کو قتل نہیں کیا......!" یہ جملہ میں نے اس انداز میں ادا کیا تھا کہ اسے بہ یک وقت بیانیہ اور سوالیہ سمجھا جاسکتا تھا۔

"جی ہاں، یہ بات صد فیصد طے ہے۔" وہ میرے جملے کو سوالیہ جان کر بولا۔ "میں مقبول شاہ کا قاتل نہیں ہوں۔"

"پھر آپ کو یہ تو اندازہ ہوگا کہ مقبول شاہ کو کس نے قتل کیا ہوگا؟" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بیگ صاحب! اگر میں قاتل کو جانتا ہوتا تو پھر اس وقت پولیس کسٹڈی میں کیوں ہوتا۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ "میں پولیس والوں کو قاتل کا نام بتا کر اپنی جان چھڑا سکتا تھا۔"

"وقوعہ کے روز آپ مقتول کے گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"میں لگ بھگ شام چھ بجے اپنے گھر سے روانہ ہوا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "شادمان ٹاؤن سے گارڈن ایسٹ تک لگ بھگ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو ہے۔ میرا خیال ہے، میں ساڑھے چھ بجے مقبول شاہ کے گھر پہنچا تھا۔"

"جب آپ مقتول کے گھر پہنچے تو وہاں مقتول کے علاوہ اور کون کون تھا؟" میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔

"مقبول شاہ کی بیوی نازش تھی اور اس کا گھریلو ملازم توفیق تھا۔" اس نے بتایا۔ "اور نازش کا کزن فیصل بھی موجود تھا۔"

"جب آپ وہاں سے رخصت ہوئے تو کیا یہ تینوں افراد بنگلے میں موجود تھے؟" میں نے استفسار کیا۔

"جی ہاں......" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "جب میں مقبول شاہ کو "خداحافظ" کہہ کر اس کے بیڈروم سے نکلا تو نازش سے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ اپنے کزن کے ساتھ بیٹھی باتیں کررہی تھی۔ ہمارے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور میں صحن عبور کرکے گیٹ تک پہنچ گیا۔ گھریلو ملازم توفیق نے میرے لیے گیٹ کھولا اور میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگیا تھا۔"

"جس وقت آپ نے مقبول شاہ کو "خداحافظ" کہا، آپ کے خیال میں وہ زندہ تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے بیگ صاحب!" اس نے الجھن

زدہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ”اگر وہ زندہ نہیں تھا تو میں نے ”خدا حافظ“ کس کو کہا تھا......؟“

”دراصل، میں یہ اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ وقوعہ سے رخصت ہوئے تو مقتول شاہ بہ قائمی ہوش وحواس زندہ سلامت تھا......!“ میں نے کہا۔ ”لہٰذا اس کی موت میں آپ کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”میرے واضح جواب نے آپ کو مطمئن کر دیا ہے نا؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

”جی، بالکل......!“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کتنے بجے جائے وقوعہ سے روانہ ہوئے تھے؟“

”اس وقت رات کے ساڑھے نو بجے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور گھر کتنے بجے پہنچے تھے؟“

”میرا خیال ہے، اس وقت گیارہ بجے تھے۔“

”واپسی میں آپ کا سفر اتنا سست کیوں رہا؟“ میں نے پوچھا۔ ”آدھے گھنٹے والا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں کیوں طے ہوا تھا؟“

”مقتول شاہ کے گھر سے نکلنے کے بعد میں سیدھا اپنے گھر نہیں آیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لیے پاپوش چلا گیا تھا۔ ادھر بھی میرا ایک دوست رہتا ہے جو ایک بک شاپ چلاتا ہے۔ میں کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے کے بعد اپنے گھر کی جانب لوٹا تھا۔“

”اور پھر گھر پہنچتے ہی پولیس نے آپ کو مقتول شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا......!“ میں نے کہا۔ ”آپ کی گرفتاری کم و بیش کتنے بجے عمل میں آئی تھی؟“

”میں نے گھر پہنچ کر لباس وغیرہ تبدیل کیا ہی تھا کہ پولیس آدھمکی۔“ اس نے بتایا۔ ”جب وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے تو اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔“

”پولیس کی ایسی مستعدی خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس لیے یقین کرنے کو دل نہیں مانتا، بہر حال......“ میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”مقتول سے آپ کی دوستی کتنی پرانی تھی؟“

”ہماری دوستی کی عمر لگ بھگ دس سال تھی۔“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ صاحب کے مجھ پر بہت احسانات تھے۔ جب میں ملازمت کے سلسلے میں عراق جا رہا تھا تو انہوں نے میری اچھی خاصی مالی مدد بھی کی تھی۔ جب مجھے پتا چلا کہ ایک حادثے نے انہیں اپاہج بنا دیا ہے تو اس خبر سے مجھے دلی صدمہ ہوا تھا اسی لیے......“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اسی لیے ان چھٹیوں میں، میں نے زیادہ سے زیادہ وقت انہیں دیا ہے۔ میں ہر دوسرے، تیسرے دن ان سے ملنے جاتا تھا اور ان کے پاس اچھا خاصا وقت گزارنے کے بعد گھر واپس آتا تھا۔ میں پچھلے تین سال سے عراق کی ایک آئل کمپنی میں مکینیکل انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں اور ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر پاکستان آتا ہوں۔ پچھلی مرتبہ جب میں پاکستان آیا تو شاہ صاحب غیر شادی شدہ تھے اور ابھی آیا ہوں تو......!“

”کیا مطلب؟“ میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی سوال کر ڈالا۔ ”وہ غیر شادی شدہ تھے، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، اکبر صاحب؟“

”بات دراصل یہ ہے کہ کافی عرصہ پہلے مقتول شاہ کی بیوی عالیہ کا انتقال ہو گیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ان دنوں میں پاکستان ہی میں تھا۔ عالیہ سے شاہ صاحب کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ عالیہ کے انتقال کے بعد میں نے اور چند دوسرے خیر خواہوں نے بھی شاہ صاحب کو یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لیں لیکن وہ اس کام کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ پھر میں عراق چلا گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ شاہ صاحب کبھی دوسری شادی نہیں کریں گے اسی لیے اب کی بار میں جب آیا اور انہیں ”شادی شدہ“ دیکھا تو مجھے شدید حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ پچھلے بیس دن میں ہمارے درمیان جتنی بھی ملاقاتیں ہوئی ہیں ان میں زیادہ تر شاہ صاحب کی دوسری شادی خصوصاً ان کی بیوی نازش ہی زیر بحث رہی تھی......“ اس نے رک کر ذو معنی انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔

”وقوعہ کے روز بھی یہی گفتگو چل رہی تھی کہ شاہ صاحب یک دم جذباتی ہو گئے لہٰذا میں نے موضوع بدل دیا تھا۔ اس رات وہ خاصے بجھے بجھے نظر آ رہے تھے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ثابت ہوگی ورنہ میں ان سے ایسے موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔“

”ایسی کیا بات ہو گئی تھی اکبر صاحب!“ میں نے کریدنے والے انداز میں سوال کیا۔ ”نازش کے حوالے سے آپ نے مقتول سے کیا کہہ دیا تھا کہ وہ جذباتی ہو گیا تھا؟“

میرے سوال کے جواب میں وہ فوری طور پر کچھ نہیں بولا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ذہن میں کوئی ایسی

بات ہو جسے وہ بتانا مناسب نہ سمجھتا ہو۔ میں نے اسے تذبذب میں دیکھا تو کہا۔

”اکبر صاحب! آپ کی اس پراسرار خاموشی کا میں کیا مطلب لوں؟“

”بس جناب......“ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ خاصا الجھا ہوا معاملہ ہے۔“

”یہ معاملہ آپ کے لیے الجھا ہوا ہو سکتا ہے اکبر صاحب۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں آپ کا وکیل ہوں۔ آپ کی ہر الجھن کو سلجھن میں بدلنا میری ذمے داری ہے، جو بھی ہے، مجھے تفصیل سے بتا دیں اور یہ بات ذہن میں رکھیں کہ دائی سے پیٹ اور وکیل سے حقائق چھپا کر آپ فیض حاصل نہیں کر سکتے۔“

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چند لمحات کی متذبذب خاموشی کے بعد اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور ٹھہر ٹھہر کر مجھے ایک چونکا دینے والی سنسنی خیز داستان سنانے لگا۔ میں فی الحال وہ پوائنٹس آپ کے سامنے ظاہر نہیں کر رہا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں جب یکے بعد دیگرے یہ آپ پر کھلیں گے تو آپ کی دلچسپی اور سنسنی خیزی میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اس ملاقات کے اختتام پر میں اکبر کی طرف سے مطمئن ہو گیا تھا لہٰذا میں نے اس سے وکالت نامے، درخواست ضمانت اور دیگر مختلف کاغذات پر دستخط کروا لیے۔ جب میں تسلی دلاسا دے کر حوالات سے رخصت ہونے لگا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”بیگ صاحب! ایک مشورہ دیں!“

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”جی پوچھیں......؟“

”پولیس والے ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔“ اس نے بتایا۔ ”جب میں انجان بن گیا تو انہوں نے کھل کر بات کی......“

میں سمجھ گیا، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ ”کیا انہوں نے آپ سے رقم وغیرہ کا مطالبہ کیا ہے؟“

”جی بالکل یہی بات ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”کہہ رہے تھے، اگر میں ان کے لیے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر دوں تو وہ میرے خلاف کیس میں کوئی نرم دفعہ لگائیں گے اور میرا وکیل آسانی سے عدالت سے مجھے چھڑا لے گا......“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“ میں نے اکبر سے پوچھا۔

”میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے بے وقوف بنا کر رقم اینٹھنا چاہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے ان سے کہا، ایک لاکھ تو بہت زیادہ ہیں۔ میں اتنی بڑی رقم کا انتظام نہیں کر سکتا۔ انہوں نے کہا، جان ہے تو جہان ہے۔ عراق میں کمائی ہوئی رقم کو بچا کر میں اپنے ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔ اگر میں ہی پھانسی چڑھ گیا تو دولت ادھر ہی رکھی رہ جائے گی۔“

”آپ نے انہیں کوئی رقم دی تو نہیں؟“ اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب۔“ وہ بڑی مضبوطی سے بولا۔ ”میری طرف سے مایوس ہونے کے بعد انہوں نے دوسرا حربہ آزمانا شروع کر دیا ہے......!“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کون سا حربہ؟“

وہ بولا۔ ”کہہ رہے ہیں، میرے خلاف بڑی مضبوط شہادتیں ہیں ان کے پاس۔ انہوں نے آلۂ قتل میری گاڑی کے اندر سے برآمد کیا ہے۔ مجھے چاہیے کہ میں چپ چاپ اقبال جرم کر لوں۔ اسی میں میری عافیت ہے۔ ورنہ وہ مجھ پر ایسا بھیانک تشدد کریں گے کہ میرا ایک ایک عضو اس قتل کا اقرار کرتا سنائی دے گا۔“

”یہ لوگ ریمانڈ کی مدت کے دوران میں ملزم پر ہر قسم کا جبر اور تشدد تو کرتے ہیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ”ریمانڈ کے نتیجے میں انہیں عدالت میں چالان پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے ہتھکنڈے چالان کو توانا اور قوی بنانے کے لیے ہوتے ہیں۔“

”پتا نہیں، میں نے غلط کیا یا درست۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”بیگ صاحب! میں نے اپنے جسم و جان کی سلامتی کے پیش نظر ان کے فراہم کردہ ایک پرچے پر دستخط کر دیے ہیں۔ وہ ایک سادہ کاغذ تھا۔ میرا خیال ہے وہ اس پرچے پر میرا اقبالی بیان تحریر کریں گے......“

”جی ہاں!“ میں نے اس کے خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔“ پھر میں نے اس کی تسلی کی خاطر ایک قانونی نکتہ اس پر واضح کر دیا۔

”اکبر صاحب! پولیس کی تحویل میں دیے گئے یا لیے گئے بیان کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ عدالت کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے پولیس کے پیش کردہ چالان سے زیادہ حالات و واقعات اور کیس کے پس منظر و جرم کے اسباب کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیتی ہے۔ شہادتوں کو پرکھتی ہے اور دونوں اطراف کے وکلا کی جرح کے نتیجہ میں سامنے آنے والے حقائق کو قانون اور انصاف کے ترازو میں تولتی

ہے لہٰذا آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر......"
میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

"اور پھر جب میں آپ کی وکالت کے لیے عدالت میں موجود ہوں گا تو آپ کو فکر کس بات کی اکبر صاحب......!"

ان لمحات میں وہ مجھے بہت مطمئن دکھائی دیا۔ امید کی کرن اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایک ساتھ چمکی تھی اور پلک جھپکتے میں مایوسی کی جگہ خوشی نے لے لی تھی۔

×××

کہتے ہیں، کسی کام کا مصمم ارادہ کر لینا آدھا کام کر لینے کے برابر ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی پریشان انسان کو خوشی کی امید دلانا بھی اس کی آدھی پریشانی دور کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ میں اپنے کلائنٹس کو پہلا ٹریٹمنٹ یہی دیتا ہوں کہ ان کے اندر امید اور حوصلے کا دیا روشن کر دیا کرتا ہوں جس کی وجہ سے وہ اپنی سوچ میں ایک خاص قسم کی مثبت توانائی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں جینے کی امنگ اور اپنے حالات سے نمٹنے کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے اس سائیکو تھراپی کے بڑے اچھے نتائج حاصل کیے ہیں۔

آئندہ روز اکبر کی بیوی کنول اپنے دیور کے ساتھ پہلے سے طے شدہ وقت پر مجھ سے ملنے آفس پر آ گئی۔ آج وہ دونوں کل کی بہ نسبت خاصے سنبھلے ہوئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد کنول نے مجھ سے کہا۔

"بیگ صاحب! ہم ابھی تھانے میں اکبر سے ملاقات کرنے کے بعد آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ لگتا ہے، آپ نے ان کا کیس لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اکبر سے میری خاصی تفصیلی ملاقات ہوئی ہے اور میں اس بات سے مطمئن اور متفق ہوں کہ وہ قاتل نہیں۔ اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں بیگ صاحب!" کاشف نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ "بھائی صاحب اس مصیبت سے بہ آسانی باہر نکل آئیں گے نا؟"

"کیوں نہیں بھئی...... اللہ نے چاہا تو جیت ہماری ہی ہوگی۔" میں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "لیکن اس کے لیے آپ دونوں کو بڑے صبر و تحمل اور برداشت سے کام لینا ہوگا اور خاص طور پر آپ کو میری ہدایات کو ذہن میں رکھ کر آگے بڑھنا ہوگا۔"

"ہم وہی کریں گے جو آپ ہمیں بتائیں گے۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ان دونوں کو اس گفتگو کا خلاصہ سنا دیا جو میرے اور اکبر کے درمیان ہوئی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر باتیں ایسی تھیں جو ان کے لیے نئی اور حیرت کا باعث تھیں۔ بہرحال، انہیں یقین کرنا پڑا کیونکہ یہ ایک سامنے کی حقیقت تھی جسے وہ جھٹلا نہیں سکتے تھے۔

"کاشف صاحب!" میں نے اکبر کے چھوٹے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو آپ اپنے بھائی کی عراقی آئل کمپنی سے رابطہ کر کے انہیں اکبر پر ٹوٹنے والی افتاد کے بارے میں تفصیلاً بتائیں گے تاکہ وہ اس کے انتظار میں نہ بیٹھے رہیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے اکبر کی ملازمت آئندہ کے لیے محفوظ ہو جائے گی۔"

"جی...... یہ کام میں کل صبح ہی کر لوں گا۔" اس نے کہا۔ "ابھی بھائی صاحب سے بھی اس موضوع پر میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔"

"ویری گڈ......!" میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

کنول نے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! کوئی اور بات کرنے سے پہلے آپ مجھے اپنی فیس کے بارے میں بتائیں تاکہ میں بھی مطمئن ہو جاؤں کہ یہ کیس آپ ڈیل کر رہے ہیں۔"

"ہاں، یہ ضروری ہے۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا اور اسے فیس کی رقم سے آگاہ کرنے کے بعد واضح الفاظ میں اضافہ بھی کر دیا۔ "یہ صرف میری فیس ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی دیگر عدالتی اخراجات ہوں گے وہ سب آپ کے ذمے ہیں۔"

"جی، سمجھ گئی۔" وہ تائیدی انداز میں بولی۔ "بتانا آپ کا کام ہے، رقم فراہم کرنا میرا کام......"

وہ مزید پندرہ بیس منٹ تک میرے پاس بیٹھے رہے۔ میں نے ان دونوں کو کیس کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی دینے کے بعد رخصت کر دیا۔

یہ کیس ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا۔ جب تک کسی کا باقاعدہ چالان نہیں پیش کر دیا جاتا، عدالتی کارروائی کا آغاز نہیں ہو پاتا لہٰذا ابھی میرے پاس چار پانچ دن بالکل فری

تھے۔ مجھے جس نوعیت کی جو بھی معلومات درکار تھیں ان کے حصول کے لیے میں نے کاشف کی ڈیوٹی لگادی تھی۔

✂✂✂

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے اس کیس کا چالان عدالت میں پیش کردیا۔ اس موقع پر میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت دائر کردی اور ضمانت کے حق میں دلائل کا آغاز کیا۔

دوسری طرف وکیل استغاثہ میرے موکل کی ضمانت رکوانے کے لیے زور لگانے لگا۔ میں پہلے بھی کئی بار اس امر کی وضاحت کرچکا ہوں کہ قتل کے کیس میں ملزم کی ضمانت ناممکنات کی حد تک مشکل ہوتی ہے تاہم کوشش کرنا بھی لازمی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ جج نے ضمانت کی درخواست کو رد کرتے ہوئے ملزم کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی آیندہ پیشی کے لیے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

عدالت کی ابتدائی چند پیشیاں تیکنیکی نوعیت کی حامل ہوتی ہیں جن میں کوئی خاص کارروائی دیکھنے میں نہیں آتی۔ چند ضابطوں کے تقاضے پورے کرنا ضروری ہوتے ہیں اور یہ تمام تر مراحل انتہائی سست رفتاری سے آگے بڑھتے ہیں۔

مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع ہونے میں لگ بھگ تین ماہ لگ گئے۔ اس دوران میں، میں نے کیس فائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کرلیا تھا اور میں اس کے تمام پہلوؤں سے کلی طور پر مطمئن تھا۔

یہاں پر میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ مذکورہ رپورٹ کے مطابق مقتول مقبول شاہ کی موت بیس اکتوبر کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کی تحقیق بتاتی تھی کہ مقتول کے بدن پر بتیس بور (اعشاریہ تین دو کیلی بر) کی تین گولیوں کے نشانات کا سراغ ملا تھا۔ ایک گولی پیشانی میں اور دو سینے پر، عین دل کے مقام پر ماری گئی تھیں۔ گولیوں کے باعث مقتول کے جسم میں جو چھید بنے تھے ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ فائرنگ بہت قریب سے کی گئی تھی۔ یہی تینوں گولیاں اس کی موت کا سبب بنی تھیں۔

آلۂ قتل کے لیبارٹری ٹیسٹ سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ پولیس نے ملزم اکبر کی گاڑی سے جو پستول برآمد کیا تھا، یہ گولیاں اسی سے چلائی گئی تھیں تاہم ایک نہایت ہی اہم انکشاف بھی اس رپورٹ کا حصہ تھا اور وہ یہ کہ...... یہ تینوں گولیاں سائیلنسر لگے پستول سے فائر کی گئی تھیں۔

پستول کی باڈی اور ٹریگر پر ملزم کے فنگر پرنٹس موجود تھے۔ پولیس نے فنگر پرنٹس میچنگ کے بعد میرے موکل کو اس کیس میں ملزم نامزد کردیا تھا۔ اس کے علاوہ بعض واقعاتی شہادتوں کی مدد سے اتنا مضبوط چالان تیار کیا گیا کہ بہ ظاہر میرے موکل کا بچ نکلنا ناممکن نظر آتا تھا لیکن میں بہ خوبی سمجھتا تھا کہ مجھے کس موقع پر کیا اور کس طرح کرنا ہے۔ جس طرح، چاہے فیلڈ کتنی بھی سخت کیوں نہ کھڑی ہو، ایک ماہر بلے باز شاندار اسٹروک کھیلنے کے لیے گیپ تلاش کر ہی لیتا ہے۔

جج کرسیِ انصاف پر براجمان ہوچکا تو عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحتِ جرم سے انکار کردیا۔ اس کے بعد گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

استغاثہ کی جانب سے آٹھ گواہوں کی فہرست عدالت میں دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر آپ کا قیمتی وقت اور سسپنس ڈائجسٹ کے صفحات کا خیال کرتے ہوئے صرف ان گواہوں کا ذکر کروں گا جن کا بیان اور ان پر ہونے والی جرح کسی زاویے سے اہمیت کی حامل ہوگی۔

ملزم کے صحتِ جرم سے انکار کے بعد اس کا تفصیلی حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا تھا۔ ملزم نے نہایت ہی نپے تلے الفاظ میں وہ تمام نکات عدالت کے ریکارڈ میں محفوظ کرا دیے تھے جن کی ہدایت میں نے اسے کی تھی اور ان میں سے کوئی بھی نکتہ ایسا نہیں تھا جو حقائق کے منافی یا ان سے متصادم ہو۔ بس، بات یہ تھی کہ ان تمام حالات و واقعات کو ڈھنگ اور سلیقے سے پیش کیا گیا تھا۔

وکیل استغاثہ خاصا جوش میں دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا وہ پہلی ہی پیشی میں ملزم کو مجرم ثابت کرکے لمبی سزا دلوانے کا ارادہ باندھ کر عدالت پہنچا ہو۔ ویسے یہ بات ماننے کی تھی کہ میرے موکل کے خلاف پیش کیا جانے والا چالان خاصا جاندار تھا۔ بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ اگر وکیل استغاثہ نے ذرا سا بھی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تو ملزم بچ نہیں سکے گا اور...... میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ عقل کسی کی میراث نہیں اور نہ ہی اس پر کسی کی اجارہ داری قائم ہوسکتی ہے۔ اگر وکیل استغاثہ عقل مندی کے معمولی سے مظاہرے سے میرے موکل کو جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے بھیج سکتا تھا تو میں بھی سیر و تفریح کے لیے کورٹ نہیں پہنچا تھا۔

پہلے بھی کئی بار میں بتا چکا ہوں کہ کسی بھی کیس میں آئی او (انکوائری آفیسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ اہم

ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ وہ ایک طرح سے استغاثہ کا وارث ہوتا ہے اور وکیل استغاثہ کی مدد سے اس استغاثہ کی حفاظت کرتا ہے۔

جج نے وکیلِ استغاثہ کو گواہ پیش کرنے کا اشارہ کیا ہی تھا کہ میں بول پڑا۔ میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی احترام کے ساتھ کہا۔

''جنابِ عالی! اگر معزز عدالت کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں......''

وکیل استغاثہ نے ناگواری سے گھور کر مجھے دیکھا تاہم جج نے بردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مخصوص بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

''نو آبجیکشن!''

انکوائری آفیسر فوراً وٹنس باکس (گواہوں والے کٹہرے) میں آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اس کے بیجز پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سب انسپکٹر صاحب! کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''مجھے فریاد حسین کہتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''خاصا افسردہ اور متاثر کن نام ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اور آپ کی سنجیدگی بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ آپ کوئی گہرا غم دل سے لگائے کھڑے ہیں......''

اس نے میرے تبصرے پر کچھ نہ کہا اور گہری نظر سے مجھے گھورتا رہا۔

''فریاد حسین صاحب!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو ہلکے پھلکے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں آپ کو آپ کے نام سے مخاطب کرسکتا ہوں؟''

''آپ مخاطب کر تو چکے۔'' وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اب اجازت حاصل کرنے کا کیا فائدہ......؟''

''ٹھیک ہے جناب! اجازت حاصل کیے بغیر ہی آپ کو فریاد حسین کہہ لیتے ہیں......'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''فریاد حسین صاحب! میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس حادثے کی اطلاع آپ کو کس نے دی تھی؟''

''مقتول کی بیوی نازش نے۔'' اس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

''محترمہ نازش صاحبہ خود یہ اطلاع دینے تھانے آئی تھیں یا......؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں...... انہوں نے تھانے فون کرکے یہ اطلاع دی تھی۔''

ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے جرح کا آغاز کرنا بھی میرا ایک آزمودہ کار ہتھیار ہے۔ اس سے سامنے والے کا دھیان اصل معاملے کی طرف سے ہٹ جاتا ہے اور وہ خاصا پرسکون ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے مجھے موقع مل جاتا ہے کہ میں اسے الجھن اور جذباتی کشمکش میں مبتلا کرکے کام کی بات اس کے منہ سے اگلوالوں جو عام حالات میں وہ شاید کبھی بھی مجھے بتانے پر تیار نہ ہو۔ میرے اس شریر اسٹائل سے وکیل استغاثہ کا بہت خون جلتا تھا اور وہ اکثر و بیشتر ''آبجیکشن یور آنر'' کا نعرہ بھی بلند کردیا کرتا تھا۔

اس کیس کا تفتیشی افسر جو عہدے کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا، اس سے مجھے کچھ زیادہ ہی تفریح سوجھ رہی تھی اور اس کی وجہ اس کا ڈیل ڈول اور جسامت تھی۔ میں اس کے حلیے اور وضع قطع کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ اپنی آسانی کے لیے یہ سمجھ لیں کہ وہ معروف کامیڈین خالد سلیم موٹا سے بہت مشابہت اور مماثلت رکھتا تھا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''فریاد حسین صاحب! نازش صاحبہ نے آپ کو اس افسوسناک واقعہ کی اطلاع کتنے بجے دی تھی؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر جواب دیا۔ ''ہمارے روزنامچے کے مطابق، یہ اطلاع رات پونے دس بجے دی گئی تھی۔''

''یعنی بیس اکتوبر کی رات پونے دس بجے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''اطلاع کنندہ محترمہ نازش نے کن الفاظ میں آپ کو اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا......'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''جلدی پہنچیں...... اکبر نے میرے شوہر کو قتل کردیا ہے......!''

''یعنی...... اس نے باقاعدہ اکبر کا نام لیا تھا؟'' میں نے تصدیقی نظر سے آئی او کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں، مقتول کی بیوی کے یہی الفاظ تھے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ اکبر کون ہے تو اس نے بتایا کہ یہ بندہ مقتول کا کوئی پرانا جاننے والا ہے۔''

''اوہ...... آئی سی!'' میں نے متاسفانہ انداز میں ہونٹ سکیڑے اور کہا۔ ''تو پھر آپ قتل کی ایک واردات کی اطلاع پاکر فوراً جائے وقوعہ پر پہنچ گئے تھے......؟''

''جی ہاں...... یہ تو ہمارا فرض ہے۔'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

"آپ کتنے بجے مقتول کے گھر پہنچے تھے؟"

"ٹھیک دس بجے!"

"یعنی واردات کی اطلاع کے ٹھیک پندرہ منٹ بعد!" میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی زیادہ پھرتی اور مستعدی اور وہ بھی آپ کی طرف سے......؟"

بات ختم کر کے میں نے اس کے سراپا پر ایک گہری نظر ڈالی۔ اسے میری یہ نظر قطعاً پسند نہ آئی اور خاصی برہمی سے بولا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا؟"

میں نے بات بدلتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "مطلب یہ کہ پولیس کی جانب سے عموماً ایسی مستعدی دیکھنے کو نہیں ملتی اس لیے یقین نہیں آرہا تھا......!"

وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ میں نے "مستعدی اور پھرتی" والے الفاظ اس کے بے ہنگم جثے پر طنز کرنے کے لیے استعمال کیے تھے اور اس کی برہمی کا سبب بھی یہی تھا۔ بہرحال، میں اسے غصہ دلا کر اپنے مقصد میں سو فیصد کامیاب رہا تھا۔

وہ جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! پولیس کی کارکردگی کے حوالے سے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہے اور اس قسم کی غلط فہمیاں آپ جیسے لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ آپ کو پولیس کے اندر خرابیاں ہی خرابیاں نظر آتی ہیں اور یہ جو آپ نے پندرہ منٹ کی بات کی ہے نا......!" لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"شاید آپ کو پتا نہیں کہ تھانہ جائے وقوعہ سے محض دس منٹ کی دوری پر ہے۔ ہمارا وہاں پندرہ منٹ میں پہنچ جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں......!"

میں نے اس بحث میں پڑنا ضروری نہ سمجھا کہ مجھے کیا پتا ہے اور کیا نہیں پتا...... میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھانا ہی مناسب سمجھا اور انکوائری آفیسر فریاد حسین سے پوچھا۔

"جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو وہاں کتنے افراد موجود تھے...... مقتول کی لاش کے علاوہ......؟"

"لاش" کے ذکر پر اس نے گھور کر مجھے دیکھا تاہم کسی جارحانہ ردعمل کے بجائے اس نے میرے سوال کا سیدھا اور مختصر جواب دیا۔

"دو......!"

"کون کون......؟" میں نے پوچھا۔

"مقتول کی بیوی نازش اور ان کا گھریلو ملازم توفیق۔"

"آپ نے جائے وقوعہ پر کیا دیکھا تھا؟"

"مقتول مقبول شاہ اپنے بیڈ پر مردہ پڑا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ بستر پر نیم دراز تھا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ اس کے بدن میں تین گولیاں اتاری گئی تھیں۔ ایک کھوپڑی میں اور دو سینے میں۔ اس کا لباس، بستر اور......"

"ایک منٹ آئی او صاحب!" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا "کیا آپ کی آنکھوں میں ایکسرے مشینیں فٹ ہیں؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ جارحانہ انداز میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

"مطلب یہ کہ......" میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔ "آپ مقتول کی خون میں لت پت لاش کو دیکھتے ہی یہ جان گئے تھے کہ اسے تین گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ علاوہ ازیں آپ کو یہ بھی پتا چل گیا کہ ان میں سے ایک گولی مقتول کی کھوپڑی اور باقی دو سینے پر فائر کی گئی تھیں۔ اس نوعیت کی جان کاری تو اسی وقت ممکن ہے جب آپ مقتول کے جسم کے اندر جھانکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں...... اسی حوالے سے میں نے آپ کی آنکھوں میں ایکسرے مشین کی فٹنگ کی بات کی ہے......!"

"آپ خوامخواہ بات کو گھما پھرا کر لمبا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وکیل صاحب۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "جائے وقوعہ پر مقتول کی لاش کی حالت کو دیکھ کر تو یہی اندازہ قائم کیا گیا تھا کہ اسے شدید فائرنگ کر کے موت کی نیند سلایا گیا تھا۔ تین گولیوں والی وضاحت تو میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی روشنی میں کی ہے۔"

"اوہ...... تو ایسا ہے!" میں نے سادگی سے کہا پھر پوچھا۔ "آپ نے جائے وقوعہ سے ملزم کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی یا مقتول کی بیوہ کے دعوے کو من و عن سچ مان کر ملزم کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوگئے تھے؟"

"پولیس اتنے کچے انداز میں تفتیش نہیں کرتی جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔ "ملزم کے فنگر پرنٹس جائے وقوعہ پر مختلف مقامات سے حاصل کیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں خصوصی طور پر میں اس کرسی کا ذکر کروں گا جو مقتول کے بیڈ کے نزدیک ہی بچھی تھی۔ مذکورہ کرسی کی ہتھوں اور پشت گاہ پر ملزم کی انگلیوں کے بڑے واضح نشانات پائے گئے تھے۔ نازش نے ہمیں بتایا تھا کہ

مقتول کی موت سے تھوڑی دیر پہلے ملزم اسی کرسی پر بیٹھا مقتول کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔"

"مقتول کی بیوہ نے آپ کو اور کیا بتایا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"نازش صاحبہ کے مطابق......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم اور اس کے شوہر میں پرانی شناسائی تھی لیکن اس نے محسوس کیا تھا کہ ملزم کسی حوالے سے اس کے شوہر کو بلیک میل کر رہا تھا۔ اصل معاملہ نازش کے علم میں نہیں تھا۔ اس نے مقتول سے کئی بار پوچھا بھی لیکن وہ ہر مرتبہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ اس سلسلے میں وہ اس سے بعد میں بات کرے گا۔ نازش اتنا تو جان گئی تھی کہ اس کا شوہر ملزم کو پسند نہیں کرتا تاہم وہ اس سے ملاقات سے انکار بھی نہیں کرتا تھا۔ اسی وجہ سے نازش کو بلیک میلنگ کا شک ہوا تھا۔ مقتول نہ چاہتے ہوئے بھی ملزم سے ملنے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا۔ دورانِ گفتگو میں ان کے بیچ گرما گرمی اور تلخ کلامی بھی ہوتی تھی۔ نازش نے کئی مرتبہ مقتول سے پوچھا بھی کہ یہ کیا مصیبت آپ نے اپنے اوپر مسلط کر رکھی ہے۔ ہر بار مقتول یہی جواب دیتا تھا کہ...... بس، چند دن کی بات ہے۔ یہ واپس عراق چلا جائے گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن سب ٹھیک نہ ہو سکا اور وقوعہ کے روز ملزم نے اپنے پستول سے تین گولیاں مقتول کے جسم میں اتاریں اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔"

آئی او نے اپنا بیان مکمل کیا جو درحقیقت مقتول کی بیوہ نازش کا موقف تھا۔ وہ خاموش ہوا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اور پھر نازش ہی کی ہدایت نما نشاندہی پر آپ نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب؟"

"نہیں جناب...... آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "موقع کی کارروائی نمٹانے کے بعد ہم نے اسی رات ملزم کو اس کے گھر واقع شادمان ٹاؤن سے حراست میں لے لیا تھا۔"

"ملزم کی گرفتاری کتنے بجے عمل میں آئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے، اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔"

"میری اطلاع کے مطابق، اور حالات و واقعات بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ ملزم وقوعہ کی رات ساڑھے نو بجے مقتول کے گھر سے رخصت ہوا تھا اور وہ لگ بھگ رات گیارہ بجے اپنے گھر پہنچا تھا۔" میں نے ملزم کی حمایت میں استعمال ہونے والے ایک نکتے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "جبکہ گارڈن ایسٹ سے شادمان ٹاؤن زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ کیا آپ نے ملزم سے یہ پوچھنے کی زحمت گوارا کی کہ تیس منٹ کا فاصلہ اس نے ڈیڑھ گھنٹے میں کیوں طے کیا تھا...... کیا راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی یا......؟"

مجھے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہو چکی تھی کہ وقوعہ کی رات میرا موکل مقتول کے گھر سے نکلنے کے بعد کہاں کہاں گیا تھا۔ میں نے تو محض آئی او کی کارکردگی کو چیک کرنے کے لیے یہ سوال کر دیا تھا۔

"جی...... ہم نے اس سے پوچھا تھا۔" فریاد حسین نے جواب دیا۔

"پھر اس نے کیا بتایا تھا؟"

وہ اکیوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ اپنے کسی دوست سے ملنے پاپوش نگر کی طرف چلا گیا تھا۔"

"واہ وا...... سبحان اللہ!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ملزم نے کیا کانفیڈنس شو کیا تھا۔ اس نے ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتارا پھر بڑے آرام سے اپنے کسی دوست سے ملنے پاپوش نگر پہنچ گیا......"

آئی او نے میرے طنز کا جواب نہیں دیا۔ بس، معاندانہ انداز میں مجھے گھور کر رہ گیا۔ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"فریاد حسین صاحب! کیا آپ نے آنکھیں بند کر کے ملزم کی بات پر یقین کر لیا تھا......؟"

"کون سی بات؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"یہی کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "مقتول کے بنگلے سے واپسی پر وہ اپنے کسی دوست سے ملنے پاپوش نگر کی طرف چلا گیا تھا؟"

"ہم کسی کی بات پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کرتے وکیل صاحب۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اس کے پاپوش نگری دوست سے اس کے بیان کی باقاعدہ تصدیق کی تھی۔ اس بندے کا نام عرفان ہے۔ وہ ادھر پاپوش نگر میں کتابوں کی دکان چلاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں آپ کی کارکردگی سے متاثر ہوا ہوں فریاد صاحب۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق، آپ نے ملزم کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے آلۂ قتل بھی برآمد کرلیا تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ملزم کی گرفتاری کے بعد جب اس کی گاڑی کی تلاشی لی گئی تو ڈیش بورڈ کے اندر آلۂ قتل یعنی اعشاریہ تین دو کیلی بر کا پستول موجود تھا۔ بعدازاں فنگر پرنٹس ٹیسٹ کے نتیجے میں اس پستول کے مختلف حصوں اور ٹریگر پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات کی بھی تصدیق ہوگئی تھی۔"

"وہ پستول ایک لائسنس یافتہ اسلحہ تھا اور ملزم کی ذاتی ملکیت بھی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لہٰذا اس کے ٹریگر یا باڈی کے مختلف حصوں پر اس کے فنگر پرنٹس کی موجودگی ایک عام سی بات ہے۔ آپ اس امر کا ذکر کرکے کیا ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں آئی او صاحب......؟"

میرے استفسار پر وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا پھر "سوال گندم، جواب چنے" کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے بولا۔ "جب میں نے اس پستول کو چیک کیا تو اس میں سے تین گولیاں چلی ہوئی تھیں اور......اور......" لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اور...... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بڑے واضح انداز میں لکھا ہوا ہے کہ مقتول مقبول شاہ کے جسم سے برآمد ہونے والی گولیاں اسی پستول سے چلائی گئی تھیں......"

میں اس میز کی جانب بڑھا جس پر آلۂ قتل اعشاریہ تین دو کیلی بر کا پستول ایک سیلوفین بیگ کے اندر بند پڑا تھا۔ میں نے جج کی اجازت سے وہ سیلوفین بیگ اٹھالیا اور واپس وٹنس باکس کے قریب آگیا پھر میں نے مذکورہ بیگ کو تفتیشی افسر کی آنکھوں کے سامنے جھلاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ اسی پستول کی بات کررہے ہیں نا، پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتول مقبول شاہ کے جسم سے برآمد ہونے والی تینوں گولیاں جس سے چلائی گئی تھیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "اور یہ پستول ملزم کی ملکیت ہے۔"

"بے شک یہ پستول میرے موکل کی ملکیت ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور اس بات میں بھی شبے کی گنجائش نہیں کہ مقتول کی زندگی کا چراغ گل کرنے والی تینوں گولیاں اسی پستول سے فائر کی گئی ہیں مگر......!"

میں نے ڈرامائی انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو آئی او نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "مگر کیا......؟"

"مگر یہ کہ...... میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو درجن سے زیادہ مرتبہ نہایت ہی توجہ سے پڑھا ہے۔" میں نے دستور ڈرامائی لہجے میں کہا۔ "لیکن اس میں مجھے کہیں بھی لکھا ہوا نظر نہیں آیا کہ یہ تینوں گولیاں میرے موکل اور اس کیس کے ملزم مسٹر اکبر نے چلائی تھیں۔ آپ نے کس بنا پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ گولیاں ملزم ہی نے فائرنگ کرکے مقتول کے بدن میں اتاری تھیں؟"

"ظاہری بات ہے۔" وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پستول، ملزم کی ملکیت ہے، اس کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے برآمد ہوا ہے، اس پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے ہیں، پوسٹ مارٹم رپورٹ بتاتی ہے کہ اسی پستول کی فائرنگ سے مقتول مقبول شاہ ہلاک ہوا ہے......" پھولی ہوئی سانس کو ہموار کرنے کے لیے اس نے تھوڑا توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"جناب! یہ سارے اشارے ملزم ہی کی طرف جاتے ہیں......!"

"فرض کریں......!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کی گاڑی چرا کر کوئی خطرناک ایکسیڈنٹ کر بیٹھتا ہوں۔ آپ کی گاڑی سے کسی راہ گیر کو بری طرح کچل کر ہلاک کردیتا ہوں اور بعد میں گاڑی کو وہیں کھڑا کردیتا ہوں جہاں سے چرائی تھی۔ پولیس واقعاتی شہادتوں کی انگلی پکڑ کر آپ کی گاڑی تک اور اس گاڑی کے توسط سے آپ تک پہنچ جاتی ہے......" میں نے لمحاتی توقف کرکے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر دوبارہ آئی او کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"مذکورہ گاڑی آپ کی ملکیت ہے، اس کی باڈی کے مختلف حصوں اور اسٹیئرنگ پر آپ کے فنگر پرنٹس پائے جاتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ قتل آپ ہی کی گاڑی سے ہوا ہے تو پھر...... آپ کو تو پھانسی کی سزا ہوجانا چاہیے نا!"

"جناب! یہ کیا اصول بیان کیا ہے آپ نے؟" وہ برہمی سے بولا۔

میں نے تحمل سے کہا۔ "آئی او صاحب! میں نے آپ کے بیان کردہ اصول کا اپلی میٹیشن بیان کیا ہے۔"

"جب میری گاڑی چرا کر آپ قتل کی کوئی واردات کریں گے تو سزا مجھے نہیں، آپ کو ہونا چاہیے......!"

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ "جب میرے موکل کا پستول چرا کر کوئی اس سے مقبول شاہ کو قتل کرڈالے گا تو پھر اس جرم کی سزا بھی اسی شخص کو ہونا چاہیے، میرے موکل کو نہیں!"

"تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ کسی شخص نے ملزم کا پستول چرا کر مقبول شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟" وہ بے حد حیرت سے بولا۔

"جی ہاں...... میرا دعویٰ تو یہی ہے۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

جج گہری دلچسپی اور خاموشی سے ہمارے درمیان ہونے والی دھواں دھار بحث کو دیکھ اور سن رہا تھا۔ وکیل استغاثہ نے بھی ابھی تک مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی "ذمے داری" تفتیشی افسر بڑے احسن طریقے سے نبھا رہا تھا لہٰذا اس کا اطمینان سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

وکیل استغاثہ کی خاموشی، انکوائری آفیسر کو شہ دے رہی تھی۔ اس نے خاصے اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ اپنے دعوے کو سچ ثابت کرسکتے ہیں؟"

"بالکل کرسکتا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "وقت آنے پر میں بھری عدالت میں یہ کرکے بھی دکھا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے......!" آئی او نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا "چند لمحات کے لیے میں آپ کے دعوے کو درست تسلیم کرلیتا ہوں۔ اب آپ کو یہ وضاحت کرنا ہوگی کہ اگر کسی ایکس، وائے، زیڈ نے ملزم کا پستول چرا کر اس کی مدد سے مقبول شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے تو پھر اس واردات کے فوراً بعد وہ پستول ملزم کی گاڑی کے ڈیش بورڈ سے کیسے برآمد ہوا؟"

"آپ ایک ذہین پولیس آفیسر ہیں۔" میں نے اسے مسکا لگایا۔ "مجھے پتا تھا کہ آپ یہ سوال ضرور کریں گے......!"

"پھر دیں جواب......!" وہ آنکھیں پٹ پٹا کر بولا۔

"اس سوال کا بڑا مدلل جواب ہے میرے پاس۔" میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا پھر دوبارہ آئی او کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "لیکن ابھی اس راز کو کھولنا کسی بھی طور مناسب نہیں ہوگا۔ اس سے یہ کیس اور آگے کی عدالتی کارروائی متاثر ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا......" میں نے رک کر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ میرا مخاطب تفتیشی افسر تھا۔ "میں فی الحال اس سلسلے میں معذرت چاہتا ہوں......!"

آئی او بیزاری سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اپنی جرح کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "فریاد حسین صاحب! آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ تو پڑھی ہے نا؟"

"جی ہاں......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "بڑی توجہ سے پڑھی ہے۔"

"ویری گڈ......!" میں نے مصنوعی ستائشی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "اس کے بارے میں وہ رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

بات ختم کرتے ہی میں نے پستول والا سیلوفین بیگ اس کی آنکھوں کے سامنے سے لہرایا۔ مذکورہ بیگ پچھلے پندرہ منٹ سے میرے ہاتھ ہی میں تھا۔

"رپورٹ اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مقبول شاہ کو اسی پستول کی فائرنگ سے ہلاک کیا گیا تھا......" اس نے جواب دیا پھر الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں اس کی الجھن کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ میرے سوال کی تہ تک پہنچنے کی کوشش میں بحرِ سوچ و بچار میں غوطہ زن نظر آتا تھا۔

"ہاں، رپورٹ سے اس امر کی یقیناً تصدیق ہوتی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے۔" میں نے اسے گھسنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس "تصدیق" کے ساتھ ہی ایک اہم معاملہ بھی جڑا ہوا ہے......!"

"کون سا معاملہ؟" وہ حیران نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آئی او صاحب! میں محسوس کررہا ہوں، آپ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ کو دھیان سے بالکل نہیں پڑھا ورنہ آپ کے ذہن میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا؟"

وہ میرے بار بار کے حملوں سے تڑپ اٹھا اور جھلاہٹ بھرے انداز میں بولا۔ "آپ ہی بتا دیں، وہ اہم معاملہ کون سا ہے۔ آپ نے تو ماشاءاللہ! اس رپورٹ کو درجنوں بار پڑھنے کا شرف حاصل کیا ہے......!"

میں نے آئی او کی چوٹ کو معنی خیز مسکراہٹ میں اڑا دیا اور ایک بار پھر آلۂ قتل والا سیلوفین بیگ اس کی آنکھوں کے سامنے بلند کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہ پستول آپ کو اسی حالت میں ملا تھا...... تن تنہا؟"

اس نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا اور منہ ٹیڑھا کرکے مجھ سے مستفسر ہوا "تو کیا اس گن کے ساتھ اس کا کوئی جہیز وغیرہ بھی تھا؟"

آئی او کے ریمارکس اگرچہ انتہائی عامیانہ اور ناشائستہ تھے لیکن ان لمحات میں اس کی جھنجلاہٹ دیدنی تھی اور اسی جھنجلاہٹ کے پیش نظر حاضرین عدالت نے ان ریمارکس کو انجوائے کیا تھا۔ میں نے دیکھا، جج کے لبوں پر بھی ہلکا سا تبسم نمودار ہوگیا تھا۔

''میں نے تھوڑی دیر پہلے آپ کو اگر عقل مند انسان کا خطاب دیا ہے تو کچھ غلط نہیں کیا آئی او صاحب۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں...... بالکل...... پوسٹ مارٹم رپورٹ میں اس ''جگہ'' کا واضح تذکرہ موجود ہے!''

''کدھر ہے...... کہاں ہے......؟'' وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

''میں نے اپنی فائل میں سے مذکورہ رپورٹ نکال کر پڑھنا شروع کیا اور ایک مقام پر پہنچ کر میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''فریاد حسین! یہاں لکھا ہے کہ مقتول مقبول شاہ کو سائیلنسر لگے پستول سے فائرنگ کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا......!''

''تو......؟'' آئی او حیرت سے منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔

''تو یہ کہ......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ملزم کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے پستول تو برآمد کرلیا اور اس کے سائیلنسر کا کہیں کوئی اتا پتا نہیں ملتا...... وہ کہاں چلا گیا؟''

''ملزم نے جائے وقوعہ سے واپسی پر سائیلنسر کو راستے میں کہیں پھینک دیا ہوگا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''اس رات یہ بہت گھوم پھر کر گھر پہنچا تھا۔''

''بہت خوب آئی او صاحب......!'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب وہ موقع آگیا ہے کہ میں آپ کو دیا ہوا ''خطاب'' واپس لے لوں اور یہاں کھڑے کھڑے آپ کی عقل پر ماتم شروع کردوں......!''

''یہ کیا بکواس ہے......!'' اس کی برداشت جواب دے گئی۔

''آرڈر...... آرڈر......!'' جج نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''عدالت کے وقار کا خیال رکھا جائے......''

''یہ بکواس نہیں ہے آئی او صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک حقیقت بیان کی ہے۔''

جج کی وارننگ کا اثر تھا کہ وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ کس قسم کی حقیقت ہے جو آپ کو میری عقل پر ماتم کرنے کا مشورہ دے رہی ہے؟''

''بہت ہی سفاک اور چبھنے والی حقیقت!'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور وہ یہ کہ......'' میں نے دانستہ توقف کیا پھر ڈرامائی انداز میں اضافہ کیا۔ ''ایک شخص اپنے سائیلنسر لگے پستول سے تین گولیاں فائر کر کے ایک انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور واپسی پر وہ اپنے پستول کے سائیلنسر کو کہیں بھی پھینک دیتا ہے مگر پستول کو اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں اطمینان سے رکھ دیتا ہے، اپنی انگلیوں کے نشانات سمیت تاکہ پولیس کو آلۂ قتل تلاش کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔ ایسا بھولا بھالا اور پولیس دوست قاتل دیکھا ہے کہیں آپ نے......؟''

''اگر......'' وہ میری تاڑ کے جواب میں جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر مجرم غلطی نہ کرے تو پھر...... پکڑا کیسے جائے...... آپ نے سنا نہیں کہ ذہین سے ذہین مجرم بھی کوئی غلطی ضرور کر جاتا ہے......!''

''ہاں سنا ہے۔'' میں نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''اور بعض ذہین مجرم تو میرے موکل سے بھی زیادہ سیدھے اور معصوم ہوتے ہیں۔ وہ جرم کے ارتکاب کے فوراً بعد متعلقہ تھانے پہنچ کر اپنی گرفتاری پیش کردیتے ہیں۔ اللہ اللہ، خیر سلا......'' میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

''دیٹس آل یور آنر......!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ آئی او سے جرح میں خاصی لمبی چھیڑ چھاڑ ہوگئی تھی تاہم میں سمجھتا ہوں، یہ ''چھیڑ چھاڑ'' آگے چل کر میرے موکل کی بے گناہی کے سلسلے میں انتہائی مفید ثابت ہونے والی تھی۔ میں نے آئی او سے سوال وجواب کے دوران میں عدالت کے سامنے متعدد ایسے نکات اجاگر کردیے تھے جو استغاثہ کی خامیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ اب مجھے انہی خطوط پر زور آزمائی کرتے ہوئے اپنے موکل کی باعزت رہائی کی راہ ہموار کرنا تھی اور مجھے قوی امید تھی کہ میں اپنے اس مقصد میں کلی طور پر کامیاب رہوں گا......!

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

✕✕✕

اگلی پیشی سے پہلے کنول اور کاشف دو مرتبہ مجھ سے ملنے میرے دفتر آئے تھے۔ وہ میری کارکردگی سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ کنول نے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ نے تو کمال کردیا۔ پہلے ہی اوور میں تین وکٹیں لے لیں۔''

''یہ تو ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھیے، ہوتا ہے کیا۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ نے جو مثال دی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے، آپ کو کرکٹ سے بہت دلچسپی ہے۔''

''ایسی ویسی دلچسپی جناب۔'' وہ فرط جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔ ''میں تمام انٹرنیشنل میچز بہت شوق سے دیکھتی ہوں...... میرا تو بس نہیں چلتا کہ پاکستان کی ایک ویمن کرکٹ ٹیم بنا ڈالوں......!''

جس زمانے کا یہ واقعہ ہے ان دنوں پاکستان کی ویمن کرکٹ ٹیم کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ آج کل کی تو بات ہی دوسری ہے۔

''کوئی بات نہیں کنول صاحبہ!'' میں نے اس کے شوق وذوق کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ دل چھوٹا نہ کریں اور اپنے جذبے کو جوان رکھیں۔ وہ دن دور نہیں جب اس ملک میں عورتوں کی بھی ایک کرکٹ ٹیم بن جائے گی۔''

کاشف نے مجھے بتایا۔ ''میں نے بھائی صاحب کی کمپنی والوں کو یہاں کی سنگین صورتِ حالات سے آگاہ کردیا ہے۔''

''انہوں نے اس معاملے پر کیا کہا ہے؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ اس مصیبت کا سن کر تعاون کے لیے تیار ہیں۔'' کاشف نے بتایا۔ ''ان کا کہنا ہے، بھائی صاحب جب بھی واپس عراق آئیں گے، ان کی نوکری پکی ہے۔''

''یہ تو خاصی حوصلہ افزا بات ہے۔'' میں نے اطمینان کی سانس خارج کرتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''مسٹر کاشف! میں نے آپ کے ذمے جو کام لگائے تھے ان میں سے اکادکا باقی ہیں۔ آئندہ پیشی سے پہلے وہ کام ہوجانا چاہئیں......!''

''آپ بالکل بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب۔'' وہ پراعتماد انداز میں بولا۔ ''میں نے جن کاموں کی ذمے داری اٹھائی ہے انہیں ضرور مکمل کروں گا۔ آئندہ پیشی میں دس دن باقی ہیں اور میں انشاء اللہ! دو چار روز میں آپ کی مطلوبہ معلومات فراہم کردوں گا۔''

''بس، تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

وہ مزید پندرہ بیس منٹ میرے پاس بیٹھ کر اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے پھر میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئے۔

✕✕✕

آئندہ پیشی پر مقتول کے گھریلو ملازم توفیق کو استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش کیا گیا۔ توفیق کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ متناسب بدن کا مالک ایک پستہ قامت شخص تھا جس کے بالوں میں سفیدی بڑے طمطراق سے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

توفیق نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرادیا۔ اس کے بیان کو سن کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ اس بیان کو رٹوانے میں پولیس کو خاطر خواہ محنت کرنا پڑی ہوگی۔

وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا پھر اپنے گواہ سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''توفیق صاحب! آپ ملزم کو پہچانتے ہیں؟''

بات ختم کرتے ہی اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ بھی کردیا۔ گواہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''جی جانتا ہوں۔''

''پھر تو آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ ملزم ملک سے باہر کہیں ملازمت کرتا ہے؟'' وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جی...... یہ عراق کی کمپنی میں ملازم ہے۔'' گواہ نے بتایا۔ ''اور جن دنوں صاحب کا قتل ہوا، یہ چھٹی پر پاکستان آیا ہوا تھا...... بلکہ آیا ہوا ہے کیونکہ اس کیس کی وجہ سے اس کی چھٹی کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی ہے۔''

''حالانکہ......'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں گرہ لگائی ''یہ بے چارہ صرف ایک ماہ کی چھٹی لے کر یہاں آیا تھا۔''

گواہ توفیق نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''کیا یہ درست ہے کہ ملزم جب سے پاکستان آیا تھا، ہر دوسرے تیسرے دن آپ کے صاحب مقتول مقبول شاہ سے ملنے آجاتا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے ایک خاص زاویے سے سوال کیا۔ ''اور مقتول کی اہلیہ اس کی آمد سے بہت چڑتی تھی؟''

''جی ہاں، یہ سچ ہے......!''

''کیوں چڑتی تھی مقتول کی بیوی!'' وکیل استغاثہ نے کافی زور دے کر پوچھا۔ ''اس راز کے بارے میں کچھ پتا ہے آپ کو؟''

''نہیں جناب......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''باوجود کوشش کے بھی میں یہ راز نہیں جان سکا تھا حالانکہ میں نے کئی بار سوچا بھی کہ اس سلسلے میں نازش بی بی سے بات کروں لیکن پھر میری ہمت نہ ہوئی اور یہ واقعہ پیش آگیا۔''

''کیا محسوس ہوتا تھا آپ کو......'' وکیل استغاثہ نے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔ ''جب ملزم، مقتول سے طویل ملاقات کر کے واپس جاتا تھا تو گھر کا ماحول کیسا ہوجاتا تھا؟''

"نہایت ہی کشیدہ جناب۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اس رات صاحب جی اور نازش بی بی میں لڑائی ضرور ہوئی تھی۔"

"اور آپ سمجھتے ہیں، اس فساد کا سبب یہی شخص تھا؟" وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر اکیوزڈ باکس میں چپ چاپ کھڑے میرے موکل کی جانب اشارہ کر دیا۔

"جی ہاں، میرا اندازہ تو یہی کہتا تھا۔" گواہ توفیق بڑے وثوق سے بولا۔ "کیونکہ میاں بیوی کی چپقلش کا سلسلہ اس شخص کی آمد کے بعد ہی شروع ہوا تھا۔ یہ بات تو طے ہے کہ نازش بی بی اسے سخت ناپسند کرتی تھیں۔"

"وقوعہ کی رات آپ گھر میں موجود تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

"جی بالکل...... میں نے کہاں جانا ہے۔" وہ سادگی سے بولا۔ "میرا رہنا سہنا، کھانا پینا سب کچھ صاحب جی کے بنگلے میں ہے۔ میں ادھر ہی رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وکیل استغاثہ نے اطمینان سے گردن ہلائی۔ "اب وقوعہ کی رات کو ذہن میں لانے کی کوشش کریں......"

وکیل استغاثہ نے توقف کر کے سوالیہ نظر سے گواہ کی جانب دیکھا۔

توفیق کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر اس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"جی پوچھیں وکیل صاحب...... آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"وقوعہ کی رات ملزم نے مقتول یعنی تمہارے صاحب کے ساتھ کتنا وقت گزارا تھا؟" وکیل استغاثہ نے استفسار کیا۔

گواہ نے نہایت ہی اعتماد سے جواب دیا۔ "لگ بھگ تین گھنٹے جناب۔"

"کیا ملزم آپ کے سامنے ہی وہاں سے رخصت ہوا تھا؟"

"جی ہاں...... اس کے لیے گیٹ میں نے ہی کھولا تھا۔" گواہ توفیق نے جواب دیا۔ "اس کی گاڑی بنگلے کے باہر کھڑی تھی۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "ملزم کے جانے کے بعد وہاں کیا حالات پیش آئے تھے؟"

گواہ توفیق نے جھرجھری لیتے ہوئے جواب دیا۔

"جناب! وہ بڑی قیامت خیز رات تھی۔ ملزم کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی نازش بی بی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز بنگلے کے اندرونی حصے سے آئی تھی۔ میں نے بھاگ کر اندر جانا چاہا۔ ابھی میں راستے ہی میں تھا کہ نازش بی بی پریشان حال میری طرف بڑھتی نظر آئیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی سوال کرتا، انہوں نے بکھرے ہوئے لہجے میں بتایا...... شاہ صاحب کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میں نے پوچھا۔ کس نے؟ انہوں نے جواب دیا، اسی مردود نے جو تھوڑی دیر پہلے ان کے پاس سے اٹھ کر گیا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان کا اشارہ اس شخص کی جانب تھا۔" بات ختم کر کے گواہ نے اکیوزڈ باکس کی طرف دیکھا اور انگلی سے میرے موکل اکبر کی جانب اشارہ کر دیا۔

"پھر...... آپ نے کیا، کیا؟" وکیل استغاثہ کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں نازش بی بی کے ساتھ بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "جب ہم صاحب کے بیڈروم میں پہنچے تو میں نے انہیں بیڈ پر خون میں لت پت پڑے دیکھا......"

بات کے اختتام پر استغاثہ کے گواہ نے ایک مرتبہ پھر جھرجھری لی۔ وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ "پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟"

"پھر جی......" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "نازش بی بی نے فوراً پولیس کو فون کر کے صاحب جی کے قتل کے بارے میں بتا دیا۔ پولیس آئی۔ انہوں نے بنگلے پر ضروری کارروائی کی پھر نازش بی بی کی نشاندہی پر ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔ اب یہ یہاں کھڑا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے مزید ایک آدھ سوال کے بعد جرح ختم کر دی۔ میں اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"توفیق صاحب! آپ کو مقتول کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟"

"تقریباً پانچ سال جناب۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تو ملزم آپ کے لیے اجنبی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔ "میری معلومات کے مطابق ملزم اور مقتول کی دوستی کی عمر دس سال سے زیادہ ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "عراق جانے سے پہلے بھی یہ کبھی کبھار صاحب جی سے ملنے بنگلے پر آیا کرتا تھا۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ مقتول کی بیوی ملزم کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ وہ ملزم سے چڑتی تھی اور ملزم جب بھی مقتول سے ملاقات کر کے واپس جاتا تھا تو میاں بیوی میں شدید ترین جھگڑا بھی ہوا کرتا تھا۔" میں نے لمحاتی توقف کر کے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ان خیالات کا بھی اظہار کیا ہے کہ نازش بی بی اور مقتول کے بیچ چپقلش کا سلسلہ ملزم کی آمد کے بعد ہی شروع ہوا تھا......؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "جی ہاں، یہی بات ہے۔"

میں نے اسے اپنی جرح کے حلقے میں لا کر اس کی زبان سے اہم باتیں اگلوانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ "توفیق صاحب! ملزم پچھلے تین سال سے عراق میں ملازمت کر رہا تھا۔ یہ ہر سال ایک ماہ کی چھٹی لے کر پاکستان آتا رہا ہے اور ظاہر ہے، اس ایک ماہ کے اندر اس کی مقتول مقبول شاہ سے بھی ملاقات ہوتی ہوگی۔ کیا پہلے جب ملزم، مقتول سے ملنے بنگلے پر آتا تھا تو نازش بی بی کو اچھا لگتا تھا......؟"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں سمجھا نہیں جناب؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "آپ کے بیان کے مطابق نازش بی بی ملزم سے شدید نفرت کرتی تھی اور اس کی آمد پر چڑتی تھی۔ کیا پہلے بھی نازش بی بی کا یہی رویہ ہوتا تھا......؟"

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "جناب! پہلے تو اس بات کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔"

"سوال ہی نہیں تھا......" سب کچھ جاننے کے باوجود بھی میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"ظاہر ہے جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم ایک سال کے بعد پاکستان آیا تھا اور شاہ صاحب نے اپنی موت سے صرف دس ماہ پہلے نازش بی بی سے شادی کی تھی۔ وہ پہلی بار ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تھے۔ اس سے قبل ان کی کسی چپقلش کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا؟"

"اوہ...... تو یہ بات ہے!" میں نے سانس خارج کرتے ہوئے حیران ہونے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "میرے سننے میں یہ بھی آیا ہے کہ مقتول مقبول شاہ کسی حادثے کا شکار ہو کر اپنے جسم کا زیریں حصہ مفلوج کر بیٹھا تھا۔ کیا آپ کے صاحب نے نازش بی بی سے شادی اس حادثے کے بعد کی تھی؟"

"نہیں جناب......!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ حادثہ تو شادی کے سات آٹھ ماہ بعد پیش آیا تھا۔ جب سے ان کی زندگی بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی وہیل چیئر پر بیٹھ کر گھر کے اندر تھوڑا "چل پھر" لیتے تھے۔"

"توفیق صاحب!" میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم نے لگ بھگ تین گھنٹے مقتول کے بیڈروم میں گزارے تھے اور جب وہ وہاں سے جانے لگا تو آپ نے اس کے لیے بنگلے کا گیٹ کھولا تھا؟"

"جی ہاں...... میں نے یہی بتایا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ نے یہ بھی کہا کہ ملزم کی گاڑی بنگلے کے باہر کھڑی تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا ملزم کو آپ نے اپنی آنکھوں سے گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوتے دیکھا تھا؟"

"نہیں جناب۔" وہ گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس کے باہر نکلتے ہی گیٹ بند کر دیا تھا۔"

"یعنی آپ وثوق سے نہیں بتا سکتے کہ ملزم کب اپنی گاڑی میں سوار ہوا اور کس سمت میں روانہ ہوا......؟"

"نہیں جناب، مجھے اس بارے میں کوئی خبر نہیں۔" وہ بے بسی سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "ملزم کے جائے وقوعہ سے رخصت ہونے کے کتنی دیر بعد آپ نے نازش صاحبہ کو چیختے چلاتے سنا تھا؟"

"یہی کوئی پانچ منٹ......" وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ......!"

"اچھی طرح سوچ کر بتائیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ "وقوعہ کے روز بنگلے پر کون کون موجود تھا؟"

"مقبول صاحب تھے، نازش بی بی تھیں، میں تھا، ملزم تھا......" وہ فرداً فرداً تذکرہ کرتے ہوئے بولا۔ "اور......!"

''اور کون؟'' وہ اٹکا تو میں نے فوراً پوچھ لیا۔

''اور فیصل صاحب تھے۔'' وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''کون فیصل صاحب؟''

میں ایک مرتبہ پھر انجان بن گیا حالانکہ اکبر مجھے بتا چکا تھا کہ فیصل نازش کا کزن تھا اور وقوعہ کے روز جب اکبر وہاں سے رخصت ہوا تھا تو اس نے نازش اور فیصل کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ استغاثہ کے گواہ توفیق کی طرف سے جواب آیا۔

''فیصل صاحب نازش بی بی کے کزن ہیں۔''

''جب نازش صاحبہ نے اپنے شوہر کے قتل کے حوالے سے چیخ پکار شروع کی تو کیا اس وقت فیصل صاحب بھی بنگلے میں موجود تھے؟'' میں نے گواہ سے پوچھا۔

''نہیں جناب! وہ مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے۔''

''وہ اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ کی نازش بی بی تو ضرور جانتی ہوں گی؟''

''یہ آپ انہی سے پوچھیں......'' وہ روکھے انداز میں بولا۔

میں نے جج کی طرف دیکھا اور جرح کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

مقتول کے گھریلو ملازم توفیق کی گواہی کے بعد استغاثہ کی جانب سے مزید دو گواہ بھگتائے گئے لیکن مذکورہ گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح میں کوئی خاص بات نہیں تھی لہٰذا میں ان کے ذکر کو گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

آیندہ پیشی سے قبل ملزم کے چھوٹے بھائی کاشف نے میرا بتایا ہوا کام مکمل کر دیا۔ اب اس کیس کے ہر پہلو سے متعلق اہم معلومات میرے پاس جمع ہو چکی تھیں۔ اس اللہ کے بندے کاشف نے کوشش کر کے ایک ایسا شخص بھی ڈھونڈ نکالا تھا جسے بہ وقت ضرورت صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ اس شخص کا نام نوید قریشی تھا اور وہ ایک مقامی اخبار کے لیے رپورٹنگ کا کام کرتا تھا۔ کاشف نے نوید قریشی سے میری ملاقات بھی کرا دی تھی۔

✂✂✂

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں مقتول کی بیوہ اور اس کیس کی مدعی نازش کھڑی تھی۔

نازش کی عمر لگ بھگ پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ تیکھے نقوش والی ایک پرکشش اور جاذب نظر عورت تھی۔ اگر مقبول شاہ نے خود سے کم از کم آدھی عمر کی عورت سے شادی کی تھی تو یقیناً وہ نازش کے حسن و جمال پر مرمٹا ہوگا۔ نازش کو قدرت نے جوانی کی ایسی دولت سے نواز رکھا تھا کہ کوئی بھی مرد اس پر فریفتہ ہو سکتا تھا۔

نازش نے حلفیہ بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ سوال و جواب کے لیے اس کے قریب پہنچ گیا لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد وکیل استغاثہ نے ہلکی پھلکی جرح سے گزار کر اسے فارغ کر دیا۔

اس کے بعد جرح کی میری باری تھی اور میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ یعنی مقتول کی بیوہ نازش کو اچھی طرح گھیرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اپنے بیان میں اس نے ملزم کے خلاف حد سے زیادہ زہر اگلا تھا۔ اس کا منہ توڑ جواب دینا مجھ پر لازم تھا۔ نازش کے زہر کا تریاق کر کے مجھے اپنے موکل کو بچانا تھا۔ میں نے بالکل مختلف انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''نازش صاحبہ! کہا جاتا ہے کہ کسی لیڈی سے اس کی عمر کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے۔ کیا میں یہ غلطی کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور بولی۔ ''اگلے ماہ میں پچیس سال کی ہو جاؤں گی...... بس یا اور کچھ؟''

''مقتول سے شادی آپ کا ذاتی فیصلہ تھا یا......؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیل استغاثہ نے بہ آواز بلند کہا۔ ''اس وقت عدالت میں مقبول شاہ مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست استغاثہ کی معزز گواہ کی نجی زندگی کے بارے میں غیر متعلقہ سوالات کر کے عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بیگ صاحب! مقتول کی بیوہ کی شادی والا معاملہ اس کیس سے کوئی تعلق رکھتا ہے؟''

''بہت گہرا تعلق جناب عالی!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کی گواہ نازش مقتول کی بیوہ ہے لہٰذا اس کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی بھی سوال غیر متعلقہ کیسے ہو سکتا ہے......''

جج نے وکیل استغاثہ کے اعتراض کو مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کر دیا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

''جی نازش صاحبہ!'' میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں؟''

اس نے خفگی آمیز نظر سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''یہ میرا ذاتی فیصلہ تھا۔''

''آپ کے والدین نے اس شادی کی مخالفت نہیں کی تھی؟'' میں نے اپنے پاس جمع اہم معلومات کا مناسب استعمال کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔ ''ظاہر ہے، مقتول عمر میں آپ سے دگنا تھا اور اس کی پرسنلٹی بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ ایسے موقع پر والدین اپنی اولاد کو اس قسم کے فیصلوں پر سمجھانے یا انہیں روکنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں......!''

اس نے ناپسندیدہ انداز میں مجھے دیکھا لیکن چونکہ جواب دینا اس پر لازم تھا اس لیے با دل ناخواستہ بولی۔ ''میں والدین کے سائے سے محروم ہوں اسی لیے اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔ ''خاندان کے کسی اور بزرگ نے اس کام سے روکنے کی کوشش کی ہو مثلاً ماموں، خالہ، چچا، پھوپی وغیرہ؟''

''ان میں سے بھی کوئی دنیا میں موجود نہیں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''اور میں اپنے معاملات میں کسی ایرے غیرے سے مشورہ کرنا پسند نہیں کرتی۔''

''گویا آپ خود مختار ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ تڑ کی بہ تڑ کی بولی۔ ''جی ہاں!''

''نازش صاحبہ!'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تک اس کیس کی جتنی بھی سماعت ہو چکی ہے اس کے مطابق آپ ملزم کو سخت ناپسند کرتی تھیں اور گھر میں اس کی آمد پر چڑ جاتی تھیں۔ آپ کے اس ردعمل کا سبب کیا تھا؟''

''سبب یہ خود ہی تھا۔'' وہ نفرت آمیز انداز میں ملزم کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اسی سے پوچھیں......!''

''ملزم اپنا بیان ریکارڈ کرا چکا ہے اور مجھے بھی تمام تر حقائق سے آگاہ کر چکا ہے۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔ اگر میں محسوس کروں گا تو اس سے دوبارہ بھی پوچھ گچھ کر لوں گا۔ فی الحال......'' میں نے کافی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''فی الحال، میں آپ سے جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دیں؟''

چند لمحات تک متذبذب رہنے کے بعد وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ ''ملزم انتہائی بدنیت اور اوباش قسم کا شخص ہے۔ مجھے اس بات پر سخت افسوس ہوتا تھا کہ میرا شوہر اسے اپنا دوست کہتا تھا اور اس کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ جب بھی مقبول سے ملنے آتا تھا، اس کے جانے کے بعد ہمارے درمیان خاصا سنگین جھگڑا ہوا کرتا تھا۔''

''نفرت، ناپسندیدگی اور جھگڑے فساد کی تمام باتیں عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکی ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ جو شخص آپ کو جانتا تک نہیں تھا، وہ مقتول کو آپ کے خلاف کیوں بھڑکایا کرتا تھا۔ آخر اس فتنہ گری میں اس کا کون سا مفاد چھپا ہوا تھا؟''

''آپ نے دو سوال کیے ہیں وکیل صاحب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''میں آپ کے دونوں سوالات کا جواب دوں گی لیکن پہلے دوسرے کا اور بعد میں پہلے کا......!''

''ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔

''اس تمام تر سازش اور فتنہ گری میں اس کا ایک نہایت ہی اہم مفاد چھپا ہوا تھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بتانے لگی۔ ''مقبول شاہ ایکسیڈنٹ کے بعد بستر کا ہو کر رہ گیا تھا لہٰذا اس کے بزنس کو دیکھنے کے لیے مجھے میدان میں اترنا پڑا۔ یہ کوئی آسان آزمائش نہیں تھی لیکن میں نے نہایت ہی کم عرصے میں ثابت کر دکھایا کہ میں بیک وقت کئی محاذوں پر لڑ سکتی ہوں۔ دن بھر میں بزنس کی نگرانی کرتی تھی پھر گھر آ کر اپنے شوہر کا خیال بھی رکھتی تھی اور دیگر گھریلو ذمے داریوں کو بھی نبھاتی تھی۔ میرا شوہر نہ صرف یہ کہ مجھ پر بے پناہ بھروسا کرتا تھا بلکہ وہ میرا احسان مند بھی تھا لیکن اس عیار شخص نے ہماری خوشیوں کو آگ لگانے کی کوشش کی اور مقبول شاہ کو شیشے میں اتار کر اس بات کے لیے راضی کر لیا کہ وہ اسے اپنا بزنس منیجر بنا لے۔ یہ واپس عراق نہیں جانا چاہتا تھا بلکہ منیجر بننے کی آڑ میں یہ مقبول شاہ کے بزنس کو ہائی جیک کرنا چاہتا تھا۔ یہ تھا اس کا عظیم مالی مفاد......'' وہ یہاں تک پہنچنے کے بعد رکی، دو چار گہری سانسیں لیں پھر اپنی جذباتی تقریر کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس نے بڑا اوچھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس نے نہایت ہی گھٹیا اور بے ہودہ انداز میں مقبول شاہ کو میرے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا تھا۔ وہ کس بنا پر میرے شوہر کے کان بھر رہا تھا اس کی تفصیل میں آپ کے پہلے سوال کا جواب چھپا ہوا ہے جو میں اب آپ کو بتا رہی ہوں......'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوئی،

حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"ہماری پہلی ملاقات میرے لیے انتہائی کوفت کا باعث بنی تھی کیونکہ اس بدکردار شخص نے مجھے گھیرنے کی کوشش کی تھی۔ جب میں نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا تو یہ قدرے محتاط تو ہو گیا تاہم مجھے بھوکی نظر سے دیکھتا رہتا تھا۔ میں اس سے دور رہنے لگی تھی پھر ایک روز موقع پا کر اس کمینے نے مجھ سے دست درازی کرنے کی کوشش کی۔ میں نے بڑی مشکل سے، اس بھیڑیے سے اپنی عزت بچائی۔ اس روز میرے ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور میں نے اپنے ساتھ ہونے والی بدتمیزی کے بارے میں مقبول شاہ کو بتا دیا......"

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ رکی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"پھر مقتول نے آپ کی شکایت کے جواب میں کیا کہا تھا؟"

"یہ پہلا موقع تھا جب میں نے مقبول کو اس کے دوست کے کالے کرتوتوں کے بارے میں بتایا تھا۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔ "میں توقع کر رہی تھی کہ مقبول میری شکایت سنتے ہی آگ بگولا ہو جائے گا اور اپنے دوست کو نہ صرف یہ کہ کھری کھری سنائے گا بلکہ اس سے قطع تعلق کر کے آئندہ گھر میں اس کے داخلے پر پابندی عائد کر دے گا لیکن افسوس کہ ہوا اس کے برعکس......" ذرا دیر کو رک کر اس نے مایوسی سے گردن ہلائی اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"مقبول میری بات سننے کے بعد مجھی پر برس پڑا۔ تب پہلی بار مجھے پتا چلا کہ یہ شیطان میری ذات کے حوالے سے کس کس انداز میں مقبول کے کان بھرتا رہا تھا۔" اس نے باقاعدہ کٹہرے میں کھڑے میرے موکل کی جانب انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اس نے مقبول کو میرے خلاف بری طرح ورغلا دیا تھا۔ اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میرے فیصل کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں...... اور یہ کہ...... میں مقبول سے بے وفائی کر رہی ہوں......!"

نازش نے حقائق کی تصویر کو توڑ موڑ کر بلکہ بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں مطمئن تھا کہ شروعات اس کی طرف سے ہوئی تھی۔ جواب دینا اب میرے لیے نہایت ہی آسان ہو گیا تھا۔ اس کے خاموش ہونے پر میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"نازش صاحبہ! ابھی آپ نے معزز عدالت کے سامنے اپنا جو دکھڑا رویا ہے اگر اسے سو فیصد درست بھی مان لیا جائے تو ایسے بہت سے سوالات سر اٹھائیں گے جن کے جواب صرف تین افراد دے سکتے ہیں......"

"کون سے تین افراد؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"نمبر ایک مقتول مقبول شاہ، نمبر دو ملزم اکبر، نمبر تین مقتول کی بیوہ نازش۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مقتول جس دنیا میں منتقل ہو چکا ہے وہاں سے اس کا جواب دینا ممکن نہیں۔ ملزم اکبر جو کچھ بھی کہے گا، اس کی بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔ باقی بچیں آپ......" میں نے لمحاتی توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر ڈرامائی انداز میں کہا۔

"میرے ذہن میں جو بھی سوال سر اٹھائے گا، اس کا جواب اب صرف آپ ہی کو دینا ہوگا۔ کیا آپ ریڈی ہیں؟"

اس نے پریشان نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر دوبارہ میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے متذبذب لہجے میں بولی۔

"جی، ریڈی ہوں۔ پوچھیں، کیا پوچھنا ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "آپ نے اپنی حمایت میں جو کچھ بھی فرمایا اگر وہ سو فیصد درست ہے تو پھر آپ ہی بتائیں، ملزم نے مقتول کو کیوں قتل کیا...... مقبول شاہ تو اس کی باتوں پر یقین کر کے آپ کے خلاف ہو گیا تھا یعنی ملزم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا پھر ایسا کیوں ہوا......؟"

"یہ صورت حال وقوعہ سے ایک روز پہلے کی ہے۔" وہ بڑی چالاکی سے بولی۔ "جس روز مقبول شاہ کو موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس کا دماغ میں نے صاف کر دیا تھا......"

"دماغ صاف کر دیا تھا۔" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا......؟"

"وقوعہ سے صرف ایک دن پہلے میں نے فیصل کو اپنے گھر بلایا اور مقبول شاہ کی موجودگی میں اس حساس موضوع پر ہماری خاصی سنجیدہ گفتگو ہوئی تھی۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "فیصل نے بڑے جامع اور متاثر کن انداز میں مقبول شاہ کو یقین دلایا تھا کہ میرے اور فیصل کے بیچ ایسا کوئی معاملہ نہیں جس کا ذکر ملزم نے اس سے کیا تھا لہٰذا وقوعہ کی رات جب ملزم، مقبول شاہ سے ملنے آیا تو اس نے تبدیل شدہ سوچ کے ساتھ ملزم سے بات کی۔ میں سمجھتی ہوں، جب ملزم نے اپنی منصوبہ بندی کو فیل ہوتے دیکھا تو جھنجلا کر مقبول کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے رخصت ہو گیا۔"

"وقوعہ کی رات......" میں نے اپنی جرح میں تیزی لاتے ہوئے کہا۔ "جب ملزم آپ کے بنگلے سے رخصت ہوا تو آپ اس وقت کہاں تھیں؟"

"میں اس وقت کچن میں تھی......" اس نے جواب دیا۔

وہ سراسر جھوٹ بول رہی تھی۔ اکبر نے مجھے بتایا تھا کہ جب وہ مقتول سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا تو اس نے نازش اور فیصل کو ڈرائنگ روم میں بیٹھے، باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

"نازش صاحبہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "وقوعہ کی رات جب آپ اپنے شوہر کے کمرے میں پہنچیں تو آپ نے وہاں کیا دیکھا تھا؟"

"مقبول شاہ اپنے خون میں لت پت بستر پر مردہ پڑا تھا۔" وہ بولی۔ "میں چیختے ہوئے باہر کو لپکی۔ توفیق پر میری نظر پڑی تو میں نے اسے اس واردات کے بارے میں بتایا۔ اس نے بھی بیڈروم میں جا کر مقبول شاہ کی لاش دیکھی۔ پھر میں نے فوراً پولیس کو فون کر دیا......"

"اور جب تھانے میں آپ کا فون اٹینڈ کیا گیا تو آپ نے چھوٹتے ہی کہا تھا......" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ جلدی سے آ جائیں...... اکبر نے میرے شوہر کو قتل کر دیا ہے......" میں نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "یہی الفاظ تھے نا آپ کے؟"

"جی، میں نے یہی کہا تھا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"نازش صاحبہ!" میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ "اپنے شوہر کو خون میں لت پت دیکھ کر کس چیز سے آپ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ قتل ملزم اکبر ہی نے کیا تھا؟"

"ظاہر ہے، اس کے سوا یہ کسی اور کا کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ "میں یا گھریلو ملازم توفیق تو مقبول شاہ کو قتل کرنے سے رہے......!"

"آپ دونوں کے علاوہ بھی تو ایک شخص اس وقت بنگلے میں موجود تھا......" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اور...... میں ملزم اکبر کی بات نہیں کر رہا......؟"

"پھر آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟" وہ بری طرح الجھ کر مجھے دیکھنے لگی۔

"فیصل!" میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "میں آپ کے کزن کی بات کر رہا ہوں نازش صاحبہ......؟"

خوابِ غفلت

سویا ہوا انسان پانی کی بوندوں سے بھی جاگ جاتا ہے۔
لیکن سوئی ہوئی قوم کو جگانے کے لیے لوڈشیڈنگ کرنی پڑتی ہے۔
"سنہرا قول فرام واپڈا۔"

مرسلہ: رضوان تنولی گریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

"وہ...... اس دن ہمارے گھر آیا ضرور تھا......" وہ بات کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "لیکن پھر واپس چلا گیا تھا۔"

"کب آیا تھا وہ اور کب واپس گیا تھا؟" میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

وہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔ "جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ کوئی آٹھ بجے بنگلے پر پہنچا تھا اور ساڑھے آٹھ بجے واپس چلا گیا تھا۔ جب اس کو پتا چلا کہ ملزم اندر مقبول شاہ کے بیڈروم میں موجود ہے تو اس نے زیادہ دیر رکنا مناسب نہ سمجھا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر وہ واپس چلا گیا تھا۔"

یہ بھی وہ صریحاً جھوٹ بول رہی تھی کیونکہ اکبر کی واپسی رات ساڑھے نو بجے ہوئی تھی اور جب وہ مقتول کے بنگلے سے رخصت ہوا تو نازش اپنے کزن فیصل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے دانستہ وقوعہ کے وقت فیصل کی جائے وقوعہ سے غیر حاضری کو ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی اور نازش کی اسی بات نے مجھے خطرناک حد تک ہوشیار کر دیا تھا۔ فیصل کے حوالے سے میرے پاس جو معلومات تھیں وہ تسلی بخش نہیں تھیں یعنی اس کی ذات میری نظر میں قابلِ بھروسا نہیں تھی اور نازش کے حالیہ رویے نے مجھے اور بھی چوکنا کر دیا تھا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

"نازش صاحبہ! تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ آپ خودمختار ہیں۔ آپ کے سر پر والدین کا سایہ موجود نہیں۔ خاندان کا دیگر کوئی بزرگ مثلاً چچا، تایا، ماموں، خالو، خالہ، پھوپی وغیرہ بھی باقی نہیں ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں اور...... میرے توسط سے معزز عدالت بھی یہ جاننے کی مشتاق ہے کہ فیصل آپ کا کس قسم کا کزن تھا؟"

"کیا قانون کی کتابوں میں کزنز کی بھی مختلف اقسام

ہوتی ہیں؟" وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ اس کے سوال میں حقارت آمیز طنز جھلکتا تھا۔

"جی ہاں......" میں نے بڑی شدومد سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "قانون کی کتابوں میں تو نہیں البتہ ہماری معاشرتی روایات میں کزنز کی تین اقسام پائی جاتی ہیں......"

"مثلاً......؟" وہ خشمگیں انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً......!" میں نے مزے لے لے کر بتایا۔ "فرسٹ کزن، سیکنڈ کزن اور تھرڈ کزن......"

"فرسٹ اور سیکنڈ کزن کے بارے میں تو سنا ہے۔" وہ متامِلانہ انداز میں بولی۔ "یہ تھرڈ کزن کیا بلا ہے۔"

"آپ نے درست فرمایا نازش صاحبہ!" میں نے گہرا طنز کیا۔ "یہ تھرڈ کزن واقعی کسی بلا سے کم نہیں ہوتا۔ یہ چور رشتوں کو بڑی آسانی سے چھپانے کے کام آتا ہے اور...... کسی کو بتانا بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ فرسٹ کزن ہے یا سیکنڈ کزن...... بس "کزن" کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے...... جیسا کہ آپ نے فیصل کے بارے میں کہا ہے......؟"

وہ تلملا کر رہ گئی اور امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ خاصی دیر سے خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا، فوراً خدائی فوجدار بن کر لپکا۔

"آبجیکشن یور آنر......" وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ "میرے فاضل دوست استغاثہ کی معزز گواہ کی توہین کر رہے ہیں۔"

"مثلاً...... میں نے نازش صاحبہ کی کیا توہین کی ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔

"آپ نے پہلے تھرڈ کزن کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ چور رشتوں کو چھپانے کے کام آتا ہے۔" وہ جارحانہ انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اور بعد میں گواہ کے کزن فیصل کو اسی نوعیت کا کزن قرار دے کر آپ نے معزز گواہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے۔"

جج نے ہمیں باہم بحث و تکرار دیکھا تو مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! آپ "تھرڈ کزن" کے ٹاپک کو ایک طرف رکھ کر اپنی جرح کو جاری رکھیں۔"

جج کی اس ہدایت پر وکیل استغاثہ نے فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھا جیسے کوئی بہت بڑا میدان مار لیا ہو۔ میں اسے نظرانداز کر کے نازش کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"نازش صاحبہ! آپ کے کزن فیصل صاحب کرتے کیا ہیں؟"

"وہ گاڑیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔"

"یعنی کار شوروم......؟"

"یہی سمجھ لیں۔" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

"فیصل صاحب کی رہائش کہاں پر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سوسائٹی میں۔" اس نے جواب دیا۔

"کراچی میں ایک درجن سے زیادہ سوسائٹیز ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ سوسائٹی کا نام بھی بتا دیں تو بہتر ہوگا؟"

"سوسائٹی آفس......!"

میں نے ازراہ مذاق کہہ دیا۔ "اوہ...... تو آپ کے کزن فیصل کے پاس کوئی باقاعدہ رہائش نہیں ہے بلکہ وہ کسی سوسائٹی کے آفس میں رہتے ہیں......!"

"میں نے سوسائٹی آفس کہا ہے، سوسائٹی کا آفس نہیں۔" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ کس قسم کے وکیل ہیں کہ آپ کو یہ بھی پتا نہیں "سوسائٹی آفس" کراچی کا ایک رہائشی علاقہ ہے؟"

"اس معلومات افزائی کے لیے میں تہِ دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے گردن کی خفیف جنبش کے ساتھ کہا۔ "اب یہ بھی بتا دیں کہ کیا فیصل شادی شدہ ہے؟"

"جی ہاں!" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "نازش صاحبہ! آپ کا کزن فیصل شادی شدہ ہے، اس کی رہائش سوسائٹی آفس کے علاقے میں ہے، وہ کاروں کا شوروم چلاتا ہے...... کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟"

"جی...... جی ہاں......!" اس نے جواب دیا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! مجھے مقتول کی بیوہ سے اور کوئی سوال نہیں کرنا۔ اس کی گواہی مکمل ہو چکی۔ اس کے عدالتی بیان کو فیصل کے بیان سے چیک کیا جائے گا۔ معزز عدالت سے میری درخواست ہے کہ آئندہ پیشی پر فیصل کی عدالت میں موجودگی کو یقینی بنایا جائے۔ دیٹس آل یور آنر......!"

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ "کیا مسٹر فیصل آپ کے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے؟"

"یس سر!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔ "فیصل استغاثہ کے آخری گواہ ہیں۔"

جج نے وکیل استغاثہ کو ہدایت کی کہ آئندہ پیشی پر فیصل

عدالت میں ضرور پیش کیا جائے پھر دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

"دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!"

فیصل کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ دراز قامت اور مضبوط بدن کا مالک تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرایا۔ نازش نے فیصل کے حوالے سے جتنی معلومات فراہم کی تھیں، یہ بیان اس کی مکمل عکاسی کرتا تھا۔ وکیل استغاثہ نے رسمی سی جرح کے بعد اسے فارغ کر دیا تو میں اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کر کے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا اور ابتدا ہی آڑے ہاتھوں سے کی۔

"مسٹر فیصل! کیا مقتول کی بیوہ میڈم نازش واقعی آپ کی کزن ہیں؟"

"جج...... جی......" وہ بوکھلا گیا۔ "آپ کو کوئی شک ہے؟"

"شک و شبہ کا فیصلہ عدالت پر چھوڑ دیں۔" میں نے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ "یہ بتائیں، آپ دونوں کزنز میں سے زیادہ بڑا جھوٹا کون ہے؟"

"کک...... کیا مطلب ہے...... آپ کا......؟" وہ میرے وار کو برداشت نہیں کر پایا تھا۔

"سوال نہیں کریں، صرف جواب دیں!" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔

وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ "مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی۔ میرے فاضل دوست کس قسم کی جرح کر رہے ہیں؟"

"بیگ صاحب!" جج مجھ سے مستفسر ہوا۔ "کیا آپ کے اس سوال کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟"

"بہت گہرا تعلق ہے جناب عالی!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "آج میں معزز عدالت کے سامنے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، آپ جرح جاری رکھیں۔" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جی فیصل صاحب!" میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ "آپ دونوں میں سے بڑا جھوٹا کون ہے؟"

وہ "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" ایسی کیفیت میں نظر آیا پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "میں تو جھوٹا نہیں ہوں جناب......!"

"پھر آپ کو میری بات سے اتفاق کرنا پڑے گا؟"

"کون سی بات؟" وہ حیرت سے مجھے تکنے لگا۔

"یہ کہ......" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی، آپ ایک اعلیٰ درجے کے موٹر مکینک ہیں اور پی آئی بی کالونی کے ایک کوارٹر میں رہتے ہیں......؟"

وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ "یہ...... یہ آپ...... کیا کہہ رہے ہیں......؟"

"میں نے کہا ہے نا، سوال نہیں کریں صرف جواب دیں۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے ابھی آپ کے جن اوصاف اور حقائق کا ذکر کیا ہے انہیں ثابت کرنے کے لیے ایک درجن گواہ بھی پیش کر سکتا ہوں۔ آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ صرف سچ کہیں اور سچ کے سوا کچھ نہ کہیں......!"

"جب آپ کو سب کچھ پتا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں!" وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

"اس لیے پوچھ رہا ہوں تاکہ آپ کی نام نہاد کزن کی دروغ گوئی کو ثابت کیا جا سکے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "وہ معزز عدالت کے روبرو پچھلی پیشی پر بتا چکی ہے کہ آپ کا کاروں کا شوروم ہے، آپ سوسائٹی آفس کے علاقے میں رہتے ہیں اور آپ شادی شدہ ہیں......؟"

"یہ میری مستقبل کی خواہشات ہیں جو نازش نے بیان کی ہیں۔" وہ بات کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "ایک دوست کو ایسا خیر خواہ تو ہونا ہی چاہیے۔"

"بہت خوب......!" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "تو گویا نازش آپ کی کزن نہیں بلکہ محض دوست ہے؟"

"کیا کزن سے دوستی نہیں ہو سکتی؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ضرور ہو سکتی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "دوستی بھی ہو سکتی ہے اور شادی بھی۔ کیا آپ نازش سے شادی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے کیونکہ جن خواہشات کا تھوڑی دیر پہلے آپ نے ذکر کیا ہے وہ نازش سے شادی کے بعد ہی پوری ہو سکتی تھیں؟"

"پتا نہیں، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......!" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

میں نے اپنی جرح میں تندی بھرتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ زاہد حسین کو جانتے ہیں؟"

"کون زاہد حسین؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔

"آپ کا دوست زاہد حسین!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو پٹیل پاڑا میں رہتا ہے اور رکشا چلاتا ہے۔"

"اچھا وہ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں، وہ زاہد حسین میرا بہت اچھا دوست ہے۔"

"زاہد حسین پچھلے دو ڈھائی یا تین ماہ سے رکشا چلا رہا ہے۔" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس سے پہلے وہ ایک ٹرک ڈرائیور تھا؟"

"جی......" اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

"زاہد حسین جو ٹرک چلاتا تھا اس کا نمبر "ٹو تھری ون نائن" تھا۔" میں نے کہا۔ "میں غلط تو نہیں کہہ رہا فیصل صاحب؟"

"نن......نہیں......" وہ گھبراہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جنابِ عالی! معزز عدالت کے ریکارڈ پر یہ بات موجود ہے کہ مقتول مقبول شاہ کی موت سے دو ڈھائی ماہ پہلے اسے ایک خطرناک حادثہ پیش آیا تھا۔ ایک بدمست ٹرک نے اس کی گاڑی کو روندنے اور کچلنے کی کوشش کی تھی۔ مقتول اس حادثے میں جان تو نہیں ہارا تھا البتہ اس کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں اس بات کو ثابت کر سکتا ہوں کہ......" میں نے ڈرامائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جس ٹرک نے مقتول کی گاڑی کو کچلنے کی کوشش کی تھی اس کا نمبر "ٹو تھری ون نائن" تھا اور جس وقت یہ حادثہ پیش آیا اس وقت ٹرک کو فیصل کا دوست زاہد حسین ڈرائیو کر رہا تھا......!"

"آپ اس بات کو کس طرح ثابت کریں گے؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"میں ایک ایسے گواہ کو عدالت میں پیش کر سکتا ہوں جو ایک مقامی اخبار میں کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ میں نے ابھی جس حادثے کا ذکر کیا ہے اس کی کوریج اس صحافی نے بھی اپنے اخبار کے لیے کی تھی۔ اس ٹرک کا نمبر خبروں میں آتا رہا ہے مگر مذکورہ ٹرک منظر سے غائب ہو گیا تھا......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"استغاثہ کے انتہائی معتبر گواہ مسٹر فیصل کا اس ٹرک ڈرائیور کے ساتھ خاصا گہرا یارانہ ہے جو اب ایک رکشا چلا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، اگر زاہد حسین کو شاملِ تفتیش کر کے اس کا ٹرائل کیا جائے تو وہ بڑی شرافت سے بتا دے گا کہ اس نے کس کے ایما پر مقتول مقبول شاہ کی گاڑی کو کچل کر اسے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی......"

ادھر میری بات ختم ہوئی ادھر فیصل نے وٹنس باکس سے نکل کر عدالت کے دروازے کی سمت دوڑ لگا دی لیکن دروازے پر متعین مستعد مسلح افراد نے اسے پلک جھپکنے میں قابو کر لیا۔

فیصل کے فرار نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیا تھا۔ اس کی حرکت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ اسی کے ایما پر ٹرک ڈرائیور زاہد حسین نے مقبول شاہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی تھی۔

✕✕✕

صورتِ حال واضح ہو جانے کے بعد عدالت نے آئندہ پیشی پر میرے موکل کو باعزت بری کر دیا اور نازش، فیصل، زاہد حسین کو شاملِ تفتیش کر کے اس کیس کا نیا چالان پیش کرنے کے لیے پولیس کو خصوصی ہدایت کر دی۔

اصل مجرم پولیس کے ہتھے چڑھے تو ان کی زبان کھلوانے کے لیے کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا۔ فیصل اور نازش نے اپنے جرائم کا اقبال کر لیا۔

فیصل اور نازش کی بہت پرانی دوستی تھی۔ مقبول شاہ اور نازش کی شادی کے لیے انہوں نے باقاعدہ پلاننگ کی تھی۔ پہلے فیصل نے زاہد حسین کی مدد سے مقبول شاہ کو موت کی نیند سلانے کی کوشش کی۔ جب اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے اکبر کی آڑ لے کر اکبر ہی کے پستول سے مقبول شاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ملی بھگت سے اکبر ہی کو مقبول شاہ کا قاتل ٹھہرانے کا ڈراما رچایا لیکن وہ کہتے ہیں نا، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

اس قادرِ مطلق نے میری وکالت کے بہانے اکبر کو اس مصیبت سے بال بال بچا لیا تھا۔

جو سوال آپ کے ذہن میں گردش کر رہا ہے وہ میں نے فیصل سے بھی پوچھا تھا اور اس نے جواب دیا تھا کہ اپنی "مکینکی" کو کام میں لاتے ہوئے، دستانے پہن کر اس نے اکبر کی گاڑی کے ڈیش بورڈ میں سے اس کا پستول اسی وقت نکال لیا تھا جب وہ مقتول سے ملنے وہاں پہنچا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھتا، فیصل نے اس پستول کو واپس ڈیش بورڈ میں رکھ دیا تھا۔ جتنی دیر میں نوفیق آ کر گیٹ کھولتا اور اکبر کو باہر نکلنے کا راستہ دیتا، اسی مہلت میں نہایت ہی "پھرتی" کے ساتھ فیصل نے مقبول شاہ کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ عقبی دیوار پھاند کر اکبر سے پہلے اس کی گاڑی تک پہنچنا فیصل کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوا تھا!

(تحریر: حُسام بٹ)



کہتے ہیں فن کوئی بھی ہو اپنی معراج تک پہنچتے پہنچتے کتنی قربانیاں لے لیتا ہے مگر... یہ کیسا فن تھا اور وہ کیسے فن کار تھے جو قربانیاں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کی بھینٹ لے رہے تھے۔ سفاکی و درندگی اور انتقام میں بس دو چار قدم کا ہی فاصلہ ہوتا ہے لیکن... زندگی کے بعض مقامات پر سب آپس میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے جنون میں نہ فاصلہ برقرار رکھ سکی اور نہ ہی فرق نظر میں رکھ سکی... اس کے باوجود وہ فن اور فنکار کی بہت بڑی قدردان تھی۔

خود غرضی کی اس دنیا میں ایک فن شناس

کا ماجرا

فن کار

روبینہ رشید

ایمی کاؤنٹر کی دراز سے چابیوں کا گچھا نکال کر دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ عین اسی وقت دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور ایک عورت آندھی طوفان کے مانند اندر داخل ہوئی۔ اس نے اندر آتے ہی جلدی سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"اگر ان احمقوں کو برف باری میں ڈرائیونگ کرنا نہیں آتی تو انہیں فن لینڈ سے کسی گرم علاقے کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا رین کوٹ اتار کر دروازے کے قریب ایک ریک پر ٹانگا، اسی لمحے اس کی نظر ایمی کے ہاتھوں میں موجود چابیوں پر پڑی۔

"اوہ کیا تم دکان بند کر رہی ہو؟" وہ اپنی گھڑی کی جانب دیکھ کر حیرت سے بولی۔ "ابھی تو صرف 6 بجے ہیں۔"

"ہاں ہم 6 بجے ہی اسٹور بند کرتے ہیں۔" ایمی نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ اکیس بتیس سال کی خاصی خوب صورت عورت تھی۔ اس کے سنہرے بال پونی ٹیل کی شکل میں اس کے بیضوی چہرے پر بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی نیلی آنکھیں کسی سمندر کے مانند گہری تھیں اور اس کے چہرے پر سب سے دلکش چیز اس کی مسکراہٹ تھی۔

"کرسمس سے دو دن قبل بھی......؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... ہمارے اوقات وہی رہتے ہیں۔" ایمی کندھے اچکا کر بولی۔

"اوہ، میں سمجھی، دراصل اس علاقے میں لوگ اندھیرے کے بعد آتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے۔ لگتا ہے تمہاری دکان میں ہفتوں بعد ہی کوئی گاہک آتا ہوگا۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔

"آپ کو ایمی کلاسیکل گٹارز کی جانب سے خوش آمدید...... میں ایمی کیلمور ہوں۔" وہ اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو کیا چاہیے؟"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... میں لوسی ہوں یونی ہیٹر۔"

"او کے آپ کو گٹار اپنے لیے چاہیے یا کسی کو تحفہ دینا ہے؟"

"اپنے لیے۔" وہ بولی۔ "آپ کے پاس بہت اچھا کلیکشن نظر آرہا ہے، میں نے اتنے سارے کلاسیکل گٹار پہلے کبھی ایک ساتھ نہیں دیکھے۔"

"یہ ہماری اسپیشلٹی ہے......" ایمی نے فخر سے جواب دیا۔

"مگر میں دیکھ رہی ہوں کہ یہاں بالکل رش نہیں ہے حالانکہ روک اینڈ رول ہال آف فیم یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"دراصل...... ہمارے ہاں عام گاہکوں کا رش نہیں ہوتا، یہاں وہی لوگ آتے ہیں جو عام ڈگر سے ہٹ کر خاص اور کلاسیکل ازم کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔"

"کلاسیکل ازم......؟"

میں نے اس کو یہ نام دیا ہے۔" ایمی متانت سے مسکرا دی "لوگ عموماً اسٹیل کی تاروں والے گٹار بجاتے ہیں، انہیں کلاسیکل گٹار کے لطف کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ جب انہیں کلاسیکل گٹار کو ہاتھ لگانے کا موقع ملتا ہے تو پھر عام گٹار انہیں لکڑی کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں لگتا۔ اس کے سر، اس کے لمس کا احساس اور اس کی آواز ان پر جادو کر دیتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے بھی گٹار بجانا پسند ہے میں چودہ سال کی عمر سے گٹار بجا رہی ہوں مگر میں نے ہمیشہ اسٹیل کی اسٹرنگ والے گٹار ہی بجائے ہیں۔ کیا میں کوئی اصل کلاسیکل گٹار دیکھ سکتی ہوں؟" وہ بچوں جیسے تجسس سے بولی۔

"کیوں نہیں، آپ یہاں بیٹھیے اور اپنا بایاں پاؤں اس چھوٹے اسٹول پر رکھیں۔" ایمی نے اس کی مدد کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے نہایت احتیاط سے ایک گٹار کو دیوار سے اتار کر اس کی جانب بڑھایا۔ وہ اسے یوں تھامے ہوئے تھی جیسے وہ ایک نوزائیدہ بچہ ہو۔

"زبردست" لوسی نے اسے ایک ہاتھ سے پکڑتے ہوئے جیب سے "پک" (گٹار بجانے والا پلاسٹک کا ٹکڑا) نکالا۔

"اوہ نہیں...... پک کو استعمال نہ کریں آپ کو اسے اپنی انگلیوں سے بجانا ہے۔" ایمی تڑپ کر بولی۔

"مجھے اس کے بغیر بجانے کی عادت نہیں ہے مگر میں کوشش کرتی ہوں۔" ایمی کے تاثرات دیکھ کر لوسی نے پک دوبارہ جیب میں رکھ لی۔ پھر اس نے گٹار کی تاروں کو دائیں انگوٹھے اور انگلیوں سے تھرکایا۔ "بہت خوب، واقعی ایسا لطیف احساس اس سے پہلے کبھی کسی گٹار کو بجاتے ہوئے نہیں ہوا۔" وہ بے ساختہ بولی۔

"دیکھا آپ نے...... اس کی ٹیون اور آواز پر غور کریں۔" ایمی جذباتی انداز میں بولی۔

"واقعی بہت خوب صورت...... بہت نفیس۔" لوسی نے اسٹرنگ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ کس چیز کی تاریں ہیں؟ کیا انہیں بلیوں وغیرہ سے بنایا گیا ہے؟"

"نہیں یہ انسانی حسن کا شاہکار نہیں اور یہ میرا خصوصی برانڈ ہے، میں برلاٹ میں بنائی گئی تاروں کو نیا نام دیتی ہوں۔ اس کا نام "ماچوڈیلابٹ" ہے۔"

"دلچسپ اور نفیس، آپ کا جواب نہیں۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ بلیوں کی انتڑیوں سے اسٹرنگز بنائے جاتے رہے ہیں؟" لوسی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" ایمی نے سوال کے جواب میں سوال کیا۔ "میرا خیال ہے کہ یہ سب کہانیاں ہیں۔"

"غلط...... اس کام کے لیے قدیم زمانے میں لوگ بھیڑوں کی آنتوں کا استعمال کرتے آئے ہیں۔" ایمی نے بتایا۔

"اف......"

"آج کل زیادہ تر کلاسیکل گٹار کی اسٹرنگز نائلون کی بنائی جاتی ہیں یا پھر سنتھیٹک فائبر کی...... مگر بلیوں اور بھیڑوں کی آنتوں والے اسٹرنگز اب بھی دستیاب ہیں۔ آپ ویب پر انہیں 100 سے 150 ڈالر میں خرید سکتی ہیں۔"

"اوہ...... یہ آنتوں سے تار کیسے بنا لیتے ہیں؟" لوسی نے کراہیت سے کہا۔

"اس کا الگ طریقہ کار ہوتا ہے۔ انہیں اس وقت جانور کے جسم سے حاصل کیا جاتا ہے جب وہ گرم ہو یعنی اسے مرے ہوئے زیادہ وقت نہ ہوا ہو پھر انہیں خصوصی طریقے سے صاف کر کے ان کی لمبی لمبی اسٹریس بنائی جاتی ہیں بعد میں انہیں گھما کر پالش......"

"بس بس...... میں اس سے زیادہ سننا نہیں چاہتی۔" لوسی نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "آپ کی تاروں میں کیا خاص بات ہے؟"

"اگر میں نے تمہیں ان کا راز بتا دیا تو مجھے تم کو قتل کرنا پڑے گا۔" ایمی نے سفاک لہجے میں کہا پھر یکدم اس نے قہقہہ لگایا۔ "مذاق کر رہی ہوں مگر یہ بزنس سیکریٹ ہے میری اسٹرنگز صرف میرے پاس ہی دستیاب ہوتی ہیں اسی وجہ سے ایمی اسٹرنگز کا ایک کیسٹ عموماً 850 ڈالرز سے زیادہ قیمت میں بکتا ہے۔"

"واقعی!...... یہ تو بہت مہنگی ہیں۔ لوگ اتنی قیمتی اسٹرنگز خریدتے ہیں؟"

"بالکل...... وہ پروفیشنل موسیقار ہوتے ہیں۔ مجھے میری ویب سائٹ پر دنیا بھر سے آرڈرز ملتے ہیں اور میرا اصل بزنس آن لائن ہی ہے۔ اب آپ یہ بتائیں کیا آپ کو گٹار پسند آیا؟"

"بہت...... یہ کتنے کا ہے؟"

"صرف چار ہزار پانچ سو ڈالرز کا۔" ایمی نے کہا۔

"اوہو......" لوسی نے احتیاط سے گٹار ایمی کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت زیادہ مہنگا ہے، میرے لیے اسے خریدنا ممکن نہیں ہے ویسے اس میں ایسی کیا خاص بات ہے یار...... آخر ایک تار ہی تو ہے۔"

"میں نے تمہیں بتایا نا کہ یہ ہینڈ میڈ ہے اور یہ تاریں ہمارے خصوصی لوتھیر نے بنائی ہیں۔"

"لوتھیر...... یہ کیا ہوتا ہے؟" لوسی نے چونک کر پوچھا۔

"لوتھیر خاص انسٹرومنٹس بنانے والے کو کہا جاتا ہے۔"

"او کے...... کیا تمہارے پاس کچھ کم قیمت کے گٹار ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں، وہ یہاں پیچھے والی دیوار پر لگے ہیں، ان میں کچھ جاپانی ہیں اور کچھ اسپینش، مگر وہ ہینڈ میڈ نہیں ہیں۔" ایمی کی دلچسپی صاف کم ہوتی نظر آرہی تھی "کوئی بات نہیں چلے گا۔" لوسی دیوار کی طرف بڑھی مڑتے ہی اس کا ہاتھ کاؤنٹر پر رکھی بلی کو لگا۔

"اوہ سوری" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر جب بلی وہیں بیٹھی اسے اپنی سبز آنکھوں سے گھورتی رہی تو لوسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ "ارے یہ تو بالکل زندہ لگ رہی ہے۔"

وہ انتہائی خوب صورتی سے اسٹف کی گئی تھی اور فروزن ہونے کے باوجود اس کا فر تک اصلی لگ رہا تھا۔ یہ میرے بیٹے کا کمال ہے۔ یہ اس کا شوق بھی ہے اور مشغلہ بھی۔ وہ بارہ سال کا تھا جب اس کا پالتو کتا مر گیا تھا۔ ہم نے اسے پچھلے حصے میں دفن کر دیا تھا مگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکا۔ اسی رات اس نے انٹرنیٹ پر خوب ریسرچ کی اور اگلے دن فلفی کو قبر سے نکال کر اس کی ٹیکسی ڈرمی کر ڈالی۔ فلفی کو تو وہ اچھا نہیں بنا سکا تھا مگر اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ اس کام میں ماہر ہوتا چلا گیا۔ اب تو مجھے یاد بھی نہیں کہ اس نے اب تک کتنے جانوروں کو مار کر ان کا اسٹف بنایا ہے۔" ایمی نے فاخرانہ انداز میں کہا۔

"تو اس نے اس بے چاری بلی کو مار دیا تھا۔"

"نہیں نہیں...... یہ تو ایک حادثہ تھا، جب بھی اسٹور میں کوئی گاہک آتا تو یہ بھی اندر بھاگ آتی تھی۔ وہ اسے ڈنڈا دکھا کر بھگا دیا کرتا تھا، ایک روز غلطی سے ڈنڈا اس کے سر پر لگ گیا اور وہ مر گئی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا وہ اس کا اسٹف بنا سکتا ہے اور مجھے اس میں کوئی حرج نظر نہیں آیا۔" لوسی نے پچھلی دیوار پر لگے گٹاروں میں سے ایک سرخ رنگ کے گٹار کو اتارتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کے شوہر بھی آپ کے ساتھ اسی اسٹور میں کام کرتے ہیں؟"

"میرے شوہر گزشتہ دنوں ایک حادثے میں جاں بحق ہو چکے ہیں۔" ایمی نے سرد لہجے میں کہا۔

"اوہ...... آئی ایم سوری۔" اس نے گٹار کو دوبارہ دیوار پر لگاتے ہوئے کہا۔ "ایک منٹ...... مجھے یاد آرہا ہے، شاید میں نے اخبار میں ان کے بارے میں پڑھا تھا۔ اسی وجہ سے مجھے آپ کا نام جانا پہچانا لگ رہا تھا، یہ شاید چند ہفتوں پہلے کی بات ہے نا؟"

"ہاں" ایمی کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی۔

لوسی واپس مڑتے ہوئے کارنس پر رکھی اسٹف گلہری کے پاس آئی۔ "اوہ کیا اسے بھی جوزف ہی نے تیار کیا ہے؟"

"ہاں" ایمی کے چہرے پر ایک سایہ سا گزر گیا تھا، لوسی اس کے بیٹے کا نام جانتی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اب تک جوزف کا نام نہیں لیا تھا۔

"بہت بہترین...... یہ بالکل زندہ محسوس ہو رہی ہے۔" وہ اس کے مزید قریب جاتے ہوئے بولی۔ جیسے اسے یقین نہ ہو کہ وہ مر چکی ہے۔ "ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں آپ کو یہ یقین ہے کہ آپ کے شوہر پہاڑی سے گرنے والی کار کے ساتھ گر کر مر چکے ہیں......؟ کیونکہ پولیس کو اب تک لاش تو نہیں ملی ہے۔"

"ہاں مگر میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ ہمارے دوستوں کی دعوت تھی سب یہاں جمع تھے اچانک کارل کو یاد آیا کہ بیئر بہت کم رہ گئی ہے اس لیے وہ اوپر بنے اسٹور سے بیئر خریدنے چلا گیا، وہ بیئر لے کر آ گیا تھا مگر اس کے بعد اس نے ڈرائیو وے میں گاڑی سے کرتب دکھانے شروع کر دیے اور اسی تیز رفتاری میں پیچھے کی ریلنگ ٹوٹ گئی اور وہ پچاس فٹ کی بلندی سے گاڑی سمیت جنگل میں جا گرا۔ پولیس کا خیال ہے کہ شاید گاڑی کا ایکسی لریٹر پھنس گیا تھا یا شاید کارل نے خوب پی رکھی تھی اور وہ بریک نہیں لگا پایا۔ میں اس وقت اپنی دوستوں کے ساتھ تھی مجھے تو یہ پتا بھی نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔"

"وہ اتنے خراب موسم میں گاڑی دوڑا رہا تھا؟" لوسی نے یقین نہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"وہ اکثر ایسا کرتا تھا، اس طرح وہ خود کو جوان محسوس کرتا تھا حالانکہ میں اسے کتنی ہی بار کہہ چکی تھی کہ اب وہ 45 کا ہندسہ عبور کر چکا ہے اور اس طرح کی حرکتیں اسے دوبارہ جوان نہیں بنا سکتیں مگر وہ کارل ہی کیا جو کسی دوسرے کی بات مان لے اور خصوصاً جب وہ پی لیتا تھا تب تو آپے سے ہی باہر ہو جاتا تھا۔" وہ بڑبڑائی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں سی پڑی تھیں یقیناً اس کا دماغ کہیں اور مصروف تھا۔

"مگر ہو سکتا ہے کہ وہ اس حادثے میں بچ گیا ہو؟"

"ہو سکتا ہے مگر زندگی اور فلموں میں بڑا فرق ہوتا ہے یوں بھی اب پانچ ہفتوں سے زائد گزر چکے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو واپس آ چکا ہوتا...... اوہ مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں ایک اجنبی سے اتنی باتیں کر رہی ہوں...... یوں لگتا ہے کہ تم بڑے غور سے اخبار پڑھتی ہو یا پھر اس کیس میں کوئی خاص دلچسپی ہے؟" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"نہیں تو...... ہاں میں باخبر رہنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں...... اب میں سوچ رہی ہوں کہ کیوں نہ تمہیں اپنے ایک اور راز میں بھی شریک کرلوں۔" ایمی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"کیسا راز......؟"

"یہی کہ میں 250 ڈالرز والی اسٹرنگز کیسے بناتی ہوں۔"

"ارے...... اگر وہ تمہارا بزنس سیکریٹ ہے تو رہنے دو...... ویسے بھی اسے جان کر کیا کروں گی؟"

"پتا نہیں کیوں مگر میں اب تم سے یہ راز چھپانا نہیں چاہتی پھر تم تو ابھی چلی ہی جاؤ گی تمہیں بتانے سے میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا...... آؤ نا......" وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی، اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی کے تاثر سے دمک رہا تھا۔ لوسی گویا بادل ناخواستہ اس کے پیچھے چل پڑی۔ کاؤنٹر کے پیچھے سے دروازے سے گزر کر وہ اندرونی حصے میں داخل ہوگئے تھے۔

"یہاں عجیب سی بو آرہی ہے۔" لوسی اندر داخل ہوتے ہوئے ناک سکیڑ کر بولی۔

"ہاں اصل میں یہ کیمیکل کی بو ہے تم چند لمحوں میں اس کی عادی ہوجاؤ گی۔" ایمی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور اس چھوٹے سے کمرے کی دوسری جانب بنے دوسرے دروازے کو کھول کر لوسی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ درمیان کا کمرا گویا ایک کوریڈور تھا جو دونوں حصوں کو ملاتا تھا۔ اندر والا کمرا خاصا طویل و عریض تھا جس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کمرے میں قدرے خنکی سی تھی۔ کمرے کے ایک حصے میں لمبی سی ورکنگ ٹیبل تھی جو غالباً ایمی کے کام کرنے کی جگہ تھی وہاں صرف ایک لیمپ جل رہا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک میز رکھی ہوئی تھی جہاں اس وقت چار آدمی بیٹھے پوکر کھیلتے نظر آرہے تھے۔ ان کے سر پر ایک بہت ہلکی روشنی والا بلب روشن تھا۔ لوسی کی نظر جونہی ان پر پڑی وہ تیر کے مانند میز کی چوتھی کرسی پر بیٹھے کارل کی طرف لپکی۔

"کارل...... کارل تم زندہ ہو اور یہاں آرام سے بیٹھے پوکر کھیل رہے ہو؟ تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا......؟ میں کس قدر پریشان تھی کیا تم نہیں جانتے؟" لوسی بے ساختہ بولے جارہی تھی۔ ایمی چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی پھر وہ اپنی ڈیسک کی طرف بڑھی اور اس کی دراز میں رکھے پستول کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "بلی تھیلے سے باہر آہی گئی۔" اس نے سوچا۔

"کارل" لوسی اس بار زور سے چلائی تھی پھر وہ ایمی کی طرف مڑی۔ "تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ یہ زندہ نہیں ہے تم نے اسے مار ڈالا...... اور پھر اس پاگل جوزف کو اسے اسٹف کرنے کی اجازت دے دی...... ہے نا...... کیونکہ تمہیں اس میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوا ہوگا...... مگر اب تم بچ نہیں سکو گی...... تم نہیں جانتی میں کون ہوں؟" وہ غرائی۔

"ہاں واقعی میں نہیں جانتی تھی، جب تم اسٹور میں آئیں میں تم کو صرف ایک احمق اور مفلس گاہک ہی سمجھی تھی مگر اب میں جانتی ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کون ہو......" ایمی دانت پیس کر بولی۔ "نہیں نہیں...... یہ غلطی مت کرنا...... لاؤ اپنا پستول مجھے دے دو...... شاباش" وہ لوسی کے ہاتھ کو پرس کی جانب بڑھتے دیکھ کر بولی اور پھر اس نے لوسی کا پرس جھپٹ لیا۔

"کیوں......؟" "تم نے کارل کو کیوں مار ڈالا...... میں اس سے پیار کرتی تھی...... ہم شادی کرنے والے تھے۔" لوسی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اسی وجہ سے......" ایمی اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی۔ "کیونکہ وہ تمہارے ساتھ چکر چلا رہا تھا اور میں اسے اس سے پہلے والے چکر کے بعد ہی بتا چکی تھی کہ اب اگر اس نے یہ غلطی کی تو میں اسے جان سے مار ڈالوں گی مگر اس نے حسبِ معمول میری بات کو گیدڑ بھبکی سمجھ کر مذاق میں اڑا دیا۔"

"تو تم نے یہ سارا ڈراما رچایا تھا اس کی کار کو چٹان سے نیچے پھینک دیا تھا۔ کیا وہ اس وقت کار میں موجود تھا؟"

"نہیں...... جوزف نے اس کے ہیئر کے اسٹور پر جانے کے بعد اسے فون کردیا تھا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ کچھ آگے بنے ویران پارکنگ لاٹ میں اس کی وین خراب ہوگئی ہے۔ کارل نے حسبِ معمول اسے گالیاں دی تھیں۔ تم جانتی ہوتا کہ جوزف میرے پہلے شوہر کا بیٹا ہے اور کارل اسے صرف اس وجہ سے برداشت کررہا تھا کہ یہ اسٹور اور مکان اس کے نام پر ہے۔ بہرحال جب کارل وہاں پہنچا تو جوزف نے اس کے سر پر ڈنڈا مار کر اسے ہلاک کردیا پھر اس کی لاش کو وین میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس نے برف کے بڑے بڑے ٹکڑے اس کی کار میں بھرے اور اسے گھر لے آیا اس کے بعد اس نے ایکسی لریٹر پر برف کے بڑے ٹکڑے رکھے جن کی وجہ سے وہ دب گیا اور پھر کار کو اسٹارٹ کر کے چٹان کی جانب رخ کر کے چھوڑ دیا۔ اندر سے کارل کے دو دوستوں نے اس کی کار کو چٹان کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اس پلان میں بڑا خطرہ تھا۔ گاڑی ادھر ادھر ہوسکتی تھی۔ سب کچھ سب کے سامنے ہونا تھا...... اور بھی مشکلات کھڑی ہوسکتی تھیں مگر ایسا نہیں...... جوزف اپنے کام میں بہت ماہر ہوگیا ہے۔ فخر ہے مجھے اس پر۔" ایمی خوش دلی سے مسکرائی۔

"مگر تم نے اسے مار کیوں ڈالا...... تم...... تم اس کو طلاق بھی تو دے سکتی تھیں اسے مارنا کیوں ضروری تھا؟"

"ضروری تھا کیونکہ وہ مکار انسان طلاق کی صورت میں میرا آدھا کاروبار بھی مانگ رہا تھا۔ حالانکہ اس نے کبھی اسے چلانے کے لیے ناخن برابر کام بھی نہیں کیا۔ اسے تو شراب پینے اور دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں تھا۔" ایمی نفرت سے بولی۔

"تو وہ اس وقت کار میں نہیں تھا جب کار جھیل میں گری......؟"

"بالکل...... برف کے تودے پانی میں جا کر گھل گئے لہٰذا کوئی ثبوت نہیں رہا...... اسے کہتے ہیں مکمل جرم...... بے حد زبردست پلاننگ...... تمہیں اس کی داد ضرور دینی چاہیے کیوں سارجنٹ لوسی......" ایمی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟ یقیناً تم مجھے قتل نہیں کرو گی......؟ میں ایک پولیس والی ہوں، میری کار تمہاری دکان کے باہر موجود ہے اور پھر میری لاش تمہارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔" لوسی گویا اسے خبردار کرتے ہوئے بولی۔

"ہم...... دیکھتے ہیں۔" ایمی سوچنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی۔ "کار تو خیر کوئی مسئلہ نہیں، یہ علاقہ رات کے وقت چوروں اور ڈاکوؤں کی جنت بن جاتا ہے یہ تم جانتی ہو۔ سویرا ہونے تک یہ گاڑی ٹکڑوں میں بٹ کر بک بھی چکی ہوگی۔ یہاں رہنے کے فائدے بھی بہت ہیں...... دیکھا تم نے؟ ہاں تمہاری لاش...... اس کے بارے میں سوچنا پڑے گا مگر تم پریشان مت ہو، آخر تم میرے شوہر سے محبت کرتی تھیں اور اتنی کہ اسے ڈھونڈنے یہاں تک چلی آئیں تو میں تمہارے لیے کچھ اچھا ہی سوچوں گی۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

لوسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، اس پاگل عورت سے خود کو کیسے بچائے، اس کی پستول ایمی کے قبضے میں تھی اور وہ بہت ہوشیار نظر آرہی تھی اسے باتوں میں مصروف رکھ کر کچھ وقت حاصل کرنے کی کوشش بہرحال وہ کر ہی سکتی تھی۔ اگرچہ اس کا امکان بہت کم تھا کہ کوئی اور گاہک آجائے اور اس کی مدد کرسکے یا پھر اس کی توجہ بھٹکے تو وہ اس سے ہتھیار چھین کر اس پر قابو پاسکے۔

"تم نے ان باقی افراد کو کیوں مارا؟" اس نے میز کے گرد بیٹھے بقیہ تین افراد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ...... ہاں تو مجھے اپنے کام کے لیے را میٹریل کی بھی تو ضرورت پڑتی ہے۔" ایمی سادگی سے بولی۔

"را میٹریل......؟"

"ہاں اسٹرنگز بنانے کے لیے۔"

"تم نے کہا تھا کہ وہ اسٹرنگز مین میڈ ہیں...... اوہ تو تمہارا مطلب یہ تھا کہ تم یہ تاریں انسانوں کی آنتوں سے تیار کرتی ہو...... میں یقین نہیں کرسکتی۔" لوسی اسے بے یقینی سے گھورتے ہوئے بولی جبکہ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ "تم نے ان لوگوں کو صرف اس لیے مارا کہ تم اپنے خاص گٹاروں کے خصوصی تار بنا سکو؟" لوسی کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

"ہاں...... صرف یہ ہی نہیں اور بھی بہت سے...... میں نے تمہیں بتایا کہ میرا کام آن لائن آرڈرز سے چلتا ہے پھر میں نے یہ اسٹور کیوں کھولا ہے اور میں گاہکوں کا انتظار کیوں کرتی ہوں؟ سمجھیں تم......؟" اس کی ہنسی میں وحشت چھپی ہوئی تھی۔

"اف...... میٹریل حاصل کرنے کے لیے تم اتنے لوگوں کو مار چکی ہو تم ان کی لاشوں کا کیا کرتی ہو؟ پولیس کو اب تک اس کی خبر کیوں نہیں ہوسکی؟"

"ہم انہیں فلش کر کے سیوریج سسٹم میں بہا دیتے ہیں۔ حیران مت ہو یہ بہت آسان ہے بس آپ کے پاس کمرشل گرائنڈر ہونا چاہیے۔ پہلی بار میں نے یہ سب تجربے کے طور پر کیا تھا مگر اس سے اس قدر نفیس اور بہترین تاریں بنیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ راتوں رات میری ڈیمانڈ بڑھ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ایمی اسٹرنگز اتنی خاص ہوتی ہیں۔ ان کے سروں اور آواز کے ردھم کی مثال دی جاتی ہے...... اور اب میں تمہارے مرنے کی آواز سننا چاہتی ہوں۔" اس نے اپنے پستول والے ہاتھ کو بلند کیا۔ "دیکھو اگر تم نے گولی چلائی تو باہر دوسری دکانوں تک آواز جاسکتی ہے، تم مجھے اس طرح نہیں مار سکتی۔" لوسی بولی۔

"گڈ پوائنٹ!" ایمی نے پستول نیچے کرلیا۔ لوسی کی سانس میں سانس آئی۔ شاید اسے کوئی راستہ مل جائے، اسے یہاں اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب وہ کیا کرے، وہ تیزی سے سوچ رہی تھی، شاید وہ اسے باتوں میں لگا کر اس مصیبت سے نکل سکے...... کیا کرے؟ وہ اپنی سوچ میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے اپنے عقب میں بنے دروازے سے جوزف کے اندر آنے کی خبر بھی نہیں ہوسکی۔ جس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا پائپ رینچ تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد کرسمس کی شام اسی بڑے سے کمرے میں ایمی اپنی ڈیسک کے پاس بیٹھی اپنے خاص گٹار پر ایک خوب صورت دھن بجا رہی تھی۔ اس کا واحد سامع جوزف تھا جو اس کے سامنے بیٹھا دلچسپی سے موسیقی سن رہا تھا۔

"بہت خوب صورت...... زبردست، اس کی آواز ناقابلِ فراموش ہے ممی۔" ایمی نے دھن مکمل کی تو وہ تالی بجاتا ہوا بولا۔ "ممی آپ اسٹرنگز کے اس لاٹ کا کیا نام رکھنے والی ہیں؟"

"لوسی نیل ایتما۔" وہ مسکرائی۔

"یہ...... یہ کون سی زبان ہے؟"

"اٹالین...... اس کا مطلب ہے لوسی کی روح کی روشنی......"

"کیا بات ہے...... واہ...... ممی آپ نام رکھنے میں بھی لاجواب ہیں۔"

"شکریہ جوزف مگر تم مجھ سے زیادہ ہنرمند ہو۔" ایمی مسکرا کر بولی۔ "تمہارا کیا خیال ہے لوسی؟" اس نے قدرے بلند آواز میں پوچھا۔

لوسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سرخ رنگ کے اسکرٹ اور جرسی میں ملبوس لوسی جواب دے ہی نہیں سکتی تھی وہ پوکر ٹیبل کی پانچویں کرسی پر بیٹھی اپنے محبوب کارل کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر لازوال مسکراہٹ منجمد تھی۔

محفلِ شعر و سخن

❀ ریاض بٹ.....حسن ابدال
اُڑ جائیں گے تصویر کے رنگوں کی طرح ہیں
ہم وقت کی ٹہنی پہ پرندوں کی طرح ہیں

❀ ہارون رشید.....ضلع مردان
عجب اپنا حال ہوتا جو وصالِ یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی کبھی دل نثار ہوتا
کوئی فتنہ تا قیامت نہ پھر آشکار ہوتا
تیرے دل پہ کاش ظالم مجھے اختیار ہوتا

❀ قاضی عرفان احمد عاجز، ماسٹر جمیل احمد.....چکوال
فلک پہ رقص کرتے ان گنت روشن ستاروں کو
جو ہم ترتیب دیتے تھے تو تیرا نام بنتا تھا



❀ ڈاکٹر ناصر فراز.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
کتنا دشوار ہوتا ہے کسی کو یوں بھلا دینا
کہ جب وہ شخص شامل ہو رگوں میں خون کے مانند

❀ امتیاز علی اللہ.....سرگودھا
میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

❀ ڈاکٹر ناہید شیخ.....سیلائٹ ٹاؤن، سرگودھا
رکھا تھا میں نے جان سے بڑھ کر جسے عزیز
تنہائیوں کا زہر وہ جیون میں بھر گیا
عمرِ رواں کا سلسلہ آخر ہوا تمام
آیا نہیں وہ لوٹ کر جانے کدھر گیا

❀ انعم ریاض.....نیول کالونی ڈالمیاں، کراچی
میری طلب تھا اک شخص وہ نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرے کہ بھول گئے سوال بھی

❀ حسنین عباس، کمیل عباس.....کھاریاں
یہ خنک رُت، یہ نئے سال کا پہلا لمحہ
دل یہ کہتا ہے کہ موسم کو اب یاد آئے
ہم نے ماضی کی سخاوت پہ جو پل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یاروں کے سبب یاد آئے



❀ محمد احمد انجم.....کوٹ لکھپت جیل، لاہور
کون سی خوشیاں لایا ہے جنوری
تم جو کہتے تھے برا ہے دسمبر

❀ مہرین ناز.....حیدرآباد
ابھی مصروف ہوں کافی، کبھی فرصت میں سوچوں گی
کہ تجھ کو یاد رکھنے میں، میں کیا کیا بھول جاتی ہوں

❀ کائنات مریم.....ملتان
انسان میں نہیں کوئی پتھر کے دور کا
اہلِ زباں ہوں عزتِ گویائی دے مجھے
بستی میں اندھے، بہروں کی کس سے کروں کلام
کوئی بھی تو شناسا نہ دکھلائی دے مجھے

❀ جانوی دیوی.....ملتان
اب کے برس بھی لکھا میں نے اس کے نام ہی دیباچہ
میرے ذکر سے خالی رکھے جس نے اپنے باب تمام

❀ طالب حسین طلحہ.....ملتان
ہری ہے شاخِ تمنا ابھی جلی تو نہیں
دبی ہے آگ جگر کی مگر بجھی تو نہیں
جفا کی تیغ سے گردن وفا شعاروں کی
کٹی ہے برسرِ میدان مگر جھکی تو نہیں

❀ سنزا بابر عباس، ماہین بابر.....کھاریاں
سردیوں کا موسم ہے برفیلی ہوائیں ہیں
سال تو آچکا ہے، جنوری کی شامیں ہیں
اداسیوں میں لیے ہوئے ماہ و سال گزرتے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترستی ہوئی نگاہیں ہیں

❀ بابر عباس.....گلیانہ روڈ، کھاریاں
جب اعتبار و بے اعتباری کے درمیان ہے زندگی
میں فریب ہوں کسی اور کے، مجھے جانتا کوئی اور ہے
تیری روشنی تیرے خدوخال سے مختلف تو نہیں
تو قریب آ تجھے دیکھ لوں، تو وہی ہے یا کوئی اور ہے

❀ رانا حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر احمد چوہان.....لاہور
بہت درد دیے ہمیں اس اسیری نے
جو اپنے تھے وہ بھی پرائے ہوئے

❀ محمد لطیف ساحل.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
سانسوں میں ابھی تک ہے تیری یاد کی خوشبو
لمحات ملاقات کے بھلائے نہیں جاتے

❀ عمر دراز انصاری.....بھلوال شہر
چاند میں بنا کے تیری صورت
پھر اس کا عکس دیکھیں گے
ہلا کے چند موجوں کو رات بھر
پھر تیرا رقص دیکھیں گے

❀ اظہر حسین بچار.....ہزاری، جتوئی
یہ سال بھی گزرا ہے تیرے پیار کے مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

❀ ابرار وارث.....سندیلیانوالی
یہ قیام کیسا ہے راہ میں، تیرے ذوقِ عشق کو کیا ہوا؟
ابھی کانٹے چبھے نہیں تیرے سب ارادے بدل گئے

❀ رحیمہ سرور.....ساہووالی، لاہور
سمجھ کر مالِ غنیمت ہم کو
تری یادوں نے بے پناہ لوٹا

❀ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
ڈار سے ہٹ کے اِک اڑان بھری
نوچ ڈالے گئے ہمارے پر
عشق بنیاد کیوں اٹھاتا ہے؟
اکثر و بیشتر خسارے پر

❀ محمد صفدر معاویہ.....خانیوال
سنا کے رنج والم مجھ کو الجھنوں میں نہ ڈال
تھکن کا خوف مرے عزم کی رگوں میں نہ ڈال
میں اس جہان کو کچھ اور دینا چاہتا ہوں
تو کاروقت کے پُرہول چکروں میں نہ ڈال

❀ عاصم اقبال جسپال.....ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
جب اس نے گفتگو ہی سے تاثیر کھینچ لی
میں نے بھی میل جول میں تاخیر کھینچ لی
پہلے تو میرے ہاتھ میں کشکول دے دیا
پھر یوں کیا کہ وقت نے تصویر کھینچ لی

❀ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
اِک عجیب سی کیفیت ہے میری تیرے بن
رہ بھی لیتے ہیں اور رہا بھی نہیں جاتا

❀ محمد فراز.....فیصل آباد
بڑے سکوں سے رہتے ہو میرے بن آج کل
جیسے تیرے دل پر بوجھ کی صورت تھے ہم

❀ انتظار احمد فاروقی.....جیل کوٹ لکھپت، لاہور
ضبط تہذیب ہے محبت کی
وہ سمجھتے ہیں بے زبان ہیں ہم

❀ شبیر نازش.....کراچی
ایک مدت سے کچھ نہیں دیکھا
دل کی فریاد ہے کہ آئینہ
جسم و جاں دیکھ کر لرزتے ہیں
کوئی افتاد ہے کہ آئینہ

❀ علی ڈوگر.....ساہیوال
تیرے ہجراں سے تعلق کو نبھانے کے لیے
میں نے اس سال بھی جینے کی قسم کھائی ہے

❀ راجا ثاقب محمود جنجوعہ.....پنڈدادن خان
ظلم سہنا بھی ہوا ظلم ہی اِک حد کے بعد
خاموشی بھی تو ہوئی، پشت پناہی کی طرح

٭ رانا منشی حماد فرہاد......ساہیوال
ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اِک دسمبر اکیلے

٭ محمد عقیل چٹھہ......حافظ آباد
مجھ سے لے لو میری آنکھیں یہ کام آئیں گی
ہم نہ ہونگے تو بہت آپ کو رونا ہوگا

٭ افتخار حسین اعوان......مظفر آباد، آزاد کشمیر
پتھروں کے دیس سے آتی ہیں صدائیں
شیشے کے گھروں میں نہ تم کبھی رہنا

٭ محمد حمزہ علی صدیقی......رحیم یار خان
اُٹھا کر پھول کی پتی نزاکت سے مسل دی
اشارے سے کہا یہ حال ہم دل کا کرتے ہیں

٭ حاجی خالد محمود خان......اسلام آباد
یہ بھی اچھا ہوا شاید کہ اسے پا نہ سکے ہم
ہمارا ہو کے اگر بچھڑتا تو قیامت ہوتی

٭ زاہد چودھری......جھور کینٹ
ہم اپنے عشق کی اب اور کیا شہادت دیں
ہمیں ہمارے رقیبوں نے معتبر جانا

٭ اشفاق شاہین......کراچی
میری جانب سے شکایت نہ تقاضا ہوتا
خود مرے گھر وہ چلے آتے، کچھ ایسا ہوتا

٭ داؤد اشفاق......کراچی
کہیں فرقے، کہیں ذاتیں، کہیں کنبے، کہیں گوٹھ
ہم بھی رکھتے ہیں بکھرنے میں مہارت کیسی

٭ ماہین فاطمہ......کراچی
وہ مجھ میں ایسے سمایا کہ مل سکا نہ کبھی
مرے وجود سے ہوتا جدا تو مل بھی جاتا

٭ رمضان پاشا......گلشن اقبال، کراچی
گلے آپس میں جب ملتے ہیں دو بچھڑے ہوئے ساتھی
عدم ہم بے سہاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

٭ احمد حسن عرضی......قبولہ شریف
سامنے اس کے بدل جاتے ہیں
لفظ سارے ہیں منافق میرے

٭ عادل عاصی خان......ڈگرلزی کرک
تیرے بیمار ساجن کو آتی نہیں موت
پڑھی جائے اب کوئی لیٹین کہاں تک

٭ ثمینہ حبیب......مری آباد، کوئٹہ
غریبوں کی یہ بستی ہے کہاں سے شوخیاں لاؤں
یہاں بچے تو رہتے ہیں مگر بچپن نہیں رہتا

٭ احمد خان توحیدی......اسٹیل ٹاؤن، کراچی
ہوائیں لاکھ چلیں میرا رخ بدلنے کو
دل ونگاہ میں وہ سرزمین آج بھی ہے

٭ سعدیہ بخاری......اٹک
تو رازِ کُن فکاں ہے اپنی آنکھوں پہ عیاں ہوجا
خودی کا رازداں ہوجا خدا کا ترجماں ہوجا

٭ سعدیہ ناز، محمد علی اسد، ایم عمار احمد......کراچی
یہ ہمدردی غریبوں سے امیروں سے تری نفرت
یہ تیری سوچ کا پہلو بھی طبقاتی لگا مجھ کو

٭ محمد جاوید......تحصیل علی پور، ضلع مظفر گڑھ
رتجگے آنکھوں میں ہیں تو خود ہی آکر دیکھ لے
تجھ کو میرے گھر کا دروازہ کھلا مل جائے گا

٭ جبران احمد ملک......کراچی
لگا رہے تھے جو کل انقلاب کے نعرے
وہ آج بن گئے سرمایہ دار تاجر کیوں

٭ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
صرف دھوکا ہے دکھاوا ہے تری دریا دلی
تو سخی ہے تو دکھا ظرف سمندر جیسا

٭ حاجی خالد محمود خان......اسلام آباد
بے شک میں تھا نشے میں مگر اتنا ہوش تھا
آپس میں لڑ رہے تھے جو ان کو ملا دیا



بے ایمانی کے ساز پر ایمانداری کا گیت گانے والے ایک بیوپاری کا قصہ

کاروبار

تنویر ریاض

اچھا کاروبار ہمیشہ بہترین ذہانت سے مشروط ہوتا ہے... اور اس کے پاس تو گویا ذہانت کا خزانہ تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خزانہ کتنا ہی زیادہ ہو ایک دن ختم ہو جاتا ہے اور جب اس پر ذہانت کے معاملے میں غربت چھائی تو سارا کاروبار ڈوب گیا... البتہ ڈولتی ہوئی اس کی ذہانت نے ڈوبتے ڈوبتے بھی کام کر دکھایا۔ قطع نظر اس کے اسے کنارہ ملتا یا نہیں۔

جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد سے ہی میں نے فراڈ کا دھندا شروع کر دیا تھا۔ میرا طریقۂ واردات بالکل مختلف اور منفرد تھا۔ کسی نامعلوم فرد کی حیثیت میں امیر لوگوں سے راہ رسم بڑھاتا اور ان سے ضرورت کے تحت تعلق قائم کرتا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ جان پاتے کہ ان کے ساتھ کیا دھوکا ہوا ہے؟ میں ان کے درمیان سے صاف نکل جاتا۔ 1929ء میں ہونے والی کساد بازاری نے بھی میرے کام پر کوئی اثر نہیں ڈالا اور میں 1931ء تک بڑے

اطمینان سے مغربی ساحلی شہروں میں مصروف عمل رہا لیکن اچانک ہی مجھے ایک ٹھوکر لگی اور میں منہ کے بل آن گرا۔

ان دنوں میری ملاقات فریڈ نامی ایک انشورنس ایجنٹ سے ہوئی جو گھر گھر جا کر انشورنس کیا کرتا تھا جو آپ کو پالیسی بیچنے کے ایک ہفتہ بعد ہی پانچ یا دس سینٹ کا سکہ لینے آجاتے تھے اور ہر وقت آپ سے مزید انشورنس کے بارے میں باتیں کیا کرتے تھے۔ فریڈ نے میرے ساتھ مل کر ایک منصوبہ بنایا۔ اس نے پچھلی تاریخوں میں میرے بھائی کے نام سے دو ہزار ڈالرز کی پالیسی بنائی۔ اب مجھے ایک ایسی لاش کا انتظام کرنا تھا جس کی شناخت نہ ہو سکے۔ اس کے بعد بیمہ کی رقم ہم دونوں آپس میں تقسیم کر لیتے۔

میرے پاس ایک پرانے ماڈل کی کنورٹیبل کار تھی جو میں نے چائنا ٹاؤن میں جوئے میں جیتی تھی۔ اب اس کار کی حالت کافی خستہ ہو چکی تھی اور اس کی مرمت پر اچھی خاصی رقم خرچ ہو جاتی جو میری برداشت سے باہر تھا۔ چنانچہ میں نے اپنے منصوبے کے لیے اسی کار کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی پشت پر سگریٹ لائٹر میں استعمال ہونے والا پیٹرول چھڑکا اور ایک پرانے لائٹر کا پیچ ڈھیلا کر کے وہاں اس طرح رکھ دیا جیسے یہ پیٹرول اس میں سے لیک ہوا ہو۔ مجھے سب سے زیادہ مشکل اس شرابی کو گھسیٹ کر لانے میں ہوئی جو نشے میں مدہوش تھا لیکن اس کی سانس چل رہی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ایک والٹ اور انگوٹھی بھی رکھ دی پھر اطمینان سے پیٹرول کو آگ دکھا کر وہاں سے کھسک لیا پھر میں نے اس لاش کو اپنے بھائی سام کے طور پر شناخت کیا اور اس کے انشورنس کی رقم مجھے مل گئی جسے ہم نے معاہدے کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا۔ میں نے اپنا حصہ جیب میں ڈالا اور خاموشی سے مشرق کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ میرا مخصوص انداز تھا کہ کسی بھی واردات کے بعد اس شہر کو فوراً چھوڑ دیا کرتا تھا اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ نہ جانے کس طرح فریڈ کی کمپنی کو اس پر شک ہو گیا اور جب انہوں نے اسے فراڈ کے الزام میں پکڑا تو یقیناً مجھ پر بھی قتل کا الزام آتا لیکن میری قسمت اچھی تھی کہ اس سے پہلے ہی نیویارک پہنچ گیا جہاں میں نے ولسن گراہم کے نام سے ایک نئی شناخت حاصل کر لی۔

یہ میرے لیے ایک مشکل وقت تھا۔ لوگوں نے اپنا پیسا روک رکھا تھا اور وہ کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈال رہے تھے، چنانچہ میں نے بھی عارضی طور پر اپنے دھندے سے کنارہ کشی اختیار کی اور زیورات کی دکانیں لوٹنے لگا۔ ابتدا میں کچھ چھوٹی موٹی کامیابیاں ہوئیں، لیکن ایک رات میں ایسی دکان میں گھس گیا جہاں الارم لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی میں نے شوکیس کو ہاتھ لگایا اور اس سے پہلے کہ میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا پولیس کی گاڑی پہنچ گئی اور میں رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

میں نے جیل میں چار سال بڑے آرام سے گزارے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ باہر کی دنیا میں مجھ جیسے بدمعاشوں کی کیسے گزر ہو رہی ہے لیکن یہ جگہ میرے لیے سرکاری مہمان خانے کی حیثیت رکھتی تھی جہاں آرام دہ بستر، عمدہ خوراک اور علاج کی سہولتیں میسر تھیں۔ یہاں تک کہ سرکاری خرچ پر میرا اپنڈکس کا آپریشن بھی ہوا۔

اس جیل میں ہر قیدی اپنے آپ کو بے گناہ سمجھتا تھا۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کا جرم ثابت ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ قسمیں کھا کر کہتے کہ انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا لیکن میں نے کبھی ان کی بات پر یقین نہیں کیا جب تک میری ملاقات جیک ہارٹلے سے نہیں ہوئی۔ وہ دو کوٹھریاں چھوڑ کر ڈی بلاک میں تھا۔ دیکھنے میں خاموش طبع لگتا اور اپنا بیشتر وقت لائبریری میں گزارتا تھا۔

وہ مجھے اکثر صحن میں ٹہلتا ہوا نظر آتا۔ اس کے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں اور سر اوپر کی جانب اٹھا ہوا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹ سکیڑتا جیسے اپنے پالتو کتے کو بلا رہا ہو۔ ہم دونوں کے درمیان ہائے ہیلو سے زیادہ گفتگو نہیں ہوتی تھی لیکن ایک روز تکلف کی دیوار گر گئی۔ ہوا یوں کہ ان دنوں ورلڈ سیریز کے مقابلے چل رہے تھے۔ میں نے نہ جانے کیا سوچ کر اپنی پسندیدہ ٹیم پر شرط لگا لی لیکن بدقسمتی سے وہ ٹیم میچ ہار گئی، جن دو قیدیوں سے میں نے شرط لگائی تھی، وہ دونوں بڑے تنومند اور خونخوار قسم کے تھے اور میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چند ہفتوں بعد ان کی پائی پائی ادا کر دوں گا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور ان میں جو زیادہ طاقتور تھا، اس نے پیٹ پر ایک مکا جڑ دیا۔ میں تکلیف کی شدت سے دہرا ہو گیا پھر میرے کانوں میں جیک کی سیٹی کی آواز آئی۔ وہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”کتنی رقم ہے؟“

”بیس ڈالر!“ خونخوار چہرے والا بولا۔

”ٹھیک ہے، کام ختم ہونے کے بعد میرے پاس آنا۔ میں کچھ بندوبست کرتا ہوں۔“

ان دونوں نے آپس میں نظروں کا تبادلہ کیا اور ہمیں گھورتے ہوئے وہاں سے چلے گئے، ان کے جانے کے

بعد میں نے اپنا ہاتھ اس کی جانب مصافحے کے لیے بڑھایا اور اپنا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ”ولسن گراہم، مجھے ڈکیتی کے الزام میں چار سال کی سزا ہوئی ہے۔“

اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”جیک ہارٹلے، عمر قید۔“ اسے اپنے جرم کی نوعیت بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ عمر قید کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ کسی کو قتل کر کے آیا ہے۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا کہ عمر قید کاٹنے والا بھی جیل کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ عام طور پر ایسے قیدی اپنی زبان بند رکھتے اور دوسروں کے مسئلے سے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے تو وہ ہم دونوں کو ماریں گے۔“

”بے فکر رہو، میں تمہیں بچا لوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن وہ دونوں میرے پاس سے گزرے تو ان میں سے ایک بولا۔ ”گراہم! تمہارا ادھار ختم ہو گیا، آج کس گیم پر شرط لگا رہے ہو؟“

میں ان دونوں کے منہ نہیں لگنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموشی سے کھسک گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری اور جیک کی دوستی مضبوط ہوتی گئی۔ اسے چھوٹے گھوڑے پسند تھے۔ وہ گھنٹوں نیویارک ورلڈ ٹیلی گرام کے کھیلوں والے صفحے کا مطالعہ کرتا رہتا۔ میں نے بھی لائبریری کا کارڈ بنوا لیا اور اس بہانے میری اس سے ملاقاتیں ہونے لگیں، وہ مجھے گھوڑوں کے بارے میں بتاتا اور میں اسے اپنے اچھے دنوں کے قصے سنایا کرتا۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا کہ اسے گھوڑوں کے بارے میں اتنی معلومات کس طرح ہیں تو اس نے مجھے ٹال دیا اور کہا کہ میں اسے کیلی فورنیا کی سونے کی کانوں والی کہانی دوبارہ سناؤں۔

میری سزا کی مدت ختم ہونے والی تھی جب میں اس سے ملنے لائبریری میں گیا۔ وہ کونے میں ایک تصویر لیے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہ تصویر مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ برائٹ اسٹار ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ شاندار گھوڑا نہیں دیکھا۔ میں اس کا ٹرینر تھا۔“ اس کا سر جھک گیا اور وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”میں نے اسے مار ڈالا۔“

اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ ان میں مجھے معذرت کی جھلک نظر آئی لیکن میں جانتا تھا کہ کوئی بھی معافی اس کے زخموں کا مداوا نہیں ہو سکتی۔ وہ کہنے لگا۔ ”میں گھوڑوں اور ریس کے میدان سے پیار کرتا ہوں۔ دوسرے بھی چاہتے تھے کہ برائٹ اسٹار نہ جیتے چنانچہ انہوں نے مجھے ایک خطیر رقم کے عوض اس پر آمادہ کر لیا کہ میں ٹریننگ کے دوران اپنے گھوڑے کو نشے کی ہلکی ہلکی مقدار دیتا رہوں تاکہ وہ پرسکون ہو جائے، میرا خیال تھا کہ ریس والے دن ایک معمولی خوراک سے اس کی رفتار کم ہو جائے گی لیکن ریس کے دوران اسے ایک ٹھوکر لگی اور وہ بے قابو ہو گیا۔ میں نے اسے میدان کے آخری موڑ پر گرتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد وہ کبھی پلٹ کر نہیں آیا۔ میں مجرم ہوں اور مجھے یہی سزا ملنی چاہیے تھی۔“

یہ کہہ کر اس نے جھاڑو اٹھائی اور لائبریری کے فرش کی صفائی کرنے لگا لیکن میں جانتا تھا کہ اصل کہانی کچھ اور ہے۔ محض ایک گھوڑے کو مارنے کے جرم میں اسے عمر قید نہیں ہو سکتی۔

میری رہائی میں بہت تھوڑے دن رہ گئے تھے۔ ایک دن میں لائبریری میں بیٹھا نیویارک ٹائمز میں سماجی خبروں والا حصہ پڑھ رہا تھا جبکہ جیک اخبارات کو ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ اچانک میری نظر ایک مضمون پر گئی جس کے ساتھ کسی مرنے والی کی تجہیز و تکفین کی تصاویر بھی شائع ہوئی تھیں۔ میں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسے موقع پر امیر بیوہ کا دکھ مجھے کچھ مصنوعی سا لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترکہ میں ملنے والی دولت کے لیے یہ سارا ڈراما رچا رہی ہے۔“

جیک نے میرے کندھوں پر سے جھک کر اخبار پر نظر ڈالی اور اس کے قدم زمین پر جم کر رہ گئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ اس نے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنی جیب سے ایک اخباری تراشا نکالا اور مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

”گلوریا ڈومنٹ ہے۔“

”لیکن یہاں تو بریسکی لکھا ہوا ہے۔“

”وہ اس کا دوسرا شوہر ہے۔ میں یہاں پہلے والے کو مارنے کے جرم میں آیا ہوں۔“

یہ تصویر مسٹر اور مسز تھامس بریسکی کی تھی جو ڈومنٹ ہارس فارم کو کسی فضائی کمپنی کے ہاتھ بیچ رہے تھے، میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس کے پہلے شوہر کو قتل کیا تھا؟“

”نہیں، بلکہ اس عورت نے مجھے پھنسایا ہے اور اس

سلسلے میں بریسکی نے اس کی مدد کی تھی۔ لگتا ہے کہ وہ بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

ہم کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "برائٹ اسٹار کے جانے کے بعد میں بھی بے کار ہو گیا اور کوشش کے باوجود مجھے کوئی اچھی ملازمت نہ مل سکی پھر ایک دن گلوریا ڈومنٹ سے میرا رابطہ ہوا، اس نے مجھے لانگ آئی لینڈ میں واقع اپنے شوہر کے فارم پر ملازمت کی پیشکش کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر بچوں کے سمر کیمپ کے لیے سستے گھوڑے خریدنے گیا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ گھوڑوں کی دیکھ بھال کے لیے میری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے بے روزگار سمجھ کر یہ پیشکش کی ہوگی، وہ جانتی تھی کہ میں کم تنخواہ پر بھی تیار ہو جاؤں گا۔

مسٹر ڈومنٹ خاصے معقول شخص تھے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ مجھے اچھے لگے لیکن کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے احاطے میں مردہ پائے گئے۔ ان کی گردن میں ایک ٹوٹی ہوئی سوئی پھنسی ہوئی تھی اور اس کا دوسرا حصہ میرے سامان سے برآمد ہوا۔ اس کے ذریعے دی جانے والی نشہ آور دوا بھی وہی تھی جس سے برائٹ اسٹار کی موت واقع ہوئی تھی۔ مجھے جیل بھیج دیا گیا اور اس کے کچھ دنوں بعد ہی گلوریا نے وہ زمین ایئر لائن کو فروخت کر دی جس پر مسٹر ڈومنٹ سمر کیمپ بنانے والے تھے۔"

"اس کہانی میں بریسکی کہاں فٹ ہوتا ہے؟"

"وہ فارم میں فورمین تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اسی نے مسٹر ڈومنٹ کو مارا ہوگا پھر قتل کا الزام میرے سر پر تھوپنے کے لیے اس نے پولیس کو میری پرانی ہسٹری بتا دی اور انہیں میرے سامان کی تلاشی کے لیے بھیج دیا۔"

"تمہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ لوگ تمہیں پھنسا سکتے ہیں؟"

"مجھے کام کی ضرورت تھی اور گلوریا جیسی دلکش عورت جب مہربان ہو تو آدمی کو قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں۔"

اس تصویر کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس کی باتوں میں کتنی سچائی ہے۔

بالآخر میری رہائی کا دن بھی آن پہنچا۔ میں نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا اور سنگل بریسٹ سوٹ پہن کر تیار ہو گیا۔ ایک لڑکا مجھے جیل کے گیٹ تک چھوڑنے کے لیے آیا اور میرا سامان اٹھا کر چلنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا میں کچھ دیر کے لیے لائبریری میں رک کر اپنے دوست جیک کو خدا حافظ کہہ سکتا ہوں تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

میں نے جیک کے ساتھ گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور پوچھا کہ کیا میں اس کی ضرورت کی کوئی چیز باہر سے بھیج سکتا ہوں تو اس نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔"

وہ لڑکا مجھے گیٹ تک چھوڑنے آیا اور مجھے اشارے سے وہ جگہ دکھائی جہاں سے بس مل سکتی تھی۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تیار تھا۔ پہلے میں البانی جاتا جہاں میری جان پہچان کے ایک دو فلم پروڈیوسر تھے۔ اگر وہ مجھے اپنی فلموں میں کوئی کام دے دیتے تو میں دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جاتا۔ اس کے بعد میں نیویارک کے جنوب میں چلا جاتا جہاں کا ماحول میرے لیے بہت سازگار تھا۔

موسم بہار کی پہلی صبح کو میں البانی یونین اسٹیشن سے روانہ ہوا۔ مجھے ریل کے درمیانی ڈبے میں جگہ ملی۔ میری جیب میں کئی کارڈ اور ایک تعارفی خط بھی تھا جس کے مطابق میں ایک ایسا شخص ہوں جو فی الوقت نیویارک کی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لے رہا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ جنگ سر پر کھڑی ہے۔ اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو امید تھی کہ روزویلٹ کی مجوزہ اصلاحات کی بدولت یہ جنگ یورپ تک محدود رہے گی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے امکانات کم ہیں لیکن جب لوگ خود ہی آسمان پر دھوپ نکلنے کی پیش گوئی کر رہے ہوں تو مجھ جیسے آدمی کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے۔

میں گرانڈ سینٹرل اسٹیشن کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور ففتھ ایونیو پر واقع بیالیسویں اسٹریٹ کی جانب بڑھ گیا۔ اس سڑک پر مہنگی دکانیں تھیں اور وہاں پیسے والے لوگ رہتے تھے۔ میں نے ایک کونے پر کھڑے ہو کر گہری سانس لی تو مجھے پیسوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میرے ذہن میں گلوریا ڈومنٹ کا نام پہلے سے موجود تھا۔ ایک ایسی عورت جو دولت اور طاقت کی خاطر کسی کو بھی قتل کر سکتی ہو، میرے لیے بہت کارآمد ہو سکتی تھی۔ مجھے سیونتھ ایونیو پر ایک چھوٹا سا پورشن مل گیا جس میں فون کی سہولت بھی موجود تھی۔ پھر میں نے کچھ پیسے خرچ کر کے ایک نیا نام اختیار کیا۔ ایک بڑی دکان سے کچھ کپڑے خریدے، پائر میں کمرا بک کروایا اور والڈورف اسٹوریا میں ہونے والی تقریب کا دعوت نامہ حاصل کر لیا۔ یہ تقریب ایک وکیل کی جانب سے چندہ اکٹھا

کرنے کے لیے تھی جو سینیٹ کے انتخابات میں حصہ لے رہا تھا اور اس قانونی فرم سے تعلق رکھتا تھا جو گلوریا کے معاملات دیکھتی تھی۔ اس لیے وہاں اس کا ہونا لازمی تھا۔

وائٹی کا شمار معززین میں ہوتا تھا لیکن اس کی زیر زمین سرگرمیاں کافی مشکوک تھیں۔ اس نے اپنے دوست تھامس عرف جوجو کے ساتھ مل کر بینک کے پیسوں سے بروکلین کے علاقے میں مختصر فیملی کے لیے مکانات خرید رکھے تھے۔ جوجو بینک میں سینئر وائس پریذیڈنٹ تھا۔ وہ بآسانی ایک دو مکان امیر لوگوں کو سستے داموں فروخت کرتا پھر ہم جیسے دھوکے بازوں کو ان کے پاس بھیجتا جو پندرہ سے بیس فیصد پر یہ مکان خرید لیتے۔ تھامس اس سودے کے لیے قرض کی درخواست منظور کر لیتا اور چند سودوں کے بعد وہ ٹھگ غائب ہو جاتے اور مکان کا مالک سر پیٹتا رہ جاتا کیونکہ جس بینک نے قرض کی ضمانت دی تھی۔ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

لوگوں میں مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی دولت کو تکیوں اور گدوں کے نیچے چھپا چھپا کر تنگ آ چکے تھے اور ایک بڑا جوا کھیلنے کے لیے تیار تھے۔ وائٹی نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام بنایا۔ اسے اپنے سینیٹر بننے کا یقین تھا اور اس کی نظریں شہر کے مشرقی علاقے کے باہر واقع تین سو ایکڑ زمین کے اس ٹکڑے پر تھیں جس پر حکومت کی جانب سے اسپتال تعمیر کیا جانے والا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ سینیٹر بننے کے بعد حکومت کو تجویز دے گا کہ یہ قطعۂ زمین کسی بلڈر کو فروخت کر دیا جائے تاکہ ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے کیونکہ زمین کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کے علاوہ ان پلاٹوں میں سرمایہ کاری کرنے والے بھی ٹیکس کے دائرے میں آ جائیں گے۔ اسپتال کسی دوسری جگہ بھی تعمیر کیا جا سکتا ہے جب ریاست کی آمدنی میں اضافہ ہوگا تو مریضوں کو بہتر سہولتیں فراہم ہو سکیں گی اور اس کا سہرا بھی سینیٹر کے سر جائے گا جن لوگوں کو اس اسکیم کے بارے میں معلوم ہوگا وہ الیکشن سے پہلے ہی زمین بک کروانا چاہیں گے اور وائٹی ہی سارے مالی معاملات دیکھے گا۔

میں اس بات کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ گلوریا بھی اس اسکیم میں پیسا لگائے۔ مجھے معلوم تھا کہ وائٹی اور جوجو ساری رقم سمیٹ کر فرار ہو جائیں گے اور لوگوں کو بعد میں پتا چلے گا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ یقیناً مجھے گلوریا کے نقصان پر خوشی ہوتی۔

میں ہال میں داخل ہوا اور بڑے باوقار انداز میں کچھ لوگوں کو دیکھ کر سر خم کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ گلوریا کچھ لوگوں کے درمیان شام کا لباس پہنے ہوئے کھڑی تھی۔ وہ ایک موٹے اور گنجے شخص سے مسکرا کر باتیں کر رہی تھی جس پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ بھی اس کا تیسرا شوہر بننے کے امیدواروں میں سے ہے۔ میں بھی اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"تم نے یقیناً اس زمین کے بارے میں سنا ہوگا جو

بروکلین میں واقع ہے۔"

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی اس معاملے میں دلچسپی لے رہی ہے لیکن گنجے نے بے زاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "مائی ڈیئر۔ ایسی جگہ پر سرمایہ کاری کرنا فضول ہے۔"

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی زمانے میں مین ہٹن میں کھیتوں اور درختوں کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن آج وہ جگہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔"

گلوریا نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری چمک نمودار ہوئی۔ "تم اس کے مشورے سے فائدہ اٹھا سکتے ہو لوئیس۔" پھر اس نے اپنا خالی گلاس اس گنجے کی طرف بڑھایا اور بولی۔ "کیا تم مجھے تھوڑی سی شیمپئن لا کر دے سکتے ہو؟"

وہ گنجا فرماں بردار غلام کی طرح بار کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "گلوریا ڈومنٹ بریسکی۔" پھر اس نے سگریٹ کیس اور سنہری لائٹر میری طرف بڑھا دیا۔

"ولیم موریسن۔" میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے بل بھی کہہ سکتی ہو۔"

وہ وقتی طور پر گنجے کو بھول گئی۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور ہال کی دوسری طرف چلتے ہوئے بولی۔ "بل۔ مجھے بتاؤ کہ ہماری ملاقات پہلے کیوں نہیں ہوئی؟"

میں نے اسے اپنی مصروفیات کے بارے میں ایک فرضی کہانی سنا دی لیکن اس کا ذہن اس زمین میں اٹکا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ لوئیس تیزی سے چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔ گلوریا نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ "میرا نمبر ڈائریکٹری میں ہے، مجھے ضرور فون کرنا۔"

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر وہاں ٹہلتا رہا اور اجنبی چہروں کو دیکھ کر اس طرح مسکراتا رہا جیسے وہ سب میرے قریبی دوست ہوں پھر اکتا کر باہر آ گیا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا محسوس ہوتے ہی مجھے جیک کا خیال آیا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا جس کے طفیل گلوریا جیسی عورت سے ملنے کا موقع نصیب ہوا۔

چند روز کے وقفہ کے بعد میں نے اسے فون کیا تو وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ "کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں تم سے اس زمین کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔ بہرحال کوشش کرتی ہوں کہ تمہارے لیے اس ہفتے کچھ وقت نکال سکوں۔"

میں نے اس سے معذرت کی اور بالکل یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی ہے، اس نے میری معذرت قبول کر لی اور ملاقات کا وقت دے دیا۔ آئندہ دو ہفتوں کے دوران ہم اتنے قریب آ گئے کہ میں اس کی موجودگی میں جیک کو بھی بھلا بیٹھا۔ ہم ایک جوڑے کے طور پر سینما، کاک ٹیل اور ڈنر پارٹیوں میں شرکت کرنے لگے اور سب لوگ ہمارے رومانس سے واقف ہو گئے۔

اس کے اصرار پر میں ایک دن اسے زمین کا وہ ٹکڑا دکھانے لے گیا جس میں وہ سرمایہ کاری کرنا چاہ رہی تھی۔ اس جگہ کو دیکھ کر وہ پاگل ہو گئی اور کہنے لگی کہ میں جلد از جلد اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں سے بات کروں۔ تین دن بعد میں وائٹی اور جو جو سے ملا اور انہیں گلوریا کی دلچسپی کے بارے میں بتایا۔ وائٹی یہ سن کر پھیل گیا اور بولا کہ "بہت سے لوگ اس اسکیم میں پیسا لگا رہے ہیں۔ اپنی دوست سے کہو کہ جلد فیصلہ کرے۔ اس سے پہلے کہ ساری زمین بک ہو جائے۔"

وائٹی نے اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے سب لوگوں کو اسکیم کے اختتامی روز ایک جگہ جمع کیا اور انہیں بتایا کہ اس نے ان سے ملنے والی تمام رقم اس زمین میں لگا دی ہے۔ اس کے سینیٹر بننے کے بعد زمین کا قبضہ مل جائے گا۔ اسے یقین ہے کہ تمام لوگوں کے لیے یہ ایک منافع بخش سودا ثابت ہوگا۔

گلوریا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے پچاس ہزار ڈالرز کی سرمایہ کاری کی تھی اور اسے دگنے تگنے منافع کی امید تھی۔ اس نے مجھ سے ڈنر پر چلنے کی فرمائش کی لیکن میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے ایک کاروباری میٹنگ میں جانا ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی اس کے گھر پہنچ جاؤں گا۔

"شب خوابی کا لباس ساتھ لے کر آنا۔" وہ سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ "ضروری نہیں کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔" اس کے انداز میں دعوت پنہاں تھی جسے میں خوب سمجھتا تھا۔

اس سے جان چھڑا کر میں سیدھا وائٹی اور جو جو کے پاس آیا جو ہوٹل کے ایک کمرے میں منتقل ہو چکے تھے اور بھاگنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے ان سے اپنا کمیشن وصول کیا جو سات ہزار ڈالر بنتا تھا۔

وائٹی بولا۔ "تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ تمہاری ہی کوششوں سے گلوریا نے اتنی بڑی سرمایہ کاری کی جو ہماری توقع سے بہت زیادہ تھی۔"

میں نے زوردار قہقہہ لگایا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ افسوس بھی ہونے لگا کہ آج کے بعد میں گلوریا کے ساتھ حسین لمحے گزارنے سے محروم ہو جاؤں گا، ہم نے مستقبل میں بھی رابطے میں رہنے کا فیصلہ کیا لیکن ہم جیسے دھوکے باز اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور پہلے ٹونی کے پاس گیا۔ میں نے اسے گلوریا کو تحفہ میں دینے کے لیے ایک خاص قسم کے سگریٹ کیس کا آرڈر دیا تھا جس کے ساتھ لائٹر بھی منسلک تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ سگریٹ کیس کھولتے ہی لائٹر بھی جل جاتا تھا۔ سیلز مین نے اس میں پیٹرول ڈال دیا اور اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتا دیا۔

گلوریا نے دروازہ کھولا۔ اس وقت وہ سلور کلر کی نائٹی میں ملبوس تھی۔ "میں نے ملازموں کو چھٹی دے دی ہے۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مجھے بیڈ روم میں لے گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، دوسری صبح اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور ہم دونوں بہترویں اسٹریٹ کے مشرق میں واقع سینٹرل پارک کی جانب روانہ ہو گئے۔ میں نے گاڑی ایک ریستوران کے باہر کھڑی کی اور ناشتا کرنے کے بعد گزشتہ روز کی کاروباری میٹنگ کے بارے میں جھوٹی سچی باتیں کرنے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "یوں سمجھو کہ اگلے چھ ماہ میں پندرہ فیصد منافع یقینی ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "کیا میں یقین کر لوں کہ تمہارے ساتھی میری چھوٹی سی سرمایہ کاری کے لیے گنجائش نکال لیں گے؟"

"یقیناً۔" میں نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں تک لے جاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنا میک اپ درست کرنے واش روم میں چلی گئی اور میں موقع غنیمت جان کر باہر نکل آیا۔ میرا رخ پارکنگ لاٹ کی طرف تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر اس کی کار میں ایک چیز ڈال دی اور فوراً ہی واپس آ گیا لیکن وہ مجھے ریستوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اس نے سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھا تو میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے شبہ ہوا کہ میری جیب سے نکل کر کوئی چیز تمہاری کار میں گر گئی ہے۔ وہی دیکھنے گیا تھا۔" پھر میں نے اپنی جیب سے گفٹ باکس نکالا اور اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں۔"

بچے ہمارے عہد کے

گنجا مہمان بچے سے۔ "تم میری طرف دیکھ کر ہنس کیوں رہے ہو؟"

بچہ۔ "دراصل انکل امی نے آپ کے کُرتے میں کنگھی رکھ دی ہے۔"

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

"ٹھہرو۔ میں بل دے کر آتا ہوں۔ پھر ہم کسی پرائیویٹ جگہ پر جا کر اسے دیکھیں گے۔" یہ کہہ کر میں نے وہ پیکٹ دوبارہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کار کے پاس پہنچ کر میں نے دروازہ کھولا اور اسے ڈرائیونگ سیٹ کی جانب دھکیل کر اسے وہ باکس تھما دیا۔ پھر دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے اپنی جیب پر ہاتھ مارا اور بولا۔ "میں اپنا پرس میز پر بھول آیا ہوں۔ تم میری واپسی تک یہ پیکٹ مت کھولنا۔"

یہ کہہ کر میں ریستوران کی جانب مڑ گیا۔ 65 ویں اسٹریٹ کے کونے پر پہنچ کر میری رفتار تیز ہو گئی، اچانک ایک شخص زور سے چلایا۔ "آگ!"

ایک دوسری آواز آئی۔ "اوہ میرے خدا، کار میں کوئی ہے۔"

پھر گلوریا کی دردناک چیخیں سنائی دیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس سے صبر نہیں ہوگا لہٰذا اس نے پیکٹ کھول لیا۔ میں نے اس کا ایک اسکریو پہلے ہی ڈھیلا کر دیا تھا جس سے پیٹرول کے قطرے اس کے لباس پر گرتے رہے، جیسے ہی اس نے سگریٹ نکالا تو لائٹر سے ایک شعلہ نکلا اور اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ وہ جتنا اپنے آپ کو ان شعلوں سے بچانے کی کوشش کرتی۔ لائٹر سے نکلنے والا پیٹرول اس کے کپڑوں اور کار کے مختلف حصوں تک بکھرتا جاتا اور دیکھتے ہی دیکھتے کار کی چھت تک آگ پھیل گئی۔

میرے ذہن میں وہ اخباری تراشا آیا جو میں سنگ سنگ جیل بھیجتا۔ جیک نے غلط کہا تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس خبر کو پڑھ کر یقیناً اس کے انتقام کی آگ سرد پڑ جائے گی۔ میں نے اپنا ہیٹ اتار کر کار سے نکلتے ہوئے شعلوں کی طرف لہرایا اور بولا۔ "جیک کا سلام قبول ہو۔" گلوریا کو معلوم نہیں تھا کہ میں کوئی بھی کام منافع کے بغیر نہیں کرتا جو میں سات ہزار ڈالر کی صورت میں پہلے ہی وصول کر چکا تھا۔



محی الدین نواب

دوسری قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کُن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



ماروی سفید لباس میں تھی۔ اگر کبھی پری دکھائی دے تو وہ ایسی ہی ہوگی۔ اُس نے سنا تھا سفید چمکیلا نورانی سراپا ہوتا ہے۔ وہ اس روح پرور نظارے میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔

چاچا نے انسپکٹر سے کہا۔ ''حضور! ہم مراد کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایک بار اس سے ملا دو۔''

انسپکٹر محبوب کی محویت دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ بہت دور تک سمجھ رہا تھا کہ ایک کروڑ پتی سرمایہ دار اپنے ملازم مراد پر کیوں مہربان ہے؟

اس نے کہا۔ ''چانڈیو صاحب بڑے مہربان ہیں۔ ہم بھی ان کے خادم ہیں۔ ماروی جب چاہے مراد سے ملنے آسکتی ہے۔''

اس نے جان بوجھ کر محبوب کے سامنے صرف ماروی کا نام لیا۔ جبکہ چاچا چاچی بھی ملاقات کے لیے آئے تھے۔

اس نے دور کھڑے ہوئے سپاہی سے کہا۔ ''ان لوگوں کو مراد کے پاس لے جاؤ۔ یہ چانڈیو صاحب کے بندے ہیں۔ جب تک چاہیں گے قیدی سے باتیں کرتے رہیں گے۔''

وہ تینوں تھانے کے اندر جانے لگے۔ محبوب کو صرف ماروی دور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے سینے سے نکل کر جا رہی تھی۔ پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ نظارہ ہی کیا جو گم ہوجائے۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی لیکن دل کی آنکھ سے نظر آنے لگی اور زیادہ نمایاں ہوگئی۔ سنجیدہ سی نورانی سی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ صورت اُدھر مراد کے پاس پہنچی ہوئی تھی۔ اِدھر نا مراد کو بھی بہلا رہی تھی۔ وہ تھانے کے اندر آئی تو مراد کو حوالات میں دیکھ کر تڑپ گئی۔ وہ بھی آہنی سلاخوں کو تھامے اپنی جان حیات کو دیکھ کر مچل گیا تھا۔ ایسی جدائی کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ سامنے تھا اور بیچ میں لوہے کی دیوار تھی۔

ماروی نے بے اختیار روتے ہوئے، دوڑتے ہوئے آکر اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ بچپن میں کھیلتے وقت اسی طرح ایک دوسرے کو تھام لیتے تھے پھر ماروی نے کہا تھا۔ ''تمہیں چھونے سے جانے کیا ہونے لگتا ہے۔ وعدہ کرو شادی سے پہلے مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔''

مراد نے اب تک وعدہ نبھایا تھا۔ آج ماروی نے خود ہی بے اختیار روتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ تو مستی میں جھوم گیا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پوری کائنات مل رہی ہے۔

اس نے دوسرا ہاتھ بھی اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ ایک مدت کے بعد انہوں نے آہنی سلاخوں کے سنگم پر ایک دوسرے کو چھو لیا۔ کیا بدنصیبی تھی کہ ایک ذرا خوش نصیب گھڑی بنا رہی تھی۔

یہ ایسے جذباتی لمحات تھے کہ وہ بڑی دیر تک کچھ بول نہ پائے۔ لیکن چاچا بول پڑا۔ ''بیٹے! ہم تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔ ماروی تو رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ کہہ رہی ہے جب تک گھر نہیں آؤ گے یہ کھانا نہیں کھائے گی۔''

مراد ماروی کی آنکھوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے بڑے دُکھ سے کہا۔ ''میں بہت بڑے الزام میں پکڑا گیا ہوں۔ قتل کا مقدمہ برسوں چلتا رہتا ہے۔ تم ابھی جا کر روٹی کھاؤ گی۔ نہیں تو میں بھی یہاں بھوکا رہوں گا۔''

ماروی بڑے جذبوں سے بہت کچھ بولنا چاہتی تھی لیکن کیا کرتی، وہاں مجبور ہو گئی تھی۔ بزرگوں کی موجودگی میں دل کا حال کھل کر بیان نہیں کر سکتی تھی۔

انسپکٹر محبوب کا دیا ہوا لفافہ کھول کر دیکھ چکا تھا۔ اس میں بیس ہزار روپے تھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ بہت بڑی اسامی ہے۔ لہٰذا ایک تابعدار کی طرح تھانے کے اندر آکر بولا۔ ''بزرگو! وہاں کیا کر رہے ہو۔ یہاں آؤ اور اپنا بیان دو۔''

چاچا چاچی اس کے دفتری کمرے میں چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی دونوں نے بڑے جذبے سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مراد نے سلاخوں کے درمیان سے دونوں ہاتھ نکال کر اس کے چہرے کو تھام لیا۔ وہ قانونی شکنجہ باعثِ رحمت ہو گیا تھا۔

بچپن گزرنے کے بعد وہ جوانی میں پہلی بار اس کے ہاتھ آئی تھی۔ وہ سحرزدہ سا ہو رہا تھا۔ اتنی قربت تو تب ہوتی جب اس کی دلہن بنتی۔ تقدیر مذاق کر رہی تھی۔ لوہے کی دیوار کھڑی کر کے اپنے مراد کی دلہن بنا رہی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کو قریب لا رہا تھا۔ اس کی طرف جھک رہا تھا۔ آہنی سلاخوں کے درمیان قربت کی گنجائش تھی لیکن وہ اچانک ہی تڑپ کر ہاتھوں سے نکل گئی۔

اس نے گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اور ہاتھ لگایا تو مر جاؤں گی۔ گھر جاؤں گی تو یہاں کا ایک ایک پل یاد آئے گا۔ ہائے مراد...! میں کیسے جیوں گی۔''

''اس یقین سے جیو گی کہ میں جلد ہی واپس آؤں گا۔''

محبوب کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ تھانے کے

...ے کو یوں تک رہا تھا جیسے وہ اپنے مراد کے لیے روتی ہوئی دکھائی دے رہی ہو۔ اپنے خدا سے پوچھ رہی ہو کہ یار کے بغیر کیسے جیئے گی؟

اور وہ سوچ رہا تھا۔ ''میں تیری آنکھوں میں آنسو نہیں رہنے دوں گا۔ میں کل ہی ضمانت پر اسے رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔''

وہ کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ اسے اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا۔ ''میں وہ کام کروں گا' جو مراد نہیں کر سکے گا۔ یہ میری جیت ہوگی۔

ماروی! مجھے تسکین حاصل ہوگی جب تیری آنکھوں میں آنسو نہیں ہوں گے اور تیرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوگی...... ایک عاشق کی دی ہوئی مسکراہٹ......''

☆☆☆

حشمت جلالی اپنی کوٹھی کے لان میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ بے چینی اس بات کی تھی کہ اس نے دو برس بعد ماروی کو دیکھا تو تڑپ گیا تھا۔ اس کے گوٹھ میں کھلنے والا... گلاب کانٹوں میں کھِل رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اتنے بڑے شہر میں آکر اسے جبراً حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے اپنے گوٹھ میں ہی مراد اور ماروی کے عشق کا تماشا بنا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ہاتھ میں آنے سے پہلے وہ کسی سے منسوب ہو جائے۔ اس نے چاچا کو حویلی میں بلا کر حکم دیا تھا کہ ماروی کو حویلی میں لاکر چھوڑ دے۔ اسے دس ہزار روپے دیے جائیں گے۔

اس کا خیال تھا کہ ایک غریب ہاری نے کبھی زندگی میں دس ہزار روپے نہیں دیکھے ہیں۔ وہ راضی ہو جائے گا۔ ویسے بھی راضی نہ ہوتا تو ماروی جبراً اٹھوالی جاتی۔ چاچا بظاہر راضی ہو کر گیا تھا لیکن دوسرے دن معلوم ہوا کہ وہ رات کے اندھیرے میں ماروی کو لے کر وہاں سے چلا گیا ہے اور اب دو برس بعد مراد چرائے ہوئے ہار کے ذریعے پکڑا گیا تو معلوم ہوا کہ ماروی بھی وہیں میمن گوٹھ میں رہتی ہے۔ وڈیرے کے لیے مشکل یہی تھی کہ اس کی حویلی کے غنڈے اتنے تگڑے نہیں تھے کہ کراچی جیسے شہر سے لڑکی کو اٹھا لاتے۔

وہ مراد کو قتل کے سنگین الزام میں گرفتار کرا چکا تھا۔ الزامات یہ تھے کہ اس نے وڈیرے کی بیٹی کو میلا کیا تھا پھر سونے کے زیورات چھین کر اسے موت کے گھاٹ اتار کر فرار ہو گیا تھا۔

حشمت جلالی نے یہ سودا کرنا چاہا تھا کہ ماروی کو اس کے حوالے کیا جائے تو وہ مراد کے خلاف عدالت میں نہیں جائے گا۔ لیکن مراد اور محبوب نے اس سودے پر تھوک دیا تھا اور تب سے جلالی سلگ رہا تھا۔ بار بار قسم کھا رہا تھا کہ بیٹی کے قتل کے الزام میں مراد کو پھانسی کی سزا ضرور دلائے گا۔

زلیخا کا قصہ کچھ یوں تھا کہ اس کے باپ اور دو بھائیوں نے اس کی شادی قرآن سے کرا دی تھی۔ اس جاہلانہ دستور کے مطابق زلیخا نہ کبھی کسی کی دلہن بن سکتی تھی اور نہ ہی اپنے حصے کی جائداد لے کر پرائے گھر جا سکتی تھی۔ وہ شاید صبر کر لیتی۔ اپنے جذبات کو اور فطری تقاضوں کو مار ڈالتی۔ لیکن حویلی میں کبھی کبھی اپنے باپ اور بھائیوں کو دیکھتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی خوشی کے موقع پر شہر سے طوائفیں بلاتے تھے۔ مجرا سنتے اور راتیں کالی کرتے تھے، اور تو اور حویلی کی نوکرانیوں کو بھی کھلونا بناتے رہتے تھے۔

زلیخا نے چھپ چھپ کر وہ شرمناک تماشے دیکھے بھی تھے۔ اس کے اندر چپ چاپ آگ جلتی رہتی تھی۔ حویلی میں سب کچھ تھا' آگ بجھانے والا پانی نہیں تھا۔

وہاں صرف منشی مراد علی منشی کھاتہ لکھنے آتا تھا۔ وہ چھپ کر اسے دیکھتی رہتی تھی۔ دل اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ وہ ایسے آتش شوق کا انجام سمجھتی تھی کہ پکڑی جائے گی تو اس غریب منشی کے ساتھ بے موت ماری جائے گی۔

اس نے کچھ عرصہ تو برداشت کیا لیکن زیادہ نہ کر سکی۔ فصل کی کٹائی کے وقت مراد حساب کتاب کے لیے راتوں کو بھی حویلی کے ایک دور اُفتادہ حصے میں رہتا تھا۔ وہ ایک رات اس کے پاس آگئی۔

حویلی کا نوکر کبھی اسے ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ حویلی کی اتنی اونچی ہستی کو چھونے کا انجام جانتا تھا مگر زلیخا سلگ رہی تھی۔ آگ نہ بجھتی تو مر جاتی۔ وہ بھی مجبور تھی۔

اس نے دھمکی دی اور کہا۔ ''میں جو کہتی ہوں مان لو۔ ورنہ ابھی شور مچاؤں گی کہ تم میری عزت لوٹنا چاہتے ہو۔ پھر سوچو' تمہارا انجام کیا ہوگا؟''

انجام ظاہر تھا۔ وہ گناہ گار نہ بنتا تب بھی اونچی حویلی میں بدکاری کا الزام اُٹھاتا اور بے موت مارا جاتا۔ وہ مجبور ہو گیا۔ مالک کی بیٹی جو چاہتی تھی' وہ کرنا پڑا۔ اس نے جانے سے پہلے سونے کا ہار اُتار کر اسے دیا اور کہا۔ ''حوصلہ کرو گے تو تمہیں سونے میں تول دوں گی۔ میرے پاس لاکھوں روپے کے زیورات ہیں۔ مجھے یہاں سے لے چلو۔''

وہ اس کے منہ پر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ چپ رہا۔ وہ

بول رہی تھی۔ ''ہم شہر جا کر کچہری میں شادی کر لیں گے تو میرے بابا اور بھائی قانون کے خلاف ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

وہ بولا۔ ''آپ جانتی ہیں۔ سائیں اور ان کے بیٹے کسی قانونی جھگڑے میں نہیں پڑیں گے۔ ان کے غنڈے چپ چاپ ہمیں گولی مار کر چلے جائیں گے۔''

وہ بولی۔ ''ہمارے پاس دولت ہوگی۔ کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ ہم انسانوں کے سمندر میں چھپ جائیں گے۔''

''میں اپنی ماروی کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ آپ کوئی اور بات منوالیں۔ یہ بات نہیں مانوں گا۔''

زلیخا نے اسے گھور کر دیکھا۔ پھر کہا۔ ''میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ لیکن یاد رکھو، تم اسی طرح ملتے رہو گے۔ ڈرو گے تو مرو گے۔ میں کل رات پھر آؤں گی۔''

وہ اپنا فیصلہ سنا کر چلی گئی۔ مراد نے اسی لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ مجبوری میں ایک بار غلطی ہوگئی ہے۔ جسے وہ اب دہرانا نہیں چاہتا تھا۔ ماروی کے حقوق وہ زلیخا کو نہیں دے گا۔ وہ پہلے ہی چاچا چاچی کے ساتھ جا چکی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ جلد ہی وہ بھی گوٹھ چھوڑ کر چلا آئے گا۔

حالات نے اسے مجبور کیا تو اسی رات اس کا باپ مختصر سا سامان لے کر چلا گیا۔ دوسرے دن شام ہوتے ہوتے وہ بھی وہاں سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ نہیں جانتا کہ زلیخا پر کیا گزری؟

زلیخا کو ایک رات کی مسرتوں نے سرشار کر دیا تھا۔ وہ برسوں صحرا میں پیاسی رہنے کے بعد بارش میں بھیگی تھی۔ اس کی پیاس اور بڑھ گئی تھی۔ وہ ایک غریب مُنشی کے لیے پاگل ہو رہی تھی۔

مراد دوسری رات نہیں آیا تو وہ باؤلی ہو کر بار بار زنان خانے سے نکل کر اسے ڈھونڈنے لگی۔ حقیقتاً وہ بڑی شرم والی تھی مگر باپ اور بھائیوں نے اسے بے حیا بنا دیا تھا۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ مراد گوٹھ سے چلا گیا ہے۔ وہ رو پڑی۔ ایک غریب ماروی کتنی خوش نصیب تھی۔ مراد اس کی خاطر حویلی کی شہزادی کو چھوڑ کر اور لاکھوں روپے کی پیشکش کو ٹھکرا کر کبھی نہ آنے کے لیے چلا گیا تھا۔ زلیخا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نامراد نہیں رہے گی۔ کسی اور مراد کو اپنے مقصد کے لیے ہموار کرے گی پھر حویلی کو چھوڑ کر، تمام رشتوں کو توڑ کر اس کے ساتھ کہیں چلی جائے گی۔ اس نے یہی کیا۔ حویلی میں قید رہنے کے باوجود ایک رازدار ملازمہ کے ذریعے ایک نوجوان کھیت مزدور کو آشنا بنا لیا۔ وہ اسے حویلی سے بھگا لے جانے پر راضی ہو گیا تھا۔

بہت سے گناہ چھپ جاتے ہیں اور کچھ اچانک ہی ظاہر ہو جاتے ہیں۔ مراد کے جانے کے دوسرے مہینے ہی زلیخا کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ یہ بات حویلی کی ایک بڑھیا سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے حشمت جلالی کے کانوں میں یہ بے حیائی پھونک دی۔

وہ غصے سے طنطناتا ہوا زلیخا کے حجرے میں آیا تو وہ جا چکی تھی۔ چڑیا پُھر ہو گئی تھی۔ اس کی الماری اور سیف کو کھول کر دیکھا گیا تو وڈیرے کے حساب سے وہ زیورات کی صورت میں لاکھوں روپے سمیٹ کر لے گئی تھی۔

اس نے اپنے حواریوں اور غنڈوں کو حکم دیا۔ ''اسے رازداری سے تلاش کرو۔ ہماری بدنامی نہ ہو۔ وہ زندہ پکڑ میں نہ آئے تو اس کے یار کے ساتھ اسے قتل کر دو۔ اس کی لاش دنیا کو دکھائی جائے گی تب ہی ثابت ہوگا کہ ہم غیرت مند ہیں۔''

حواری اور غنڈے اس کی تلاش میں نکل گئے لیکن دوسری صبح ناکام واپس آئے۔ جوان بیٹوں نے باپ سے کہا۔ ''اگر ہم نے پولیس کو زلیخا کی لاش نہ دکھائی تو شرم سے مر جائیں گے۔''

دوسرے بیٹے نے کہا۔ ''ہمارے پیچھے کہا جائے گا کہ ہماری بہن بدکار تھی۔ کسی کے ساتھ منہ کالا کر کے چلی گئی۔ توبہ توبہ ہم کسی کو منہ نہیں دکھا سکیں گے۔''

''ہم اسے کہاں ڈھونڈیں؟ اگر اسے قتل نہ کیا، اس کی لاش نہ دکھائی تو سر اُٹھا کر نہیں چل سکیں گے۔''

حشمت جلالی بیٹوں کی باتیں سن رہا تھا اور دور تک سوچ رہا تھا۔ اس نے بیٹوں کو قریب بلا کر رازداری سے کہا۔ ''ہماری ملازمہ رانی کی جسامت اور قد زلیخا جیسا ہے۔''

دونوں بیٹوں نے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ ایک ملازمہ کی جسامت اور قد ان کی بہن جیسا ہے تو کیا ہوا؟

ایک بیٹے نے پوچھا۔ ''کرنا کیا ہے؟''

باپ نے کہا۔ ''اسے زلیخا کا لباس پہناؤ۔ بدن پر زیور نہ رہے۔ صرف ایک انگلی میں انگوٹھی رہے۔ ہم بیان دیں گے کہ زلیخا جس کے ساتھ حویلی سے بھاگ رہی تھی۔ اس شخص نے کھیتوں میں پہنچ کر پہلے اس کی عزت لوٹی پھر اسے قتل کر کے اس کے تمام زیورات لے گیا۔''

بیٹوں نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ باپ کی بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی۔ ایک نے پوچھا۔ ''لیکن قتل کے بعد بھی وہ نوکرانی رہے گی۔ اسے زلیخا کیسے ثابت کریں گے؟''

''قتل کے بعد تیزاب سے اس کی صورت بگاڑ دو۔ ہم باپ بیٹے اس کے لباس کو اور انگوٹھی کو پہچان کر یقین سے کہیں گے کہ وہ زلیخا ہے۔ ہمارے بیانات اور تمام حالات کے پیش نظر قانون کے محافظ اسے زلیخا تسلیم کر لیں گے۔''

انہوں نے پھر ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلایا۔ دوسرے بیٹے نے پوچھا۔ ''اور اگر بعد میں کہیں زلیخا پکڑی گئی تو؟''

''تو ہم ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر اسے گولی مار دیں گے۔''

''اور اگر ہماری نظروں میں آنے سے پہلے پولیس نے اسے ڈھونڈ نکالا تو؟''

''تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ وڈیروں کے علاقوں میں ایسی کون سی پولیس اور تھانہ ہے، جہاں ہمارا سکہ نہیں چلتا۔ انہیں خرید لیا جائے گا۔ زلیخا کو کوئی بیان دینے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے گا۔ ہمارے گوٹھ سے دو نوجوان کہیں چلے گئے ہیں۔ ایک تو مراد ہے اور دوسرے کا نام جمال ہے۔ دونوں میں سے کسی ایک کو قاتل ثابت کیا جائے گا۔''

ایک بیٹے نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بابا جانی! یہ تو لاکھوں روپے کا آئیڈیا ہے۔ پہلے میں رانی کو خراب کروں گا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''تم ایسے معاملے میں فوراً اُچھل کر آگے چلے آتے ہو۔ میں کہہ دیتا ہوں، میری نیت اس پر بہت پہلے سے تھی۔ پہلے میں اس کے پاس جاؤں گا۔''

باپ دونوں کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کتوں کی طرح کیوں لڑ رہے ہو؟ کیا میں بوڑھا ہو گیا ہوں، جو میرے سامنے جوانی دکھا رہے ہو؟''

اس نے تنبیہی کے انداز میں انگلی دکھا کر کہا۔ ''خبردار... !تم دونوں رانی سے دور رہو گے۔''

وہ دونوں جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ بے بسی سے باپ کو دیکھا۔ شیر کے آگے بکرے کچھ بول نہیں سکتے تھے۔ منصوبے کے مطابق رانی کو زلیخا کا ایک لباس پہنایا گیا۔ اسے یہ خوش خبری سنائی گئی کہ وڈیرا حشمت جلالی اس پر مہربان ہو گیا ہے۔ اب اس کی تنخواہ بڑھا دی گئی ہے۔

منہ زوروں کے سامنے بے غیرتی سمجھ میں نہیں آتی۔ رانی کو اس کی بیٹی کا لباس پہنایا گیا۔ جو لباس بیٹی کے بدن پر رہا کرتا تھا، اسے پہنا کر اس سے منہ کالا کیا۔ کوئی شرم اور غیرت نہیں تھی۔ ایسے وقت خدا کا ایک ذرا خوف نہیں رہتا۔

اس کے بعد حواریوں نے اس کے منہ پر پٹی باندھی۔ پھر اسے اُٹھا کر کھیتوں میں لے گئے کہ جیسے یہ معمول کا کام ہو۔ بڑے آرام سے اس کی زندگی چھین کر اس کے چہرے پر تیزاب اسپرے کر دیا۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ یہاں کسی بے گناہ اور مجبور کی زندگی چھین لینا کوئی صدمہ کی بات نہیں رہی۔ دولت اور قانون کے محافظوں نے اسے قاتلوں کے لیے آسان بنا دیا ہے۔

دوسری صبح پولیس نے کھیت میں آ کر وہ لاش دیکھی جس کی صورت پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ انہوں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے شہر بھیج کر باپ بیٹوں کے بیانات لیے۔ چور دروازے سے رشوت لی اور وڈیرے کے عین مقاصد کے مطابق اپنی رپورٹ لکھ کر فائل بند کر دی۔ یہ لکھ دیا کہ مفرور قاتل کو تلاش کیا جا رہا ہے۔

دو برسوں تک حشمت جلالی مطمئن رہا۔ وہ دنیا کے سامنے بیٹی کی لاش پیش کر کے یہ ثابت کر چکا تھا کہ وہ کسی یار کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ اس یار نے اسے کھیتوں میں لے جا کر مار ڈالا۔ یوں بہت بڑی بات کو بڑی آسانی سے ختم کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد قاتل کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ اسے تلاش کرنے میں خواہ برسوں لگ جاتے۔ ایک بیٹی کے باپ نے اور ایک بہن کے بھائیوں نے غیرت کے تقاضے پورے کر دیے تھے۔

وہ باپ بیٹے کبھی مراد کو اور کبھی جمال کو زلیخا کا قاتل کہتے تھے اور کہتے تھے، ان میں سے جو گرفتار ہوگا۔ اس سے پولیس اپنے طریقے سے سچ اگلوائے گی۔ جلالی نے پہلی بار محبوب علی چانڈیو کو قومی اسمبلی میں دیکھ کر کہا تھا۔ ''آپ بُرا نہ مانیں۔ آپ کو دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی بیٹی کے مفرور قاتل کو دیکھ رہا ہوں۔''

محبوب نے ناگواری سے پوچھا۔ ''کیا میں صورت سے قاتل بدمعاش لگتا ہوں؟''

''آپ ناراض نہ ہوں، آپ اس قاتل کے ہم شکل ہیں۔ سر سے پاؤں تک مراد علی منگی دکھائی دیتے ہیں۔ کیا آپ کا کوئی جڑواں بھائی بھی ہے؟''

''نہیں۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''مراد کی کوئی تصویر ہمارے پاس نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو ہم اسے تمام تھانوں میں پہنچا دیتے پھر پولیس آپ کو مراد سمجھ کر گرفتار کر لیتی۔''

''کسی کا باپ بھی مجھے گرفتار نہیں کر سکے گا اور نہ ہی میری تصویر کسی تھانے میں لگا سکے گا۔''

اس کے بعد بھی ان دونوں کی ملاقات کئی بار اسلام

آباد میں ہوئی۔ محبوب نے اس وڈیرے کو کبھی منہ نہیں لگایا لیکن بدلتے ہوئے حالات خود ہی اسے منہ لگنے کے لیے یسین گوٹھ کے تھانے میں لے آئے تھے۔

اتنا کچھ ہونے کے بعد زلیخا اپنے باپ کے دماغ کا پھوڑا بنی ہوئی تھی۔ یہ صرف باپ اور دو بیٹے جانتے تھے کہ وہ زندہ ہے اور اپنے یار جمال کے ساتھ کہیں چھپی ہوئی ہے۔ جسے مرجانا چاہیے تھا وہ کہیں چھپ کر اندیشے پیدا کر رہی تھی کہ کسی دن بھی سامنے آجائے گی تو باپ اور بھائیوں کا جھوٹ کھل جائے گا۔

پھر مقدمہ ہارنے والی بات یہ ہوگی کہ جسے قتل کیا گیا تھا۔ وہ نہ تو حشمت جلالی کی بیٹی تھی اور نہ ہی مراد کے خلاف کوئی ثبوت ملے گا کہ اس نے کسی عورت کو کھیت میں لے جا کر قتل کیا ہے۔

یوں مراد بڑی آسانی سے باعزت طور پر بری کردیا جائے گا۔ جلالی ہر پہلو سے مات کھائے گا۔

وہ بہ ظاہر ایک وڈیرے کی فطرت کے مطابق اکڑتا تھا لیکن بہ باطن پریشان رہتا تھا۔ بیٹی نے گم ہوکر اس کا سکون برباد کردیا تھا۔ وہ خیالوں میں آکر کہتی تھی۔ ”بابا جانی! تو نے نہ تو مجھے قتل کیا ہے اور نہ ہی اپنی غیرت مندی کا ثبوت دے پائے گا۔ نہ ماروی کو حاصل کرسکے گا اور نہ مراد کو پھانسی کے تختے تک پہنچا سکے گا۔“

اس نے پریشان ہوکر دونوں بیٹوں کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ دونوں گوٹھ کے معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اس لیے باپ کے ساتھ کراچی نہیں آئے۔ ایک بیٹے نے پوچھا۔ ”جی بابا جانی! کیا مراد گرفتار ہوگیا؟“

”وہ تو ہوگیا ہم اسے چھوٹنے نہیں دیں گے لیکن تمہاری بہن کی گمشدگی پریشان کررہی ہے۔ ہمارے آدمی اسے دو برسوں سے تلاش کررہے ہیں۔ آخر وہ کہاں مرگئی ہے؟“

”بابا جانی! ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ کسی دوسرے ملک میں جمال کے ساتھ رہتی ہے۔“

”وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں ہو۔ اسے ڈھونڈ کر جہنم میں پہنچانا ہوگا۔ وہ کمبخت زندہ رہے گی تو ہم مقدمہ ہار جائیں گے۔ بدنامی الگ ہوگی۔ ہمارے سر جھک جائیں گے۔“

”بابا جانی! ہم زمینوں کے معاملے میں ایسے الجھے رہتے ہیں کہ یہاں سے دو سو میل دور کراچی شہر بھی سال میں ایک دو بار چلے جاتے ہیں۔ اسے ڈھونڈنے کے لیے دوسرے ملکوں میں نہیں جاسکیں گے۔ ہمارے تابعدار اور جاسوس جاہل گنوار ہیں۔ اپنے گوٹھوں کے شیر ہیں۔ باہر بھیگی بلی بن جائیں گے۔“

بیٹا درست کہہ رہا تھا۔ جلالی نے مایوس ہوکر فون بند کردیا۔ فی الحال خیریت تھی۔ دل کہہ رہا تھا زلیخا حرام موت مرنے نہیں آئے گی۔ جہاں چھپی ہوئی ہے وہاں سے کبھی نہیں نکلے گی۔

اس نے دل کو سمجھایا۔ ”تیسرا برس گزر رہا ہے۔ اسے اپنی زندگی پیاری ہے۔ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اسے اپنی سلامتی عزیز ہوگی۔ وہ کبھی ادھر نہیں آئے گی۔“

دوسرے دن یہ خوش خبری ملی کہ مراد کی ضمانت منظور نہیں ہوئی ہے۔ جب تک کسی قاتل کا کیس کمزور نہیں ہوتا تب تک اسے پنجرے میں ہی رکھا جاتا ہے۔

ماروی کو معلوم ہوا کہ مراد نہیں آئے گا تو وہ پھر تھانے میں آئی۔ وہ سلاخوں کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہ ماروی کو دیکھ کر اٹھ گیا۔ سلاخوں کے پاس آکر بولا۔ ”میں نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ کیا تُو نے کھالیا؟“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”حلق سے پانی کی بوند نہیں اتر رہی ہے کھانا کیسے اترے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ تُو نے قتل نہیں کیا پھر تیری ضمانت منظور کیوں نہیں ہورہی ہے؟“

”تم نہیں سمجھو گی۔ یہ قانونی پیچیدگیاں ہیں۔ پہلے ہمارا وکیل ثابت کرے گا کہ میرے خلاف جو الزام ہے وہ کمزور ہے۔ تب ضمانت ہوگی۔

سائیں محبوب مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرسکتے ہیں مگر ذرا صبر کرنا ہوگا۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا ہوگا۔“

ایسے وقت محبوب آگیا۔ ماروی اس کے ذہن پر سوار تھی۔ اس نے خیالی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ مراد کی جدائی میں بھوکی پیاسی ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اسے مراد ہی کھلائے گا تو وہ کھائے گی اور وہ مراد سے ملنے وہاں ضرور آئے گی۔

اسی لیے وہ فائیو اسٹار ہوٹل سے اتنا کھانا لایا تھا کہ انسپکٹر اور اس کے سپاہی بھی کھاسکتے تھے۔ اتنا مہنگا اور لذیذ کھانا انہیں کبھی نصیب نہ ہوتا۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

سلاخوں والا دروازہ کھول دیا گیا۔ ماروی کو مراد کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ حوالات میں بیٹھ کر کھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ضمانت منظور نہ

ہونے کی وجہ سے دل ڈوب رہا تھا۔ وہ ایک دانہ منہ میں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔

مراد نے کہا۔ ”ایسے ہی وقت حوصلے سے کام لیا جاتا ہے۔ خدا پر پورا بھروسا کیا جاتا ہے۔ حوصلہ نہیں کرو گی۔ کھانے سے انکار کرو گی تو میں بھی بھوکا رہوں گا۔“

ماروی نے روٹی توڑ کر سالن میں بھگو کر اسے مراد کی طرف بڑھایا۔ مراد نے بھی یہی کیا۔ پہلے اس نے ماروی کے منہ میں لقمہ دیا۔ پھر ماروی نے اسے کھلایا۔ محبوب حوالات سے باہر دیوار کی آڑ میں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

عشق جادو ہے تو ان لمحات میں اس پر عجیب سا سحر طاری ہوگیا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ خود حوالات کے ننگے فرش پر بیٹھا ہے اور اپنی ماروی کو اپنے ہاتھ سے بڑے پیار سے کھلا رہا ہے۔

وہ چاہتا تھا دلبر کی آنکھ میں آنسو نہ آئیں اور نہیں آرہے تھے۔ وہ مراد کی رہائی کے لیے جی جان سے کوششیں کرتا ہوا معشوق کے آنسو پونچھ رہا تھا۔

یہی محبت ہوتی ہے۔ یار کسی کا ہو مگر ہم یار کے ہوں۔
وہ ہمیں نہ دیکھے ہم اسے دیکھتے رہیں۔
وہ کسی کے ہاتھ سے کھائے پر ہماری ہی خوراک کھائے۔

اسے معلوم نہ ہو راہ میں کانٹے ہیں اور دیوانے عاشق نے کانٹوں پر اپنی ہتھیلیاں بچھا دی ہیں۔ اب وہ لہولہو ہونے والی ہتھیلیوں پر سے بخیریت گزر رہی ہے۔

محبوب ہاتھوں میں پلیٹ لیے کھڑا تھا لیکن کھانا بھول گیا تھا۔ اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔ دور بیٹھا ہوا انسپکٹر لقمے چباتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔ دل میں کہہ رہا تھا۔ ”ایک انار ہے اور دو بیمار ہیں اور دونوں ہم شکل ہیں۔ ماروی خوش قسمت ہے۔ ایک ارب پتی سرمایہ دار اس کا عاشق ہے۔ لیکن لڑکی بہت ہی نادان ہے۔ ایسی بھی کیا نادانی کہ خوش قسمتی کو لات مار رہی ہے اور دو کوڑی کے غریب عاشق کی ہم نوالہ و ہم پیالہ بنی ہوئی ہے۔“

مراد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ”تم جانتی ہو؟ یہ تھانے والے کسی رشتے دار کو قیدی سے ملنے نہیں دیتے۔ لیکن ہم ان باتوں میں خوش قسمت ہیں۔ یہاں مل بھی رہے ہیں اور ساتھ بیٹھ کر کھا بھی رہے ہیں جیسے اپنے گھر میں ہوں۔“

وہ بولی۔ ”ہاں تھانے دار مہربان ہے۔“

”یہ سب سائیں محبوب کی مہربانی ہے۔ انہوں نے تھانیدار کی مٹھی گرم کی ہے۔ یہ میری رہائی کے لیے اور مجھے تم سے ملانے کے لیے لاکھوں روپے پانی کی طرح بہاتے رہیں گے۔“

”میں نے پہلی بار انہیں کل تھانے کے باہر دیکھا تھا۔ مجھے ایسا لگا تم میرے سامنے آگئے ہو اور وہ بھی مجھے ایسے دیکھ رہے تھے کہ میں گھبرا گئی۔ وہ تمہاری آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

مراد... ! بالکل تمہاری جیسی آنکھیں ہیں اور تمہاری طرح ہی دیکھتے ہیں۔ میں پریشان ہوگئی تھی۔“

ماروی نے سر گھما کر سلاخوں کے باہر دیکھا۔ محبوب دیوار کی آڑ میں تھا، نظر نہیں آیا۔ وہ بولی۔ ”میں باہر جاؤں گی۔ وہ پھر نظر آئیں گے۔ مجھے پھر ایسا لگے گا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو۔“

”تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی آنکھیں تمہیں میری امانت سمجھ کر دیکھتی ہیں۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہوگیا۔ دل میں بولا۔ ”پتا نہیں امانت سمجھتے ہیں بھی یا نہیں؟“

لیکن ماروی کے سامنے سائیں پر شبہ کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”اگرچہ انہوں نے صاف طور سے کہا ہے کہ وہ تمہیں چاہتے ہیں لیکن اس چاہت میں ہوس اور خود غرضی نہیں ہے اور نہ مجھ سے حسد اور رقابت ہے۔“

”لیکن وہ مجھے کیوں چاہتے ہیں؟ یہ تو جان گئی ہوں کہ ایک اچھے انسان ہیں۔ مجھے ان سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن ان کے سامنے گھبراہٹ سی ہوگی۔“

”کیوں گھبراہٹ ہوگی؟“

”وہ محبت اور ہمدردی سے پیش آئیں گے اور مجھے یوں لگے گا کہ تم آگئے ہو اور محبت سے پیش آرہے ہو۔“

”کوئی بات نہیں۔ پہلے ایک آدھ بار ایسا ہوگا۔ تم بچپن سے مجھے دیکھ رہی ہو، سمجھ رہی ہو۔ تمہیں جلد ہی وہ فرق معلوم ہوجائے گا جو میرے اور سائیں کے دیکھنے کے انداز میں ہے۔“

محبوب سر جھکائے سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”میرے لیے یہ بہت ہے کہ وہ مجھے ایک اچھا انسان سمجھتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ مجھے سچا چاہنے والا بھی سمجھے۔ مجھ سے نہ گھبرائے۔ میرے سامنے چلی آیا کرے۔“

عشق و محبت کے حوالے سے بڑی دلچسپ رنگین الجھنیں تھیں اور قتل کے مقدمہ کے حوالے سے بڑی سنگین پیچیدگیاں تھیں۔ اس کا وکیل مراد پر لگائے ہوئے الزامات

کے سلسلے میں تفصیلی معلومات حاصل کر رہا تھا۔ جلد ہی یہ بتانے والا تھا کہ کسی حد تک یہ کیس سنگین ہو سکتا ہے۔

وہ مراد اور ماروی کی خاطر اپنے کاروبار سے غافل ہو گیا تھا۔ وہ سمیرا اور مختلف شعبوں کے اہم عہدیداروں سے فون پر باتیں کرتا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ دو چار روز اس کی غیر موجودگی میں بزنس کے اہم معاملات کو سنبھالیں۔ پھر دو چار روز میں آفس آ کر اپنی ذمے داریاں نباہے گا۔

اس روز وہ اپنی کوٹھی میں آ کر تنہائی میں سوچنے لگا۔ ''میں خود کو سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ ماروی کی محبت مجھے کہاں لے جا رہی ہے۔ میں اسے دیکھتا ہوں تو اس کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

اسے تو اب تک دو ہی بار تھانے میں دیکھا ہے۔ اسے وہاں نہ دیکھتا تو کوئی فرق نہ پڑتا، وہ تو دن رات خیالوں میں رہتی ہے اور خیالوں میں ایسے نظر آتی ہے جیسے سچ مچ آ گئی ہو۔

میں پاگل ہو رہا ہوں یا پھر عاشق ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے میں ہوتا جا رہا ہوں۔ آج دو روز ہو گئے، میں نے شیو نہیں کیا ہے۔ جبکہ روز صبح کرتا ہوں۔ جاگنگ کے لیے نہیں جا رہا ہوں۔ آج صبح ناشتا کیے بغیر نکل گیا۔ نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ اسے تصور میں دیکھتا رہتا ہوں تو پیاس بجھتی رہتی ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ ملازم نے آ کر کہا۔ ''حماد صدیقی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''انہیں یہاں لے آؤ۔''

ملازم چلا گیا۔ حماد صدیقی انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ میں ایک جونیئر آفیسر تھا۔ سرکاری ملازمت کے علاوہ محبوب کے پورے بزنس سیٹ اپ کی نگرانی بھی کرتا تھا اور دھاندلی کرنے والے ملازموں کو بڑی ذہانت سے بے نقاب کر دیتا تھا۔

اس نے ڈرائنگ روم میں آ کر محبوب کو سلام کیا۔ محبوب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

وہ سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''معروف تجی صاحب نے مراد کی ہسٹری بتائی ہوگی؟''

''جی ہاں۔ یہ بتایا ہے کہ اس کا پورا نام مراد علی منگی ہے۔ وہ آپ کا ہم شکل ہے۔ جلالی گوٹھ میں رہتا تھا۔ وہاں کے وڈیرے حشمت جلالی کا منشی تھا۔ وڈیرے کی بیٹی زلیخا نے ایک رات اسے گناہ کرنے پر مجبور کیا تھا اور اپنا ایک سونے کا ہار دیا تھا۔ وہ ہار آج مراد کے گلے کا پھندا بن گیا ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''مراد نے زلیخا کو قتل نہیں کیا ہے لیکن اس پر قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ فی الحال اس کے خلاف ٹھوس ثبوت ہیں۔ وہ زلیخا سے پیچھا چھڑانے گوٹھ سے بھاگ کر آیا تھا۔ یوں ثابت ہو رہا ہے کہ وہ قتل کر کے وہاں سے فرار ہوا تھا۔ زلیخا کا ہار اس کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ وہ بہت ہی سیدھا سادا سا آدمی ہے۔ بری طرح قانون کے شکنجے میں آ گیا ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''یہ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ باپ نے اور بھائیوں نے پہلے ہماری مقدس کتاب سے بیٹی کی شادی کرائی تاکہ وہ اپنے حصے کی جائداد لے کر سسرال نہ جائے۔ پھر اسے کھیتوں میں لے جا کر قتل کر دیا۔

اگر مراد کے خلاف ثبوت ہیں تو باپ اور بھائیوں پر بھی شبہ ہے کہ انہوں نے زلیخا سے نجات پانے کے لیے کاروکاری کے ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔''

''آپ کو یہی معلوم کرنا ہے کہ باپ اور بیٹوں نے درپردہ کیا کھیل کھیلا ہے۔ میں چند دنوں میں مراد کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ یہ پورے یقین سے کہتا ہوں کہ وہ قاتل نہیں ہے۔ اس کے گوٹھ سے چلے آنے کے بعد زلیخا کو ہلاک کیا گیا ہے۔''

حماد نے کہا۔ ''قتل کے سلسلے میں ایک بات عجیب ہے کہ قاتل نے زلیخا کا چہرہ کیوں بگاڑ دیا۔ ایسا کرنا ضروری نہیں تھا۔ اسے ہلاک کر دینا ہی کافی ہوتا۔''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ یہ ایک اہم پوائنٹ ہے۔ قتل کے بعد اس کی شناخت نہ ہو سکی کہ وہ زلیخا ہی ہے۔ صرف ان باپ بیٹوں نے اور حویلی کی کچھ عورتوں نے اس کے لباس سے اور ایک انگوٹھی سے اسے پہچانا ہے۔''

''تیزاب سے بگاڑے ہوئے چہرے نے الجھا دیا ہے۔ مجھے یہ بات کھٹک رہی ہے کہ وہ زلیخا نہیں تھی۔ اس کی جگہ کسی دوسری عورت کو قتل کر کے اس کا چہرہ بگاڑا گیا ہے۔''

''حماد صاحب! میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے۔ وہاں خود جانا ہوگا۔ آپ حویلی کے ایک ایک فرد کو اور وہاں کے لوگوں کو ٹٹولتے رہیں گے تو حقیقت کھل سکتی ہے۔''

وہ کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں کل جاؤں گا۔ قاتل نے چہرہ کیوں بگاڑا تھا؟ اس کی ٹھوس وجہ بیان نہ کی گئی تو باپ بیٹے ہماری نظروں میں مشکوک رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کیس میں جو کمزوریاں ہیں وہ ہمیں معلوم ہوں گی۔ غلطیاں کرنے والے کہیں نہ کہیں ضرور پکڑے جاتے ہیں۔''

حماد صدیقی تھوڑی دیر تک کیس کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا رہا۔ پھر دوسرے دن گوٹھ جانے کے لیے وہاں سے چلا گیا۔

دوسرے دن مراد کو سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ ماروی کو معلوم ہوا کہ جیل کے قوانین بڑے سخت ہوتے ہیں۔ وہاں قیدیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔

گوٹھ میں کچھ ایسے بھی تھے جو جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ ماروی، چاچی اور چاچا ان لوگوں سے وہاں کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے، وہاں کے قانون بڑے سخت ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی کرو تو ڈنڈے پڑتے ہیں۔

ایک نے کہا۔ ''مراد تو بڑی اونچی جگہ گیا ہے۔ یہ جو ہمارے سیاست دان، حکمران اور بڑے بڑے وزیر ہیں نا، یہ بھی اسی جیل میں رہ کر آئے ہیں۔ یہاں لوگ نفرت سے کہتے ہیں کہ ہم جیل گئے تھے۔ یہ کیا جانیں کہ ہمارے جیسے عزت دار لوگ ہی وہاں اندر جاتے اور باہر آتے رہتے ہیں۔''

چاچی نے پوچھا۔ ''ہم نے سنا ہے، قیدیوں سے بڑی مشقت کرائی جاتی ہے؟''

''ہاں، وہ جو غریب چور اُچکے ہوتے ہیں۔ جو کچھ دیتے دلاتے نہیں ہیں۔ وہ تو لات جوتوں میں رہتے ہیں۔ غریب جیل میں ہوں یا جیل کے باہر ہوں۔ وہ تو ہر جگہ ٹھوکریں کھانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔''

ایک اور شخص نے کہا۔ ''مراد تو یہاں سوٹ کیسوں میں دولت بھر کے لایا ہے۔ جیل والوں کو سونے کے جوتے مارتا رہے گا تو وہاں اے کلاس میں رہے گا۔''

ماروی اور چاچی متی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں سمجھ رہی تھیں کہ محبوب ہی دولت لٹائے گا۔ وہاں مراد پر ظلم نہیں ہونے دے گا۔ ایک نے کہا۔ ''جیل والے بڑے فرعون ہوتے ہیں۔ قیدیوں کو ان کے رشتے داروں سے ملنے نہیں دیتے۔''

ماروی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر چاچی سے کہا۔ ''کیا میں اس سے مل نہیں سکوں گی؟''

چاچا نے گھر آ کر اسے تسلی دی۔ ''فکر نہ کر وہاں بھی ملاقات ہوتی ہے۔ سائیں محبوب کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ پھر دوسرے تیسرے دن اس سے تیری ملاقات کرا دیں گے۔''

ماروی گھر کے آنگن کو دیکھ رہی تھی۔ اب مراد اس آنگن میں آنے والا نہیں تھا۔ آئندہ محبوب علی کی مہربانیوں

ازدواجیات

عورتوں کے ایک گروپ سے پوچھا گیا کہ کون کون اپنے شوہر سے پیار کرتی ہے؟

سب نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔

ان سب کو ایک، ایک میسج دیا گیا کہ اپنے، اپنے شوہروں کو سینڈ کرو ''آئی لو یو''

تو ان کے شوہروں کے جواب کچھ یوں آئے؟

1۔ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟

2۔ اب کیا ہو گیا؟

3۔ پھر سے کار کہیں ماردی؟

4۔ ایکسکیوزمی؟

5۔ صرف اتنا بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں؟

6۔ نشہ تو نہیں کیا؟

7۔ اب کیا کر دیا تم نے؟ میں اس بار معاف نہیں کروں گا۔

اور سب سے اچھا جواب یہ تھا

8۔ کون ہیں آپ؟

☺☺☺

اگر شوہر اپنی بیوی کے لیے کار کا دروازہ کھولے تو سمجھ لو۔

کار نئی ہے یا بیوی نئی ہے۔

یا پھر بیوی نہیں ہے۔

☺☺☺

شوہر ایک ایسی چیز ہے جس کے سامنے چھپکلی سے ڈرنے والی بیوی

شیر بن کے گھومتی ہے۔

6 بچوں والی ایک بیوہ عورت نے 6 بچوں والے آدمی سے شادی کی۔

شادی کے بعد دونوں کے پھر 6 بچے ہو گئے۔

ایک دن گھر میں بچوں کی زبردست جنگ شروع ہو گئی۔

بیوی نے شوہر کو فون کیا، جلدی گھر آ جایئے آپ کے بچے اور میرے بچے مل کر ہمارے بچوں کو مار رہے ہیں۔

مرسلہ: رضوان تنولی گریزوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

سے ہی وہ اپنے محبوب کی صورت دیکھ سکتی تھی۔ جو نہیں ہونا چاہیے وہ ہو رہا تھا۔ وہ سائیں کی محتاج ہوگئی تھی۔ وہ خلا میں تک رہی تھی اور ان لمحات میں پہلی بار محبوب کو خیالی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ کیا کرتی' اب وہ ضروری ہوگیا تھا۔ اس کی دولت سے اور اس کی انسانی ہمدردیوں سے ہی وہ کبھی کبھی جیل جا کر اپنے مراد کا منہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ خیالی آنکھوں سے محبوب کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کبھی کسی بہانے سے مراد کی جگہ لینے کی کوشش تو نہیں کرے گا؟

یہی تو موقع ہوتا ہے' جب دامے' درمے' سخنے محبوبہ کو اپنی طرف مائل کیا جاتا ہے۔ بہت دھیرے دھیرے' بڑے سلیقے سے اسے احسانات کے بوجھ تلے دبایا جاتا ہے۔ سہارا دینے والا دور ہو جائے تو بہ آسانی اس کا سہارا بننے کا موقع مل جاتا ہے۔ اکثر ایسے حالات میں بازیاں پلٹ جایا کرتی ہیں۔ نہ چاہنے کے باوجود زندگی کے ایک خانہ سے بہک کر' بھٹک کر دوسرے خانے میں جانا پڑتا ہے۔

جب ہم نہیں ہوتے تو ہمارا جام کسی اور کے نام ہوجاتا ہے۔

ابھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ مراد کے لیے ماروی کا پیار بدلنے والا نہیں تھا اور محبوب کی نیکی اور شرافت کہہ رہی تھی کہ وہ امانت میں خیانت کرنے والوں میں سے نہیں ہے۔ یہ تو مقدر کے فیصلے ہوں گے جو شطرنج کی بساط پر مہروں کو اٹھا کر اِدھر سے اُدھر کریں گے۔ زندگی کے رنگین و سنگین سفر میں محض راستے ہی نہیں بدلتے۔ منزلیں بھی بدل جاتی ہیں۔

☆☆☆

محبوب چار دنوں کے بعد اپنے آفس میں آیا۔ سمیرا نے شکایت کی۔ "آپ تو صرف مجھے ہی نہیں' پورے بزنس کو بھی بھول گئے تھے۔ میں کال کرتی تھی۔ آپ کبھی کبھی کال اٹینڈ کرتے تھے پھر مختصر سا جواب دے کر فون بند کر دیتے تھے۔"

وہ اپنی ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کچھ ایسی مصروفیات تھیں کہ پہلے ان سے نمٹنا ضروری تھا۔"

وہ میز کی دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کیا وہ مصروفیات ختم ہوگئیں؟"

"نہیں۔ زندگی ختم ہوجاتی ہے۔ کام ختم نہیں ہوتے۔ ایک کے پیچھے دوسرے کئی کام نکل آتے ہیں۔"

"میری اشتہاری فلم تیار ہو چکی ہے۔ بڑی فنٹاسٹک کمرشل ہے۔ آپ دیکھنا چاہیں گے؟"

"ہاں۔ تم میری دست راست کی حیثیت سے بزنس کی نگرانی کر رہی ہو۔ معروف صاحب تمہاری بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔ تم رپورٹ دو کہ میری عدم موجودگی میں کیا ہوتا رہا ہے۔"

وہ پچھلے ایک ہفتے کی رپورٹ پیش کرنے لگی۔ لیکن محبوب کا ذہن پوری طرح حاضر نہیں تھا۔ رہ رہ کر ماروی کی طرف خیال جاتا تھا کہ مراد نہیں ہے۔ وہ اکیلی ہوگی۔ وہ تنہائی میں تصور کی آنکھ سے اسے دیکھتی ہوگی تو گویا مجھے بھی دیکھتی ہوگی۔ ایک جیسی صورت کو الگ الگ نہیں کر پاتی ہوگی۔

یہ ایسا خوش کن خیال تھا کہ وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ سمیرا نے اسے دیکھا پھر کہا۔ "آپ ذہنی طور پر حاضر نہیں ہیں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں جو تم بول رہی ہو' سن رہا ہوں۔ سمجھ رہا ہوں۔ آگے بولو؟"

"آگے کیا بولوں۔ میں نے کمپیوٹر آن کیا ہے۔ نئے ملبوسات کی اشتہاری فلم دکھا رہی ہوں اور آپ سر نہیں اٹھا رہے۔ ایسا لگ رہا ہے' میری کسی حماقت پر مسکرا رہے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تم سے کوئی حماقت نہیں ہوئی ہے۔ میں تو بس یوں ہی مسکرا رہا تھا۔"

اس نے سر گھما کر کمپیوٹر کی اسکرین کو دیکھا۔ وہاں سمیرا اسی نئے لباس میں کیٹ واک کر رہی تھی' جو ماروی موئنجودڑو میں پہن چکی تھی۔ وہ بہت ہی حسین اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ محبوب نے ماروی کو دوربین سے دیکھا تھا۔ ابھی وہ اسکرین پر نگاہوں کے سامنے نہیں آئی تھی۔

سمیرا نے اچانک اسکرین کا منظر بدل دیا۔ ماروی اسی نئے لباس میں نظر آنے لگی۔ وہ بولی۔ "میں نے اپنی اور ماروی کے فلمی شاٹس کو مکس کیا ہے۔ تاکہ ایک بار میں دکھائی دوں۔ دوسری بار ماروی نظر آئے تو آپ دونوں کا موازنہ کر سکیں۔"

وہ نہ کہتی۔ تب بھی وہ خاموشی سے دونوں کا فرق دیکھ رہا تھا۔ سمیرا یوں بھی خوبصورت تھی۔ چیختے ہوئے کمرشل میک اپ کے باعث اس کا حسن شعلہ جوالہ ہوگیا تھا۔ وہ آفتاب کی طرح دمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنی فیلڈ میں ایک کامیاب ماڈل تھی۔

ماروی نے ایسا میک اپ نہیں کیا تھا اور نہ سورج کی طرح نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ جب وہ اسکرین پر آئی تو سورج بجھ گیا۔ چاند نکل گیا۔ یکبارگی چاندنی کی ٹھنڈک اور نرمی و لطافت کا احساس ہونے لگا۔ وہ دم بخود سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ جیسا قدرتی حسن اسکرین پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس

سے بھی سوا نظر آرہا تھا۔ سمیرا اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ خاموش ہیں؟"

وہ چونک کر بولا۔ "آں۔ ہاں میں سمجھتا ہوں۔ یہ دونوں اشتہارات اپنی اپنی جگہ زبردست ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے سمیرا کہ تم بہت ہی پُرکشش ماڈل ہو۔ اپنی فیلڈ کی ملکۂ عالیہ ہو۔ میں تمہارا مقابلہ ماروی سے نہیں کروں گا۔"

وہ بولی۔ "آپ کر ہی نہیں سکیں گے۔ کیونکہ یہ دوڑنے بھاگنے' شور مچانے اور شعلوں کی طرح بھڑکنے والوں کا دور ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ مان لیں کہ میں جس طرح بھڑکنے اور بھڑکانے والے انداز میں ڈسپلے ہو رہی ہوں' اس کے آگے قدرتی سادگی ماند پڑ گئی ہے۔"

"میں مانتا ہوں' ہمارے نئے ملبوسات شوخ اور بھڑکیلے ہیں۔ تمہاری جیسی ماڈلز ہی ان کی نمائش کر سکتی ہیں۔ ہماری کاروباری دنیا میں ماروی کی سادگی اور اس کے حسن کی بے قدری ہوگی۔ لہٰذا اس کی تمام اوریجنل ریکارڈ کی ہوئی فلمز اور ماسٹر کاپی مجھے لا کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ ایک غریب لڑکی کی تصویریں پرائے ہاتھوں میں پڑیں۔"

"یہ تمام چیزیں آپ کے پاس پہنچ جائیں گی۔ آپ اور کوئی سوال کرنا چاہیں گے؟"

"تھینکس۔ تم نے تفصیلی رپورٹس پیش کی ہیں۔ تم نے ایک ہفتے کے اندر اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "شکریہ۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ پرسنل گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔"

وہ ذرا ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "گفتگو کے جس حصے پر اعتراض ہوگا' میں ٹوک دوں گا۔ تم مائنڈ نہ کرنا۔"

وہ دھیمی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "میں مائنڈ نہیں کروں گی۔ میں نے سنا ہے' آپ کا ایک ملازم مراد علی منگی ہے اور وہ ہوبہو آپ کے جیسا ہے؟"

محبوب نے کہا۔ "مجھ سے کیا پوچھتی ہو؟ تم اس کا نام بھی جانتی ہو۔ اس کے ساتھ میری دلچسپی بھی جانتی ہو۔ اور یہ ساری معلومات تمہیں تجلی صاحب نے پہنچائی ہیں۔"

"آپ درست سمجھ رہے ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں۔ مجھے کچھ آگے پوچھنا چاہیے یا نہیں؟"

"یہ عورت کی مجبوری ہے۔ اس کے پیٹ میں بات ہو اور وہ اسے نہ نکالے تو سکون سے رہ نہیں پاتی۔ تمہارے ذہن میں ماروی کے متعلق مروڑ پڑ رہے ہیں۔"

"یہ صرف میرے اندر ہی نہیں' ہمارے اسٹاف میں بھی کانا پھونسی ہو رہی ہے۔ طرح طرح کی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔"

"مثلاً کیسی باتیں؟"

"یہی کہ آپ ماروی میں دلچسپی لے رہے ہیں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو؟"

"میرا خیال ہے۔ آپ کا اور اس کا معیار زندگی بالکل ہی مختلف ہے۔ وہ زمین ہے اور آپ آسمان ہیں۔ بہت زیادہ نیچے جھکنا نہیں چاہیں گے۔ آپ کی پرسنلٹی ڈیمج ہوگی۔"

"درست سمجھ رہی ہو۔ تجلی صاحب تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ میرے متعلق تم سے بہت سی باتیں کرتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ بزرگ مجھے ایک باپ کی طرح چاہتے ہیں۔ آپ کے متعلق کہتے ہیں......"

وہ بولتے بولتے رُک گئی۔ محبوب نے کہا۔ "کہتے کہتے رُک گئیں۔ سسپنس پیدا کر رہی ہو؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی ذات سے بےپروا رہتے ہیں۔ آپ کو ایک اچھی شریک حیات کی ضرورت ہے اور آپ ایسی اہم ضرورت کو نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ سمیرا میز پر رکھے ہوئے بال پوائنٹ سے کھیلتے ہوئے انتظار کرنے لگی کہ وہ اب تب میں جواب دینے والا ہے۔ وہ ایک فائل کھول کر اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھا۔ "آپ نے جواب نہیں دیا؟"

وہ جیسے خیالات سے چونک گیا۔ اس نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر پوچھا۔ "کس بات کا جواب؟"

"یہی جو تجلی صاحب کہتے ہیں' آپ کی زندگی میں ایک شریک حیات کو آنا چاہیے۔"

اس نے کہا۔ "تجلی صاحب کہتے ہیں۔ میں تو نہیں کہتا۔ جس دن کہوں گا' شریک حیات آجائے گی۔"

سمیرا کو جواب ملا لیکن توقع کے مطابق نہیں ملا۔ محبوب کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ شادی کے سلسلے میں بات کرنے سے کترا رہا ہے۔ اسی وقت کالنگ ٹون نے مخاطب کیا۔ محبوب نے نمبر پڑھے پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ "یس مسٹر حماد! کیا خبر ہے؟ کیا وہاں پہنچ گئے؟"

حماد کی آواز سنائی دی۔ "میں جلالی گوٹھ سے ہی بول رہا ہوں۔ میں نے حشمت جلالی اور اس کے دونوں

بیٹوں کو فون پر اطلاع دیدی تھی کہ زلیخا مرڈر کیس کی تحقیقات کے لیے آرہا ہوں۔لہٰذا ان سب کو حویلی میں موجود رہنا چاہیے۔“

”کیا وہ موجود ہیں؟“

”انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ کا بندہ ہوں۔وہ کیسے موجود نہیں رہیں گے۔ابھی میں ان کی بیٹھک میں ہوں۔ملازم نے کہا ہے' ابھی وہ تینوں حاضر ہونے والے ہیں۔“

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔”اس سے پہلے میرے سامنے پھل اور میوے پیش کیے گئے ہیں۔“

محبوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔”چلیں خوب کھائیں۔موج کریں مجھے امید ہے آپ وہاں سے بہت سی اہم معلومات حاصل کرسکیں گے۔“

اس نے کہا۔”اچھا سر...!یہ حضرات آگئے ہیں۔میں پھر کسی وقت آپ کو کال کروں گا۔“

حشمت جلالی اپنے دو جوان تگڑے بیٹوں کے ساتھ بیٹھک میں آگیا تھا۔تینوں نے اسے سلام کیا۔حماد نے اپنا کارڈ نکال کر حشمت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔”سنا ہے' آپ پڑھنا نہیں جانتے پھر بھی دیکھ لیں۔یہ انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ کا کارڈ ہے۔“

حشمت نے خوش آمدانہ انداز میں کہا۔”پڑھنا کیا ہے جناب!باہر آپ کی گاڑی پر لکھا ہے اور آپ کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ مجرموں کی گردنیں دبوچنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔“

ایک بیٹے نے کہا۔”یہ موسم کے تازہ پھل ہیں۔آج ہی آئے ہیں۔شوق فرمائیں۔“

حماد نے کہا۔”وہ تو فرما رہا ہوں۔وڈیروں کے یہاں قتل یا ڈکیتی ہوجائے تو ہمیں کھانے کو خوب ملتا ہے۔“

حشمت نے کہا۔”آپ حکم کریں گے تو کھانے کے اوپر اور بہت کچھ ملے گا۔اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ہاں اور اگر کچھ پینے پلانے کا شوق ہو تو...؟“

حماد نے اپنا کان پکڑ کر کہا۔”یہ شوق نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں' ہماری خواہش ہے' آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ نوش فرمائیں۔“

”چلیں کچھ کام کی باتیں ہوجائیں۔میں نے مقدمہ کی فائل پڑھی ہے۔مراد اور آپ کی بیٹی زلیخا کے درمیان جو کچھ ہوا' اس کی تفصیل فائل میں نہیں ہے اور نہ ہی ہوسکتی ہے۔اندر کی باتیں تو آپ باپ اور بیٹے ہی بتا سکتے ہیں۔“

ایک بیٹے نے کہا۔”باتیں وہی ہیں' جو ہم نے اپنے وکیل کو بتائی ہیں اور وہ سب باتیں فائل میں ہیں۔اگر اور کوئی پوچھنے کی بات رہ گئی ہو تو ہم جواب دینے کے لیے حاضر ہیں۔“

حماد نے کہا۔”مراد سے بھی سوالات کیے گئے ہیں۔اس نے ایک سوال کے جواب میں کہا ہے کہ جب وہ گوٹھ چھوڑ کر کراچی گیا تو اس وقت زلیخا زندہ تھی۔اس نے حویلی کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے چھت پر دیکھا تھا۔“

”وہ اپنا جرم چھپانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔میری بیٹی لاکھوں روپے کے زیورات لے کر اس کے ساتھ بھاگنے والی تھی۔لیکن اس ذلیل کمینے نے کھیتوں میں اسے لے جاکر اس کے ساتھ زیادتی کی۔اس کے منہ پر تیزاب پھینکا پھر اسے قتل کرکے تمام زیورات لے کر فرار ہوگیا۔“

”سب سے اہم سوال یہ کہ اس نے زلیخا کی صورت تیزاب سے کیوں بگاڑ دی۔وہ تو ہلاک ہونے کے بعد نہ اس کے خلاف بولتی۔نہ اس کھیت میں اس کی لاش پہچانی جاتی تو قاتل کو کوئی نقصان پہنچتا۔اس نے پہچان کیوں بگاڑ دی؟“

تینوں باپ بیٹوں نے ایک دوسرے کو ذرا پریشان ہوکر دیکھا۔پھر باپ نے کہا۔”ہم کیا کہہ سکتے ہیں کہ قاتل نے کیا سوچ کر اس پر تیزاب پھینکا تھا۔“

حماد نے کہا۔”اگر مراد قاتل ہے اور اس نے ایسا کیا تھا تو ایک غریب منشی کو شہر جاکر تیزاب لانا پڑا ہوگا کیونکہ یہ چیز کسی گوٹھ یا چھوٹے ٹاؤن میں نہیں ملتی ہے۔آپ کیا کہتے ہیں اس نے آپ کے گوٹھ میں تیزاب کہاں سے حاصل کیا ہوگا؟“

ایک بیٹے نے کہا۔”یہ تو وہی جانتا ہے۔ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ تیزاب کہاں سے لایا تھا؟“

”آپ لوگ گوٹھ کے مالک ہیں۔آپ کو جواب دینا ہوگا کہ یہ خطرناک چیز یہاں نہیں ملتی ہے تو مراد اسے کہاں سے لایا تھا۔گھوم پھر کر یہی جواب ملتا ہے کہ شہر سے ہی لاسکتا ہے۔“

حشمت نے کہا۔”مراد ہمارے کام سے ایک بار کراچی گیا تھا۔تب ہی وہاں سے لایا ہوگا۔“

”وہ کراچی کب گیا تھا؟“

”زلیخا کے قتل سے کچھ دنوں پہلے گیا تھا۔“

”قتل سے پہلے فصل کی کٹائی ہورہی تھی۔کٹائی میں

ہفتوں لگ جاتے ہیں پھر اناج کا ذخیرہ کیا جاتا ہے۔شہروں سے غلہ فروشوں کی اچھی خاصی تعداد آتی جاتی رہتی ہے۔تقریباً ڈیڑھ یا دو ماہ تک آپ کا منشی مراد حساب کتاب میں مصروف رہا ہوگا۔“

حشمت نے کہا۔”ہاں وہ بہت مصروف رہا تھا۔لیکن اس سے پہلے شہر گیا تھا۔“

”یعنی دو ماہ پہلے گیا تھا۔واردات اس نے فصل کی کٹائی کے بعد کی اور تیزاب دو ماہ پہلے لے آیا۔“

دوسرے بیٹے نے ڈھٹائی سے کہا۔”یہی کیا ہوگا۔اس نے دو ماہ پہلے ہماری بہن کے قتل کا منصوبہ بنایا ہوگا۔“

”پھر بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ قاتل نے مقتول کی صورت ناقابل شناخت کیوں بنا دی؟یہ بہت اہم سوال ہے۔اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے۔قاتل یہ کیوں چاہتا تھا کہ قتل کے بعد کوئی زلیخا کی صورت نہ دیکھے؟“

”اس کا جواب تو قاتل ہی دے سکے گا۔“

”مراد قتل کے جرم سے انکار کررہا ہے۔اور آپ جانتے ہیں کہ اس کا مقدمہ لڑنے والا محبوب علی چانڈیو ارب پتی ہے۔سیاسی اور کاروباری حلقوں میں بڑے ذرائع کا مالک ہے۔مراد کو مکھن کے بال کی طرح نکال لائے گا۔“

حشمت نے کہا۔”اتنا آسان نہیں ہے۔“

”ہاں۔آسان نہیں تھا۔لیکن آپ لوگوں نے ان کے لیے آسانی پیدا کردی ہے۔“

”وہ کیسے؟“

”مراد علی کا وکیل دعوے کرے گا کہ مراد نے نہ تو زلیخا کو قتل کیا ہے اور نہ ہی اس کی لاش کہیں پائی گئی ہے۔کھیتوں میں پائی جانے والی لاش زلیخا کی نہیں تھی۔اگر تھی تو ثابت کیا جائے۔کسی کی لاش کو اپنی بیٹی اور بہن کے کپڑے اور انگوٹھی پہنا کر اسے زلیخا ثابت نہیں کیا جاسکے گا۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔”آپ کا کیس کمزور نہیں ہے لیکن مضبوط بھی نہیں ہے۔ایک ذرا کھوکھلا ہے۔اسے ٹھوس بنایا جاسکتا ہے۔آپ اپنے وکیل سے بات کرلیں۔اگر وہ اس کمزوری کو دور نہ کرسکا تو میں کرکے دکھاؤں گا۔“

حشمت نے اٹھ کر کہا۔”ابھی نہ جائیں۔باتیں ادھوری ہیں۔ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔“

”جب آپ کو یقین ہوجائے کہ میں وکیل سے زیادہ آپ کے کام آسکتا ہوں۔تب آپ مجھے بلائیں۔میں مجرموں کی کمزوریوں سے کھیلنا جانتا ہوں۔دو چار پیشیوں میں ہی مراد کو پھانسی کے تختے تک پہنچادوں گا۔لیکن...“

”لیکن...؟“حشمت نے پوچھا۔

”پورے ایک لاکھ روپے لوں گا۔آدھی رقم سزائے موت کا فیصلہ سنانے سے پہلے اور آدھی فیصلہ سنانے کے بعد۔“

حشمت نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔”جناب!آپ کے لیے جان حاضر ہے۔پہلے میں اپنے وکیل سے بات کرلوں۔اگر وہ مراد پر عائد کیے ہوئے الزامات کی کمزوریاں دور نہ کرسکا تو آپ کے ایک لاکھ روپے پکے ہیں۔“

”اور میں اس شرط پر آپ کا کام کروں گا کہ آپ اندر کی کوئی بھی اہم بات مجھ سے نہیں چھپائیں گے۔رازدار بننے کے لیے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا لازمی ہے۔“

وہ گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔”ہم ضرور رازدار بن کر رہیں گے۔“

حماد نے گوٹھ سے واپس جاتے وقت محبوب سے فون پر کہا۔”زلیخا کے قتل کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔میں اپنے علم اور تجربات کے مطابق کہتا ہوں کہ اسے قتل نہیں کیا گیا ہے۔اس کی جگہ کسی اور کو اپنے مقاصد کے لیے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔اور اس کی صورت ناقابلِ شناخت بنا دی گئی ہے۔“

محبوب نے کہا۔”اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو مراد کو زلیخا کا قاتل ثابت نہیں کیا جاسکے گا۔“

”یہ ثابت کرنا آسان نہ ہوگا کہ زلیخا کی جگہ کوئی اور ماری گئی ہے۔یہ حقیقت وڈیرے اور اس کے بیٹوں کی زبان سے اگلوانی ہوگی اور اس کے لیے میں ایک رشوت خور افسر بن گیا ہوں۔میں ان کے جیسا ہی بن کر اور ایک رازدار بن کر ان کا اعتماد حاصل کروں گا تو امید ہے کہ ہم اندرونی سازشوں کو پوری طرح سمجھ کر عدالت میں ان کا اصلی چہرہ دکھا سکیں گے۔“

”آپ کراچی آکر معروف تجلی صاحب سے ملاقات کریں۔ان سے مراد کے کیس پر گفتگو کریں۔انہوں نے یہ مقدمہ لڑنے کے لیے باقاعدہ ایک سیٹ اپ قائم کیا ہے۔ان کی ہی نگرانی میں ہم عدالتی معاملات سے نمٹتے رہیں گے۔آپ ان کے ساتھ رہ کر کام کریں۔جب بھی ضروری سمجھیں' مجھ سے بھی ملاقات کرتے رہیں۔“

محبوب نے فون بند کر دیا۔ وہ مقدمہ اس کے لیے دردِ سر تھا۔ اسے تو صرف ماروی کی ذات سے دلچسپی تھی اور دلچسپی کا تقاضا تھا کہ مراد کے سنگین معاملات کو اہمیت دی جائے۔ عقل کہہ رہی تھی۔ وہ مراد کو اہمیت دے گا تو ماروی اس کی قدر کرے گی۔

سمیرا معروف تجلی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ محبوب کے لیے بہت پریشان تھا۔ اپنے تجربات کے مطابق یہ سمجھ رہا تھا کہ اس کی نیکی اور شرافت اسے لے ڈوبے گی۔ اگر وہ ماروی کو مراد کی امانت سمجھتا رہے گا تو نہ اِدھر کا رہے گا نہ اُدھر کا۔

اس نے سمیرا سے کہا۔ ”وہ ماروی کو دیوانہ وار چاہتا ہے لیکن اسے مراد سے کبھی چھیننا نہیں چاہے گا۔ اپنے عشق کو شریفانہ بناتا رہے گا تو گویا خود کو بہلاتا رہے گا۔ بہ الفاظ دیگر اپنے آپ کو الو بناتا رہے گا۔ میں اسے کیسے سمجھاؤں؟“

سمیرا نے کہا۔ ”عشق کرنے والوں کو سمجھایا جائے تو وہ سمجھانے والوں کو نادان کہتے ہیں۔“

”ہاں وہ مجھ بوڑھے کو نادان سمجھ رہا ہوگا۔ میری پریشانی یہ ہے کہ وہ کاروبار کی طرف سے غافل ہو رہا ہے۔ آئندہ ماروی کے پیچھے، مراد کے معاملات میں اور زیادہ الجھتا رہے گا اور ہم سوچتے اور انتظار کرتے ہی رہ جائیں گے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔“

سمیرا نے کہا۔ ”تجلی صاحب! ان کی بے رُخی میرا دل توڑ رہی ہے۔ میں آپ کے مشوروں کے مطابق کاروبار کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اگر ناکام ہوئی اور بے ایمان عملہ حاوی ہوتا رہا تو دیکھتے دیکھتے کاروبار بیٹھ جائے گا۔“

”مجھے بھی یہی اندیشہ ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، محبوب کو کس طرح واپس لایا جائے؟“

معروف تجلی، سمیرا کو یہ دلاسا دیتا تھا کہ آج نہیں تو کل محبوب کو اس کی غلطی کا احساس ہوگا۔ وہ اس کی طرف لوٹ کر آئے گا اور اس سے ضرور شادی کرے گا اور وہ اسی امید پر دن رات کاروبار کی طرف توجہ دیتی رہتی تھی۔ اِدھر معروف مایوس ہو رہا تھا۔ محبوب کے عشقیہ تیور بتا رہے تھے کہ اس کی دیوانگی بڑھتی ہی جائے گی۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ دیوانہ کبھی ماروی سے نہیں پھرے گا۔

اسے نارمل رکھنے اور کاروبار کی طرف لانے کا یہی ایک راستہ نظر آرہا تھا کہ ماروی اسے سر سے پاؤں تک حاصل ہو جائے۔

سر سے پاؤں تک خریدی بھی جاسکتی ہے اور باقاعدہ دلہن بنا کر بھی لائی جاسکتی ہے لیکن محبوب مراد کا حق مارنا نہیں چاہے گا۔

اس نے دل میں کہا۔ ”اور میں بھی پرانا کھلاڑی ہوں۔ ناممکن کو ممکن بنانا جانتا ہوں۔ پہلے کوشش کروں گا کہ مراد کی غیر موجودگی میں ماروی محبوب سے متاثر ہو جائے۔ نہ ہوئی تو مجبوراً وہ کرنا ہوگا جو کرنا نہیں چاہتا۔

مجھے ہر قیمت پر محبوب کو نارمل رکھنا ہے اور بزنس کو جاری رکھنا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں مراد کے مقدمے کو کمزور بنا دوں گا۔ تب اسے سزائے موت ہوگی۔“

ایسی گری ہوئی بات ذہن میں آئی تھی، جس کی توقع اس ذہین بوڑھے سے نہیں کی جاسکتی تھی۔

اور وہ سوچ رہا تھا۔ ”جب مراد نہیں رہے گا تو ماروی محبوب کی صورت میں بچھڑے یار کو دیکھے گی اور محبوب کے روپ میں یار کو پانے کے لیے اسے قبول کرے گی۔

میں کاروبار کی سلامتی اور محبوب کی بہتری چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔ یہ میری وفاداری کا تقاضا ہے۔

میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مراد کے بعد ماروی تنہا نہیں رہ سکے گی۔ عشق کرنے والوں کے پاس دل ہوتا ہے دماغ نہیں ہوتا۔ ماروی کا دل بار بار مراد کے ہم شکل کو دیکھنا چاہے گا۔

لوگ مرنے والوں کی تصویریں دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے یار کی زندہ صورت محبوب میں چلتے پھرتے دیکھے گی۔ دل اس کے قریب جائے گا اور وہ انکار نہیں کر سکے گی۔“

وہ ہر پہلو سے سوچ رہا تھا۔ دنیاوی حقائق کہہ رہے تھے کہ انسان کی دنیا میں جگہ خالی نہیں رہتی، بھر جاتی ہے۔ ایک آدمی کم ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا آکر پہلے کی کمی پوری کر دیتا ہے اور جب وہ پہلے والے کی طرح ہو بہو ہو تو ہچکچانے اور کترانے کے باوجود اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔

بوڑھے معروف تجلی نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ دور کی کوڑی لا رہا تھا۔ مراد کو اوپر پہنچانے کے بعد ماروی کو زمین پر دوسرا مراد دینے والا تھا۔

مقدمہ برسوں چلنے والا تھا۔ اسے جلدی نہیں تھی۔ ابھی وہ مراد کا کیس کمزور کرنے سے پہلے ماروی کو آزمانا چاہتا تھا کہ وہ مراد کی غیر موجودگی میں محبوب کی طرف مائل ہوگی یا نہیں؟

ہوگئی تو مراد کو بچا لیا جائے گا۔ ورنہ اس باؤلی کے لیے ایک راستہ بند کر کے دوسرا راستہ کھول دیا جائے گا۔

اندر جو منصوبہ پک رہا تھا، معروف نے اسے اندر ہی رہنے دیا۔ محبوب کو بھی نہیں بتایا کہ وہ اس کی اور بزنس کی بہتری کے لیے کیا کرنے والا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ محبوب کبھی ایسی گری ہوئی حرکت کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ وہ ماروی کو حاصل کرنے کی خاطر مراد کی زندگی سے کھیلنے کا تصور بھی نہیں کرے گا۔

ایک روز معروف نے آفس میں محبوب سے پوچھا۔ ”تم نے مراد سے جیل میں ملنے کی عرضی دی ہے؟“

”ہاں۔ ہمارا وکیل کہہ رہا تھا کہ دو چار دنوں میں ملاقات کی اجازت مل جائے گی لیکن مراد سے ملاقات کے لیے میں نہیں جاؤں گا، ماروی جائے گی۔“

”اور تم اسے اپنی کار میں لے جاؤ گے؟“

وہ بڑے جذبے سے ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”ہاں۔ اس طرح وہ کچھ تو قریب ہوگی۔“

”گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ چاچا چاچی بھی ہوں گے۔ تم اس سے کوئی بات نہیں کر سکو گے۔ جب بھی وہ مراد سے ملنے جایا کرے گی۔ بزرگ ان کے ساتھ رہیں گے۔ کیا تم اس سے اپنے دل کی کوئی بات کر پاؤ گے؟“

”ہاں مجبوری ہے۔ اپنے دل کی بات نہیں کر سکوں گا لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ کار میں بیٹھنے کے دوران میں اس کے ساتھ کچھ وقت تو گزار لوں گا۔“

”باتیں کرنے کا موقع نکالنا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی تم سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔“

جب ہم اپنی معشوق کے بارے میں سوچتے ہیں تو دل کہتا ہے وہ بھی ہمیں سوچ رہی ہے۔ وہ ہمیں نظر انداز کرے تب بھی دل کہتا ہے، شاید وہ چور نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

معروف نے کہا۔ ”میں کچھ ایسا کروں گا کہ جب پھول تمہارے پاس ہو تو آس پاس کانٹے نہ رہیں۔“

”آپ انہیں دور کیسے کریں گے؟“

”کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اور دوسرا سب سے اہم کام یہ کروں گا کہ شہر کے کسی بہت ہی صاف ستھرے علاقے میں ماروی کی رہائش کا انتظام کروں گا۔ اس طرح تم کبھی میمن گوٹھ جیسے پسماندہ علاقہ میں نہیں جاؤ گے۔“

”آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں، وہ کسی حد تک ایک اچھی معیاری زندگی گزارے۔“

ماروی کو تین دنوں کے بعد اطلاع ملی کہ بہادر آباد کے علاقے میں اس کے لیے ایک چھوٹی سی خوبصورت سی کوٹھی لی گئی ہے۔ اور اس کی رہائش کے لیے اسے ویل فرنشڈ کیا جا رہا ہے۔

وہ اتنے بڑے احسان کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ محبوب کی ہر مہربانی سے یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ قریب اور قریب آرہا ہے۔

اس نے بڑی کوٹھی میں جانے سے انکار کیا تو معروف نے اسے سمجھایا۔ ”ہم اونچی سوسائٹی کے لوگ ہیں۔ اپنی قیمتی گاڑیوں میں میمن گوٹھ جیسے پسماندہ علاقے میں بار بار نہیں جائیں گے۔ جبکہ مقدمے کے سلسلے میں دن رات ملاقاتیں ضروری ہیں۔“

ان بڑے لوگوں کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ ماروی مجبور ہو کر چاچا چاچی کے ساتھ ایک بڑی کوٹھی میں آگئی۔ انہوں نے رہائش کے لیے ایسی خوبصورت اور آرام دہ جگہ خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ معروف نے ماروی کو دیکھتے ہوئے بزرگوں سے کہا۔ ”یہ محبوب کی محبت اور مہربانیاں ہیں۔ وہ چاہتا ہے ماروی کو کبھی کانٹا نہ چبھے۔ یہ ہمیشہ پھولوں کے بستر پر رہے۔“

ماروی نے جھجکتے ہوئے معروف کو دیکھا۔ اس کے سر پر احسان کا ہتھوڑا پڑ رہا تھا۔ اسے مراد سے جیل میں ملنے کے لیے جانا تھا۔ آئندہ بھی مقدمے کے سلسلے میں محبوب اس کے لیے لازمی ہو گیا تھا۔ وہ سر جھکا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اُدھر گئی تو معروف نے دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے چاچا چاچی سے کہا۔ ”یہ نادان ہے۔ سمجھتی نہیں ہے۔ آپ دونوں جہاں دیدہ ہیں۔ محبوب صاحب کی محبت اور مہربانیوں کا مقصد سمجھ رہے ہوں گے۔“

چاچی نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ”سائیں...! ہمارے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ ماروی کو عقل سے سوچنا چاہیے۔ اگر مراد مقدمہ میں پھنس جائے گا۔ نکل نہیں سکے گا تو وہ کیا کرے گی؟ کس کے سہارے زندگی گزارے گی۔“

چاچا نے کہا۔ ”ہم تو کہتے ہیں، یہ خوش نصیب ہے۔ پر اپنی خوش نصیبی کو سمجھ نہیں رہی ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”آپ اسے سمجھنے کا موقع دیں۔ کل یہ مراد سے ملنے کے لیے جیل جائے گی۔ محبوب آکر لے جائے گا۔ آپ دونوں اس کے ساتھ نہ جائیں۔ کوئی بہانہ کر دیں۔“

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ذرا سوچا پھر چاچی نے سر ہلا کر کہا۔ ”ایک تدبیر ہے۔ کل میں بیمار ہو

جاؤں گی اور اس کے چاچا وڈالا نے اسپتال جائیں گے تو دیر تک واپس نہیں آئیں گے۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "آپ بہت سمجھدار ہیں۔"

وہ بھی مسکرا کر بولی۔ "کیا کریں، اولاد نا سمجھ ہو تو ہمیں سمجھدار بننا ہی پڑتا ہے۔"

دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی۔ چاچی نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ماروی واپس آئی تھی۔ اس کی نظریں پوچھ رہی تھیں کہ دروازے کو اندر سے بند کیوں کیا گیا تھا؟

وہ اس کی سوالیہ نظروں سے انجان بن گئے۔ معروف نے سینٹر ٹیبل پر ایک لفافہ ماروی کے قریب ہی رکھتے ہوئے کہا۔ "محبوب صاحب نے گھر کے اخراجات کے لیے یہ چالیس ہزار روپے دیے ہیں۔ کل ایک موبائل فون ماروی کو دیں گے۔ یہ ضرورت کے وقت ان سے باتیں کر سکے گی۔"

وہ بولی۔ "میں محبوب سائیں کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، کم ہے۔ ان سے بولیں، مجھے فون کی ضرورت نہیں ہے۔"

معروف نے کہا۔ "یہی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر اچانک کوئی آفت آئے گی۔ کوئی پریشانی ہوگی تو تم فوراً ہی مدد کے لیے کس کو پکارو گی؟ کیا محبوب صاحب کے سوا کوئی ہے، جو آدھی رات کو بھی یہاں دوڑا چلا آئے؟"

وہ جواب نہ دے سکی۔ اب تک جتنی ہنگامی ضرورتیں تھیں، انہیں محبوب ہی پورا کرتا آرہا تھا۔ آئندہ وہی مراد کو پھانسی کے پھندے سے چھڑا کر لانے والا تھا۔ ماروی کا سر جھک گیا۔

وہ بوڑھا خرانٹ جانتا تھا کہ کس طرح رفتہ رفتہ ایک دروازہ بند کرنا ہے اور دوسرا کھولنا ہے۔

☆☆☆

زلیخا کی مختصر سی روداد یہ تھی کہ وہ جمال کے ساتھ فرار ہوگئی تھی۔ جمال اسے اپنی ایک بہن کے گھر بستی لے آیا تھا۔ وہ دونوں وہاں دن رات چھپے رہتے تھے۔ اس کے بہنوئی نے ایک ریکروٹنگ ایجنٹ کو منہ مانگی رقم دے کر اسے جدّہ بھیج دیا تھا۔ اس نے وہاں قدم جماتے ہی زلیخا کو بلالیا تھا لیکن وہ اگلے آٹھ دس مہینوں تک نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے پاؤں بھاری تھے۔ وہ مراد سے ہونے والے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

وہاں اس نے سات ماہ کے بعد ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اگلے تین ماہ بعد جمال نے اسے جدّہ بلالیا۔ اس طرح وہ دونوں ظالم وڈیرے کی پہنچ سے بہت دور نکل گئے تھے۔

حشمت جلالی کا یہ اندیشہ ختم ہونے والا نہیں تھا کہ زلیخا کسی بھی دن زندہ واپس آئے گی تو سارا جھوٹ اور فریب کھل جائے گا۔ مراد کے خلاف مقدمہ یکلخت ختم ہوجائے گا۔ اُلٹا وہ قانون کے شکنجے میں آجائے گا۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو زلیخا کی زندگی مراد کی زندگی تھی۔ وہ اچانک کسی وقت بھی آکر اسے سزائے موت سے بچاسکتی تھی۔ کم از کم اس بچے کے طفیل اس کے کام آسکتی تھی، جسے مراد نے اس کی گود میں دیا تھا۔

لیکن اسے کیا کہا جائے کہ مراد ہی بدنصیب تھا۔ اسے ماروی کی بھرپور محبت مل رہی تھی اور وہ محبت بھی راس نہیں آرہی تھی۔ وہ اس سے نامعلوم مدت کے لیے بچھڑ گیا تھا۔

اس نے خواب دیکھا تھا۔ سوچا تھا کہ کبھی محبوب کی طرح خوش قسمت ہو جائے اور اونچی سوسائٹی میں اس کی جگہ بن جائے اور ایسا ہونے والا تھا۔ محبوب خود اپنی جگہ لانے کے لیے اسے ٹریننگ دے رہا تھا۔ وہ ٹریننگ بھی مکمل نہ ہوسکی۔

ایسے وقت کہتے ہیں کہ تقدیر سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ مقدر نے جسے جس جگہ رکھا ہے وہ وہیں رہے گا۔ زیادہ اُچھلے گا تو ہاتھ پاؤں میں زنجیریں پڑ جائیں گی۔ وہ تقدیر کے اسی مرحلے سے گزر رہا تھا۔

پھر یہ کہ ماروی کی محبت اس کے لیے مصیبت بن رہی تھی۔ معروف تجّی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ محبوب کی جھولی میں نہ آئی تو وکیل اس کا اپنا ہے۔ وہ مراد کے مقدمہ کو کمزور بنادے گا۔ اس کے گلے میں پھندا پڑے گا تو اس کے بعد ماروی ایک دن تنہا ہو کر مجبوراً محبوب کو بانہوں کا ہار پہنائے گی۔

ان تمام حالات میں دو ہی افراد مراد کو رہا کرا سکتے تھے اور سلامتی دے سکتے تھے۔ ایک معروف تجّی تھا جو مقدمہ کو کمزور بھی بنا سکتا تھا اور اس نامراد کو زندگی کی طرف لوٹا بھی سکتا تھا۔

دوسری زلیخا تھی، جو کسی وقت بھی آکر مراد کی حمایت میں بازی پلٹ سکتی تھی۔

لیکن کاتب تقدیر کو منظور ہوتا تو وہ بازی پلٹ آتی۔ اس سے پہلے قضا آگئی۔ وہ دوسری بار ماں بننے کے لیے میٹرنٹی ہوم میں پہنچی تو زچگی کا کیس بہت بگڑ گیا تھا۔ بعد آپریشن کے ذریعے بچے کو نکالا گیا تو وہ جانبر نہ ہوسکی۔ ہمیشہ کی نیند سوگئی۔

وڈیرا حشمت جلالی نہیں جانتا تھا کہ اس کے تمام اندیشے دور ہوگئے ہیں اور مراد بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے مقدمے کو حرفِ غلط کی طرح ختم کرنے والی اس دنیا سے

گئی ہے۔اب شاید کوئی اسے سزائے موت سے نہیں بچا سکے گا۔

وہ تقدیر کی کال کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ایک ماروی کا ہی خیال تھا جو اسے بہلا رہا تھا اور باہر حالات تھے کہ ماروی کو دوسری طرف بہلا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ کروٹیں بدل رہی تھی۔دوسری صبح دس بجے اپنے مراد سے ملنے والی تھی۔اس رات پہلی بار معلوم ہوا کہ بار بار کروٹیں بدلنے سے صبح نہیں ہوتی۔ان حالات میں رات مقدر کی طرح کالی ہوجاتی ہے۔صبح اپنا منہ نہیں دکھاتی۔ رات کی سیاہی میں منہ چھپاتی رہتی ہے۔

جب کسی کام کی جلدی ہو اور کہیں افراتفری میں جانا ہو تو وقت تماشے کرتا ہے۔جان بوجھ کر دیر سے گزرتا ہے۔اس نے کئی بار دیوار گیر گھڑی کو دیکھا۔یوں لگ رہا تھا‘ اس کی دونوں سوئیاں جیسے تھم گئی ہیں یا پھر اونگھ رہی ہیں۔اس کی نیند اڑا کر کمبخت خود سو رہی ہیں۔

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔رات نہیں گزرے گی تو صبح کیسے ہوگی۔صبح نہیں ہوگی تو مراد کا منہ کیسے دیکھے گی؟

محبوب نے اطلاع بھیجی تھی کہ وہ صبح ٹھیک ساڑھے نو بجے آئے گا اور اسے گاڑی میں بٹھا کر مراد کے پاس لے جائے گا۔

اس سلسلے میں اس نے کئی بار سوچا کہ محبوب کے ساتھ کار میں جائے گی تو کیسا لگے گا؟ ایسا لگے گا کہ مراد کے ساتھ بیٹھی ہے۔اگرچہ وہ ہوش و حواس میں رہے گی۔اسے محبوب ہی سمجھتی رہے گی لیکن یار کے ہم شکل کو جیل کی چار دیواری تک دیکھتی جائے گی۔

ہاں۔جب جیل میں مراد سے سامنا ہوگا۔تب محبوب اس کے سر سے نکلے گا۔

یہ کیا طلسم ہوگا‘ رقیب کو حبیب سمجھتی رہے گی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔اپنے آپ کو سمجھانے لگی۔"مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔کار میں چاچا چاچی بھی ہوں گے۔میں ان کے ساتھ بیٹھوں گی۔"

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔رات کے دو بجے تھے۔وقت بڑی مشکل سے دو قدم آگے بڑھا تھا۔وہ قبلہ رو ہو کر آیتیں پڑھنے لگی۔دل نے کہا‘ اللہ کو یاد کرتے رہنے سے وقت گزر جائے گا۔جلدی صبح ہوجائے گی۔

وہ پڑھتی رہی اور گھڑی کو دیکھتی رہی۔پھر اسے ڈرائنگ روم سے آوازیں سنائی دیں۔وہ سمجھ گئی‘ چاچا دن رات ٹی وی کے سامنے بیٹھا فلمیں دیکھتا رہتا تھا اور خبریں سنتا رہتا تھا۔

انہوں نے کوٹھی میں آنے کے بعد پہلی بار ٹی وی کو چھو کر دیکھا تھا۔اس سے پہلے کبھی کبھی دور سے اس تماشا دکھانے والے ڈبے کو دیکھتے رہے تھے۔

وہ وہاں سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی۔چاچا ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔فریج سے پھلوں کا جوس نکال کر پی رہا تھا‘ مزے سے ایک انڈین فلم دیکھ رہا تھا۔اسے دیکھ کر بولا۔"تو ابھی تک جاگ رہی ہے۔صبح جلدی اٹھ کر کھا پی کر تیار رہنا ہے۔محبوب صاحب لینے آئیں گے۔"

وہ بولی۔"تم بھی تو جاگ رہے ہو کیا تمہیں نہیں جانا ہے؟"

اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔وہ اور اس کی بیوی مختی نے پہلے ہی طے کرلیا تھا کہ اسے محبوب کے ساتھ تنہا چھوڑ دیں گے۔کوئی بہانہ کرکے اس کے ساتھ نہیں جائیں گے۔یہ بات وہ ابھی اس سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس نے کہا۔"جیلی صاحب نے کہا ہے صرف تجھے ملاقات کی اجازت ہوگی۔ہم پھر بھی تیرے ساتھ جائیں گے۔بڑے مزے کی فلم ہے۔ابھی دیکھ کے سوجاؤں گا۔"

چاچی مختی اپنا پیٹ پکڑ کر کراہتے ہوئے آئی۔چاچا کو دیکھ کر غصے سے بولی۔"تم نے تو صبح شام سینما کھول رکھا ہے۔بند کرواسے۔ہائے! میری بیماری کا ذرا تو خیال کرو۔"

ماروی نے تعجب سے پوچھا۔"تم شام کو تو اچھی بھلی تھیں۔اب کیا ہوا ہے؟"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔"بازار کے کباب پراٹھے کھائے تھے۔بڑی مرچیں تھیں۔تب سے پیٹ خراب ہوگیا ہے۔"

وہ پلٹ کر پیٹ پکڑ کر جاتے ہوئے بولی۔"یہ لو پھر گڑ بڑ ہو رہی ہے۔پھر جانا ہوگا..."

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔چاچا نے کہا۔"کھانے کے لیے مرتی ہے۔پیٹ خراب کرتی ہے اور سڈا اس کی طرف دوڑ لگاتی رہتی ہے۔"

ماروی نے پریشان ہو کر کہا۔"تم کوئی دوا لا کر دے سکتے تھے۔صبح ہمیں جانا ہے۔"

"تم فکر نہ کرو۔دوا کی دکان سے گولی لا کر کھلائی تھی۔صبح ہوگی تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔"

چاچی کی بیماری نے اسے پریشان کردیا تھا۔وہ بے چین ہو کر ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولی۔"صبح نو بجے سے پہلے ڈاکٹر نہیں ملے گا اور ساڑھے نو بجے ہمیں گاڑی لینے آجائے گی۔"

وہ بولا۔"میں نے کہا نا... فکر نہ کرو۔یہ نہ جاسکی تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔جاؤ اپنی نیند پوری کرو۔"

وہ پریشان ہو گئی تھی۔اس دروازے کی طرف سوچتے ہوئے دیکھنے لگی‘ جہاں سے ابھی چاچی مختی ہائے ہائے کرتی گئی تھی۔چاچا نے کہا۔"جاؤ بیٹی! سو جاؤ۔ہم صبح جائیں گے۔"

وہ سر جھکا کر چلی گئی۔صبح تو جانا ہی تھا۔کوئی بیمار ہو۔کوئی مصیبت آئے۔تب بھی جانا تھا۔مراد سے ملنے کے لیے قانون کا ظالم فولادی دروازہ کھلنے والا تھا۔اسے ہر حال میں سیلاب اور آندھیوں سے بھی گزر کر جانا تھا۔وہ نہیں جانتی تھی کہ کیسے جانا ہے۔اس کے چاچا چاچی جانتے تھے۔ماروی سمجھ نہیں سکتی تھی کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟

اگر ماروی سے سیدھی طرح کہا جاتا تو وہ کبھی محبوب کے ساتھ تنہا نہ جاتی۔بزرگوں سے لڑنے لگتی کہ انہیں ساتھ جانا ہی ہوگا۔اس سے پہلے ہی وہ بزرگ بڑی عیاری سے لڑائی ختم کر رہے تھے۔

محبوب ٹھیک ساڑھے نو بجے اپنی کار میں آگیا۔چاچی بستر پر تھی۔ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے تھے۔چاچا پندرہ منٹ پہلے ڈاکٹر کو بلانے یا دوا لانے گیا تھا اور پلٹ کر نہیں آیا تھا۔محبوب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔"ٹھیک دس بجے ملاقات کا وقت ہے۔وہ وقت گزر جائے گا تو پھر ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔"

چاچی نے کراہتے ہوئے کہا۔"نہ جانے اس کا چاچا کہاں جا کے مر گیا ہے۔وہ رہتا تو اس کے ساتھ چلا جاتا۔بیٹی...! اس کا انتظار نہ کر۔دیر ہوگئی تو مراد کو دور سے بھی نہیں دیکھ سکے گی۔جا بیٹی...! اللہ کا نام لے کر چلی جا۔"

جانا ہی تھا۔اس نے جاگتے ہوئے رات گزاری تھی۔وہ کچھ کہے سنے بغیر سر جھکا کر باہر آگئی۔کار کے پچھلے دروازے کی طرف پہنچ کر رک گئی۔محبوب نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔اس نے پریشان ہو کر جھجکی جھجکی نظروں سے اسے دیکھا۔سوال ابھرا۔"کیا ان کے ساتھ قریب ہو کر بیٹھنا ہوگا؟"

کھلا ہوا دروازہ کہہ رہا تھا۔"ساتھ بیٹھنا ہوگا۔انکار کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے محسن پر بھروسا نہیں کرتی ہے۔"

وہ چپ چاپ سر جھکا کر سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔حالات انسان کو اسی طرح ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیتے ہیں اور وہ اپنے اختیار میں ہوتے ہوئے بھی اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔دیکھا جائے تو یہ سچویشن چاچا چاچی نے پیدا کی تھی۔

محبوب نے دروازہ بند کیا۔پھر سامنے سے گھوم کر اسٹیئرنگ سیٹ پر اس کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ماروی نے سوچا تھا کہ کار کے اندر ان کے درمیان فاصلہ کم ہوگا۔اب دیکھ رہی تھی کہ فاصلہ سوچ سے بھی کم تھا۔وہ اس کے شانہ بہ شانہ آ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس نے بے اختیار ایک لمبی سی سانس کھینچی اور ذرا سمٹ گئی۔کھلی آنکھوں سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اپنے مراد کے ساتھ بیٹھی ہے۔

"یا اللہ...! کیا کروں۔یہ سوٹ پہنتا ہے‘ یہ مراد ہو ہی نہیں سکتا۔لیکن وہی شکل صورت ہے۔اتنے مہنگے لباس میں بھی مراد لگ رہا ہے۔"

محبوب بہ ظاہر اس سے بے نیاز تھا۔کار اسٹارٹ کر کے ایک سڑک پر آگیا تھا۔اس کی قربت کو شدت سے چپ چاپ محسوس کر رہا تھا۔وہ تو جیسے بیٹھے بیٹھے اس کے اندر پہنچی آرہی تھی۔

تقدیر پھول‘ رنگ اور خوشبو بکھیر رہی تھی۔وہ پہلی بار ایسی قیمتی اور خوبصورت کار میں بیٹھی تھی۔محبوب اپنی امارت اور شخصیت کے باعث حواس پر چھا رہا تھا۔مراد اس کے کان میں کہہ رہا تھا۔"مجھے دیکھو تو سہی... یہ میں ہوں۔"

اس نے بے اختیار سر گھما کر اسے دیکھا۔چشم زدن میں غلطی کا احساس ہوا۔"اری کیا کرتی ہے؟ یہ وہ نہیں ہے۔"

وہ فوراً ہی منہ پھیر کر ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔مراد پھر اس کے اندر بولنے لگا۔"دل پر ہاتھ رکھ کر بولو۔یہ میں نہیں ہوں تو اور کون ہے؟ کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں کہ میرا لباس بدل گیا ہے۔یہ میری امارت اور نئی شخصیت ہے۔میری قسمت بدل گئی ہے۔یقین نہیں ہے تو کچھ باتیں کرکے دیکھو۔"

وہ پھر بے اختیار سر گھما کر دیکھنا چاہتی تھی۔پھر یہ غلطی کرنے سے پہلے سنبھل گئی۔سوچنے لگی۔"یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟ یہ تو مراد ہی مراد ہے۔لیکن محبوب صاحب ہیں۔مجھے اُدھر دیکھنا نہیں چاہیے۔نہ ان کے اور نہ مراد کے متعلق کچھ سوچنا چاہیے۔"

کار اندر سے ایسی ملائم گدیوں والی‘ ایسی آرام دہ تھی کہ وہ جیسے پھولوں پر آ کر بیٹھ گئی تھی۔

کار کے ائر کنڈیشنر سے بڑی ہی خوشبودار ٹھنڈی ہوا

چل رہی تھی۔ وہ پچھلی رات سے جاگ رہی تھی۔ اب وہ ماحول دھیمے دھیمے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

اور جس خواب کی تعبیر نہ ہو وہ دھوکا ہی ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ بہت ہی خوبصورت دھوکا کھاتی جا رہی تھی۔

اچانک کار رک گئی۔ پولیس والے راستہ روک رہے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس علاقے میں ایک دھماکا ہوا تھا۔ پتا نہیں کتنے مارے گئے تھے اور کتنے اسپتال پہنچائے جا رہے تھے۔ گاڑیوں کو دوسرے راستے سے جانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

محبوب نے کار کو دوسرے راستے پر موڑتے ہوئے کہا۔ ''اس شہر میں ایسی ہی رکاوٹیں رہیں گی۔ کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ ہم کوٹھی سے جیل تک پندرہ منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔ اب لمبے راستے سے جانا ہوگا۔ دعا کرو' ہم وقت پر پہنچ جائیں۔''

مراد کے ہم شکل نے پہلی بار اس سے بات کی۔ لیکن وہ بات جواب طلب نہیں تھی۔ اسی کے فائدے کے لیے تھی کہ وہ یار سے ملنے کی دعا کرنے کو کہہ رہا تھا۔

ایسی ہی باتیں' ایسے ہی طور طریقے متاثر کرتے ہیں۔ اس نے پہلی بار جو بات کی' اس کے پیار کے لیے اس کی بہتری کے لیے کی۔ تاکہ وہ وقت پر ملاقات کے لیے پہنچ جائے۔

وہ دل ہی دل میں اللہ سے مدد مانگنے لگی۔ یہ اعتراف کرنے لگی کہ وہ ہم سفر اس کی بہتری چاہتا ہے۔ اپنے یار کی طرف سے کسی کا دھیان ہٹانا اور اسے اپنی طرف متوجہ رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ محبوب بہت محتاط تھا۔ ماروی کو اپنے بارے میں کسی طرح کا غلط تاثر نہیں دینا چاہتا تھا۔

وہ ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ وہاں اور بھی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ اپنے رشتہ دار قیدیوں سے ملنے آئی تھیں۔ محبوب دولت کے ہتھیار سے جیتنا جانتا تھا۔ حماد صدیقی نے پہلے ہی جیلر کی مٹھی گرم کر دی تھی۔ ماروی کو فوراً ہی ملاقات کی جگہ بھیج دیا گیا۔

وہ ایک لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ جہاں پہنچی' وہاں آہنی سلاخوں کی دیوار تھی۔ دیوار کے آگے لوہے کی جالیاں تھیں۔ کوئی ملاقاتی ہاتھ بڑھا کر کسی قیدی کو چھو نہیں سکتا تھا۔

تھانے کی بات اور تھی وہاں حوالات میں ان دونوں نے ایک دوسرے کو چھو لیا تھا اور ساتھ بیٹھ کر روٹیاں بھی کھائی تھیں۔ جیل میں نظر آ رہا تھا کہ وہاں کے قوانین بہت سخت ہیں۔

مراد کو جیل کے اندرونی حصے سے وہاں لایا گیا۔

دونوں نے بڑے پیار سے' بڑی بے چینی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آہنی جالیوں پر اپنے ہاتھ رکھے لیکن ایک دوسرے کو چھو نہ سکے۔ یہ ایسی محرومی تھی کہ وہ رو پڑی۔

گھر سے سوچتی ہوئی آئی تھی کہ آج فراخدلی سے اسے چھونے اور تھام لینے کی کھلی چھٹی دے گی۔ اب جو ساری رات سوچا وہ نہ ہوا۔ وہ قریب آ کر اور دور لگ رہا تھا۔

مراد نے کہا۔ ''رونے سے میں باہر نہیں آ جاؤں گا۔ آنسو پونچھ لے۔ باتیں کر ماروی!''

وہ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''کیا باتیں کروں؟ مجھے یہیں بلا لو۔ ہم ساری زندگی یہاں رہیں گے۔ باہر کی زندگی جہنم لگ رہی ہے۔''

''ماروی! صبر کرو۔ حوصلہ رکھو۔ میں جلد ہی باہر آؤں گا۔''

''سب ہی کہتے ہیں کہ قتل کا مقدمہ برسوں تک چلتا رہتا ہے۔ مجھے جھوٹی تسلیاں نہ دو۔ تم جلدی نہ آئے تو میرا کیا ہوگا؟ کس کے سہارے جیوں گی؟''

''ٹھیک ہے مقدمہ برسوں تک چلے گا۔ قیامت تک تو نہیں چلے گا۔ تم ابھی تڑپ رہی ہو پھر مجبوراً صبر کرنا آ جائے گا۔ مجھے یہ اطمینان ہے کہ تم چاچا اور چاچی کے ساتھ میں گوٹھ سے نکل کر ایک مکان میں بہت آرام سے زندگی گزار رہی ہو۔''

''کیا تم سمجھ رہے ہو کہ وہ کتنی مہنگی کوٹھی ہے؟''

وہ ایک سوال داغ کر ذرا چپ ہوئی۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ مہنگی کوٹھی کے پیچھے محبوب کی بھاری بھرکم شخصیت تھی۔

وہ بولی۔ ''اس کوٹھی میں عیش و آرام کی ایسی ایسی مہنگی چیزیں ہیں' جنہیں ہم فلموں میں دیکھتے رہے ہیں۔''

وہ ڈوبتے ہوئے دل سے بولا۔ ''ہاں سائیں نے تمہیں بڑے آرام سے رکھا ہے۔''

وہ بولی۔ ''مہربانیوں کی بھی حد ہوتی ہے۔ تمہارے سائیں نے خرچ کے لیے چالیس ہزار روپے دیے ہیں۔ آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔''

پھر اس نے سر پر آنچل رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مراد... وہ کیوں دیتے رہیں گے؟''

مراد نے اسے بڑی بے بسی سے دیکھا۔ اس نے آنکھیں ملاتے ہوئے پوچھا۔ ''بولو نا مراد...! وہ کس کا منہ دیکھ کر اتنی ساری دولت لٹا رہے ہیں؟''

یہ بہت ہی ٹیڑھا سوال تھا جس کا سیدھا سا جواب دونوں کو معلوم تھا۔ وہ چپ رہا۔

وہ بولی۔ ''تم کہتے ہو کہ ان کے دل میں میل نہیں

ہے۔ وہ مجھ پر تمہارا حق سمجھتے ہیں اور مجھ پر کبھی اپنا حق نہیں جتائیں گے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میرا دل تو یہی کہتا ہے' ہم بھروسا کریں۔ وہ ایک اچھے انسان ہیں۔''

''وہ اچھا انسان حق نہیں جتا رہا ہے لیکن اپنی مہنگی مہربانیوں سے حواس پر چھا رہا ہے۔ یہی ہوتا رہا تو وہ چپکے چپکے رینگتا ہوا میرے اندر آ جائے گا اور مجھے پتا بھی نہیں چلے گا۔ وہ اپنی نیکی اور شرافت سے متاثر کر رہا ہے۔ میرے اندر کئی بار یہ سوال پیدا کر چکا ہے کہ میرا ضمیر اس کی نیکیوں اور مہربانیوں کا صلہ کیا دے گا؟''

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ''اور کیا تم نہیں سمجھ رہے ہو کہ وہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔''

وہ جالیوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''میرے آنسو پونچھنے کے لیے تمہارا مقدمہ لڑ رہے ہیں؟ میں تمہارے ساتھ ساری زندگی ایک جھگی میں گزار سکتی ہوں۔ وہ مجھے کوٹھیوں اور کاروں والی زندگی دے رہے ہیں۔ حالات تمہیں جس قدر بدنصیب بنا رہے ہیں۔ وہ مجھے اس سے زیادہ خوش نصیب بناتے چلے آ رہے ہیں۔ بولو مراد...! جیل سے باہر جس دنیا میں رہتی ہوں' وہاں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

بڑا تکلیف دہ سوال تھا۔ وہ باہر کی دنیا میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ بولی۔ ''وہ جو اچھے انسان ہیں۔ وہ بڑی ایمانداری سے اور سچی دیانتداری سے مجھے جکڑ رہے ہیں۔ ان کے ایمان اور ان کی دیانت داری کو ہم کبھی غلط نہیں کہہ سکیں گے۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''جب رات ہو جاتی ہے۔ تمام قیدی سو جاتے ہیں تو میں بڑے دکھ سے اپنے اور تمہارے حالات پر پریشان ہو کر سوچتا رہتا ہوں کہ قتل کے الزام سے بری ہونے کے لیے سائیں محبوب کا احسان لینا ہی ہوگا۔ اگر میں کہہ دوں کہ مجھے احسان نہیں چاہیے۔ مجھے سزائے موت پا لینے دو تو میری موت کے بعد سائیں کا راستہ صاف ہو جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''ہاں۔ عورت کمزور ہوتی ہے۔ اسے عزت سے جینے کے لیے کسی کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔''

''اور یہ تو ہم دیکھ ہی رہے ہیں۔ سائیں سے بڑھ کر بھروسے کے قابل مضبوط سہارا اور کوئی نہ ہوگا۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''مراد...! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''

ایسی باتیں نہ کرنے سے بھی جو سچ ہے وہ اپنی جگہ رہے گا۔ وہ اپنے حالات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ دونوں ہی محبوب کی ان دیکھی گرفت میں تھے۔ حالات سمجھا رہے تھے کہ اس گرفت سے نکلیں گے تو نقصان میں رہیں گے اور نہ نکلے تو اندیشوں میں گھرے رہیں گے کہ نہ جانے مقدمہ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے اور ماروی کو اس کا مقدر کہاں لے جانے والا ہے؟

محبوب جیلر کے دفتری کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ حماد صدیقی نے دونوں کی آپس میں دوستی کرا دی تھی۔ وہ جیلر سے کہہ رہا تھا۔ ''میں قیدی مراد کے لیے یہاں سہولتیں چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں جتنی بھی پیمنٹ ہو' وہ کروں گا۔''

جیلر نے کہا۔ ''مطلوبہ ادائیگی پر اسے وہ کھانا دیا جائے گا' جو ہم کھاتے ہیں۔ سونے کے لیے بستر ملے گا اور اس سے برائے نام مشقت لی جائے گی۔''

''شکریہ۔ میں یہی چاہتا ہوں۔ آپ رقم بتائیں۔''

اس وقت دفتری کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جیلر نے رقم بتائی۔ محبوب نے اسی وقت بیگ سے دو لفافے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیے۔

اسے کیا ضرورت تھی کہ وہ رقیب کو سہولتوں کے ساتھ آرام سے رکھنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتا؟ وہ تو ماروی کو خوش رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جیل میں آرام سے رہتا تو ماروی گھر میں خوش رہتی اور آرام سے سوتی۔

اس میں شبہ نہیں تھا کہ وہ ماروی کی چاہت میں سحر زدہ ہو چکا تھا۔ یہ الزام دیا جا سکتا تھا کہ ماروی نے اس پر جادو کیا ہے۔ وہ اپنے اندر ایسے مست رہتا تھا کہ اس کے سوا کچھ سوچنا اور سمجھنا نہیں چاہتا تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں تھا کہ اپنے رقیب مراد کے لیے اس کے دل میں عداوت نہیں تھی۔ وہ کھلے دل سے اس کا مقدمہ لڑنے والا تھا اور آئندہ بھی ماروی کو خوش رکھنے کے لیے اس کی خوشیوں کا سامان کرتے رہنے والا تھا۔

وہ عشق کے ایسے جنونی مراحل سے گزر رہا تھا' جسے دنیا نہیں سمجھ سکتی تھی۔ شاید اسی کو بے لوث محبت کہتے ہیں۔

☆☆☆

ماروی کے جاتے ہی چاچی منی کی بیماری دور ہو گئی تھی۔ چاچا بھی کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا تھا۔ ایک ہوٹل میں بیٹھا وقت گزار رہا تھا۔ اس نے دور سے ماروی کو محبوب کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جاتے دیکھا تو مسکرا کر دل میں

کہا۔ ”سیدھی طرح سمجھاتے تو کبھی نہ جاتی۔ اس لڑکی کے ساتھ ناٹک کرتے رہنے سے ہی ایک دن محبوب سائیں ہمارے داماد بنیں گے۔“

وہ کوٹھی میں واپس آیا تو منتی نے دروازہ کھول کر کہا۔ ”جھمرو...! ہماری تدبیر کامیاب رہی ہے۔ وہ محبوب صاحب کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ کر گئی ہے۔“

چاچا جھمرو اندر آتے ہوئے بولا۔ ”ہاں میں نے دیکھا ہے۔ تم کیا کر رہی ہو؟“

”اور کیا کروں گی۔ سوچ رہی ہوں۔ یہ دو لاکھ روپے کب تک کمر سے باندھ کر رکھوں گی۔ دولت ملی ہے تو کمبخت چھپانے کی جگہ نہیں مل رہی ہے۔“

وہ آئینے کے سامنے کرتا اٹھا کر کمر سے بندھے ہوئے کپڑے کا ایک بیلٹ کھولنے لگی۔ اس نے نیفے کی طرح کپڑے کا ایک لمبا بیلٹ سلائی کر کے اس میں دو لاکھ روپے چھپائے تھے۔ جب سے جگی چھوڑ کر آئی تھی تب سے وہ بیلٹ کمر سے باندھ کر رکھتی تھی۔

اب آئینے میں نظر آ رہا تھا‘ اس کے پیٹ میں‘ پیٹھ میں اور کولہوں میں گرمی دانے نکل آئے تھے۔ دولت کی گرمی اس کے بدن سے پھوٹ رہی تھی۔

چاچا نے کہا۔ ”ایسے چھپائے رکھے گی تو یہ پھنسیاں پھوڑے بن جائیں گے۔ میں تو بڑھاپے میں ہاتھ نہیں لگاتا۔ ڈاکٹر اچھی طرح دونوں ہاتھ لگا کر پوچھے گا‘ دانے صرف کمر اور پیٹ میں کیوں ہیں؟“

وہ بولی۔ ”مذاق نہ اُڑاؤ۔ سمجھ میں نہیں آتا‘ یہ دولت کہاں چھپاؤں؟ عقل کام نہیں کر رہی ہے۔“

”اتنی مضبوط الماری ہے۔ الماری کے اندر لوہے کی تجوری ہے۔ مگر وہاں تمہارا دل نہیں مانتا۔ کہتی ہو کسی وقت ڈاکو آ کر الماری توڑ کر لے جائیں گے۔“

”ہاں اگر لے گئے تو میں مر جاؤں گی۔“

”موت آواز دے کر نہیں آتی۔ جب آئے گی تو دو لاکھ یہیں رہ جائیں گے۔ اور تم اتنی ساری پھنسیوں اور پھوڑوں کے ساتھ اوپر چلی جاؤ گی۔“

”تم باتوں کے سکندر ہو۔ کام کی بات کبھی نہ کی ہے اور نہ کرو گے۔ ہائے انہیں کہاں چھپاؤں؟“

”دو لاکھ نے تمہاری مت مار دی ہے۔ عقل کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تجوری سے محفوظ جگہ کوئی نہیں ہوتی۔ چلو ایسا کرو۔ یہ پلنگ بہت نیچا ہے اور نیچے قالین بچھا ہوا ہے۔ تم جھک کر دیوار کی طرف جا کر یہ خزانہ قالین کے نیچے دبا دو۔“

اس نے قالین پر گھٹنے ٹیک کر سر جھکاتے ہوئے پلنگ کے نیچے دیکھا پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ ”بچوں جیسی باتیں نہ کرو۔ کیا ڈاکو پلنگ کے نیچے نہیں جاسکیں گے؟“

”ڈاکو اندر سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ جلد سے جلد لوٹ مار کر کے بھاگتے ہیں۔ وہ کبھی پلنگ کے نیچے قالین الٹ کر نہیں دیکھتے۔“

وہ سر جھٹک کر بولی۔ ”نہیں۔ میں وہاں نہیں چھپاؤں گی۔“

”میں نے قالین کے نیچے چھپانے کو کہا ہے اور تم ایسی کسی جگہ نہیں چھپاؤ گی جو میری نظروں میں آ گئی ہو۔ میں خوب جانتا ہوں تمہیں مجھ پر بھی بھروسا نہیں ہے۔“

”جب جانتے ہو تو نہ بولو۔ میرا باپ زندہ ہوتا تو کبھی اس پر بھی بھروسا نہ کرتی۔“

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”نہ کرو۔ میرے دل میں یہ ارمان نہیں ہیں کہ میری بیوی مجھ پر بھروسا کرے مگر اتنا بتا دو۔ ان دو لاکھ روپے کا کیا کرو گی؟“

وہ اس کے دائیں سے بائیں آ کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں۔ اس کا ایک پیسا اپنے سائے پر بھی خرچ نہیں کرو گی۔ اپنے سوا کسی اور کا سایہ اس پر پڑنے نہیں دو گی۔“

پھر وہ بائیں سے دائیں آ کر بولا۔ ”خدا کی بندی...! اپنی کمر اور پیٹ کے زخموں پر مرہم لگا۔ اب انہیں یہاں باندھ کر نہیں رکھ سکے گی۔ اس سے پہلے کہ اسپتال جانے کی نوبت آئے گھر میں مرہم پٹی کرا لے۔ اپنے آپ پر رحم کر۔“

”میرے پاس ایک حکیمی مرہم ہے۔ اسے کئی بار آزمایا ہے۔ ابھی لگاؤں گی تم جاؤ۔“

”میرے سامنے لگاؤ۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔“

”کوئی شوہر نہیں ہو۔ عمر گزرتی جائے تو بڑھاپے میں نام کے میاں بیوی رہ جاتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں جاؤ۔ اچھی سی فلم دیکھو۔ میں ابھی آؤں گی۔“

”یعنی دروازہ اندر سے بند کر کے خزانہ چھپاؤ گی؟“

”میں کچھ بھی کروں گی‘ جاؤ یہاں سے۔“

وہ دبلا پتلا سا تھا۔ اس نے دھکا دیا تو وہ گرتے گرتے سنبھلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچ گیا۔ تن کر بولا۔ ”اب تو میں رات کو سونے سے پہلے اور صبح اٹھنے کے بعد دودھ پیتا ہوں۔ مکھن میوے اور پھل کھاتا ہوں۔ آج تک تو نے جتنے بھی دھکے دیے ہیں۔ ان کے جواب میں ایک ہی دھکا دوں گا تو کبھی اٹھ نہیں سکے گی۔ تجھے چار کاندھے ہی اٹھا کر لے جائیں گے۔“

وہ گھونسا دکھاتا ہوا چلا گیا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ ”آج اس مرد کے منہ سے سچی بات نکل گئی ہے کہ یہ مجھے کسی دن کسی تدبیر سے مارے گا تو مجھے چار کاندھے اُٹھا کر لے جائیں گے۔ میں دھوکے میں ماری جاؤں گی۔ پھر یہ پورے دو لاکھ روپے اس کے ہو جائیں گے۔“

یہ سوچتے ہی وہ صدمے سے بیٹھ گئی۔ دو لاکھ کے کمر بیلٹ کو ایسے سینے سے لگایا جیسے ابھی کوئی کلیجا نکال کر لے جا رہا ہو۔

جھمرو ڈرائنگ روم میں آ کر ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ دماغ میں منتی کا کمر بیلٹ گھوم رہا تھا اور سر گھما رہا تھا۔ پیسا کسے اچھا نہیں لگتا۔ پھر وہاں پیسا نہیں روپے تھے۔ ہزاروں نہیں لاکھوں تھے۔

وہ اب تک اس انتظار میں تھا کہ وہ آج نہیں تو کل دس بیس ہزار عیش کرنے کے لیے دے گی لیکن وہ تو ایک روپے کی بھی ہوا لگنے نہیں دے رہی تھی۔ ایک ناگن کی طرح خزانے پر بیٹھ گئی تھی۔

اب دماغ چیخ رہا تھا کہ وہ ناگن کے سر پر سوار ہوئے بغیر خزانے کو چھو بھی نہیں سکے گا۔

لیکن اس سے زبردستی نہیں کر سکے گا؟ وہ بہت تگڑی تھی۔ ایک پھونک میں سوکھے پتے کی طرح اُڑا دیتی۔ گھوم پھر کر یہی بات دماغ میں آ رہی تھی کہ کبھی وہ غافل رہے گی تو اسی وقت رقم چرالی جائے۔ بشرطیکہ رقم اس کی کمر سے لپٹی نہ ہو۔

اس نے جھنجلا کر سوچا۔ ”کمبخت دو لاکھ کو اپنے وجود سے کبھی الگ نہیں کرتی ہے۔ نہاتے وقت ایک طرف رکھتی ہوگی لیکن اس وقت غسل خانے کا دروازہ اندر سے بند رکھتی ہے۔ بہت ہی چالاک اور مکار ہے۔“

اس نے بے بسی سے سوچا۔ ”آخری راستہ یہی ہے کہ اسے موت آ جائے۔ مگر کیا کروں‘ وہ میری بددعا سے اور کوسنے سے نہیں مرے گی۔ صحت ایسی ہے کہ میرے بعد بھی زندہ رہے گی۔“

وہ صوفے کے ہتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”میرے بعد بھی زندہ رہ کر کیا کرے گی۔ وہ دو لاکھ تو خرچ نہیں کرے گی۔ انہیں مرتے دم تک اپنے وجود سے چپکائے رہے گی۔“

وہ صوفے پر پہلو بدلنے لگا۔ ”پھر کیا ہوگا؟ ہوگا کیا؟ ایک دن سب کو مرنا ہے۔ وہ بھی مر جائے گی۔ اس کے مرنے کے بعد نہ جانے وہ دو لاکھ روپے کس کے ہاتھ لگیں گے؟“

وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”اس کی سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ وہ روپے مجھے نہیں ملیں گے تو اس کے بھی کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہ انہیں دن رات دیکھتے دیکھتے مر جائے گی۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر پھر اس کے کمرے کی طرف گیا۔ دروازے کا ہینڈل ذرا سا گھما کر دیکھا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ رقم کو کہیں چھپانے کے لیے کچھ کر رہی ہے۔

اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کیا ہے؟ کیوں آئے ہو؟ میں نے کہا نا۔ ٹی وی چلاؤ اور فلمیں دیکھو۔ میں ابھی غسل کر کے آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے جلدی آؤ۔ مجھے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

اندر خاموشی رہی۔ منتی اسے کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔ وہ جھنجلاتا ہوا واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ وہ چاہتا تھا ماروی کے واپس آنے سے پہلے یہ فیصلہ ہو جائے کہ وہ دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھے گی۔ اسے کچھ حصہ دے گی۔ ورنہ وہ اسے سکون سے نہیں رہنے دے گا۔

وہ اسے مجبور کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہا تھا اور ناکام ہو کر سمجھ رہا تھا کہ دولتمند بیوی کے مقابلے میں بہت کمزور ہے۔ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے گا۔

آخر وہ ایک گھنٹے کے بعد آئی۔ اس نے گیلے بالوں کو تولیے سے لپیٹا تھا۔ بدن پر دوسرا لباس کہہ رہا تھا کہ وہ غسل کر کے تازہ دم ہو کر آئی ہے اور یہ تو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ دو لاکھ روپے بھی اپنے وجود کے ساتھ چپکا کر لائی ہوگی۔

اس نے گھور کر اس کے پیٹ اور کمر کی طرف دیکھا۔ وہ بولی۔ ”بڑھاپے میں کہاں کہاں گھور رہے ہو‘ شرم نہیں آتی؟“

وہ بولا۔ ”تم سمجھ رہی ہو میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ عقل سے کام لو تمہارے بدن کا وہ حصہ زخمی ہو رہا ہے۔ میری مانو‘ وہ رقم الماری کی تجوری میں رکھو۔“

اس نے قمیص اٹھا کر ننگے پیٹ اور پیٹھ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”رقم یہاں نہیں ہے۔ میں نے حکیمی مرہم لگا رکھا ہے۔“

”اچھا تو اس الماری میں رکھی ہے۔“

”الماری کھلی ہے۔ جاؤ۔ دیکھ لو۔“

وہ سر ہلا کر بولا۔ ”میں بھول گیا تھا کہ تم اسے اپنی جان سے لگا کر رکھتی ہو۔ یہ تمہارے ہی پاس ہے۔“

وہ لباس کو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے بولا۔

"کمال ہے، کہاں چھپایا ہے؟"

"چھپائی جانے والی چیز بتائی نہیں جاتی۔ بس تم سوچتے ہی رہو اور کڑھتے ہی رہو۔"

وہ بولا۔ "ہم میاں بیوی ہیں۔ برسوں سے دکھ سکھ کے دن ایک ساتھ گزارتے آئے ہیں۔ آگے بھی مصیبت میں، میں ہی کام آؤں گا۔ سچ بولو میں ہمیشہ محبت کرتا رہا ہوں یا نہیں؟"

"تم اچھے شوہر ہو۔ میں شاباش کہتی ہوں۔"

"ارے کیا میں بچہ ہوں کہ شاباشی دے رہی ہو۔ مجھے میرے حصے کی رقم دو۔"

وہ گھور کر بولی۔ "کیا... تم رقم مانگ رہے ہو؟ دولاکھ پر دانت لگائے بیٹھے ہو۔ اسی لیے اسے چھپا کر رکھنے کا مشورہ دے رہے ہو۔ اور مشورہ کیوں دے رہے ہو، یہ اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔"

"تم انصاف سے بولو۔ ہم دونوں نے مل کر ماروی کی پرورش کی ہے۔ اب ان دولاکھ میں میرا حصہ ہے یا نہیں؟"

وہ ایک جھٹکے سے سر ہلا کر بولی۔ "نہیں...!"

پھر ذرا نرمی سے بولی۔ "جب ہم محبت سے ساتھ رہتے ہیں تو کیوں خوانخواہ دشمنوں کی طرح رقم کا بٹوارا کریں؟"

"میں کوئی محبت وحبت سے نہیں رہوں گا۔ تمہارے ساتھ گزارا نہیں ہوگا۔ اپنا حصہ لے کر چلا جاؤں گا۔"

"اللہ سائیں یہاں تمہاری اوقات سے زیادہ دے رہا ہے۔ یہ عیش و آرام چھوڑ کر کہیں جانے کی ناشکری کرو گے تو میں پھوٹی کوڑی نہیں دوں گی۔"

"لڑائی جھگڑے والی بات نہ کرو۔ یہ تو سوچو۔ میں مرجاؤں گا۔ تم بھی مرجاؤ گی تو یہ دولاکھ تمہاری قبر میں نہیں جائیں گے۔"

وہ بولی۔ "کوئی نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد اس کے بدن کا کپڑا کہاں جاتا ہے۔ جب تک جیوں گی یہ لباس کی طرح میرے بدن سے لپٹا رہے گا۔"

وہ اسے غصہ سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ اگر تمہارے سر میں دماغ نام کی کوئی چیز ہے تو ایسا کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا کہ تم بھی پھانسی پر چڑھ جاؤ گے۔ یہ رقم تمہارے کام نہیں آئے گی۔"

وہ بولا۔ "میں کمزور ہوں۔ بزدل ہوں۔ اپنی موت سے ڈرتا ہوں۔ تمہیں کسی بھی طرح ہلاک نہیں کرسکوں گا۔"

"تو پھر بھول جاؤ میرے پاس دولاکھ ہیں۔"

"یہ تو نہیں بھولوں گا۔ ابھی میرے دماغ میں ایک تدبیر آئی ہے۔ جب مجھے ایک پیسا بھی نہیں ملے گا تو دیکھ لینا، تمہارے پاس بھی رقم نہیں رہے گی۔"

"کیا کرلو گے تم؟"

"میں باہر جاتا رہتا ہوں۔ لوگوں سے ملتا رہتا ہوں۔ اب جس سے بھی ملوں گا اسے کہوں گا کہ میری گھر والی کے پاس دولاکھ روپے ہیں۔ وہ بیوقوف اتنی بڑی رقم کسی بینک میں نہیں رکھتی ہے۔ اسے اپنے لباس کے اندر چھپائے رکھتی ہے۔"

وہ غصے سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اے دشمن...! میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔"

وہ جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے اچھل کر صوفے کے پیچھے چلا گیا۔ اپنا دبلا پتلا سا گھونسا دکھاتے ہوئے بولا۔ "مجھے کمزور نہ سمجھو۔ میری ہڈیوں میں بڑا دم ہے۔"

"ابھی ایک چٹکی میں ناک پکڑوں گی تو دم نکل جائے گا۔ تجھے شرم نہیں آئے گی باہر جا کر بولے گا کہ میں اپنے لباس میں رقم چھپا کر رکھتی ہوں۔ چور ڈاکو آ کر مجھے ننگا کریں گے۔ چار پیسوں کے لیے میری عزت اتارے گا۔ تھو ہے تجھ پر۔"

"تجھے شرم آرہی ہے تو لا نکال میرا حصہ۔ ایک لاکھ میرے ایک تیرے۔ سارا جھگڑا ختم۔"

"ایک لاکھ روپے کبھی تیرے باپ نے بھی دیکھے ہیں۔"

"تیرے باپ نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ اب تُو دیکھ رہی ہے تو میں بھی دیکھوں گا۔"

وہ بھاگتا ہوا دروازے کے پاس آ کر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ "میں جارہا ہوں۔ تیرے دولاکھ کا ڈنکا پیٹوں گا۔ دیکھ لینا جلد ہی کیا ہونے والا ہے۔ کسی دن ڈاکو یہاں گھس کر تجھے مار ڈالیں گے۔ یا کبھی باہر نکلے گی تو تجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "اے رک جا! باہر نہ جا۔ ہم جھگڑا نہیں کریں گے۔ میں مانتی ہوں تجھے کچھ نہیں دوں گی تو میرے پاس بھی کچھ نہیں رہے گا۔ میں سمجھ گئی ہوں، ہمارے جھگڑے سے دوسروں کو فائدہ پہنچے گا۔"

وہ باہر جانے کے لیے دروازہ کھول چکا تھا۔ اسے بند کرتے ہوئے بولا۔ "تو پھر میرا حصہ دے رہی ہے؟"

"دوں گی۔ جلدی کیا ہے؟ یہاں آ۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"میں باتوں سے بہلنے والا نہیں ہوں۔ چل

کپڑے اتار۔"

"ہائے ہائے شرم نہیں آتی، کپڑے اتارنے کو کہہ رہا ہے۔ جب کہہ دیا ہے تو دوں گی۔ ذرا دم لے۔ مجھے بھی سانس لینے دے۔ اچھی طرح سوچنے دے۔"

"ہوں... میں تجھے سوچنے کا ٹائم دوں گا تو ساری رقم لے کر یہاں سے بھاگ جائے گی۔"

"کیا میں پاگل ہوں کہ گھر سے باہر رقم چھپاتی پھروں گی؟ دیکھ ایک بات بولتی ہوں۔ کل رات تک تجھے بھیج دوں گی۔"

"کل کیوں؟ آج کیوں نہیں؟ ابھی کیوں نہیں دے گی؟"

"ایک بار کہہ دیا ہے۔ دوں گی تو کل۔ ابھی میرا دماغ ٹھنڈا ہونے دے۔ مجھے سوچنے دے۔"

"میں جانتا ہوں، مجھے جھانسا دینے والی، مجھے اُلّو بنانے والی کوئی بات سوچے گی۔"

"میں نے ایک بات کہہ دی۔ یقین کرنا ہے تو کر۔ کل رات کو تیرے ہاتھ میں تیرا حصہ ہوگا۔ نہیں مانتا تو جا۔ جو کرنا ہے کرلے۔ تیرے کمینے پن سے ہم دونوں ہی برباد ہوں گے۔"

اس نے بڑی بے بسی سے اس ضدی عورت کو سوچتے ہوئے دیکھا۔ پھر مجبور ہو کر دروازے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

☆☆☆

وہ آہنی جالیوں کے آر پار ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوئے تھے۔ اپنے دلوں کی باتیں بولنے کے لیے وقت کم تھا پھر بھی بول رہے تھے۔

جب ماروی وہاں آئی تو اس سے کہا گیا تھا کہ ملاقات کے لیے صرف پندرہ منٹ کی اجازت ہے۔ لیکن اب آدھا گھنٹا گزر رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ "یہ محبوب سائیں کی مہربانی ہے۔ انہوں نے جیلر کے پاس جا کر ٹائم بڑھایا ہوگا۔"

ماروی نے کہا۔ "تم بولتے ہو، وہ اپنی دنیا میں بہت سخت اصولوں والے آدمی ہیں۔ کسی سے بولتے نہیں ہیں۔ اپنے کاروبار سے لگے رہتے ہیں۔ اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ وہ بہت رکھ رکھاؤ والے، سخت اصولوں والے اور بڑے رعب اور دبدبے والے آدمی ہیں۔"

"وہ سخت اصول والے آدمی آج پتا نہیں کتنے بجے گھر سے نکلے۔ نو بجے مجھے یہاں لے کر آئے۔ میرے انتظار میں اُدھر کہیں آفس میں بیٹھے ہیں۔ صرف مجھے

یہاں سے گھر پہنچانے کے لیے اپنا کتنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

مراد نے جواب نہیں دیا۔ اس کا منہ تکنے لگا، وہ بولی۔ "یہ میں کہہ رہی ہوں کہ وہ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ لیکن اندر کی بات جانتی ہوں وہ تو دعائیں مانگ رہے ہوں گے کہ مجھے لانے لے جانے کا وقت کبھی ختم نہ ہو۔"

"ماروی! وہ اپنے طور پر تمہیں چاہتے ہیں۔ انہیں چاہنے دو۔ ان کی چاہت ہمیں نقصان نہیں پہنچا رہی ہے۔"

وہ آہنی جالیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں چھو نہیں سکتا۔ ابھی خیالوں میں ہاتھ تھام کر کہتا ہوں۔ تم صرف میرے لیے پیدا ہوئی ہو۔ جب تک ان کی شرافت اور دیانتداری قائم ہے۔ میں خاموش تماشائی ہوں۔ اگر انہوں نے کبھی تمہیں چھین لینے والی حرکت کی تو میں..."

وہ بولی۔ "تو میں تم سے پہلے ان کی دشمن بن جاؤں گی۔ ان کی تمام عنایتوں کو ٹھکرا دوں گی۔"

"اور میں ان سے صاف کہہ دوں گا کہ میرا مقدمہ نہ لڑیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میری بے گناہی ثابت نہیں ہو سکے گی۔ مجھے سزائے موت ہوگی۔ ہونے دو۔"

وہ ایکدم سے تڑپ کر بولی۔ "چپ ہو جاؤ۔ مریں گے تمہارے دشمن۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ میں تمہاری موت کا تماشا دیکھوں گی؟ ہرگز نہیں، مر جاؤں گی مگر تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔"

"تم میری زندگی کسی سے مانگ کر یا خرید کر نہیں لا سکو گی۔"

"لاؤں گی۔ کچھ بھی کر گزروں گی۔ اپنے آپ کو بیچ دوں گی مگر تمہاری زندگی خرید لوں گی۔"

"پھر تو خریدار وہی ہوگا۔"

ماروی کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ محبوب ہی مہربان تھا اور اس کا قدردان تھا۔ محبوب ہی اسے مراد کی چھاؤں میں پہنچا سکتا تھا اور محبوب ہی اپنی دیوانگی کی دھوپ میں اسے لا رہا تھا۔

ایک لیڈی کانسٹیبل نے آ کر کہا۔ "ٹائم ختم ہو گیا۔ چلو بی بی...! اب یہاں سے..."

دونوں نے بڑے دکھ سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے جالی پر اپنے اپنے ہاتھ رکھے۔ وہ بولی۔ "میں پھر آؤں گی۔"

وہ بولا۔ "بار بار آنے نہیں دیا جائے گا۔ مگر ہاں محبوب صاحب سے کہو گی تو شاید جلد ہی آ سکو گی۔"

لیڈی کانسٹیبل نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ "چلو..."

وہ اسے دیکھتے ہوئے اس کمرے سے باہر آ گئی۔ مراد کی صورت نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن وہ صورت جیلر کے آفس میں پھر سامنے آ گئی۔ جو آہنی دیواروں کے پیچھے مجبور اور بے بس تھا۔ وہ آزادی سے سامنے آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

اچھی طرح سمجھنے کے باوجود دل نہیں مانتا، دھوکا کھاتا ہے۔ ماروی نے چند لمحوں تک بے اختیار مراد کو دیکھا پھر محبوب کو دیکھتے ہی سر جھکا لیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "آؤ چلیں۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔ ماروی مراد کے شانہ بشانہ چلتی تھی۔ اس وقت جیسے سائے کے پیچھے چلتے ہوئے باہر جیل کے احاطے میں آئی۔ محبوب نے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔

وہ دروازہ پیار سے کھل کر خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ کبھی مراد کبھی محبوب، پھر وہی دھوکا دینے والی قربت پکار رہی تھی۔ تقدیر مذاق کر رہی تھی۔ کبھی فاصلہ بڑھا رہی تھی کبھی فاصلہ مٹا رہی تھی۔ کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ محبوب نے کہا۔ "لنچ کا وقت ہو گیا ہے پھر یہ کہ ریسٹورنٹ میں ایک اہم شخص سے ملنا ہے، کاروباری میٹنگ ضروری ہے۔ پہلے ہم وہاں جائیں گے۔"

وہ پریشان ہو گئی۔ کسی ہوٹل میں یا کسی بھی جگہ اس کے ساتھ جانے سے کیسے انکار کرے؟ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔ "میں آج تک کبھی کسی ہوٹل میں نہیں گئی۔ مجھے ایسی جگہ نہ لے جائیں۔"

اس نے سمجھایا۔ "جو کام ہم کبھی نہیں کرتے، اسے کبھی کرنا پڑتا ہے۔ ہر نئے چیلنج کا سامنا کیے بغیر زندگی نہیں گزرتی۔"

وہ گاڑی کو ایک طرف موڑتے ہوئے بولا۔ "دیکھو آگے بڑھتے رہنے کے لیے راستے بدلنے پڑتے ہیں۔ ابھی میں سمجھا رہا ہوں پھر وقت سمجھائے گا کہ خود کو بدلنے سے نہ گھبراؤ۔"

وہ سر کے آنچل کو گھونگٹ کی طرح آگے کرتے ہوئے بولی۔ "میں بول نہیں پا رہی ہوں۔ دراصل وہاں بڑے لوگ ہوں گے۔ مجھے گھبراہٹ سی ہوگی۔"

"خود کو چیونٹی سمجھو گی تو لوگ پہاڑ دکھائی دیں گے۔ تم اس وقت دولت کے پہاڑ کے شانہ بشانہ ہو۔ سر اٹھا کر اونچے دماغ سے دیکھتی رہو، تمام بڑے لوگ چھوٹے اور

حقیر دکھائی دیں گے۔"

وہ سمجھ گئی۔ اس کے آگے بول نہیں پائے گی۔ چپ چاپ اپنے آنچل سے کھیلنے لگی۔ محبوب نے ہاتھ بڑھا کر ڈیش بورڈ کے خانے کو کھولا پھر ایک ڈبا نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اسے کھولو۔"

ڈیش بورڈ کا خانہ بند ہو گیا۔ ماروی نے اس ڈبے کو ہاتھوں میں لے تو لیا تھا لیکن یہ سوچ کر گھبرا رہی تھی کہ وہ دوستی کی ابتدا کرنے کے لیے کوئی تحفہ دے رہا ہے۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ قبول نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ ہاتھوں میں آ چکا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نصف قبولیت ہو چکی تھی۔ ہاتھوں میں مہندی لگ چکی تھی۔ اسے چھڑا نہیں سکتی تھی۔

محبوب نے کہا۔ "کھولو...!"

وہ ایک محسن اور مہربان کے مزاج کے خلاف کچھ بول نہیں سکتی تھی پھر بھی اس نے ہمت کی اور کہا۔ "آپ ناراض نہ ہوں۔ میں کوئی تحفہ نہیں لوں گی۔"

وہ ذرا چپ رہا پھر بڑے تحمل اور سنجیدگی سے بولا۔ "ٹھیک ہے نہ لو۔ لیکن یہ تحفہ نہیں ہے۔"

ماروی نے پہلی بار پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر نظریں ملتے ہی سر کو جھکا لیا۔ اس نے کہا۔ "یہ ضرورت کی چیز ہے۔ تمہارے لیے ایک موبائل فون ضروری ہے۔"

"میں اسے لے کر کیا کروں گی؟ جس سے بات کرنا چاہوں گی اس کے پاس فون نہیں ہوگا۔ اسے کوئی مجھ سے بات کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔"

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولا۔ "حالات ایسے ہیں کہ تمہیں مراد کے علاوہ دوسروں سے بھی ضروری باتیں کرنی ہوں گی۔ کیا یہ معلوم کرنا نہیں چاہو گی کہ مقدمہ لڑنے کے سلسلے میں کیا کیا جا رہا ہے؟"

وہ سر جھکا کر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی۔ "ہوں...!"

"کیا یہ معلوم کرنا نہیں چاہو گی کہ دشمن وڈیرا کس طرح مراد کو پھانس رہا ہے اور ہم اسے کس طرح سازشوں سے نکالنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ کیا مراد سے پھر جیل میں ملاقات کرنے کے لیے اور اس کی بہتری کے لیے مجھ سے فون پر نہیں بولو گی؟"

وہ تو مراد کے بارے میں دن رات معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی اور ضرورتیں ایسی تھیں کہ مجبوراً محبوب سے کچھ بولنا ضروری ہو جاتا... محبوب نے پوچھا۔ "اب تم خود بتاؤ کیا تم مجھ سے رابطہ کر کے ایسی تمام معلومات حاصل نہیں کرو گی۔ مراد سے بے خبر ہو کر بیٹھی رہو گی؟"

وہ تمام سوالات ایسے ٹھوس حقائق پر مبنی تھے کہ وہ جواب نہیں دے سکتی تھی۔ محبوب نے کہا۔ "اب بھی سمجھتی ہو کہ یہ ضروری نہیں ہے تو اسے کھڑکی کھول کر باہر پھینک دو۔"

اس نے چونک کر محبوب کو دیکھا۔ اس کی نظریں ونڈ اسکرین کے پار تھیں۔ وہ بڑے سکون سے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کسی پہلو سے دیوانہ عاشق نہیں لگ رہا تھا۔ وہ شبہ نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی اس کے دل میں بیٹھی ہے۔

ویسے محبوب نے یہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ فون اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ اس کے ذریعے محبوب تک اور محبوب کے ذریعے مراد کی خیر خیریت تک پہنچ سکتی تھی۔

وہ اپنے محسن سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ معروف تجلی سے بھی فون پر ضروری معلومات حاصل کر سکتی ہے۔ ایسا کہنے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ نیکی کرنے والے کو اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ خوامخواہ اس سے کترا رہی ہے۔

آخر اس نے مجبور ہو کر ریپر کو ہٹا دیا۔ ڈبے کو کھولا۔ ایک بہت ہی مہنگا خوبصورت موبائل فون دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ چارجر اور ایئر فون رکھے ہوئے تھے۔ محبوب نے کہا۔ "پہلے اچھی طرح یقین کر لو کہ فون تمہارے لیے ضروری ہے۔"

اس نے فون کو پہلے چھو کر دیکھا پھر اسے ہاتھ میں لے کر بولی۔ "میں مانتی ہوں، یہ میرے لیے ضروری ہے۔ لیکن میں نے فون کو اب تک دور سے دیکھا ہے کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میں نہیں جانتی، اس کو کیا کرنا ہے، کیسے باتیں کرتے ہیں؟"

"ویسے تو یہ آسان ہے۔ میں سمجھاؤں گا تو چند منٹوں میں کال کرنا اور کال ریسیو کرنا آ جائے گا لیکن اس میں اور بہت سی دلچسپیاں ہیں۔ تم اس کے ذریعے پیغام بھیج سکتی ہو اور پیغام وصول کر سکتی ہو۔ اس میں طرح طرح کے کھیل تماشے ہیں۔ تمہیں کھیلنا آ جائے گا تو وقت اچھا گزارتی رہو گی۔ یہ ایک کیمرا بھی ہے۔ تم اپنی اور دوسروں کی چلتی پھرتی تصویریں اتار سکو گی۔"

"میں اتنی ساری باتیں سیکھ نہیں سکوں گی۔"

"ایک دن میں نہ سہی۔ ایک ہفتہ میں سیکھ لو گی۔ آج میرے دفتر کی ایک ملازمہ تمہارے پاس آئے گی۔ پھر روز آ کر تمہیں بہت کچھ سکھاتی رہے گی۔"

"میرا دل کسی بات میں نہیں لگتا۔ یہ کام کی چیز ہے۔ پھر بھی میں سیکھ نہیں سکوں گی۔"

"مراد کے آنے تک تمہیں وقت گزارنے کے لیے اچھی اچھی باتیں سیکھنی ہوں گی۔ سوچو وہ آئے گا اور تمہارے اندر اچھی تبدیلیاں دیکھے گا تو کتنا خوش ہوگا؟"

اس نے چشم تصور سے اپنے یار کو دیکھا۔ وہ خوش ہو کر حیرانی سے کہہ رہا تھا۔ "ماروی! یہ تمہارا لباس، تمہاری باتیں، یہ موبائل فون، یہ صاف ستھری زندگی کتنی اچھی لگ رہی ہو۔ تم پڑھی لکھی شہری لڑکیوں کی طرح دکھائی دے رہی ہو۔"

وہ دور مراد کے پاس پہنچ گئی تھی اور بے اختیار مسکرا رہی تھی۔ محبوب نے ڈرائیو کرتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھا پھر وہ بھی مسکرانے لگا۔ وہ یہی چاہتا تھا، اس کے لبوں پر مسکراہٹیں کھیلتی رہیں اور وہ اپنا غم بھول جائے۔ تھوڑی دیر کے لیے سہی، یار سے دور ہو کر اس کے سامنے مسکرائے۔

اور وہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

وہ پہلی بار کسی بڑے ہوٹل کے ڈائننگ روم میں آئی۔ وہاں کے رئیسانہ ماحول میں خود کو بہت ہی حقیر محسوس کرنے لگی۔ اس نے اندر آتے ہی پریشان ہو کر کہا۔ "میرا دل گھبرا رہا ہے۔ مجھے اپنی کار ہی میں بیٹھنے دیں۔"

"تم اس لیے گھبرا رہی ہو کہ خود کو چھوٹی اور کمتر محسوس کر رہی ہو۔ اپنے دل میں پورے یقین سے اور فخر سے یہ کہو کہ تم اس ملک کے ایک ارب پتی کے ساتھ ہو اور یہ سب لوگ تم سے چھوٹے ہیں۔ پھر تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوگی۔"

وہ ایک میز کے پاس آ کر رک گئے تھے۔ ایک شخص جو عمدہ لباس میں نکٹائی پہنے ہوئے تھا۔ اس نے سامنے آ کر سلام کیا پھر ماروی کو بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔ اس نے حیران ہو کر محبوب کو دیکھا۔ محبوب نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹھو۔"

وہ بیٹھ گئی۔ محبوب بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ شخص ان کے سامنے مینیو رکھ کر چلا گیا۔ وہ حیرانی سے بولی۔ "اس رئیس آدمی نے مجھے سلام کیا ہے۔ مجھے کرسی پر بٹھایا ہے۔"

محبوب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ ویٹر ہے۔ اس ہوٹل کا ملازم ہے۔ اس ہوٹل کے باہر میرے ساتھ جہاں جاؤ گی وہاں بڑے بڑے لوگ تمہاری عزت کریں گے۔ تمہیں سلام کریں گے۔ یہ سوچنا چھوڑ دو کہ تم اس دنیا کے کسی بھی امیر آدمی سے چھوٹی ہو اور غریب ہو۔ اب تم جھگی میں رہنے والی ماروی نہیں ہو۔"

وہ سر جھکا کر یہ مان رہی تھی کہ محبوب نے اسے کوٹھی میں پہنچا کر کار میں بٹھا کر رئیسوں کے ہوٹل میں لا کر اس کا مان مرتبہ بڑھایا ہے اور اس کے اندر سے احساس کمتری ختم کر رہا ہے۔

جھکے ہوئے سر کو اٹھانا نیکی ہے۔ اور وہ بلاشبہ نیکی کر رہا ہے۔

وہ مان رہی تھی کہ محبوب نے اسے برتر بناتے وقت اب تک مراد کو کمتر نہیں کہا ہے۔ اس نے کسی بھی بہانے اسے اپنے مقابلے میں حقیر نہیں کہا ہے۔

ہاں مگر نہ کہنے کے باوجود ایک کا ہاتھ اوپر تھا، دینے والا اور دوسرے کا ہاتھ نیچے تھا، لینے والا۔ ماروی کے لاشعور میں مانگنے والے اور دینے والے کا فرق کچھ سمجھائے بغیر واضح ہو رہا تھا۔

جب وہ گھر کی طرف واپس جا رہی تھی تو سوچ رہی تھی۔ "محبوب صاحب شریف انسان ہیں۔ اس کے اور مراد کے درمیان دیوار نہیں ہیں۔ لیکن میرے دیوانے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہوٹل میں ایک اہم شخص سے کاروباری ملاقات کرنی ہے لیکن وہاں کوئی ان سے ملنے نہیں آیا تھا۔ انہوں نے میرے ساتھ زیادہ دیر تک وقت گزارنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔"

☆☆☆

حشمت جلالی کے دونوں بیٹے رحمت جلالی اور برکت جلالی شہر آئے ہوئے تھے۔ ان کے لیے گوٹھ کی عورتیں گھر کی مرغی دال برابر لگتی تھیں۔ جب چاہتے حاصل کر لیتے تھے۔ شہر میں دال نہیں گلتی تھی۔ ایسے گلفام نہیں تھے کہ کوئی ان پر عاشق ہو جاتی۔

وہ مایوس کبھی نہیں ہوتے تھے۔ شہر کی مٹھائی کھائے بغیر واپس نہیں جاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کرائے کی عورتیں اٹھا لیں تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ہائی روف میں ایسی شان سے گھوم رہے تھے۔ جیسے مقابلۂ حسن سے دو عالمی حسیناؤں کو جیت کر لے جا رہے ہوں۔

وہ ان کے ساتھ ہنس بول رہے تھے اور انہیں اپنی مردانگی کے قصے سنا رہے تھے۔ وہ چھٹی ہوئی پیشہ ور عورتیں تھیں۔ ان کے جھوٹے سچے قصے سن کر حیران ہو رہی تھیں اور ان کی ایسی تعریفیں کر رہی تھیں جیسے پہلے کبھی ایسے مرد نہ دیکھے ہوں۔

وہ اپنی اوقات کے مطابق انجوائے کرتے ہوئے ایک پیٹرول پمپ پر آ کر رک گئے۔ برکت نے ملازم سے کہا۔ "ٹنکی بھر دو۔"

رحمت نے کہا۔ "بھر دو نہیں، فل کر دو۔"

رحمت نے شہری عورتوں کے سامنے اسے ٹوکا تھا۔ اس نے بھائی کو گھور کر کہا۔ "مجھے بھی انگریزی آتی ہے۔"

پھر وہ کھڑکی کے باہر دیکھ کر چونک گیا۔ رحمت کے شانے کو جھنجوڑ کر بولا۔ "رحمت! وہ دیکھ مراد علی۔"

پیٹرول پمپ کی پہلی دوسری اور تیسری لین میں کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ آخری لین میں محبوب علی اپنی کار سے باہر آ کر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ برکت نے کہا۔ "وہ مراد نہیں محبوب علی چانڈیو ہے۔ ارے واہ...! کیا خدا کی قدرت ہے ایک کو دیکھو تو دوسرے کا دھوکا ہوتا ہے۔"

ان بھائیوں کے لیے ایک اور چونکا دینے والی بات تھی۔ محبوب کی کار اس رخ پر کھڑی تھی کہ ڈرائیونگ سیٹ ادھر تھی۔ اِدھر کھڑکی کے پاس ماروی بیٹھی ہوئی تھی۔ جب اس نے سر گھما کر کھڑکی کے باہر دیکھا تو وہ دونوں اسے چند لمحوں تک حیرت سے منہ کھول کر دیکھتے ہی رہ گئے۔

انہوں نے برسوں پہلے اسے گوٹھ میں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو وہ سیدھی آ کر دل میں ترازو ہو گئی۔ دونوں کے دل ترازو کے پلڑوں کی طرح اوپر نیچے ہونے لگے۔

وہ گوٹھ میں اسے دیکھ کر للچاتے تھے۔ لیکن باپ کی نظر اس پر تھی۔ اس لیے اس سے دور رہتے تھے۔ وہاں ابھی باپ نہیں تھا وہ اسے جی بھر کے دیکھ سکتے تھے۔ اب بھی دور ہی سے للچانے والے تھے۔ کیونکہ مجبور تھے۔ وہ اس شہر کے بہت بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار کے ہاتھ میں تھی۔

انہوں نے اپنی خریدی ہوئی عورتوں کو دیکھا تو یوں لگا جیسے تاج محل سے نکل کر کھنڈر میں آ گئے ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں شدت سے اپنی اوقات کا پتا چلا۔ وہ اپنی توہین محسوس کر رہے تھے۔

برکت نے جیب سے روپے نکالے۔ ہزار ہزار کے تین تین نوٹ نکال کر دونوں کو دیتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے جاؤ۔ اب ہمیں ضرورت نہیں ہے۔"

ایک عورت نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ اچانک کیا ہو گیا ہے؟ ہمیں راستے میں چھوڑ رہے ہو؟"

اس نے کہا۔ "ہمیں دوسرے کام سے کہیں جانا ہے۔"

انہوں نے رقم لی۔ پھر کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیا ہم پیدل جائیں گے؟ ٹیکسی کا کرایہ تو دو۔"

اس نے پانچ سو روپے دیے۔ وہ دونوں گاڑی سے نکل کر چلی گئیں۔ رحمت نے اگلی سیٹ پر آ کر کہا۔ "تم نے اچھا کیا انہیں بھگا دیا۔ بھائی! یہ ماروی کیا سے کیا ہو گئی ہے؟"

بھائی نے کہا۔ "کلی سے پھول اور گل سے گلستان ہو گئی ہے۔ کیا خیال ہے۔ اس کے پیچھے چلیں؟"

"ہاں۔ ہم ماروی کا پیچھا کریں گے۔ دیکھیں گے محبوب اسے کہاں لیے جا رہا ہے۔"

محبوب اسٹیرنگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ لیکن گاڑی وہاں سے نکال کر لے جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ کئی گاڑیاں بے ترتیبی سے آگے پیچھے کھڑی تھیں۔

یوں وہ دونوں ماروی کو نظر بھر کر دیکھ رہے تھے۔ اپنی گاڑی لین سے نکال کر ایسی جگہ لے آئے تھے۔ جہاں سے وہ دور ہونے کے بعد بھی نظر آ رہی تھی۔

برکت نے کہا۔ "یہ چانڈیو بڑا موقع پرست ہے۔ مراد جیل میں ہے اور یہ اس کی محبوبہ کے ساتھ مزے کر رہا ہے۔"

رحمت نے کہا۔ "اسے داشتہ بنا کر رکھتا ہے۔ ہمیں معلوم تو ہوا اسے کہاں رکھتا ہے؟"

وہ دونوں کھڑکی کی طرف ایسے جھکے ہوئے تھے جیسے ابھی چھلانگ مار کر ماروی کے پاس پہنچ جائیں گے۔ رحمت نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "بھائی! کیا چیز ہے۔ اللہ سائیں کبھی کبھی کوئی ماروی پیدا کرتا ہے۔"

برکت نے کہا۔ "اور ہم دور ہی سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ تھو ہے ہمارے نصیب پر۔ ہمارے گوٹھ کی چیز ہے اور ہم دور سے للچا رہے ہیں اور وہ چانڈیو مزے لوٹ رہا ہے۔"

محبوب کی کار گاڑیوں کے ہجوم سے نکل آئی۔ ان کی ہائی روف بھی حرکت میں آ گئی۔ ان کے پیچھے طارق روڈ کی سمت جانے لگی۔ رحمت نے کہا۔ "مجھے بابا سائیں پر غصہ آ رہا ہے۔ نہ خود کھا سکا۔ نہ ہمیں کھانے دیا۔"

برکت نے کہا۔ "بابا سائیں دھوکا کھا گیا۔ بابا سائیں تو کیا ہم بھی کبھی سوچ نہیں سکتے تھے کہ اس کے چاچا چاچی اسے راتوں رات گوٹھ سے لے جائیں گے۔"

"اس بوڑھی اور بوڑھے نے کتنا لمبا ہاتھ مارا ہے۔ چانڈیو نے ماروی کی اچھی قیمت دی ہوگی۔"

"بلا سے اچھی قیمت دی ہوگی۔ یہ سوچو کیا ہمیں اب بھی مل سکتی ہے؟ یا اب بھی دور ہی سے دیکھتے رہ جائیں گے؟"

"یہاں شہر میں ہماری بدمعاشی نہیں چلے گی۔ ویسے بابا سائیں دو برس بعد اسے دیکھ کر پاگل ہو رہا ہے۔ وہ شہر کے بدمعاشوں سے کام لینے والا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ہم تو منہ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔ ابھی اسے نہ دیکھتا تو اچھا ہوتا۔ یہ میرا سکون برباد کر رہی ہے۔"

"میں بھی تڑپتا رہوں گا۔ ایک راستہ تو یہی ہے کہ

بابا سائیں اسے کسی طرح اٹھالیں۔ اور یہاں سے حویلی میں لے جائیں تو کبھی ہمیں بھی موقع ملے گا۔"

محبوب کی کار بہادر آباد کی ایک کوٹھی کے احاطے میں جا کر رک گئی تھی۔ برکت نے کہا۔ "چانڈیو اسی کوٹھی میں اُسے رکھتا ہے۔ آؤ واپس چلو۔ یہ شکار بابا سائیں ہی کھیل سکتے ہیں۔ انہیں بتانا ہوگا کہ ماروی اس کوٹھی میں ہے۔"

☆☆☆

محبوب نے فون کے ذریعے کسی خاتون سے کہا تھا کہ وہ بہادر آباد والی کوٹھی میں آجائے۔ جب ماروی کوٹھی کے احاطے میں آکر کار سے اتری تو وہ خاتون بھی وہاں پہنچ گئی۔ محبوب نے تعارف کرایا۔ "یہ ماروی ہے۔ میں ان کے متعلق آپ کو بتا چکا ہوں۔"

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ "یہ میڈم روزی ہیں۔ اندر چلو وہاں باتیں کرتے ہیں۔"

چاچی نے ان کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ محبوب نے کہا۔ "ماروی! یہ میڈم روزی آج سے تمہاری گورنس ہیں۔ تم سب کو کوٹھی میں رہنے سہنے اور گفتگو کرنے کے آداب سکھائیں گی۔ پوری کوٹھی کو کس طرح سجا بنا کر رکھنا ہے' یہ ان کے ساتھ رہ کر سیکھ لو گی۔ تمہیں موبائل فون کو استعمال کرنا بھی آجائے گا۔ میڈم یہاں دن رات رہا کریں گی۔"

چاچی نے کہا۔ "آپ ہمیں انسان بنانے کے لیے اور سر اٹھا کر رہنے کے لیے دن رات ہمارے کام آرہے ہیں۔ ماروی کو سمجھنا چاہیے کہ آپ کتنی محبت کرنے والے انسان ہیں۔"

ماروی نے چونک کر محبوب کو دیکھا۔ اس سے نظریں ملیں تو سر کو جھکا لیا۔ چاچی نے اپنے انداز سے یہ جتایا تھا کہ محبوب اس سے محبت کرتا ہے۔ میڈم روزی کے سامنے ایسی بات کہنا سراسر جہالت تھی۔ وہ جھینپ رہی تھی۔ صوفے پر پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔

جب محبوب وہاں سے جانے لگا تو میڈم نے ماروی کی طرف جھک کر کان میں کہا۔ "یہ تمہارے محسن ہیں۔ انہیں باہر جا کر رخصت کرنا اخلاقی فرض ہے۔"

میڈم یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ اپنے دیوانے کو رخصت کرنے باہر تک جاؤ۔ لیکن چاچی اور میڈم میں تعلیم اور تربیت کا فرق تھا۔ اس نے محبوب کو محسن کہا تھا اس کا دیوانہ نہیں کہا تھا۔ وہ محبوب کے ساتھ باہر کار تک آئی۔ لیکن خاموش رہی۔ رسمی طور پر کچھ کہنا چاہیے تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کہے...؟

اس نے کار کا دروازہ کھول کر بیٹھنے سے پہلے کہا۔ "شکریہ۔"

ماروی نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کی نظروں نے پوچھا۔ "کس بات کا شکریہ...؟"

"تم مجھے رخصت کرنے یہاں تک آئی ہو۔ تم نے اپنایت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے۔"

وہ الجھ گئی۔ اس نے اپنایت والی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اخلاقی فرض ادا کر رہی تھی۔ یہ بڑی مشکل تھی' وہ لفظ اپنایت سے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کار اسٹارٹ کر کے الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر چلا گیا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ ایسے محبوبانہ انداز پر اعتراض کرتی، صاف کہہ دیتی کہ میرے مراد کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جگہ بنا رہا تھا۔ اس کے سامنے اعتراضات کے تمام دروازے بند کر دیے تھے' احسانات کے دروازے دونوں بانہوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میڈم روزی نے اس کے پاس آکر کہا۔ "میں جا رہی ہوں۔ اپنا مختصر سا ضروری سامان لے کر شام تک آجاؤں گی۔"

وہ اس سے مصافحہ کر کے چلی گئی۔ ماروی نے ڈرائنگ روم میں آکر چاچی کو گھور کر کہا۔ "تم سوچے سمجھے بغیر بولتی کیوں ہو؟"

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "میں نے کیا کہا ہے؟"

"تم نے محبوب صاحب کے سامنے یہ کیوں کہا تھا کہ مجھے سمجھنا چاہیے کہ وہ کتنی محبت کرنے والے انسان ہیں؟"

"میں نے کیا غلط کہا تھا۔ ان کی محبتوں سے، مہربانیوں سے ہم اس محل میں رہتے ہیں۔"

"ہاں تو ان کی محبت' ان کی مہربانیاں ہم سب کے لیے ہیں۔ صرف میرے لیے تو نہیں ہیں۔ تم نے میڈم روزی کے سامنے صرف میرا نام لے کر کیوں کہا؟"

"کہہ دیا تو کیا ہوا؟ کیا دنیا نہیں دیکھ رہی ہے کہ کوئی اتنی دولت کس کے لیے لٹا رہا ہے؟"

وہ دیدے پھاڑ کر چاچی کو دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "تم زیادہ سے زیادہ مجھ سے جھگڑا کرو گی۔ مگر جو سچ ہے اسے کیسے جھٹلاؤ گی؟ وہ معروف حجی صاحب ہیں۔ اب میڈم روزی آئی ہیں اور ان کے کئی ملازم جو یہاں آکر ہمارے ضروری اور مشکل کام کر دیتے ہیں۔ کیا وہ نہیں جانتے ہیں کہ ان کے مالک محبوب صاحب کس کی خاطر ان سے ہم لیے رہتے ہیں؟"

وہ شکست خوردہ انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ چاچی نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ تمہارے پیچھے پاگل ہیں اور میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ وڈیروں اور شہری دولت مندوں کی طرح عیاش نہیں ہیں۔ تمہیں دل و جان سے چاہتے ہیں۔ وہ تمہیں خرید نہیں رہے ہیں۔ تمہاری مصیبتوں میں کام آرہے ہیں۔"

وہ صوفے پر پہلو بدل کر بولی۔ "کیا وہ اتنی سی بات نہیں سمجھ رہے ہیں کہ میں بدنام ہو رہی ہوں۔"

"کیا دنیا بدنام کرے گی تو وہ تمہاری مصیبتوں میں کام آنا چھوڑ دیں گے؟ اگر انہوں نے چھوڑ دیا تو ہم پھر وہیں مسکین گوٹھ میں چلے جائیں گے اور مراد کبھی جیل سے باہر نہیں آئے گا۔"

"وہ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ صرف مراد کے کام آئیں اور میری طرف آنا جانا چھوڑ دیں۔"

"کیا تم مراد کو محبت کرنے سے روک سکتی ہو؟"

"میں کیوں روکوں گی؟"

"مان لو کہ تم اسے صاف کہہ دیتی ہو کہ اس سے اب محبت نہیں کرتی ہو۔ وہ بھی نہ کرے تو؟"

"تو وہ میری چاہت سے باز نہیں آئے گا۔ میں اسے چاہوں یا نہ چاہوں۔ مرتے دم تک میری محبت کا دم بھرتا رہے گا۔"

"اسی کو عشق کہتے ہیں۔ محبوب صاحب بھی اپنے دل سے مجبور ہیں۔ تم انہیں چاہو یا نہ چاہو آئندہ آزما لو وہ بھی تمہاری محبت سے باز نہیں آئیں گے۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ چاچی اس کے قدموں کے پاس آکر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ "بیٹی! مراد اور محبوب صاحب دونوں ہی ایک جیسے ہیں۔ اگر صورت دیکھ کر اور مراد کو دیکھ کر ایک کو چاہتی ہو تو دوسرا بھی بالکل وہی ہے۔"

وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "جب دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو ذرا عقل سے سوچو اور بولو کہ مراد کیا ضروری ہے اور محبوب کیوں غیر ضروری ہے؟ ایک دل میں سمایا ہے دوسرے سے کیوں کترا رہی ہو؟"

"اس لیے کہ مراد میرے بچپن کا پیار ہے۔ کچی عمر سے دل اور دماغ میں رہتا آیا ہے۔"

"کچی عمر کا پھل میٹھا ہے اور کچی عمر کا پھل کچا ہی رہ گیا۔ بہت سا گر وہ مقدمہ سے نہ چھوٹا' کبھی باہر نہ آسکا۔ اگر عمر قید ہو گئی تو کیا ہوگا؟ کیا ساری عمر محبوب صاحب کی گاڑی میں بیٹھ کر جیل میں اس سے ملنے جاتی رہو گی؟"

اس سے جواب نہ بن پڑا۔ وہ بولی۔ "ایسا نہیں ہوگا۔"

"اللہ کرے ایسا نہ ہو۔ اسے رہائی مل جائے۔ تجھے یہ سوچنا اور سمجھنا چاہیے کہ رہائی نہ ملی تو کیا ہوگا؟"

"جب ایسا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔"

"ہاں تب دیکھا جائے گا تو یہی اندر کی بات بول' کیا دیکھے گی' کیا کرے گی؟ ایمان سے بول میری بچی! کیا مراد ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے گا تب بھی محبوب صاحب کو ان کی محبتوں کا اور مہربانیوں کا صلہ نہیں دے گی؟"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "چاچی! چپ ہو جاؤ۔ مجھے پریشان نہ کرو۔ جب مراد نہیں آئے گا تو میں مر جاؤں گی۔"

"واہ شاباش! خوامخواہ جان دے کر اپنے محسن کو اپنے مہربان کو بھی مار ڈالے گی۔ وہ منہ سے نہیں بولتا۔ میں اس کی آنکھوں میں پڑھ چکی ہوں۔ وہ تیرے بغیر نہیں جیئے گا۔"

"خدا کے لیے چاچی کوئی دوسری بات کرو۔ چھوڑو میں ہی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔"

وہ جانے کے لیے اٹھنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ہی چاچی اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔ "نہ جا۔ میری بات سن۔ میں نہیں کہتی کہ بے وفا بن جا اور مراد کو چھوڑ دے۔ میں کہوں گی تو یہ ذلالت ہوگی۔ مراد تمہیں مبارک ہو۔ لیکن میری بچی...! محسن کے احسانات کا کچھ تو صلہ دے۔"

وہ ذرا چپ ہوئی پھر بولی۔ "دل مراد کے لیے ہے محبوب صاحب کو دل نہ دے۔ مگر ان کے ساتھ دل سے ہنستی بولتی رہا کر۔"

"ہنسنے بولنے سے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہیں گے۔"

"جب تمہارا دل صاف ہے تو ڈر کیسا؟ وہ بہت سمجھ دار ہیں غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ مجھ سے ذرا بھی شہہ ملے گی تو وہ میرا ہاتھ پکڑنا چاہیں گے۔ کیا مردوں کی فطرت نہیں جانتی ہو؟"

"جانتی ہوں۔ تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ ابھی میری اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ جب تک تم ہاتھ نہیں بڑھاؤ گی وہ شریف آدمی اپنی انگلی بھی تمہاری طرف نہیں بڑھائے گا۔"

وہ چاچی کو دیکھ کر سوچنے لگی۔ "واقعی وہ شریف آدمی ہیں۔ جب تک پھل خود ہی شاخ سے ٹوٹ کر نہیں آئے

گا۔ وہ اسے ہاتھ میں نہیں لیں گے۔"

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ "پھر بھی میرا دل ڈرتا ہے۔ مجھے دور دور محتاط رہنا ہوگا۔"

وہ چاچی سے کہہ نہیں سکتی کہ دل اس لیے ڈرتا ہے کہ۔ کہ۔ وہ بالکل مراد ہی مراد ہے۔ میں اس سے زیادہ بولوں گی۔ زیادہ اس کے قریب رہوں گی تو کبھی جادو نہ چل جائے۔ کہیں اسے مراد نہ سمجھ لوں۔ وہ ہاتھ پکڑے گا تو یہی لگے گا کہ مراد نے تھام لیا ہے۔

نہیں۔ میں ایک ہی جیسی صورت سے دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ احتیاط لازمی ہے۔ فاصلہ ضروری ہے۔"

☆☆☆

حشمت جلالی اس وقت اپنی سیاسی پارٹی کے زونل کمیٹی کے چیئرمین بہلو شاہ کی کوٹھی میں بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بہلو شاہ ایک تیز طرار مڈل مین تھا۔ پارٹی کے تمام اہم سیاستدانوں سے رابطہ رکھتا تھا اور ان کے سیاسی اور ذاتی مسائل بھی حل کرتا تھا۔

اسے پارٹی چیئرمین کے دفتر سے اطلاع ملی تھی کہ ایم این اے محبوب علی چانڈیو اور ایم این اے حشمت جلالی آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ اگر وہ عدالت میں جائیں گے تو پارٹی بدنام ہوگی۔ پریس اور الیکٹرانک میڈیا والے رائی کا پربت بنائیں گے۔ بات بگڑنے سے پہلے ان کے درمیان فوراً سمجھوتا کراؤ۔

بہلو شاہ نے پہلے محبوب علی سے فون پر کہا۔ "سائیں! میں ہوں بہلو شاہ، آپ سے دو منٹ کی ملاقات چاہتا ہوں۔"

محبوب نے جواب دیا۔ "میں ایک سنگین معاملے میں مصروف ہوں۔ آج کل کاروباری اور سیاسی معاملات سے بھی دور رہتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے ابھی کچھ دنوں تک ملاقات نہیں کر سکوں گا۔ پھر کسی دن سہی۔"

"سائیں! یہ خادم جانتا ہے' وڈیرا حشمت جلالی سے مقدمہ بازی کی نوبت آ گئی ہے۔ میں آپ دونوں سے مل کر معاملہ نمٹا دوں گا۔ عدالت میں جانے والی بات نہ کریں۔"

"عدالت میں، میں نہیں' وہ جلالی جا رہا ہے۔ اسے روکو۔ اسے سمجھاؤ کہ میرے آدمی پر قتل کا جھوٹا الزام نہ لگائے۔ وہ الزام واپس لے گا تو جھگڑا ابھی ختم ہو جائے گا۔"

بہلو شاہ نے حشمت جلالی سے پوچھا۔ "سائیں اگر آپ اپنی زمینوں پر ہیں تو میں ملاقات کے لیے آؤں گا۔"

جلالی نے کہا۔ "ابھی تو میں آپ ہی کے شہر میں ہوں۔ سنا ہے اسلام آباد سے کچھ احکامات آئے ہیں۔"

"جی ہاں اسی سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ابھی فارغ ہوں تو ابھی آ جائیں؟"

اور وہ ایک گھنٹے کے اندر بہلو شاہ کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے اپنی روداد سنائی کہ مراد علی منگی جو محبوب کا ہم شکل ہے' اس کی بیٹی زلیخا کی عزت لوٹ کر لاکھوں روپے کے زیورات چھین کر اسے قتل کرنے کے بعد فرار ہو گیا تھا۔ ابھی قانون کی گرفت میں آیا ہے۔ "محبوب علی خوامخواہ اس قاتل کو بچانے کے لیے میرا دشمن بن گیا ہے۔"

"آپ سے دشمنی کی کوئی تو وجہ ہوگی؟"

"مراد علی منگی کی ایک بہت ہی خوبصورت منگ ہے۔ محبوب اس پر لٹو ہو گیا ہے۔"

"تعجب ہے' کیا وہ ایسی حور پری ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے سیاسی دوست کے خلاف ہو گیا ہے۔"

"کیا بتاؤں کتنی حسین ہے۔ یوں دیکھو تو دوسری حسیناؤں جیسی ہے۔ ان سے کچھ الگ نہیں ہے۔ مگر اس میں کچھ عجیب سی کشش ہے۔ دیکھتے ہی دل میں گولی کی طرح لگتی ہے۔"

پھر وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "میرے گوٹھ میں پلی بڑھی اور میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔"

بہلو شاہ نے کہا۔ "ہم سب عیاش ہیں۔ عاشق نہیں ہیں۔ مگر آپ اس کے لیے کچھ زیادہ ہی بے چین دکھائی دے رہے ہیں۔"

"میں اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی بیٹی کے قاتل کو معاف کر سکتا ہوں۔ مقدمہ ختم کر سکتا ہوں اور اس سے زیادہ کیا کر سکتا ہوں؟

میں نے محبوب علی چانڈیو سے کہا تھا کہ وہ ماروی کو دیدے' میں مراد کو عدالت میں نہیں گھسیٹوں گا۔ لیکن وہ اس خوبصورت بلا کو چھوڑنے کے لیے راضی نہیں ہے۔"

"آپ نے تو بہت ہی اچھی سیدھی سی بات کی ہے۔ چانڈیو صاحب کو مان لینا چاہیے۔ عورت چاہے کتنی ہی حسین ہو۔ کتنی ہی دل نشین ہو' وہ سیاسی مفادات کے سامنے مٹی دھول ہوتی ہے۔"

"یہ بات انہیں سمجھائیں' ایک عورت کے پیچھے الو بن رہے ہیں۔ پارٹی ڈسپلن بھول گئے ہیں۔"

"میں ابھی بات کرتا ہوں۔"

اس نے اپنے فون پر نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی پھر آواز بند ہو گئی۔ بہلو شاہ نے پھر ری ڈائل کیا۔ دوسری بار بھی وہ کال کٹ گئی۔ فون رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔"

"جلالی نے کہا۔ "عاشق جیل میں ہے۔ اس کی معشوق سے مزے لوٹ رہا ہوگا۔"

اسی وقت جلالی کے فون سے رنگ ٹون ابھری۔ اس نے اسکرین پر اپنے بیٹے کے نمبر پڑھے۔ پھر بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ "کہاں ہو تم؟ اور رحمت کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ہے۔ ابھی ہم نے ماروی کو دیکھا ہے۔"

وہ یکدم سے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "کہاں دیکھا ہے؟"

"وہ ایک کار میں چانڈیو کے ساتھ تھی۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔ "کہاں تھی؟"

"پتا نہیں کہاں سے آ رہی تھی۔ ہم نے نرسری کے پیٹرول پمپ میں اسے چانڈیو کے ساتھ دیکھا ہے۔"

"ارے تو گدھے کے بچو! اس کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟"

"آپ کے بچوں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔ چانڈیو اسے بہادر آباد کی ایک کوٹھی میں لے گیا ہے۔ ہم ابھی اس کوٹھی کے سامنے ہیں۔ واپس آ رہے ہیں۔"

"وہیں کوٹھی کے آس پاس رہو۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کرو اور یہ معلوم کرو کہ چانڈیو صرف عیاشی کے لیے اسے لے گیا ہے یا اسی کے لیے وہ کوٹھی خریدی ہے؟"

"ہم معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور سنو۔ ان کی نظروں میں نہ آنا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے بیٹوں کو جاسوس بنا کے اس کے پیچھے لگایا ہے۔"

پھر وہ فون بند کر کے بہلو شاہ سے بولا۔ "دیکھا آپ نے؟ وہ آپ کا فون اسی لیے کاٹ رہا تھا۔ جس کے لیے میں ترس رہا ہوں' اس کے ساتھ مزے لوٹ رہا ہے۔"

"آپ ذرا صبر کریں' اس کا دل بھر جائے گا تو پھر سمجھوتا کرے گا۔ ماروی کو آپ کے حوالے کر کے مراد کو جیل سے نکالے گا۔ دشمنی دوستی میں بدل جائے گی۔"

وہ سر جھٹک کر ہاتھ لہرا کر بولا۔ "میں کوئی گیا گزرا نہیں ہوں کہ اس کا جھوٹا کھاؤں گا۔ اب تو عدالت میں ہی اس سے باتیں ہوں گی۔ آپ سمجھوتا نہ کرائیں۔"

"یعنی اب ماروی ملے گی تو اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے؟"

وہ سر جھٹک کر بولا۔ "نہیں۔۔۔"

"تو پھر بیٹوں کو جاسوس بنا کر اس کے پیچھے کیوں لگایا ہے؟"

وہ ذرا گڑبڑایا پھر بولا۔ "وہ۔ وہ اب میں اسے داشتہ بناؤں گا۔ اسے تو ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔"

بہلو شاہ نے ناگواری سے کہا۔ "آپ اور چانڈیو صاحب اپنے سیاسی کیریئر کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ آپ محض غصے میں دکھاوے کے لیے اسے جھوٹا کھانا کہہ رہے ہیں۔"

وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ "سچ یہ ہے کہ وہ آپ کے سینے میں کیل کی طرح گڑی ہے۔ ابھی آپ نے کہا ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے بیٹی کے قاتل کو معاف کر دیں گے۔"

ملازم ان کے درمیان کھانے کی ٹرالی لے آیا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ پلیٹیں اور ڈشیں ایک دوسرے کی طرف بڑھانے لگے۔ بہلو شاہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

جب ملازم چلا گیا تو بہلو شاہ نے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ مراد نے آپ کی بیٹی کو قتل نہیں کیا ہے۔ اسی لیے ایک حسینہ کے بدلے آپ اسے معاف کر دیں گے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"آپ نے دو برس تک اسے تلاش نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کی اہمیت نہیں تھی۔ یہ ہماری پارٹی کے سب ہی لیڈر جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ کیا ہو چکا ہے؟"

جلالی نے گھور کر پوچھا۔ "کیا ہو چکا ہے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ آپ نے وڈیروں کی روایات کے مطابق کاروکاری کا کھیل کھیلا ہے۔ بیٹی کو جائداد میں حصہ دینے سے پہلے اسے قتل کیا ہے یا کرایا ہے۔"

"آپ فضول باتیں نہ کریں۔"

"یہ فضول باتیں ہیں تو جواب دیں' آپ کیسے باپ ہیں' ماروی کو داشتہ بنانے کے لیے ابھی بیٹی کا خون معاف کرنے پر راضی ہو رہے تھے؟"

وہ اپنے ہاتھ کا لقمہ پلیٹ میں پھینک کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔ "میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

بہلو شاہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "پلیز رزق کو نہ ٹھکرائیں۔ بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے ذاتی معاملات میں نہیں بولوں گا۔"

وہ کوئی جواب دیے بغیر اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگا۔ وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "ہم سب اپنی پارٹی کے قاعدے اور قوانین سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھ سے باتیں نہیں کریں گے، کسی نتیجے پر نہیں پہنچیں گے تو آپ کو اور چانڈیو صاحب کو اسلام آباد سے کال آئے گی۔ وہاں آپ

دونوں کو پارٹی کے مفادات میں اپنی ضد اور عداوت سے باز آنا ہوگا۔“

وہ دروازے پر رک کر بولا۔ ”اب میں صاف صاف کہہ دوں کہ پارٹی کو چھوڑ دوں گا۔ ماروی کو نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر باہر اپنی گاڑی کے پاس آیا۔ ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ بلگو شاہ نے کہا۔ ”آپ جوش میں ہیں ہوش میں نہیں ہیں۔ آپ کو ہیلتھ منسٹر بنانے کی بات ہو رہی ہے اور آپ پارٹی چھوڑنے کی بات کر رہے ہیں۔“

وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں پارٹی چھوڑوں گا تو اپوزیشن والے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ میری سیاسی حیثیت برقرار رہے گی۔ میری یہ آخری سیدھی سی بات چیئرمین صاحب تک پہنچا دیں۔ میں اسی پارٹی میں رہوں گا جو ماروی کو میری جھولی میں ڈالے گی۔“

اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ”چلو۔“

اس نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ محبوب نے مسجد کے سامنے کار روک دی۔ وہ صبح نو بجے سے اب تک ماروی کے ساتھ تھا۔ اسے جیل میں اس کے محبوب سے ملا کر لایا تھا۔ اسے پہلی بار نئی نئی سی مسرتیں حاصل ہوئی تھیں اس نے پہلی بار اس کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا تھا۔ اب اذان ہو رہی تھی۔ اپنے ربّ کے آگے جھکنے کے لیے مسجد سے بلاوا آ رہا تھا۔

دل میں یہ بات سمائی تھی کہ ماروی کو محبوبہ بنائے رکھنے کے لیے مجھے بھی خدا کا محبوب بندہ بن کر رہنا چاہیے۔ ان دنوں یہی بات اسے نماز کی طرف مائل کر رہی تھی۔

وہ کار کو لاک کر کے مسجد کے اندر چلا گیا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر برکت جلالی ہائی روف میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ رحمت جلالی کو بہادر آباد والی کوٹھی کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ باپ کا حکم تھا کہ اس کوٹھی کے آس پاس رہ کر ماروی اور محبوب کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ وہ دونوں فرمانبردار بیٹے حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔

صرف دشمن ہی ان کی ٹوہ میں نہیں تھے۔ دوست بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ معروف تجلی اس کے باپ کے وقت سے ان کا وفادار مشیر تھا اور ان کے تمام معاملات کا نگران اعلیٰ تھا۔ ان دنوں محبوب کی عشقیہ مصروفیات نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ ماروی اسے کاروباری دنیا سے نکال کر لے گئی تھی۔

اسے واپس لانے کے لیے اس پر نظر رکھنا لازم تھا۔ یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں کہاں بھٹک رہا ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے؟

اس مقصد کے لیے معروف تجلی نے اس کے پیچھے دو جاسوس لگا رکھے تھے۔ ان میں سے ایک اپنی موٹر سائیکل میں اس کے پیچھے پھرتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی اس جاسوس کی موٹر سائیکل مسجد کے قریب ہائی روف کے پیچھے تھی۔ دوسرے جاسوس کی ڈیوٹی رات 8 بجے سے شروع ہونے والی تھی۔

وہ دوسرا کوٹھی کا پرانا ملازم تھا۔ محبوب کا تابعدار تھا۔ اپنے مالک کی بہتری کے لیے معروف تجلی کو ضروری اطلاعات فراہم کرتا رہتا تھا۔ گویا گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا رہتا تھا۔ یہ نمک حرامی نہیں تھی۔ مالک کو ایک عورت کے کر سے نکالنے والی وفاداری تھی۔

محبوب عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلا تو برکت جلالی پھر اس کے پیچھے چل پڑا اور موٹر سائیکل اس ہائی روف کے پیچھے ہو گئی۔

برکت نے محبوب کی کوٹھی تک اس کا تعاقب کیا۔ پھر ملیر کینٹ اپنے مکان میں آ گیا۔ باپ بیٹے گوٹھ سے آ کر وہاں رہا کرتے تھے۔ موٹر سائیکل والے نے معروف تجلی کے پاس آ کر صبح نو بجے سے اب تک کی رپورٹ دی۔ معروف نے پوچھا۔ ”اس ہائی روف میں کون تھا؟ کیوں محبوب کا پیچھا کر رہا تھا؟“

جاسوس نے کہا۔ ”میں نے موبائل فون سے اس کی تصویریں لی ہیں۔ یہ دیکھیں۔“

اس نے تصویریں دکھائیں۔ معروف تجلی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”او گاڈ! یہ حشمت جلالی کا بڑا بیٹا ہے۔ یہ باپ بیٹے اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور محبوب ان سے بے خبر ہے۔“

اس نے ملیر کینٹ والے مکان کا نمبر نوٹ کر کے جاسوس کو رخصت کیا پھر اپنے فون پر نمبر پنچ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد انٹیلیجنس کے سراغرساں حماد صدیقی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو تجلی صاحب!“

معروف نے پوچھا۔ ”تم ایک ہفتے پہلے جلالی گوٹھ گئے تھے۔ ایک رشوت خور بن کر وڈیرے حشمت کو ابھی

آفر دی تھی۔ وڈیرے نے کہا تھا کہ وہ اپنے وکیل سے بات کرنے کے بعد تمہاری آفر کا جواب دے گا۔“

”ہاں۔ ابھی تک اس کی طرف سے خاموشی ہے۔ یقیناً اس کے وکیل نے اسے مجھ سے رابطہ کرنے سے منع کیا ہوگا۔“

”پھر تم کیا کر رہے ہو؟“

”قتل کی واردات میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مقتولہ کا چہرہ تیزاب سے بگاڑ کر اسے ناقابل شناخت بنا دیا گیا ہے۔ وڈیرے کو ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ وہ مقتولہ اس کی بیٹی زلیخا ہے۔ یہ مقدمہ عدالت میں پہنچ گیا ہے۔ کمزور ثابت ہونے والا ہے۔ ہمارا وکیل ان کی کمزوریوں سے کھیلنے کے لیے تیار ہے۔“

معروف نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک نئی اطلاع ہے۔ وہ باپ بیٹے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ آج اس کا بڑا بیٹا محبوب کا تعاقب کرتا رہا ہے۔ معلوم کرو ان کے ارادے کیا ہیں؟“

”کیا یہ معلوم ہے کہ یہاں ان کا قیام کہاں ہے؟“

”میں ابھی ان کا مکمل پتا ایس ایم ایس کر رہا ہوں۔“

اس نے فون بند کر کے ان باپ بیٹے کا پتا Send کر دیا۔ پھر اس نے محبوب سے فون پر پوچھا۔ ”کب تک اپنے کاروباری فرائض سے بھاگتے رہو گے؟“

وہ بولا۔ ”میں آپ کی ذمے داریوں کو اور پریشانیوں کو سمجھ رہا ہوں۔ کل سے آفس اٹینڈ کروں گا۔“

”کیا دوست اور دشمن اٹینڈ کرنے دیں گے؟ ماروی دوست ہے وہ جان سے لگی ہوئی ہے۔ حشمت جلالی دشمن ہے وہ جان کے پیچھے پڑا ہے۔ آج صبح سے تم ماروی کے ساتھ تھے اور وڈیرے کا بیٹا اپنی گاڑی میں تمہارا تعاقب کرتا رہا ہے۔“

”وہ تعاقب کر کے میرا کیا بگاڑ لے گا؟“

”کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بگاڑنے والا ہے۔ تب ہی دور سے تم پر نظر رکھی جا رہی ہے۔“

”آپ اطمینان رکھیں میں ان سے نمٹ لوں گا۔“

”مجھے اطمینان رکھنے کو کہہ رہے ہو۔ اب جو اطلاع دے رہا ہوں اسے سن کر تمہارا اطمینان غارت ہو جائے گا۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”اس کا ایک بیٹا تمہارے پیچھے لگا تھا۔ دوسرا بیٹا شاید ابھی تک ماروی کی تاک میں اس کوٹھی کے پاس ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ باپ بیٹے ماروی کو انا کا مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں، اسے اغوا کرا سکتے ہیں۔“

فون بند ہو گیا۔ واقعی محبوب کا اطمینان غارت ہو گیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھا تھا۔ اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ہوا میں اُڑتا ہوا ماروی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ دروازہ کھول کر کوٹھی سے باہر آنے تک فون چیخنے لگا۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔

معروف تجلی نے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔ ”تم نے اچانک فون بند کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوچے سمجھے بغیر اس کی طرف دوڑے جا رہے ہو۔“

وہ بولا۔ ”میں ابھی کوئی بات نہیں کروں گا۔ پلیز فوراً سیکیورٹی والوں کو فون کریں۔ ابھی تین گارڈز اس کوٹھی میں پہنچائیں۔ وہ باری باری دن رات وہاں ڈیوٹی دیں گے۔“

”ابھی سارے انتظامات ہو جائیں گے۔ میری بات مانو تمہارا وہاں جانا ضروری نہیں ہے۔“

فون پھر بند ہو گیا۔ معروف سر تھام کر بڑبڑایا۔ ”یہ عورت کیا ہوتی ہے؟ پاگل بنا دیتی ہے۔ آخر ماروی میں کیا بات ہے کہ اس کے لیے پاگل ہو رہا ہے۔“

پھر وہ شکست خوردہ سا ہو کر بولا۔ ”میں بوڑھا ہوں۔ شاید اسی لیے یہ جنون سمجھ میں نہیں آئے گا۔“

☆☆☆

رحمت جلالی تھوڑی دیر تک کوٹھی کے قریب ٹہلتا رہا۔ اسے پھر ماروی کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ کوٹھی میں آرام کر رہی ہوگی اور وہ دھوپ میں جھنجلا رہا تھا۔

کوٹھی سے کچھ فاصلے پر راؤنڈ اباؤٹ کے دوسری طرف کئی دکانیں تھیں ایک ہوٹل بھی تھا۔ وہ ہوٹل کے سامنے آ گیا وہاں سے کوٹھی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک میز پر بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے ہوئے کوٹھی میں آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ہوٹل کے باہر برآمدے میں میزیں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں ایک میز پر چاچا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دوپہر کو اپنی گھر والی سے لڑ جھگڑ کر آیا تھا اور یہ بات منوا کر آیا تھا کہ دو لاکھ روپے میں سے اپنا حصہ لے کر ہی رہے گا۔

اسے یقین تھا کہ اس کی بیوی مٹی وعدے کے مطابق اس کا حصہ ضرور دے گی۔ وہ موج میں تھا۔ شیخ چلی کی طرح سوچ رہا تھا کہ ایک لاکھ روپے سے کاروبار کرے گا پھر بہادر آباد والی کوٹھی سے بھی بڑی کوٹھی بنا کر عیش و آرام سے رہا کرے گا۔

ایسے وقت اس نے رحمت جلالی کو دیکھا۔ رحمت نے بھی میز کے قریب آتے آتے اسے دیکھا۔ دونوں ہی پریشان ہوگئے۔

رحمت سے کہا گیا تھا کہ وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ اور چاچا اسے دیکھتے ہی ایک ذرا احساس کمتری میں مبتلا ہوگیا۔ کیونکہ گوٹھ میں وہ حویلی کا چھوٹا مالک کہلاتا تھا۔ ان دنوں چاچا اسے جھک جھک کر سلام کیا کرتا تھا۔

پھر اسے اپنی موجودہ برتری کا احساس ہوا کہ اب وہ جھگی میں رہنے والا کھیت مزدور نہیں ہے۔ کروڑوں روپے کی کوٹھی میں رہتا ہے۔ دودھ، مکھن، تازہ پھل میوے اور مرغن غذائیں کھاتا ہے۔ ماروی کو تین لاکھ روپے ملنے والے ہیں اور منی کی کمر سے دو لاکھ بندھے رہتے ہیں۔ منی کل شام وعدے کے مطابق اسے ایک لاکھ دے گی تو وہ بھی لکھ پتی ہوجائے گا۔

پھر ایک لکھ پتی بھلا کسی سے کیوں ڈرے گا؟ اس کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔ وہ تن کر بیٹھ گیا۔ حویلی کے چھوٹے مالک کو سناتے ہوئے ویٹر سے بولا۔ ”تمہارے ہوٹل کی جو سب سے مہنگی اسپیشل ڈش ہے، وہ لے آؤ۔“

اس نے یہ بھی جتایا کہ اسے انگریزی میں اسپیشل اور ڈش بولنا آگیا ہے۔ رحمت جلالی کو کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہاں جاسوسی کرنی تھی مگر وہ نظروں میں آگیا تھا۔

وہ چاچا کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدن پر مہنگے کپڑے تھے۔ پیروں میں نئے جوتے تھے۔ اور وہ اسے دکھانے کے لیے جیب سے سو سو کے کئی نوٹ نکال کر گن رہا تھا۔

وہ میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اونہہ۔ کُتا شیر کی کھال پہن لے تو شیر نہیں بن جاتا۔“

وہ جواباً بولا۔ ”چلو گوٹھ کا کتا ہی سہی۔ مگر یہ کاٹے گا تو چودہ انجکشن لگاتے پھرو گے۔“

وہ آواز کو بھاری بھرکم اور رعب دار بناتے ہوئے بولا۔ ”اے بڈھے! اپنی اوقات میں رہ کر بول۔ ورنہ ابھی زمین پر گرا کے جوتیاں لگاؤں گا۔“

چاچا نے اپنے سامنے موبائل فون کو اٹھا کر کہا۔ ”ابھی ایک فون کروں گا تو چانڈیو صاحب کے بندوق والے یہاں آجائیں گے۔ تیرا وڈیرا باپ بھی بھاگتا ہوا دکھائی دے گا۔“

رحمت جلالی نے مرعوب ہوکر سوچا۔ ”اس سالے نے اپنی بھتیجی کو محبوب علی چانڈیو کی گود میں بٹھا دیا ہے۔ چانڈیو نے اسے سر پہ چڑھا دیا ہوگا۔ یہ جو کچھ ہوگا۔ وہی بھتیجی کا یار کرتا ہوگا۔ یہ گوٹھ نہیں ہے۔ مجھے اس کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر اس سے دور ہوگیا۔ چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے کوئی دوسرا ہوٹل ڈھونڈنے لگا۔

محبوب یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ کوئی ماروی کو دور سے بھی نظر لگائے مگر یہ کہ رحمت جلالی کوٹھی کے آس پاس اس کی ٹوہ میں لگا تھا۔ دشمنوں کے ناپاک ارادے ظاہر تھے۔ ماروی کو کسی وقت بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔

وہ کار تیزی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ جلد سے جلد ماروی کی کوٹھی تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنی کوٹھی کے احاطے سے نکلتے ہی لنگڑے جانی کو فون پر مخاطب کیا۔ ”ہیلو جانی! میں چانڈیو بول رہا ہوں۔“

”جی حضور! حکم کریں۔“

”دس ہزار کا کام ہے۔ بیس ہزار دوں گا۔ کسی کو ٹپکانا نہیں ہے۔ صرف زخمی کرنا ہے۔“

”آپ اس کا نام پتا ٹھکانا بتائیں۔“

”بہادر آباد میں جہاں بار بی کیو کی دکانیں ہیں، وہاں ابھی پہنچو۔ میں انتظار کررہا ہوں۔“

”جی جناب! حاضر ہورہا ہوں۔“

محبوب نے فون بند کرکے کار کی رفتار بڑھا دی۔ وہ کسی غنڈے بدمعاش اور قاتل سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لنگڑا جانی ان کی سیاسی پارٹی کا ایک غنڈا اور داتا تھا۔ محبوب نے کبھی ایسے لوگوں کو منہ نہیں لگایا تھا۔ پارٹی کے غنڈے خود ہی آکر جی حضوری کرتے تھے اور اسے جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔ آج وہ پہلی بار ایک گن شوٹر سے کام لینے پر مجبور ہوگیا تھا۔

وہ بھی ایک چیونٹی کو بھی مسلنے سے پہلے سوچتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جان دی ہے۔ مجھے اس کی جان نہیں لینی چاہیے۔

بے شک وہ دشمنوں کی ناکامی چاہتا تھا لیکن ان کی موت کی دعائیں نہیں مانگتا تھا۔ اس نے لنگڑے جانی سے بھی یہی کہا تھا کہ دشمن کو ہلاک نہیں کرنا ہے صرف زخمی کرنا ہے۔

اس طرح وہ حشمت جلالی کو کچھ کہے سنے بغیر یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ ماروی کے قریب جانے والوں کو موت بھی آسکتی ہے۔

وہ ایک بار بی کیو کی دکان کے سامنے آکر رک

گیا۔ ونڈ اسکرین کے پار ماروی کی کوٹھی اور وہ راؤنڈ اباؤٹ بہت دور تک نظر آرہے تھے۔ ادھر جا کر دیکھنا تھا کہ رحمت جلالی ماروی پر نظر رکھنے کے لیے کہاں بیٹھا ہوا ہے؟

تھوڑی دیر بعد ہی لنگڑا جانی ایک ساتھی کے ساتھ موٹر سائیکل پر آیا۔ اس نے اپنی گاڑی سے اتر کر کار کے پاس آکر محبوب کو سلام کیا۔ محبوب نے دروازہ کھول کر کہا۔ ''آؤ بیٹھو۔''

اس نے اندر آکر دروازے کو بند کیا۔ محبوب نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر ہزار ہزار کے بیس نوٹ اسے دیے پھر ونڈ اسکرین کے پار دور تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ اُدھر راؤنڈ اباؤٹ کے قریب ایک کوٹھی کی طرف ہوگا۔ میں نہیں چاہوں گا کہ وہ مجھے دیکھے۔ وہ اس کار کو بھی پہچانتا ہے۔ ہم کار یہیں چھوڑ کر اُدھر جائیں گے۔''

جانی نے کہا۔ ''جناب! نہ وہ دیکھ سکے گا نہ پہچان سکے گا۔ آپ میری ہیلمٹ پہن لیں۔''

محبوب کی آنکھوں پر سن گلاس تھا۔ آنکھیں پہلے ہی چھپی ہوئی تھی۔ ہیلمٹ پہننے کے بعد چہرہ بھی چھپ گیا۔ وہ جانی کے ساتھ کار سے نکل کر ماروی کی کوٹھی کی طرف جانے لگا۔

اسے زیادہ دور جانا نہیں پڑا۔ رحمت جلالی ایک آئسکریم کی دکان میں دکھائی دیا۔ وہاں بیٹھا ٹھنڈا میٹھا جوس پی رہا تھا۔ فون پر باپ سے پوچھ رہا تھا۔ ''بابا سائیں! ادھر ایک ہوٹل میں ماروی کا چاچا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ میں کیا کروں؟''

باپ نے غصہ سے کہا۔ ''اپنی جوتی اتارو اور اسے اپنے سر پہ مارو۔ گدھے کے بچے! تجھے کوٹھی کے پاس رہنے کو کہا تھا۔ ہوٹل میں مرنے کو کیوں گیا تھا؟''

''کوٹھی کے آس پاس کہیں سایہ نہیں ہے۔ گرم لُو چل رہی ہے۔ دھوپ میں میرے بدن کا آدھا پانی نکل گیا ہے۔ میں کب تک یہاں پہرا دیتا رہوں گا۔ کیا آجاؤں؟''

''آجاؤ۔ اتنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ چاچا چاچی کے ساتھ وہاں رہتی ہے۔ چانڈیو نے اسے کوٹھی خرید کے دی ہوگی۔ اب وہ ہماری نظروں میں رہے گی۔ تم آجاؤ۔''

محبوب دکان کے باہر کھڑا لنگڑے سے بول رہا تھا۔ ''وہ جو سیاہ قمیص اور سفید شلوار میں ہے۔ کان سے فون لگائے جوس پی رہا ہے۔ وہی تمہارا شکار ہے۔''

''بس جناب! آپ جائیں۔ ابھی یہ لمبا لیٹ جائے گا۔''

اس نے اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''یاد رکھو اسے ہلاک نہیں کرنا ہے۔''

''آپ نے جو حکم دیا ہے' وہی ہوگا۔ یہ زندہ رہے گا۔''

''اور یہ پارٹی کے کسی بھی فرد کو معلوم نہ ہو کہ میں نے یہ واردات کرائی ہے۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''آپ کا راز یہاں رہے گا۔ مرتے دم تک نہیں نکلے گا۔''

اس نے کار کے قریب آکر ہیلمٹ اتار کر لنگڑے کو دیدیا۔ اپنی اسٹیئرنگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ لنگڑا جانی ہیلمٹ پہن کر اپنے ساتھی کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ پھر آگے جا کر اس آئسکریم کی دکان کے قریب رک گیا۔ رحمت جلالی آرام سے جوس پی رہا تھا۔ اسے اطمینان ہو گیا تھا کہ باپ اسے ڈیوٹی دینے کے لیے ماروی کی خاطر دھوپ میں کھڑا نہیں کرے گا۔ اب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر جا کر آرام سے کمر سیدھی کرے گا۔

وہ جوس پینے کے بعد اٹھ گیا۔ کاؤنٹر پر رقم ادا کر کے باہر آگیا۔ ذرا فاصلے پر رکشے اور ٹیکسیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ ان کی طرف جانے لگا۔ ایسے ہی وقت موٹر سائیکل پہلے دھیمی رفتار سے آئی۔ تیز رفتاری کے باعث نشانہ خطا ہو سکتا تھا۔ واردات کرنے والے جانتے ہیں کہ کب تیزی دکھانی چاہیے؟

اور کوئی نہیں جانتا کہ کب اور کہاں اس کی شامت آجائے گی۔ ریوالور سے نکلنے والی گولی سیدھی رحمت کی ران میں جا کر دھنس گئی۔ وہ چیخ مار کر لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ موٹر سائیکل رفتار پکڑتے ہوئے تیزی دکھاتے ہوئے آگے جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس شہر میں دو پہیوں والی گاڑیاں ایسے ہی وارادات کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ جب فائرنگ کی دہلا دینے والی آواز کے ساتھ گولیاں چلتی ہیں تو قانون کے محافظ بھی انہیں روکنے نہیں آتے۔ ادھر دو سپاہی ایک ہوٹل کے باہر کھڑے چائے پی رہے تھے۔ گولی چلتے ہی زمین پر گر کر لیٹ گئے تھے۔

جب قاتل گزر گئے تو لوگ دوڑتے ہوئے رحمت جلالی کے پاس آئے۔ وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ ران میں دھنسی ہوئی گولی انگارے کی طرح دہک رہی تھی۔ چاچا نے بھی دوڑتے ہوئے آکر اسے دیکھا۔ کچھ

لوگ اسے اٹھا کر ایک گاڑی میں ڈال کر لے جارہے تھے۔

وہ دشمن تھا۔ تاہم چاچا کو ذرا افسوس ہوا پھر اس نے سوچا۔ ظالموں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ یہ اپنی زمینوں پر خدا بن کر رہتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں عورتوں کی عزت سے کھیلتے ہیں اور ان کے مردوں کو گولی مار دیتے ہیں۔

وہ سوچتا ہوا وہاں سے پلٹ کر جانے لگا۔ پھر ٹھٹک گیا۔ اسے دور محبوب سائیں کی کار دکھائی دی۔ وہ ایک یو ٹرن لے کر وہاں سے جارہی تھی۔ آج صبح ہی وہ کار ماروی کو کوٹھی سے لے کر گئی تھی۔ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

اس نے حیرانی سے سوچا۔ ''سائیں یہاں آئے مگر کوٹھی میں کیوں نہیں آئے۔ یہ تو ماروی کے دیوانے ہیں۔ تعجب ہے' اس سے ملے بغیر جارہے ہیں؟''

محبوب نے اپنی آنکھوں سے رحمت جلالی کو گولی لگتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ اطمینان ہوا تھا کہ اس نے ماروی کے پہلے دشمن کو سزا دی ہے۔ آئندہ بھی اس جان حیات کو خبر نہیں ہوگی اور وہ اس کے دشمن حالات سے لڑتا رہے گا۔ کبھی اس پر آنچ نہیں آنے دے گا۔

چاچا کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ کار نظروں سے اوجھل ہوگئی تو کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''پتا نہیں وہ وڈیرے کا بیٹا اچانک ادھر کیوں آیا تھا؟ میں اس کی دھونس میں نہیں آیا تو ادھر ٹھنڈا پینے چلا گیا۔ یہ ایسے ہی نہیں آیا تھا۔ باپ بیٹے ماروی کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ شاید کوئی بدمعاشی کرنے کا ارادہ تھا۔ اس سے پہلے ہی کوئی اس سے بدمعاشی کر کے گزر گیا۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا ایک سمت یوں دیکھنے لگا جیسے نظروں سے اوجھل ہو جانے والے محبوب سائیں کو دیکھ رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ''سائیں نے بھی رحمت جلالی کو دیکھا ہوگا اور سمجھ لیا ہوگا کہ وہ ان کی ماروی کے پیچھے آیا ہے۔''

وہ بوڑھا سر کھجانے لگا۔ دماغ میں بات آئی کہ بہت سے بندوق والے سائیں کے نوکر ہیں۔ کیا ان کا کوئی نوکر رحمت کو گولی مار کے گیا ہے؟

وہ پھر کوٹھی کی طرف جانے لگا۔ جب کوئی دور کی بات سمجھ میں آتی تھی تو وہ سر کھجانے لگتا تھا اور یہ تو سامنے کی بات تھی کہ سائیں دیوانہ ہے۔ پتا نہیں ہماری ماروی میں ایسی کیا بات ہے۔ وہ آگے بھی نہ جانے اس کے لیے کیا کرتا رہے گا؟

وہ کوٹھی میں آکر ائر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ چاچی ٹی وی کے سامنے اونچی آواز میں ایک فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ بولا۔ ''اسے بند کرو۔ مجھے بات کرنی ہے۔''

وہ آواز دھیمی کرتے ہوئے بولی۔ ''مجھے پتا ہے تم پھر پیسوں کی بات کرو گے۔ تمہارا سر پھر گیا ہے۔ وہ دو لاکھ روپے تمہیں کیل کانٹوں کی طرح چبھتے ہی رہیں گے۔''

''وہ تو میں اپنا حصہ لے کر رہوں گا۔ مگر ابھی دوسری بات کرنی ہے۔ کیا ماروی سو رہی ہے؟''

''پتا نہیں۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ آرام کر رہی ہوگی۔''

وہ کچھ سوچ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگا۔ چاچی نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

''بات تم سے نہیں اس سے کرنی ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے کہ مجھ سے نہیں' اس سے کرو گے؟''

وہ تجسس میں مبتلا ہو کر اس کے ساتھ ماروی کے دروازے پر آئی۔ چاچا نے دستک دے کر پوچھا۔ ''کیا سو

رہی ہو؟“

چاچی نے کہا۔ ”میں نے کہا نا‘ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔“

وہ بولا۔ ”تم چپ رہو۔ میں اپنی بیٹی کے پاس آیا ہوں۔“

ماروی نے دروازہ کھول کر کہا۔ ”کیا مصیبت ہے‘ تم دونوں ہمیشہ لڑتے ہی رہتے ہو۔ میڈم روزی ابھی آنے والی ہیں۔ یہیں رہ کر تم لوگوں کو سیدھا کریں گی۔“

وہ بولا۔ ”پتا نہیں وہ کون ہے اور کیا کرے گی۔ میں پوچھنے آیا ہوں کیا تم نے گولی چلنے کی آواز سنی تھی؟“

ماروی نے کہا۔ ”ہاں سنی تھی۔ اس شہر میں روز ہی یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کیا آج کوئی نئی بات ہوگئی ہے؟“

”ہاں وڈیرے حشمت کے بیٹے کو گولی لگی ہے۔“

ماروی اور چاچی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ وڈیرے کے بیٹے کو گولی لگی ہے؟“

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کمرے کے اندر آیا پھر بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔“

وہ انہیں بتانے لگا کہ رحمت جلالی پہلے اس کے پاس ہوٹل میں آیا تھا۔ اس کے بعد دوسری جگہ ٹھنڈا پینے گیا اور جب وہاں سے باہر نکلا تو موٹر سائیکل والے دو آدمی اسے گولی مار کر بھاگ گئے۔ چاچی نے پوچھا۔ ”وہ رحمت ادھر کیوں آیا تھا؟“

چاچا نے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جہاں مٹھائی ہوتی ہے‘ وہاں مکھیاں ضرور آتی ہیں۔“

ماروی نے پوچھا۔ ”کیا ان باپ بیٹوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں یہاں رہتی ہوں؟“

”انہیں معلوم ہے‘ تب ہی وہ یہاں آیا تھا۔ اور یہ تو موٹی عقل سے سمجھنے والی بات ہے کہ کسی نے گولی ماری ہے تو اس کہ وجہ بھی یہی ہے کہ وہ تمہارے قریب کیوں آیا تھا؟“

ماروی نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو؟ کسی دشمن کو میرے قریب آنے سے کون گولی مارے گا؟“

”وہی جو تمہارا دیوانہ ہوگا۔“

ماروی چاچا کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ چاچی نے پوچھا۔ ”کیا محبوب سائیں نے اسے گولی ماری ہے؟“

ماروی نے پھر چونک کر چاچی کو دیکھا۔ چاچا نے کہا۔ ”نہیں گولی مار کر بھاگنے والے موٹر سائیکل پر تھے۔ ہاں مگر میں نے کباب چرغے والی دکانوں کے پاس محبوب سائیں کی گاڑی دیکھی تھی۔ وہ وہیں دور سے گھوم کر جا رہے تھے۔“

چاچی نے کہا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ یہاں تک آئیں اور ماروی سے مل کر نہ جائیں۔ تم نے کسی اور کی گاڑی دیکھی ہوگی۔“

وہ اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”وہی کار تھی جس میں آج صبح ماروی بیٹھ کر گئی تھی۔“

ماروی سن رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک دھڑک کر پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ ایسا دیوانہ ہے کہ میں ملوں یا نہ ملوں وہ میرے گھر کا چکر لگا کر چلا جاتا ہے؟

چاچا نے کہا۔ ”یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سائیں کو معلوم ہوگیا تھا کہ دشمن کا بیٹا ماروی کی ٹوہ میں ادھر آیا ہے اور یہ تو ہم جانتے ہیں کہ سائیں کے پاس بہت سے بندوق والے نوکر ہیں۔ ان میں سے دو نوکر رحمت کو گولی مار کر گئے ہیں۔“

چاچی نے پوچھا۔ ”کیا وہ مر گیا ہے؟“

”نہیں۔ جب اسے اسپتال لے جا رہے تھے تو وہ زندہ تھا۔ اسے جہنم میں جانے دو۔ اپنے سائیں کو دعائیں دو۔ وہ ماروی کو کتنا چاہتے ہیں۔ اس پر احسان بھی نہیں جتاتے باہر ہی باہر اس کے دشمنوں کو مار بھگاتے ہیں۔“

ماروی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ حد ہوگئی تھی۔ کیا پیار ایسا بھی ہوتا ہے؟ منہ سے کچھ نہیں بول رہا ہے۔ چپ چاپ اپنے حسن سلوک سے حواس پر چھا رہا ہے۔

وہ سر تھام کر اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ ”میں مراد کی ہوں۔ اس دل میں مراد کے سوا کوئی نہیں آئے گا لیکن محبوب صاحب دماغ میں سما رہے ہیں۔ کیا کروں؟

ہائے مراد...! تم جب تک دور رہو گے۔ یہ قریب آتے رہیں گے۔ نہیں‘ یہ کبھی قریب نہیں آتے ہیں۔ دور ہی دور سے جانے کیسے قریب لگنے لگتے ہیں۔ ان کے طور طریقے کچھ عجیب سے ہیں۔ یہ بہت گہرے ہیں۔“

کال بیل سنائی دی۔ چاچی نے کہا۔ ”کوئی آیا ہے۔“

ماروی نے کہا۔ ”میڈم روزی ہوں گی۔“

وہ تینوں بیڈ روم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے۔ چاچا نے بیرونی دروازے کو کھولا۔ معروف تجلی نے کہا۔ ”السلام علیکم۔“

چاچا نے سلام کا جواب دیتے ہوئے دیکھا۔ باہر تین مسلح گارڈز کھڑے ہوئے تھے۔ معروف نے ان کے ساتھ اندر آ کر کہا۔ ”ماروی! یہ تین سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ یہ

باری باری یہاں آٹھ آٹھ گھنٹے حاضر رہیں گے۔ تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو کوٹھی کے احاطے میں بھی نہیں آنے دیں گے۔“

چاچا نے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے۔ اب تو وڈیرے حشمت کا باپ بھی ادھر نہیں آئے گا۔“

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ ”میں نہ کہتا تھا کہ سائیں محبوب کے پاس بہت سے بندوق والے ہیں اور اب یہ سب تمہاری حفاظت کے لیے ہیں۔“

وہ جھینپ گئی۔ چاچا کو گھور کر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہم سب کی حفاظت کے لیے ہیں۔“

چاچی نے چاچا کے سامنے ہاتھ نچا کر کہا۔ ”بات کدھر جاتی ہے‘ کچھ سمجھتے بھی ہو۔“

ماروی چاچی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچ کر لے گئی پھر اس کے کان میں کہا۔ ”اور تم بات کو اور کھول رہی ہو۔ میں تم لوگوں کو کیسے سمجھاؤں؟ میرا سر دُکھنے لگا ہے۔“

وہ تینوں گارڈز باہر چلے گئے۔ چاچا نے معروف تجلی سے کہا۔ ”آپ کو تو معلوم ہوگا یہاں ابھی گولی چلی تھی؟“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کہاں چلی تھی؟“

”یہاں گول چکر کے پاس جو دکانیں ہیں‘ وہاں دو آدمی رحمت جلالی کو گولی مار کر بھاگ گئے۔“

وہ شدید حیرانی سے بولا۔ ”او گاڈ! رحمت کو گولی ماری گئی ہے؟ کیا تم نے اس کی لاش دیکھی ہے؟“

”لوگ اسے اسپتال لے جا رہے تھے تو وہ زندہ تھا۔“

بوڑھا مشیر سمجھ گیا تھا کہ وہ کھیل کس نے کھیلا ہے۔ وہ پلٹ کر جاتے ہوئے بولا۔ ”میں ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ اب جو بھی مسئلہ درپیش ہوگا۔ اسے میڈم روزی حل کر دیا کریں گی۔“

وہ بولتے ہوئے باہر اپنی گاڑی کے پاس آیا۔ چاچا نے پیچھے پیچھے آ کر کہا۔ ”ایک بات بولنا چاہتا ہوں۔“

”جلدی بولو۔ مجھے جانا ہے۔“

”وہ سائیں کے بندوق والے ہوں گے۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”جب وہ گولی مار کر بھاگ گئے تو میں نے اُدھر سائیں کی گاڑی دیکھی تھی۔“

معروف نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا محبوب کو وہاں لوگوں نے دیکھا ہے؟“

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”نہیں۔ وہ گاڑی سے باہر نہیں نکلے تھے اور نہ ہی گولی چلانے والی جگہ آئے تھے۔ وہ جو کباب چرغے والی دکانیں ہیں نا۔ اُدھر سے ہی مڑ کر چلے گئے تھے۔“

معروف نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر چاچا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم سائیں کی بھلائی چاہتے ہو نا؟“

وہ بولا۔ ”ان کی بھلائی کے لیے جان بھی دیدوں گا۔“

”جان نہ دو۔ بس یہ بات کسی سے نہ بولو کہ تم نے واردات کے وقت سائیں کو یہاں دیکھا ہے۔“

”نہیں بولوں گا۔ کبھی نہیں بولوں گا۔ میں سمجھ گیا۔ کسی سے نہیں بولوں گا۔“

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ چاچا نے ڈرائنگ روم میں آ کر ماروی سے کہا۔ ”تجلی صاحب ہمارے سائیں کے لیے بہت پریشان ہیں۔ ہم سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کسی سے نہ بولیں کہ جب رحمت کو گولی ماری گئی تو سائیں وہاں موجود تھے۔ ان پر الزام نہیں آنا چاہیے کہ انہوں نے رحمت پر گولی چلوائی ہے۔“

چاچی نے کہا۔ ”ہم کسی سے نہیں بولیں گے مگر یہ سچ ہے کہ وہ ماروی کے لیے مصیبتیں مول لیتے ہیں۔ اس کے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ خود قانون کی پکڑ میں آسکتے ہیں۔“

ماروی سر جھکا کر اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگی۔ یہ مان رہی تھی کہ محبوب نے وڈیرے کو اور اس کے بیٹوں کو اس سے دور بھگانے کے لیے ایک مجرمانہ قدم اٹھایا ہے۔ رحمت جلالی پر حملہ کرا کے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ماروی کی سلامتی اور تحفظ کے لیے آئندہ بھی خود کو خطرات سے دوچار کرتا رہے گا۔

☆☆☆

حشمت جلالی لاؤنج میں بیٹھا شام کی چائے پی رہا تھا۔ بڑے بیٹے سے کہہ رہا تھا۔ ”ہم تینوں یہاں آگئے ہیں۔ وہاں زمینوں پر کوئی نہیں ہے۔ ملازموں پر زیادہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ تم کل صبح ہی رحمت کے ساتھ چلے جاؤ۔ میں دو چار دنوں کے بعد آؤں گا۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی فون سے کالنگ ٹون کی آواز سنائی دی۔ حشمت نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا۔ اس کے بیٹے رحمت جلالی کا فون نمبر تھا۔ اس نے بٹن کو دباتے ہوئے اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”رحمت کہاں ہو تم؟ ابھی تک کیوں نہیں آئے؟“

دوسری طرف سے کسی نے پوچھا۔ ”آپ یہ بتائیں‘ رحمت آپ کا کون ہے؟“

حشمت نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ میرے بیٹے کے فون سے بول رہے ہو۔ وہ کہاں ہے؟“

”اسپتال میں ہے۔ اسے گولی لگی ہے۔“

حشمت ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ”کیا بول رہے ہو؟ کس نے گولی ماری ہے؟“

”یہ ہم نہیں جانتے۔ آپ یہاں اسپتال آجائیں۔“

برکت جلالی نے کہا۔ ”بابا سائیں! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ رحمت کو کیا ہوا ہے؟“

وہ فون بند کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”فوراً گاڑی نکالو۔ کسی نے اسے گولی ماری ہے۔ یاخدا...! گولی لگنے کا مطلب تو یہ ہے کہ... کہ...“

وہ تڑپ گیا۔ مکان سے باہر آکر اس نے بیٹے کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا پھر تھوڑی دیر بعد اسی اطلاع دینے والے شخص کی آواز سنائی دی۔ حشمت نے کہا۔ ”خدا کے لیے یہ تو بتاؤ۔ وہ زندہ ہے یا نہیں؟“

”ہم نہیں جانتے اسے آپریشن کے لیے لے گئے ہیں تو پھر وہ زندہ ہی ہوگا۔“

مکان کے ایک طرف گلی میں ہائی روف کھڑی ہوئی تھی۔ برکت اسے ڈرائیو کرتا ہوا باپ کے سامنے آگیا۔ وہ جلدی سے اپنی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اسپتال چلو۔ اسے آپریشن کے لیے لے گئے ہیں۔ خدا کرے وہ زندہ ہو۔ اسے کچھ نہ ہو۔“ وہ اسے اسپتال کا نام بتا رہا تھا۔

برکت جلالی گاڑی آگے بڑھا کر تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ کراچی شہر رہنے کے قابل نہیں ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ گولیاں نہ چلتی ہوں اور دھماکے نہ ہوتے ہوں۔ پتا ہی نہیں چلتا' کہیں سے بھی اندھی گولیاں آتی ہیں اور بے قصور لوگ مارے جاتے ہیں۔“

”میرا دماغ کہتا ہے۔ کوئی اندھی گولی نہیں آئی ہوگی۔ اسے جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔“

اس نے سر گھما کر باپ کی طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں؟“

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ”گدھے کہیں کے۔ سامنے دیکھو۔ کیا گاڑی ٹکراؤ گے۔ مجھے بھی مرواؤ گے؟“

”آپ بہت پریشان ہوگئے ہیں۔ آرام سے بیٹھیں۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا اور رحمت کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ ہم وہاں پہنچیں گے تو وہ ہم سے باتیں کرے گا۔“

وہ بڑبڑانے لگا۔ ”جب گولی بدن میں گھستی ہے تو بڑے آپریشن کے بعد ہی نکالی جاتی ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں گھسی ہے۔ اسے بے ہوش کیا گیا ہوگا۔“

پھر وہ ڈیش بورڈ پر غصے سے ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”کس نے اس پر گولی چلائی ہوگی؟ یہاں تو ہمارے کئی دشمن ہیں۔ کس نے ہم سے دشمنی کی ہے؟“

ایک دم سے دماغ نے چیخ کر کہا۔ ”چانڈیو...!“

وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا۔ سامنے تکنے لگا۔ ونڈ اسکرین آئینہ بن گئی اور وہ آئینے میں مسکرانے لگی۔ بڑے ناز و انداز سے اِتراتے ہوئے اس کی طرف آنے لگی۔

بیٹے کو گولی لگی تھی۔ اس وقت عیاشی کو بھول کر ساری حسیناؤں پر لعنت بھیجنا چاہیے تھا لیکن وہ چیلنج بن گئی تھی۔ چانڈیو اس کی کھوپڑی کے اندر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”آؤ۔ میری ماروی کی گلی میں آؤ۔ جو بھی آئے گا وہ مارا جائے گا۔“

وہ غصے سے چیخ پڑا۔ ”ماروی تیرے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔ تو خود کو سمجھتا کیا ہے۔ میں تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر کلیجہ نکال لاؤں گا۔ مجھے سمجھتا کیا ہے؟ اگر اسے چھین نہ لایا تو وڈیرا نہیں۔ اپنے باپ کی اولاد نہیں۔“

برکت ڈرائیو کرتے ہوئے باپ کی باتیں سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ وہ جنون کی حالت میں ہوا سے لڑ رہا ہے لیکن یہ درست سمجھ رہا ہے کہ گولی چانڈیو کی طرف سے چلائی گئی ہے۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا تھا کہ اس نے رحمت کو ماروی کی کوٹھی کے سامنے چھوڑا تھا۔ وہاں چانڈیو نے اسے دیکھا ہوگا اور اسے اپنی داشتہ سے دور رکھنے کے لیے اس پر گولی چلوائی ہوگی۔

وہ اسپتال پہنچ گئے۔ پتا چلا کہ بیٹا ابھی تک آپریشن تھیٹر میں ہے۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ ”کیا یہ رحمت جلالی آپ کا بیٹا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہاں۔ میں ایم این اے حشمت جلالی ہوں۔ آپ نے اخباروں میں اور ٹی وی میں میری تصویریں دیکھی ہوں گی۔ میں ابھی دو چار دنوں میں منسٹر بننے والا ہوں۔“

وہ ڈینگیں مارنے لگا۔ ابھی جو نہیں تھا وہ بولنے لگا۔ یوں اس نے انسپکٹر کو اپنی شخصیت سے متاثر کر لیا۔ انسپکٹر نے سپاہی سے کہا۔ ”جلالی صاحب کو بیٹھنے کے لیے کرسی دو۔“

پھر وہ بولا۔ ”جلالی صاحب! میں سمجھ گیا۔ یہ سیاسی جھگڑا ہے۔ اپوزیشن والوں نے آپ کے بیٹے پر گولی

چلائی ہے۔“

وہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ چانڈیو کی بدمعاشی ہے لیکن محبوب علی چانڈیو کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے بغیر اس پر الزام لگاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔

اس نے کہا۔ ”ہاں۔ یہ سیاسی جھگڑا ہے اور میں کسی ثبوت کے بغیر اپوزیشن والوں کو الزام نہیں دے سکوں گا۔ مجھے افسوس ہے آفیسر! اپنی پارٹی کے چیئرمین سے مشورے کے بغیر آپ کو کوئی بیان بھی نہیں دے سکوں گا۔“

اطلاع ملی کہ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ گولی نکال دی گئی ہے۔ اسے ایک کمرے میں منتقل کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ بے ہوش تھا۔ پتا نہیں کب ہوش میں آنے والا تھا۔ نہ انسپکٹر کو بیان دے سکتا تھا' نہ باپ کو اندر کی بات بتا سکتا تھا۔

اس نے بیٹے سے کہا۔ ”تم یہاں کمرے میں رہو۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھ کر ضروری کالیں کروں گا۔ جیسے ہی یہ ہوش میں آئے تو مجھے فوراً بلانا۔“

وہ اسپتال سے باہر آیا پھر ہائی روف کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ بیٹے کی جان بچ گئی تھی۔ اس کی طرف سے مطمئن ہوگیا تھا لیکن اینٹ کا جواب پتھر سے اور گولی کا جواب گولی سے دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ اسی لیے وہ تنہائی میں فون پر باتیں کرنے باہر اپنی ہائی روف میں آگیا تھا۔

اس نے اسلام آباد میں بیٹھے ہوئے پارٹی کے چیئرمین سے فون پر رابطہ کیا۔ اس کے پی اے نے کہا۔ ”عالی جناب میٹنگ میں ہیں۔ میں آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔“

”ان سے کہو میٹنگ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ میری اولاد سے زیادہ ضروری نہیں ہوسکتی۔ انہیں بتاؤ کہ میرے بیٹے پر گولی چلائی گئی ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔“

اس نے فون بند کردیا۔ دو منٹ کے اندر ہی پی اے نے رابطہ کیا۔ پھر کہا۔ ”ہولڈ کریں۔ عالی جناب بات کریں گے۔“

اس نے انتظار کیا پھر چیئرمین بابر بشیر کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو جلالی صاحب! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ آپ کے بیٹے پر گولی چلائی گئی ہے؟ کس نے چلائی ہے؟ بیٹا بچ گیا ہے نا؟“

”جی ہاں۔ آپریشن کامیاب رہا ہے۔ گولی نکال لی گئی ہے۔ وہ بچ گیا ہے لیکن یہ سن لیں کہ دشمن بچ نہیں پائے گا۔ میں اسے کتے کی موت ماروں گا۔“

”جلالی صاحب...! کون ہے وہ دشمن؟ ہم اسے قانون کی گرفت میں لے آئیں گے۔“

”اسے قانون نہیں مارے گا۔ میں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔ اسے کچل کے رکھ دوں گا۔“

”آپ غصہ تھوک دیں۔ بیٹا بچ گیا ہے۔ آپ کو اپنی سیاسی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ کچھ دنوں میں منسٹر بننے والے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ آپ ذاتی معاملات میں، قتل و غارت گری میں الجھیں اور اپوزیشن والوں کو اور پریس والوں کو آپ کے خلاف زہر اگلنے کا موقع مل جائے۔“

”آپ میرے دشمن کو حلوا کھلاتے ہیں۔ اسے کبھی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے۔“

بابر بشیر نے پریشان ہوکر کہا۔ ”یاخدا... کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چانڈیو صاحب نے آپ کے بیٹے پر حملہ کرایا ہے؟“

”ہاں۔ اور کوئی ایسا کمینہ نہیں ہے' جو حشمت جلالی سے ٹکرانے کی جرأت کرے گا۔“

”جلالی صاحب! آپ دونوں ہی ہماری پارٹی کے اہم ستون ہیں۔ دونوں کی اہمیت ہے۔ کوئی کسی سے کم نہیں ہے۔ اگر آپ دونوں آپس میں لڑیں گے تو ہم بڑے مسائل سے دوچار ہوتے رہیں گے۔

یہ یاد رکھیں کہ آپ دونوں نے حلف اٹھایا ہے۔ یہ عہد کیا ہے کہ پارٹی کی بہتری' استحکام اور بقا کی خاطر بڑی سے بڑی قربانیاں دیں گے۔“

”کبھی ضرورت پیش آئی تو میں قربانیاں دینے سے انکار نہیں کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ میری اولاد کو قربانی کا بکرا بنا رہا ہے۔ ایک پر حملہ کرچکا ہے اب مجھے دوسرے کی فکر ہے۔ کیا ہماری برسرِ اقتدار پارٹی سے یا ہماری حلف برداری سے یہ ضمانت حاصل ہوسکتی ہے کہ وہ آئندہ ہم میں سے کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟“

”اگر آپس میں سمجھوتا ہوجائے گا تو کسی کو کسی سے نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ جو چاہتے ہیں، اگر وہ مان لیں اور وہ جو چاہتے ہیں آپ مان لیں تو پھر تمام جھگڑے ختم ہوجائیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”مراد علی منگی نے میری حویلی سے لاکھوں روپے کے زیورات چرائے۔ میری بیٹی کی عزت لوٹی پھر اسے قتل کر کے فرار ہوگیا۔ کیا کوئی باپ اپنی جان سے زیادہ پیاری بیٹی کا خون کبھی معاف کرسکتا ہے؟“

بابر بشیر نے کہا۔ ”نہیں۔ آپ کی بچی کے ساتھ ظلم ہوا

ہے۔اس قاتل کو بدترین سزا ملنی چاہیے۔“

”اور وہ محبوب علی چانڈیو اسے سزائے موت سے بچانے کے لیے میرا دشمن بن گیا ہے۔“

”چانڈیو اس قاتل کو کیوں اہمیت دے رہا ہے؟ کیوں اسے سزائے موت سے بچانا چاہتا ہے؟“

”اس قاتل مراد کی ایک منگیتر ہے۔اس کا نام ماروی ہے۔چانڈیو اس کا عاشق دیوانہ پاگل ہوگیا ہے۔جبکہ ماروی پر میرا حق ہے۔وہ میرے گوٹھ میں پیدا ہوئی، پلی بڑھی اور جوان ہوئی ہے۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔اس سے پہلے ہی وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ بھاگ کر شہر آگئی۔اسے حاصل کرنا مشکل نہیں ہے۔اگر چانڈیو دیوار نہیں بنے گا تو میں اسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر اپنی حویلی میں لے آؤں گا۔“

”چانڈیو قاتل مراد کو سزائے موت سے بچانا چاہتا ہے اور آپ ماروی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔اگر وہ تمہیں حاصل ہو جائے تو کیا تم اپنی بیٹی کا خون معاف کر دو گے؟ اس طرح چانڈیو قاتل کو سزائے موت سے بچا کر اپنی ضد پوری کرلے گا۔“

”میں تو راضی تھا۔سمجھوتا کرنا چاہتا تھا۔اس سے صاف صاف کہا تھا کہ ماروی کو میرے حوالے کرے گا تو میں قتل کے مقدمے کو عدالت میں جانے سے پہلے ہی ختم کر دوں گا۔“

”یہ تم نے اسے بہت بڑی آفر دی تھی۔کوئی باپ اپنی بیٹی کا خون معاف نہیں کرتا۔آپ واقعی پارٹی کے وفادار ہیں۔اپنی پارٹی کی نیک نامی اور بہتری کی خاطر بہت ذہانت سے سمجھوتا کرنا چاہتے ہیں۔میں ابھی چانڈیو سے بات کرتا ہوں۔“

”آپ اس سے کیا بات کریں گے۔اس نے تو سمجھوتا کرنے سے انکار کردیا ہے۔“

”تعجب ہے اس نے انکار کیوں کیا ہے۔جبکہ وہ قاتل کو سزائے موت سے بچانا چاہتا ہے؟“

”چانڈیو کو اس قاتل سے خاص دلچسپی نہیں ہے۔وہ اس کی منگیتر ماروی پر مر مٹا ہے۔میں نے کہا نا وہ اس کا عاشق پاگل دیوانہ ہے۔وہ صرف دکھاوے کے لیے مراد کا مقدمہ لڑتا رہے گا۔اسے جیل میں رہنے دے گا اور اس کی منگیتر کے ساتھ مزے اڑاتا رہے گا۔اس نے بہادر آباد میں اسے کوٹھی خرید کر دی ہے۔اس پر ہزاروں لاکھوں روپے لٹا رہا ہے۔“

”میں سمجھ گیا کہ ایک عورت آپ دونوں کے درمیان فساد کی جڑ ہے۔اگر وہ آپ کو مل جائے گی تو جھگڑا ختم ہو جائے گا۔یہ بتائیں ماروی آج کل اس کے تصرف میں ہے۔کیا اب بھی آپ اسے حاصل کرنا چاہیں گے؟“

”ہاں۔وہ میری انا کا مسئلہ بن گئی ہے۔ہم جو چاہتے ہیں اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے ہی رہتے ہیں۔“

”حقیقت یہ ہے کہ سیاست میں عورت اور عیاشی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔کبھی شوق پیدا ہوتا ہے تو اسے حاصل کرتے ہیں۔پھر پان کی طرح چبا کر تھوک دیتے ہیں۔میں چانڈیو کو سمجھاؤں گا کہ پان بہت کھالیا ہے اب اگالدان حویلی میں پہنچا دے۔اس کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دے۔“

”آپ اسے سمجھائیں۔وہ مجھے آسانی سے مل جائے گی تو پھر آپ جس طرح سمجھوتا کرنے کو کہیں گے، میں کروں گا۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔جلالی فون بند کر کے سوچنے لگا۔”پارٹی کے چیئرمین کو تو یہی سمجھانا ہوگا کہ میں شرافت سے سمجھوتا کر رہا ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ سمجھوتا کروں گا اور اس سے ماروی کو مانگ کر حاصل کروں گا تو میری سبکی ہوگی۔

کہنے والے کہیں گے کہ میں اس سے جھوٹا مانگ کر کھا رہا ہوں اور میں ایسا گرا ہوا نہیں ہوں۔چھین کر لینے میں مردانگی ہے۔سر جھکا کر نہیں سر اٹھا کر سینہ تان کر اپنی عورت کو، اپنی زمین کو مردانہ وار حاصل کرنا دستورِ سکندری ہے۔“

وہ آئینے کے سامنے آکر اپنی شاہانہ اور وڈیرانہ شخصیت کو دیکھ کر مونچھوں پر تاؤ دینے لگا۔

اسی لمحے میں محبوب علی چانڈیو اپنے بیڈ روم کے بڑے سے ٹی وی اسکرین پر ماروی کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔

اور اسی لمحے میں عاشق نامراد آہنی سلاخوں کے پیچھے اس کی یادوں کے زخم کھا رہا تھا۔

وہ جھگی میں رہنے والی بیک وقت گوٹھ کی اونچی حویلی میں تھی۔شہر کے ایک ارب پتی عاشق کے دل میں دھڑک رہی تھی اور اب اس کا نام چیئرمین بابر بشیر کی سیاست میں چیلنج بننے کے لیے اسلام آباد پہنچ گیا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور
سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان
کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

ایک بھوت کی ڈائری

2 جنوری 2011ء

صبح اٹھا تو بھوتنی والی کا مقدس چہرہ میرے سامنے آگیا۔بھوتنی والی میں اپنی بیٹی کو لکھ رہا ہوں۔اس نے اپنی ضد سے پریشان کر کے رکھا ہوا تھا۔

اس نے ایک بھوتنی والے یعنی ایک بھوت کے بیٹے سے محبت شروع کر دی تھی اور ضد کر لی تھی کہ شادی ہوگی تو اسی سے ہوگی۔اس کا خاندان ہمارا پڑوسی تھا۔یعنی تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر۔برف کے میدانوں میں تو، ایسا ہی ہوتا ہے، ہم بھوت اسی قدر فاصلے پر رہا کرتے ہیں۔

ہمارے باپ دادا یہ بتایا کرتے تھے کہ وہ جہاں سے ہجرت کر کے سائبیریا آئے تھے۔وہاں بہت سے بھوت ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔جہاں کوئی ویرانہ دیکھا، اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ایک کمرے پر کسی

جہیز

منظر امام

کہتے ہیں جو چیز پکے ہوئے پھل کے مانند گود میں گر جائے اپنی قدر کھو دیتی ہے، قربانی دے کر حاصل کی جانی والی چیز ہمیشہ چاہی جاتی ہے... مگر افسوس یہاں معاملہ الٹا نظر آرہا ہے جبکہ ان الٹے پلٹے معاملات سے فائدہ کسی تیسرے کو پہنچ رہا ہے... یہی ہوتا آیا ہے آپس کے معاملات کے بگاڑ سے دوسروں کو سدھار کا موقع میسر آجاتا ہے اور انہیں بھی وہ موقع مل گیا تھا جس کے وہ منتظر تھے کیونکہ... یہاں بہت کچھ بگڑنے والا تھا۔

اشاروں، استعاروں میں زیرِ بحث ایک گمبھیر معاملہ اور خطرناک نتائج



اور بھوت کے خاندان کا قبضہ ہے تو دوسرے کمرے میں کسی اور بھوت کا خاندان رہ رہا ہے۔

باپ دادا یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہم بہت پیار اور محبت کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ ہم بھوتوں میں ویسے بھی بہت یگانگت ہوا کرتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔

میرے بڑے چاچا جن کی عمر تین سو سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کا بسیرا ایک درخت پر تھا۔ پھر درخت کے کٹ جانے کے بعد وہ بے گھر ہو گئے اور بددل ہو کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ ان کا آج تک پتا نہیں چل سکا ہے۔

میرے ابا تنہائی پسند تھے۔ اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے انہوں نے کہا۔ ''بھائی، یہاں تو بہت رش ہوتا جارہا ہے۔ چلو یہاں سے کہیں اور چلتے ہیں۔''

''کہاں؟'' میری اماں نے پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ سائبیریا ایک ایسا مقام ہے جہاں زمین ہی زمین ہے۔'' ابا نے بتایا۔ ''وہاں انسانوں کی آبادی بہت کم ہے۔ کیونکہ وہاں چاروں طرف برف رہتی ہے۔''

ہماری اماں ایک فرمانبردار بھوتنی تھیں۔ اسی لیے جو شوہر نے کہا اس پر سر جھکا دیا اور ہم اپنے آبائی وطن سے پرواز کرتے ہوئے سائبیریا آ گئے۔

ہمارے ساتھ پاسپورٹ اور ویزا وغیرہ کا کوئی جھنجٹ بھی نہیں تھا۔ بس جہاں مرضی آئے وہاں اڑتے پھرتے۔ ہم یہاں آ کر بہت خوش ہوئے۔ کیونکہ ہم نے کبھی اتنی برف نہیں دیکھی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑا تھا اور سب سے چھوٹی بہن تھی۔ جو مجھ سے اسی سال چھوٹی تھی۔ ہم اسے پیار میں گڑیا کہا کرتے تھے۔ اب ہم آ تو گئے تھے لیکن سوال یہ تھا کہ ہم کہاں رہیں؟''

یہاں نہ تو کوئی کھنڈر تھا اور نہ خالی مکان، صرف سردی تھی۔

بہرحال ہمیں ایک بڑا سا اِگلو مل گیا۔

برف کے رہنے والے اپنے لیے جو برف کے مکان بناتے ہیں۔ ان مکانوں کو اِگلو کہا جاتا ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا دروازہ ہوتا ہے اور اسکیمو رینگ کر اندر جایا کرتے ہیں۔

اِگلو کی دیواروں پر مچھلیوں اور ریچھوں کی چربی ملی جاتی ہے۔ اس چربی سے ان کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔ تو ہمیں ایک بڑا سا اِگلو نظر آ گیا۔ یہ اس علاقے کا سب سے بڑا اِگلو تھا۔

اس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ان لوگوں کی عبادت گاہ تھی۔ اس کے اندر برف ہی کے بنے ہوئے بت رکھے تھے۔ اسکیموز باہر ہی سے عبادت کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ اسی لیے وہ خالی ہی رہتا تھا۔

ابا نے اسی اِگلو کو اپنے لیے پسند کر لیا اور ہمارا پورا خاندان اس میں رہنے لگا۔ پہلے ہم یہ سمجھتے تھے کہ سائبیریا کے ان برفیلے میدانوں میں صرف ہم ہی بھوت ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وہاں کے ماحول کے عادی ہوتے گئے۔ یہ پتا چل گیا کہ وہاں مقامی بھوت بھی تھے اور سب سے قریبی پڑوسی تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

بہرحال اس صبح دو جنوری کو میں نے سب سے پہلے اپنی منحوس بھوتنی والی یعنی بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ وہ اپنے بالوں میں پھولوں کی جگہ برفانی سانپ لپیٹے میرے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔

''ابا، آج آپ ان لوگوں کے پاس ضرور جائیں۔'' اس نے کہا۔

''کن لوگوں کے پاس؟'' مجھے یاد نہیں آ سکا تھا۔

''ابا، وہی بھوتنی والے کے پاس۔'' اس نے کہا۔ ''جس سے مجھے شادی کرنی ہے۔''

''اچھا اچھا چلا جاؤں گا۔ یہ بتا باہر کا موسم کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابا، تمہیں موسم سے کیا لینا دینا۔ ہم بھوتوں پر موسم کا اثر کہاں ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے، یہ بتا تیری ماں کہاں ہے؟''

''پتا نہیں، کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ وہ ہوا میں اڑتی ہوئی مشرق کی طرف جا رہی تھیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ کچھ دنوں سے اس نے ایک شوق پال رکھا تھا۔ وہ پینگوئن کو دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے ایک لائن میں چلتے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے ہوئے پینگوئن بہت اچھے لگتے ہیں۔

میں اِگلو سے باہر آیا تو دیکھا کہ دور تک برف ہی برف تھی۔

کچھ اسکیموز اپنی عبادت کے لیے ہمارے اِگلو کی طرف چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔

ایک پرابلم یا شاید اچھی بات تھی کہ ہم بھوت تو ان کو دیکھ لیتے تھے لیکن وہ ہمیں نہیں دیکھ پاتے تھے۔

3 جنوری 2011ء

آج کا دن بھی بہت خوشگوار تھا۔

اپنی بیٹی کی ضد پر میں شادی کی بات طے کرنے

کلومیٹر کے فاصلے پر اس نوجوان بھوت کے پاس پہنچ گیا جس کے عشق میں میری بیٹی گرفتار ہو گئی تھی۔

اس وقت پورا خاندان بادلوں کی سیر کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر فوراً زمین پر اتر آئے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ وہ نوجوان بھوت تو قربان ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اس کی ماں کچھ اوندھے مزاج کی بھوتنی تھی۔ ہم بھوتوں میں ایک اچھی بات یہی ہے کہ ہمارے یہاں کھانے پینے کا تکلف نہیں ہوتا۔

ہاں، جب ہم انسان کے روپ میں آ جائیں تو اس وقت کچھ کھا لیتے ہیں۔ جیسے میری بیوی کو سانپوں کا سوپ بہت پسند ہے۔ وہ ہر ہفتے ایک بار پرواز کرتی ہوئی ہانگ کانگ چلی جاتی ہے اور نوجوان لڑکی کے روپ میں آ جاتی ہے۔ پھر وہ سانپوں کا سوپ پی کر دوبارہ پرواز کرتے ہوئے واپس آ جاتی ہے۔

ایک بار اس چکر میں اس کے ساتھ ایک بہت دلچسپ بات ہوئی۔ ایک چینی شخص اس پر عاشق ہو گیا تھا۔ اس وقت میری بیوی ایک خوب صورت لڑکی کے روپ میں تھی۔

میری بیوی کو بھی نہ جانے کیا تفریح سوجھی کہ اس نے اس بندے کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ تو چاہتا ہی یہی تھا۔ وہ فرمانبردار کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے چل پڑا اور جب ایک ویران جگہ آ کر میری بیوی نے اس کو اپنی اصل صورت دکھائی تو اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

خیر، میں یہ بتا رہا تھا کہ میں شادی کی تاریخ طے کرنے لڑکے والوں کے یہاں آیا ہوا تھا۔ جب ہم بات کر رہے تھے تو لڑکے یعنی نوجوان بھوت کی بہن نے باہر سے آ کر کہا۔ ''یہ انسان بہت تنگ کرنے لگے ہیں۔''

''کون سے انسان!'' اس کے بھوت باپ نے پوچھا۔

''یہی اسکیموز۔ ہمارا سکون غارت کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کہاں سے ڈھول لے کر آئے ہیں اور ہلا گلا کر رہے ہیں۔''

یہ واقعی ایک بڑی پرابلم تھی۔ کیونکہ ہم بھوتوں کو شور شرابا بالکل پسند نہیں ہے۔ ہمیں سکون چاہیے۔

''تو بیٹا۔ اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔'' بھوتنے باپ نے کہا۔ ''تم ان کو اپنی صورت دکھا دو۔ خود ہی ڈر کر بھاگ جائیں گے۔''

''نہیں ابا۔ میری صورت سے کام نہیں چلے گا۔ تم اماں کو بھیجو۔ وہ مجھ سے زیادہ بھیانک ہیں۔''

''یہ بات تو ہے۔'' بھوت باپ نے فخریہ طور پر اپنی گردن ہلائی۔ ''اسی لیے میں نے تمہاری ماں سے لو میرج کی تھی کہ پوری بھوت نگری میں ان جیسی بھیانک بھوتنی کوئی نہیں ہوگی۔''

اس کی بیوی یعنی بھوتنی اپنی تعریف سن سن کر شرمائے جا رہی تھی۔ پھر وہ اپنی بیٹی کی مدد کرنے کے لیے چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ اپنا کام کر کے واپس آئی تو ہم دونوں یعنی میں اور بھوت باپ رشتے کی بات تقریباً طے کر چکے تھے۔

لیکن اس بھوتنی نے آ کر رولا مچا دیا۔ ''دیکھیں بھئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ شادی ہونی ہے۔ لیکن آپ لوگوں نے جہیز کے لیے کیا سوچا ہے؟''

''دیکھیں بہن، یہ انسانوں والی رسم ہے۔ اس کو انسانوں کے لیے رہنے دیں۔ ہمیں جہیز وغیرہ سے کیا لینا دینا۔''

''لیکن میں نے تو اپنے دادا بھوت کی قسم کھا رکھی ہے۔''

''کیا قسم کھائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ جہیز میں دس ویران شہر لوں گی۔'' اس نے بتایا۔

''یہ کیا مسئلہ ہے۔ یہ پورا برفانی میدان ہی خالی پڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سب ہی لے لیں۔''

''نہیں۔ یہی تو شرط ہے۔'' وہ اٹھلا کر بولی۔ ''سائبیریا نہیں چاہیے۔ بلکہ ایسے شہر چاہئیں جو پچھلے دنوں تک آباد رہے ہوں اور اب ویران ہونے والے ہوں۔''

''اب تو آپ زیادتی کر رہی ہیں بھائی۔'' میں نے کہا۔ ''پورے سائبیریا میں ایسے شہر نہیں ملیں گے۔''

''تو کون کہہ رہا ہے کہ آپ سائبیریا میں ڈھونڈیں۔ دنیا کے کسی بھی علاقے میں ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ فاصلے ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔''

''ایک بات یہ بتائیں کہ یہ انسانوں والی عادت کہاں سے آ گئی آپ میں۔'' میں نے پوچھا۔ ''یہ جہیز وغیرہ کا چکر تو انسانوں میں ہوتا ہے۔ ہم بھوتوں میں کہاں سے آ گیا۔''

''میں نے تو اپنی سوتیلی بہن سے شرط لگا رکھی ہے کہ اپنے بیٹے کی شادی ذرا الگ اسٹائل میں کروں گی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو تو معلوم ہے کہ میں اپنی سوتیلی بہنوں سے کتنا پیار کرتی ہوں۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ آپ کی ایک سو تو سوتیلی

بہنیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ کے ابا کا تو یہی شوق تھا۔''
''ہاں، میری جو بہن چالیسویں نمبر پر ہے، میں اس کی بات کر رہی ہوں۔''
''انکل۔'' اب اس بھوتنی والے نے مجھے مخاطب کیا جو میری بیٹی سے عشق کر رہا تھا۔ ''انکل پلیز، اماں کی بات مان لیں۔ ورنہ یہ ہماری شادی نہیں ہونے دیں گی اور اگر ایسا ہوا تو مجبوراً آپ کی بیٹی کو وہ حرکت کرنی ہوگی جو صرف انسان کرتے ہیں۔''
''وہ کیا۔''
''ہم دونوں بھاگ کر شادی کرلیں گے۔'' اس نے کہا۔
''نہیں نہیں۔ یہ مت کرنا۔ یہ بھاگنا واگنا انسانوں کو زیب دیتا ہے۔ ہم بھوتوں کے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔''
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ پلیز وعدہ کرلیں۔''
''دیکھو برخوردار، ایک بھوت ہونے کی حیثیت سے تم یہ اچھی طرح جانتے ہوگے کہ ہم بھوت جو وعدہ کرلیں، اس پر ہر طرح عمل کرتے ہیں۔''
''جی ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ بھوت وعدہ خلافی نہیں کرتے۔''
''اسی لیے تو وعدہ کرتے ہوئے سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔
''پلیز انکل، سوچیں نہیں۔ آپ ذرا دنیا کا چکر لگا کر تو دیکھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایسے دس شہر مل ہی جائیں۔ آپ کو میری اور اپنی بیٹی کی محبت کی قسم۔''
اس نے اس انداز سے بات کی کہ مجھے وعدہ کرنا ہی پڑ گیا۔

8 جنوری 2011ء

کئی دن دوسری مصروفیات میں گزر گئے۔ میرے ایک دور کے چاچا کا برازیل میں انتقال ہوگیا تھا۔
وہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے برازیل میں جا کر آباد ہوگئے تھے۔ ہمارے یہاں مرنے کا تصور انسانوں سے بہت مختلف ہے۔ ہماری موت اس وقت ہوتی ہے جب کوئی خطرناک اللہ کا نیک بندہ ہمیں بند کرلیتا ہے اور ہمیں ایک طویل مدت کے لیے پابند کردیتا ہے۔ کسی خاص جگہ پر قید کر دیتا ہے اور ہم پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ جعلی پیروں اور عاملوں کی تو ہم کھٹیا کھڑی کردیتے ہیں لیکن سچے فقیروں، درویشوں اور اللہ والوں سے بچ کر رہتے ہیں، اگر یہ کسی جگہ آجائیں تو ہم وہاں سے نکل لیتے ہیں۔ چاچا کا یہ خیال تھا کہ برازیل میں عیش ہی عیش ہوں گے۔ وہاں کون اللہ والا ملے گا۔ لیکن ان کی بدقسمتی کہ برازیل میں بھی ایک حقیقی درویش مل ہی گیا جس نے چاچا کو طویل مدت کے لیے بند کردیا۔ یعنی ان کی موت واقع ہوگئی۔ تو کئی دن ان کے سوگ میں گزر گئے۔
ان کی بیوی سے تعزیت کے لیے برازیل جانے کی ہمت اس لیے نہیں ہوئی کہ کہیں ہم خود ہی نہ پھنس جائیں۔ حالانکہ اس مکار بھوتنی کی یہی کوشش تھی کہ کسی طرح ہم بھی پھنس جائیں۔
بہرحال اب جہیز کی شرط پر غور کرنا تھا۔ یعنی ہمیں دس شہر جہیز میں دینے تھے جو حالیہ دنوں تک آباد ہوں، لیکن اب ویران ہونے والے ہوں۔
میں نے واپس آکر اپنی منحوس صورت بیٹی کو بہت لتاڑا کہ کم بخت تو نے بھی کس بھوت سے محبت کی جس کی ماں اتنی لالچی ہے۔ لیکن وہ صرف روتی رہی۔ آخر میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ پریشان نہ ہو۔ میں تلاش میں نکلتا ہوں۔ اولاد تو سب کو پیاری ہوتی ہے۔ چاہے وہ کوئی بھوت ہی کیوں نہ ہو۔

14 جنوری 2011ء

میں اپنے اور سارے بھوتوں کے استاد کے پاس جانے کے لیے پرواز کر رہا ہوں۔
ہم بھوتوں کے ایک استاد ہیں جن کا قیام چین کے جنگل میں ہے۔ ان کی عمر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کرۂ ارض پر پہلا ڈائنا سار ان کے سامنے پیدا ہوا تھا۔ اب خود سوچ لیں کہ ان کی کیا عمر ہوگی۔ جب بھی کسی بھوت کو کوئی بڑا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ وہ استاد محترم کے پاس پہنچ جاتا ہے اور استاد اسے اپنے قیمتی مشوروں سے نواز دیتے ہیں۔
میرے ساتھ بھی یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اسی لیے میں استاد کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جا رہا ہوں۔
استاد چین کے ایک جنگل میں اس درخت کے پاس مل گئے جہاں میری ان سے پچھلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کو بھی نوے برس گزر چکے تھے۔
استاد اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔
ہم بھوت ویسے تو بھوک پیاس سے عاری ہوتے ہیں لیکن استاد جیسے بھوتوں کو اپنی توانائی برقرار رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کھانا پینا پڑتا ہے جیسے سانپ، نیولے، چھچھوندر وغیرہ۔
استاد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میری طرف بھی پلیٹ بڑھا دی۔ ''لو کھاؤ۔''
''شکریہ استاد محترم، میں کھا چکا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کب کھایا تھا؟''
''تقریباً ستر سال ہوئے۔'' میں نے جواب دیا۔
''اوہ۔ پھر تو تمہارا پیٹ بھرا ہوا ہی ہوگا۔''
''جی ہاں استاد محترم۔''
''کسی خاص کام سے آئے ہو کیا؟''
''جی استاد محترم، ایک مسئلہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔''
''کیسے بھوت ہو کہ تمہارے ساتھ بھی مسئلہ لگا ہوا ہے۔ یہ انسانوں والی بیماریاں تمہارے پاس بھی آگئیں؟''
''بہت بے ڈھب صورتِ حال ہے استاد۔''
''چلو بتاؤ، جب تک میں اژدہے کا جوس پی رہا ہوں۔ تم بتاتے رہو۔''
میں نے استاد کو ساری صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا۔ ''یہ معاملہ ہے استاد۔ اب خود ہی سوچیں۔ میں اس ہٹ دھرم بھوتنی کی فرمائش کیسے پوری کروں۔ مجھے کیا معلوم کہ کون سے آباد شہر ویران ہونے والے ہیں۔''
''تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''
''کوئی نشانیاں بتا دیں استاد۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ میں ان ہی نشانیوں کی بنیاد پر ایسے شہر تلاش کرلوں۔''
استاد نے کچھ دیر سوچنے کے بعد تین چار نشانیاں بتا دیں۔ میں بڑے ادب سے ان کا ہاتھ چوم کر فضا میں پرواز کر گیا۔

20 جنوری 2012ء

میں اس وقت ایک بہت شاندار اور خوب صورت شہر میں ہوں اور اس شہر میں انسانوں کے روپ میں گھوم رہا ہوں۔ شہر کو دیکھ دیکھ کر میرا دل خوش ہو رہا ہے۔ کیا خوب صورت سڑکیں ہیں، کیا اچھی عمارتیں ہیں۔
لوگوں کے چہرے تازہ اور شگفتہ، ایک سے ایک خوب صورت لڑکیاں، جیسے بہار کے پھول مہکے ہوئے ہیں۔ ہر طرف آزادی اور بے فکری۔
یہ مکمل طور پر ایک آباد شہر تھا اور ایسے آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ یہ شہر تباہ ہونے والا ہو۔ میں شہر کی سیر کرتے کرتے ایک پارک میں آگیا۔ یہاں کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے کے ہاتھ میں چپس کا خالی پیکٹ تھا اور وہ پریشان سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک ساتھی نے پکار کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے جانی، کیوں پریشان ہو رہے ہو؟''
''یار، ڈسٹ بن دکھائی نہیں دے رہا۔''
''وہ دیکھو سامنے۔'' اس کے ساتھی نے ایک طرف اشارہ کیا۔
''اوہ، تھینک یو۔''
وہ بچہ اس خالی پیکٹ کو ڈسٹ بن میں پھینک کر واپس آگیا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل میں مصروف ہوگیا۔ میں بہت دیر تک پارک میں بیٹھا ان بچوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر پارک سے باہر آگیا۔
باہر ایک بس اسٹاپ تھا۔
میں نے دیکھا کہ اس بس اسٹاپ پر صرف تین آدمی کھڑے تھے اور وہ بھی ایک دوسرے کے آگے ہیں۔ یعنی لائن بنائے ہوئے، کچھ دیر میں بس آئی اور وہ اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔
میں بور ہو کر پھر آگے بڑھ گیا اور اچانک ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔ اس لڑکی کے ہاتھ میں کتابیں تھیں جو اس ٹکر سے گر گئی تھیں۔
لڑکی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''سوری، میں نہیں دیکھ سکی تھی۔''
''سوری تو مجھے کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''نہیں تو آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔
میں نے اس کی کتابیں اٹھا کر اس کے حوالے کردیں۔ وہ کئی بار شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گئی۔ اب کیا کروں۔ ابھی تک تو ایسے آثار سامنے نہیں آئے تھے کہ یہ کہا جائے کہ یہ شہر تباہ ہونے والا ہے۔ پھر میری نظر ایک موٹر سائیکل سوار کی طرف گئی جو اچانک سلپ ہو کر گر پڑا تھا۔
اس کو اچھی خاصی چوٹ آئی تھی۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ بھوت ہونے کی وجہ سے میں تو سمجھ رہا تھا لیکن دوسرے لوگ اس کی زبان نہیں سمجھ پا رہے تھے۔
''پتا نہیں یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی زبان سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔'' ایک آدمی نے کہا۔
''زبان کو چھوڑو، ہے تو انسان۔ اور زخمی بھی ہے۔'' دوسرا بولا۔ ''میں نے ایمبولینس کو فون کردیا ہے۔''
پانچ منٹ کے اندر ایمبولینس آئی اور اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئی۔
میں اس شہر سے کچھ مایوس ہوگیا تھا۔ اس شہر کی بربادی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ استاد محترم کی بتائی ہوئی نشانیاں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔
بہت بددل ہو کر میں اس شہر سے پرواز کر گیا۔

22 جنوری 2012ء

اب میں ایک ایسے شہر میں ہوں۔ جہاں کسی بات پر لوگ حکومت کے خلاف جلوس نکال رہے تھے۔ جلوس کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ سڑک کے ایک کنارے پلے کارڈ لیے ہوئے چل رہے تھے۔ میں رک کر بہت امید بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

دل کی عجیب کیفیت تھی۔ بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شاید استادِ محترم کی ایک نشانی سامنے آنے والی تھی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ جلوس گزرتا رہا۔ لوگ چلتے رہے۔ گاڑیاں چلتی رہیں۔ دکانیں کھلی رہیں پھر میں برا سا منہ بنا کر ایک دوسری سڑک پر چل پڑا۔

کچھ دور جانے کے بعد ایک گاڑی مجھے کراس کرتی ہوئی آگے جا کر رک گئی۔ وہ گاڑی جہاں رکی تھی، وہاں پھولوں کی دکانیں تھیں۔ خوب صورت سلیقے کی دکانیں جن میں بہت سلیقے سے پھول فروخت کے لیے سجائے گئے تھے۔ گاڑی سے ایک آدمی اترا اور دکان کی طرف جانے لگا۔ دکاندار اسے دیکھ کر دکان سے باہر آ گیا۔

"ہیلو پرائم منسٹر سر۔"

"ہیلو۔" گاڑی سے اترنے والے نے اس سے ہاتھ ملایا۔

اور اس وقت پتا چلا کہ میں جس ملک میں تھا۔ یہ شخص اس ملک کا پرائم منسٹر تھا اور پھول خریدنے آیا ہوا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ پھر بور ہو کر آگے بڑھ گیا۔

اب نہیں معلوم کہ استادِ محترم نے مجھے ٹالنے کے لیے ایسی نشانیاں بتا دی تھیں۔ یا واقعی اس دنیا میں ایسے شہر ہوں گے۔ ابھی تک تو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بہر حال میں وہاں سے بھی پرواز کر گیا۔

27 جنوری 2012ء

لگتا ہے کہ میری تلاش ٹھکانے لگ گئی ہے۔

اب میں پھر ایک ایسے شہر میں تھا جو بہت آباد تھا۔ یہاں بھی ہر طرف دوڑتی ہوئی گاڑیاں تھیں۔ عالیشان عمارتیں تھیں، پارکس بنے ہوئے تھے۔

میں مقامی روپ میں تھا۔ اس لیے مجھے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کوئی بھوت ہوں یا کسی اور جگہ سے آیا ہوں۔

میں نے سوچا کہ پہلے اس شہر کا پارک دیکھ لوں۔ اس کے بعد شہر کی سیر کروں گا۔ میں ذرا جلدی میں تھا، یا وہ عورت جلدی میں تھی جس سے پارک کے گیٹ پر میری ٹکر ہوئی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ نچا نچا کر مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ "اندھا ہے کیا، دیکھ کر نہیں چلتا، تیری ماں بہنیں نہیں ہیں۔"

"معاف کرنا، اتفاق سے ٹکر ہو گئی۔" میں نے کھسیا کر کہا۔

"میں خوب سمجھتی ہوں ایسا اتفاق۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "چل دفع ہو جا۔"

زندہ باد استاد۔ میں نے دل ہی دل میں استاد کو یاد کیا۔ ان کی ایک نشانی سامنے آ گئی تھی لیکن ابھی اور نشانیاں باقی تھیں۔

بہر حال میں پارک میں داخل ہو گیا۔

یہاں بھی ہر طرف لوگ بکھرے ہوئے تھے۔ بچے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ سامنے گھاس پر ایک خاندان چادر بچھائے کھانے پینے میں لگا ہوا تھا۔ وہ پھلوں کے چھلکے، خالی پیکٹس وغیرہ بے پروائی سے اِدھر اُدھر پھینکے جا رہے تھے۔

میری آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ میری تلاش اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی تھی۔ میں بہت خوش خوش پارک سے باہر آ گیا۔

شاید حالات، سارے واقعات دہرانے میں لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ پارک سے باہر ہی فٹ پاتھ پر ایک آدمی کی بائیک گری ہوئی تھی اور وہ بری طرح تڑپ رہا تھا۔

اس کے پاس کچھ لوگ کھڑے اسے دیکھے جا رہے تھے۔ پتا نہیں کیسے لوگ تھے، میں نے آگے بڑھ کر ایک آدمی سے کہا۔ "اس بے چارے کو اسپتال تو پہنچاؤ، یہ زخمی ہو گیا ہے۔"

"کیوں، ہم اسے اسپتال کیوں پہنچائیں۔" ایک آدمی نے کہا۔ "تم دیکھتے نہیں، یہ ہماری زبان بولنے والا نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا، ہے تو انسان۔"

"زیادہ فلسفہ مت بھگارو۔ اس کی زبان کچھ اور ہے۔ یہ کسی اور علاقے کا رہنے والا ہے۔"

بھوت ہونے کے باوجود مجھ سے اس کا تڑپنا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو مجمع میں سے ایک آدمی چلانے لگا۔ "یہ اس کا ساتھی معلوم ہوتا ہے۔ اسی زبان کا بندہ ہے۔"

کچھ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے مارنا

شروع کر دیا۔

اب میں یہاں بھوتوں کی ایک مجبوری بتا دوں۔ ہمیں بھوت سے انسان بننے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ لیکن انسان سے بھوت بننے کا پروسیس کم از کم ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔

میں اپنا دفاع بھی نہیں کر سکا اور میری اچھی خاصی ٹھکائی ہو گئی۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اپنی جان بچائی اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا اور خوش بھی تھا کہ استادِ محترم کی نشانیاں پوری ہوتی جا رہی ہیں۔ واہ، بھوت ہو تو ان جیسا ہو۔

لوگ میرے پیچھے تھے اور میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ اتنا موقع بھی نہیں مل رہا تھا کہ کسی جگہ چین سے رک کر انسان سے بھوت بننے کا جاپ کر سکوں۔

اچانک کچھ پولیس والوں نے مجھے روک لیا۔

"اوئے، کہاں بھاگا جا رہا ہے۔ کہیں بم لگا کر آیا ہے۔"

"نہیں بھائی، میں تو ایک غریب بھوت ہوں۔"

"تو چاہے جو بھی ہو۔ ایک طرف کھڑا ہو جا۔" اس نے شاید میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔

"لیکن کیوں کھڑا ہو جاؤں۔"

"اوئے کھوتے دا پتر۔ ہمارے علاقے کے ایس ایس پی صاحب کی سواری گزرنے والی ہے۔ ان کے لیے راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ دیکھتا نہیں، ساری ٹریفک بند ہے۔"

مجھے وہ ملک یاد آ گیا جس کا وزیر اعظم پھول خریدنے کے لیے اکیلا آیا تھا۔ اس وقت وہاں نہ تو راستہ روکا گیا تھا اور نہ ہی کچھ اور ہوا تھا۔

بہ ظاہر تو مجھے برا لگ رہا تھا، لیکن میں دل ہی دل میں استادِ محترم کو یاد کر کے خوش بھی ہو رہا تھا۔ ایک آدمی نے روڈ کراس کرنے کی کوشش کی تو اسے پکڑ لیا گیا۔ "اوئے، کہاں جا رہا ہے روڈ کراس کر کے؟"

"بھائی، میری بچی بیمار ہے۔ میں اس کے لیے دوائیں لینے جا رہا ہوں۔"

"معلوم نہیں، ادھر سے کس کی سواری گزرنے والی ہے۔"

"معلوم ہے بھائی، لیکن میری بچی بیمار ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے ہر حال میں روڈ کراس کر کے سامنے والے میڈیکل اسٹور تک جانا ہے بس۔"

پولیس والے نے سیٹی بجا دی۔ ایک پولیس موبائل آ کر کھڑی ہو گئی۔ "کیا بات ہے؟" ایک موٹے تازے

انکم ٹیکس آفیسر

☆ یہ حضرات اپنے گھر میں ہر چیز فارن کی دیکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی بیوی بھی۔

پولیس

☆ یہ حضرات اپنی تمام تنخواہ اپنی بیوی کو دیتے ہیں، بعد میں آدھی تنخواہ تک مکا میں لے لیتے ہیں۔

ڈاکٹر

☆ اس کی بیوی سر درد کا بہانہ نہیں کر سکتی۔

وکیل

☆ اس کی بیوی شاید دنیا کی واحد بیوی ہے۔ جو اس سے بحث میں ہار مان لیتی ہے۔

انتخاب: ریاض بٹ، حسن ابدال

پولیس والے نے پوچھا۔

"صاحب جی، یہ بندہ روڈ کراس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"موبائل میں ڈالو اس کو۔" حکم دیا گیا۔

اس وقت میرا بھوت پن بیدار ہو گیا۔ اگر انسان ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ انسانیت بیدار ہو گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس شخص کی حمایت میں آواز بلند کی۔ "جانے دو اس بے چارے کو، اس کی بچی بیمار ہے۔"

"اوئے صاحب جی۔ یہ کوئی مشکوک بندہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ ہمارے ایس ایس پی صاحب گزرنے والے ہیں۔"

"ہاں۔" موٹے تازے آفیسر نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ "ٹھیک ہے، بٹھاؤ اس کو بھی موبائل میں۔"

دو چار پولیس والے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اب میں اتنا بھی کمزور نہیں ہوا تھا کہ ان لوگوں سے نمٹ نہیں سکتا میں نے استادِ محترم سے سیکھا ہوا فن آزمایا اور دو چار کو مار مار کر لٹا دیا۔

بس کیا تھا۔ اس کے بعد تو ہنگامہ ہی ہو گیا اور بہت سے پولیس والے مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ مصیبت یہی تھی کہ مجھے انسان سے بھوت بننے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے تھوڑی بہت مار کھا کر وہاں سے بھی بھاگ لیا۔

لیکن پولیس والوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بھی مسلسل تعاقب میں تھے۔ دوڑتے دوڑتے ایک مسجد نظر آئی اور میں اس میں گھس گیا۔ صحن میں سات آٹھ آدمی بیٹھے

درس و تدریس میں مصروف تھے۔ میری بدحواسی دیکھ کر میرے پاس آگئے۔

''کیا ہوا، کہاں سے آرہے ہو، کیوں دوڑ رہے تھے۔''

''پلیز، مجھے پناہ دیں۔ میں اس وقت پھنس گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''مذہب کیا ہے تمہارا۔ کس مسلک کے ہو؟'' کسی نے پوچھا۔

''بھائیو! میں مسلک وسلک تو نہیں جانتا۔ انسان ہوں تم جیسا۔''

''یہ کافر معلوم ہوتا ہے۔'' ایک نے آواز لگائی۔

''میرے بھائیو، میں نے کہا نا کہ میں صرف انسان ہوں۔''

''انسان ہو تو مسلک بتاؤ، کیا ہو تم؟''

''ارے بھائیو! یہ تم لوگ مجھے کس چکر میں الجھا رہے ہو؟'' میں گڑبڑا کر بولا۔ ''میں صرف ایک انسان ہوں اور پناہ چاہتا ہوں۔''

''یہ کافر ہے کافر۔ مارو اس کو۔'' ہر طرف آوازیں آنے لگیں۔

ان لوگوں نے بھی مارنا شروع کردیا۔ ایسا لگا جیسے میں صرف مار ہی کھانے کے لیے بھوت سے انسان بنا تھا۔ میں اس مسجد سے بھی باہر آگیا۔ باہر ایک اور تماشا ہو رہا تھا۔ ایک زبردست قسم کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ بہت سے ڈنڈا بردار دکانوں کو توڑ رہے تھے اور گاڑیوں کو آگ لگا رہے تھے، ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ میں اپنے دکھوں کو بھول کر ان لوگوں کو دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ بہت ہی پُرجوش لوگ تھے۔ غصے میں بھرے ہوئے۔ میرے قریب دو نوجوان کسی غریب کا ٹھیلا جلانے میں مصروف تھے۔

میں نے ان سے پوچھ لیا۔ ''بھائیو! کیا مسئلہ ہے۔ کیا ہوا ہے یہاں؟''

''تم کو نہیں معلوم؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''نہیں بھائی۔ مجھے نہیں معلوم۔''

''کس دنیا میں رہتے ہو۔ ڈنمارک میں ایک گستاخ نے ہمارے نبی ﷺ کا مذاق اڑانے کی جسارت کی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''ایک بات بتاؤ، کیا یہ غریب ٹھیلے والا ڈنمارک کا باشندہ ہے؟''

''نہیں۔''

''جس نے جسارت کی ہے، کیا اس سے ٹھیلے والے کی کوئی رشتے داری ہے؟''

''کیا پاگل ہوگئے ہو! رشتے داری کیسی! اس جاہل ٹھیلے والے نے تو ڈنمارک کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔''

''تو پھر اس غریب کا ٹھیلا کیوں جلا رہے ہو۔ اس بے چارے کا کیا قصور؟'' میں نے کہا۔

''بھائیو! یہ بندہ یہودیوں کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔'' کسی طرف سے آواز آئی۔

''ہاں، یہ یہودی ہے۔ ایجنٹ ہے۔ مارو اس کو۔''

ایک بار پھر وہی مار دھاڑ، اور میں وہاں سے بھی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس بار میں اتفاق سے ایک ایسے میدان کی طرف جانکلا جہاں سناٹا تھا۔ اس میدان میں کئی درخت بھی تھے۔

میں ایک درخت کے پاس پہنچ گیا۔ اب مجھے تھوڑی فرصت مل گئی تھی۔ میں یہاں بیٹھ کر دوبارہ انسان سے بھوت بن سکتا تھا اور میں بھوت بن گیا۔

28 جنوری 2012ء

میں ایک بار پھر اس بھوتنی کے پاس بیٹھا ہوا تھا جس کے بیٹے سے میری بیٹی کا رشتہ ہونے والا تھا اور جس نے دس ویران شہروں کی شرط لگائی تھی۔

''ہاں بھائی صاحب، کیا سوچا ہے آپ نے جہیز کے بارے میں!'' اس نے پوچھا۔

''بھوتنی بہن، بس چند برس رک جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے دس ویران شہروں کی بات کی تھی نا۔ میں تمہیں چند برسوں کے بعد چالیس ویران شہر بیٹی کے جہیز میں دے سکتا ہوں۔''

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''ایسا کون سا ملک ہوگا جس کے آباد شہر چند برسوں کے بعد ویران ہونے والے ہوں گے۔''

''ہے ایسا ایک ملک...... جسے ایک خاص نظریے کے تحت حاصل کیا گیا اور جس کی آزادی کی خاطر لاکھوں جانیں گئیں مگر...... اب اسی آزادی کو کروڑوں جانیں دے کر رفتہ رفتہ اختتام کی جانب دھکیلا جارہا ہے۔ بس...... میری ہونے والی سمدھن کچھ برسوں کا انتظار اور...... یقین جانیے یہ چند برس بھی یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے۔'' میں نے ہوا میں چٹکی بجاتے ہوئے ہاتھ لہرایا تو مجھے اپنے اندر ایک نیا جوش اور ولولہ صاف محسوس ہو رہا تھا۔ ''مگر اس کا نام میں نہیں بتا سکتا یقین نہ ہو تو خود جاکر دیکھ لینا۔''

صحرا نورد درویش

ضیا تسنیم بلگرامی



جن کے پیروں میں گردش ہو وہ ایام گردش سے گھبرایا نہیں کرتے... کیونکہ مشہور ہے سفر وسیلہ ظفر... ویسے بھی انسان سفر سے علم سیکھتا ہے... اللہ کے اس ولی کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ تھی کہ آپ کا زیادہ تر وقت سفر میں گزرا اور جو کچھ سیکھا اس سے عوام الناس کو بھی فیض پہنچاتے رہے اور سفر کا دائرہ مکمل کرتے رہے... ایسے لوگوں کی کیا شان ہوتی ہے جن پر اللہ کی خاص نظر کرم ہو۔

بستی بستی صحرا صحرا محوِ سفر ایک درویش کی روداد

ایران کے شہر رے میں زنبیلیں بنانے والے ابراہیمؒ نامی صوفی کو لوگوں نے اس وقت تعجب سے دیکھنا شروع کیا جب ان کے توکل اور استغنا کا چرچا بغداد اور اس سے بھی آگے پہنچ گیا۔ آپؒ نے زنبیل بنانا اور اسے بازار میں فروخت کردینا، خاص پیشے کے طور پر اختیار کر رکھا تھا۔ اس لیے لوگ انہیں ابراہیمؒ خواص کہنے لگے تھے۔ ایک عرصے تک رے میں رہنے کے بعد آپؒ نے حج کا ارادہ کیا۔ اس وقت تک آپؒ کے آس پاس ارادت مندوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوچکا تھا۔ لوگ آپؒ سے طرح طرح کے سوالات کرتے اور ان کے ایمان افروز جواب سے اپنی روح میں تازگی اور گرمی محسوس کیا کرتے تھے۔ آپؒ سفرِ حج کی تیاری مکمل کرچکے تھے۔ رے کے ارادت مندوں نے آپؒ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا اور آپ سے طرح طرح کے سوالات اور خواہشیں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا۔ ''حضرت! مکہ معظمہ میں، خدا کے گھر کے روبرو میرے حق میں دعا ضرور فرمایئے گا کیونکہ افلاس نے ایک عرصے سے میرا بہت برا حال کر رکھا ہے۔''

آپؒ جواب دیتے۔ ”اے شخص! کیا تیرا رب یہاں تیرے حال اور خواہش سے آگاہ نہیں ہے کہ میں مکہ معظمہ میں اس کے گھر کے سامنے تیرے لیے دعا کروں؟“

دوسرا کہتا۔ ”حضرت! میں صبر اور توکل سے واقف تو ہوں اور اس کے نتائج اور ثمرات کا بھی مجھے علم ہے لیکن جہاں تک طاقت صبر اور استطاعتِ توکل کا تعلق ہے، میں ان دونوں سے محروم ہوں۔ خدا سے دعا کیجیے گا کہ مجھے یہ دونوں خوبیاں بھی حاصل ہو جائیں۔“

آپؒ مسکرا کر جواب دیتے۔ ”تیری مجبوریاں اور پے در پے مایوسیاں خود بہ خود تجھ میں یہ اوصاف پیدا کر دیں گی۔ اس کے لیے دعا مانگنے کا یہ مطلب ہے کہ تجھ پر ناکامیوں اور نامرادیوں کی بارش کر دی جائے تاکہ تو ان کا خوگر ہو جائے۔“

انہی میں سے کسی ایک نے سوال کیا۔ ”حضرت! ایمان کی کیا حقیقت ہے؟“

آپؒ نے ذرا سکوت اختیار کیا پھر جواب دیا۔ ”تمہارے سوال کا اس وقت میرے پاس کوئی جواب نہیں کیونکہ اس وقت میں جو جواب دوں گا وہ قول کے ذریعے ہوگا جبکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری بات کا جواب عمل سے دیا جائے۔“

سوال کرنے والے نے پوچھا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہوگا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تمہیں اپنے جواب کے لیے میرے ساتھ مکہ معظمہ کے سفر میں چلنا ہوگا۔ اللہ نے چاہا تو دورانِ سفر تمہیں اپنے سوال کا جواب خود بہ خود مل جائے گا۔“

وہ شخص آپؒ کے جواب سے متفق ہو گیا اور حج کے سفر میں آپؒ کا ساتھی بن گیا۔ دورانِ سفر اس شخص نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ راستے میں دور دور تک آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا، اس لیے کسی دکان کا خیال تک نہ کیا جا سکتا تھا لیکن ابراہیمؒ خواص ہر روز اپنے شریکِ سفر کو تازہ تازہ دو روٹیاں اور دو آبخورے پانی پیش کر دیتے۔ جس میں سے ایک روٹی اور ایک آبخورہ پانی شریکِ سفر کھا لیتا اور دوسری روٹی اور پانی سے آپؒ سیر ہوتے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ ان روٹیوں اور پانی کے راز سے آگاہی حاصل کرے لیکن ناکام رہا۔ کافی مسافت طے کر چکنے کے بعد ان دونوں کی ایک تن رسیدہ بزرگ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ بزرگ بھی گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے ابراہیمؒ خواص کو دیکھتے ہی گھوڑے کی پشت سے چھلانگ لگا دی اور نیچے آ گئے۔ نہایت ادب و احترام سے ابراہیمؒ خواص کے پاس پہنچے اور سرگوشی میں باتیں کرنے لگے۔ جواب میں ابراہیمؒ خواص بار بار نفی میں اپنی گردن ہلا رہے تھے۔ بزرگ نے عاجزی سے کہا۔ ”اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجبوری ہے۔ بہرحال جیسی تمہاری مرضی۔“

ان بڑے میاں نے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنے گھوڑے کی طرف جاتے ہوئے بولے۔ ”اچھا، میں تو جا رہا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔“

ابراہیمؒ خواص نے فی امان اللہ کہہ کر اپنا سفر جاری رکھا۔

شریکِ سفر نے حیرت سے پوچھا۔ ”حضرت! یہ کون تھا اور کیا کہہ رہا تھا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”یہ شخص تیرے سوال کا جواب تھا۔“

اس نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟ میں آپؒ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے اور اس بات کے خواہش مند تھے کہ میری صحبت میں رہنے لگیں لیکن میں نے انکار کر دیا۔“

اس شخص نے نہایت تعجب سے کہا۔ ”لیکن آپؒ نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی خاص بات ورنہ لوگ تو حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت تک کو ترستے رہتے ہیں۔“

”تم بھی ٹھیک ہی کہتے ہو لیکن اگر میں انہیں اپنی صحبت میں رکھنے کی ہامی بھر لیتا تو اس سے میرا توکل مجروح ہو جاتا۔ میں نے خضر علیہ السلام سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں خدا کے سوا کسی پر بھی اعتماد نہیں کرتا۔ اگر تم میری صحبت میں رہنے لگو گے تو اس بات کا امکان پیدا ہو جاتا ہے کہ میں خضر پر بھی تکیہ کرنے لگوں اور میں نے ایک عرصے سے خدا کے سوا تمام سہارے اپنے دل سے نکال دیے ہیں۔ تم نے مجھ سے ایمان کی تعریف پوچھی تھی، یہ اس کا عملی جواب ہے۔“ شریکِ سفر سناٹے میں آ گیا۔

☆☆☆

آپؒ نے صحرانوردی اختیار کی تو کسی ایک جگہ جم کر رہنے کا اپنے دل سے خیال ہی نکال دیا لیکن ایک شہر میں آپؒ زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور یہاں آپؒ کی بزرگی اور عظمت کا وہ شہرہ ہوا کہ آپؒ کے گرد لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپؒ کو خیال گزرا

کہ اس شہرت سے ان کے دل و دماغ پر اچھا اثر نہیں مرتب ہو رہا اور اس سے غرور پیدا ہو جانے کا ڈر پیدا ہو گیا ہے۔ آپؒ نے اس بیماری سے نجات حاصل کرنے کا ایک عجیب و غریب علاج دریافت کیا۔ ایک دن صبح آپؒ ایک ایسے حمام میں پہنچ گئے جہاں امیر زادیاں غسل کے لیے آیا کرتی تھیں۔ اس دن ایک شہزادی غسل کے لیے آئی ہوئی تھی۔ آپؒ سیدھے حمامی کے پاس پہنچے۔ اس نے آپؒ کو دیکھتے ہی خوش اخلاقی سے سلام کیا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ نے پوچھا۔ ”کیا حمام میں کوئی امیر زادی موجود ہے؟“

حمامی نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج تو میری خوش قسمتی سے شہزادی صاحبہ تشریف لائی ہوئی ہیں۔“ پھر شہزادی کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ان کا لباس میرے پاس امانتاً رکھا ہے میں اس کی حفاظت کر رہا ہوں۔“ آپؒ چپ چاپ حمامی کے پاس بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد شہزادی نے حمامی کو کسی ضرورت سے بلوایا۔ آپؒ نے اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھایا اور شہزادی کا لباس چرا کر اپنی راہ لی پھر تخلیے میں آپؒ نے اپنے کپڑے اتارے اور شہزادی کے کپڑے پہن لیے۔ ان پر اپنا لباس پہن لیا۔

حمامی جب دوبارہ اپنی جگہ پر واپس پہنچا تو شہزادی کا لباس غائب دیکھ کر بدحواس ہو گیا پھر اس نے ابراہیمؒ خواص کو تلاش کیا ان کا بھی کہیں پتا نہ تھا۔ رہ رہ کر انہی پر چوری کا گمان جاتا تھا لیکن ان کی بزرگی کے شہرے سے وہ ڈر جاتا تھا۔ اس نے حمام کے باہر موجود خدمت گاروں سے پوچھا۔ ”یہاں کوئی آیا تھا؟“

انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”ابراہیمؒ خواص کے سوا کوئی بھی نہیں آیا۔“

حمامی نے گھبرا کر سوال کیا۔ ”جب ابراہیمؒ خواص واپس جا رہے تھے تو تم میں سے کس کس نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا؟“

دو خدمت گاروں نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں نے۔“

”وہ خالی ہاتھ تھے یا ان کے ہاتھوں میں کپڑے وغیرہ بھی تھے؟“

”ان کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی سی تھی لیکن جب وہ آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں یہ پوٹلی نہیں تھی۔“

حمامی کے لیے اب شک و شبے کی کوئی بات بھی نہ رہی تھی۔ وہ افتاں و خیزاں اٹھا اور خدمت گاروں کو حکم دیا۔ ”دیکھو تم سب ہوشیار اور چوکس یہیں موجود رہو، کچھ دیر بعد شہزادی غسل سے فارغ ہو جائے گی۔ تم شہزادی سے کہنا کہ انہیں کچھ دیر حمام ہی میں رکنا پڑے گا کیونکہ ان کا لباس چوری ہو چکا ہے اور اسے ابراہیمؒ خواص کے علاوہ کسی نے بھی نہیں چرایا۔ میں ان کی تلاش میں جا رہا ہوں۔“ خدمت گاروں کو حمامی کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیرت اور شک و شبے سے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔

حمامی بدحواس اور پریشان ابراہیمؒ خواص کے ٹھکانے پر جا رہا تھا لیکن وہ راستے میں ہی مل گئے۔ حمامی نے ان کا گریبان پکڑ لیا اور نہایت گستاخانہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں رے چور! اس بزرگی کی آڑ میں چوری کا مذموم پیشہ اختیار کرتے ہوئے تجھے شرم نہیں محسوس ہوئی؟“

آپؒ نے کہا۔ ”میرا گریبان تو چھوڑ، آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے کچھ مجھے بھی تو پتا چلے؟“

اس جھگڑے کو دیکھنے کے لیے راہ گیر بھی اکٹھے ہونے لگے۔ ان میں اکثر وہ لوگ تھے جن پر ابراہیمؒ خواص کی بزرگی کا گہرا نقش بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے حمامی سے کہا۔ ”دشمنِ دین و ایماں! کیا تو اندھا ہو گیا ہے اور یہ بھی نہیں جانتا کہ اس وقت تیرا ہاتھ کس مقدس گریبان پر ہے؟“

حمامی نے گریبان کو ایک سخت جھٹکا دیا اور آپؒ کے حامی کو جواب دیا۔ ”میرا ہاتھ میرے چور کے گریبان پر ہے۔ اس نے میرے حمام سے شہزادی کا لباس چوری کیا ہے۔ کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں شہزادی کا موردِ الزام ٹھہروں اور اس کا لباس چرانے کے جرم میں بندی خانے کی قید بھگتوں؟“

ایک ارادت مند نے کہا۔ ”لیکن تجھے یہ بات کس طرح معلوم ہوئی کہ شہزادی کا لباس انہی بزرگ نے چرایا ہے؟“

حمامی نے جواب دیا۔ ”لوگو! میں نے خدا کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا اس کے باوجود کوئی شخص بھی خدا کے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب میں شہزادی کے لباس کی نگرانی کر رہا تھا تو اس وقت سے لے کر لباس غائب ہو جانے تک وہاں اس کے علاوہ کوئی اور پہنچا ہی نہیں تھا اور یہ لباس بھی اسی وقت غائب ہوا ہے جب میں شہزادی صاحبہ کی طلبی پر اس کے پاس سے اٹھ کر شہزادی کے پاس چلا گیا تھا۔ اب تم خود ہی بتاؤ کہ شہزادی کا لباس اس کے علاوہ کون غائب کر سکتا ہے؟“

گریبان کو بار بار کھینچنے کی وجہ سے اندر سے شہزادی کا لباس صاف نظر آنے لگا۔ حمامی نے اسے دیکھتے ہی آپ کا گریبان چاک کر دیا، بولا۔ ''تو نے اندر کیا پہن رکھا ہے؟''

گریبان کے چاک ہوتے ہی شہزادی کا لباس صاف صاف نظر آنے لگا۔ حمامی نے تماشائیوں سے کہا۔ ''دیکھا، میں جو کہتا تھا کہ شہزادی کا لباس اسی نے چرایا ہے۔ آپ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے کہ شہزادی کا لباس اس نے خود اپنے اندر پہن رکھا ہے۔''

لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا لیکن وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ حقیقت تھی۔ حمامی نے اور زیادہ واویلا کیا۔ ''لوگو! جب ان جیسے بزرگ ایسی مذموم حرکتیں کریں گے تو پھر اعتبار کس پر کیا جائے گا۔''

لوگوں نے آپؒ پر لعن طعن شروع کر دی۔ ایک شخص بولا۔ ''ابراہیمؒ! پھر تم نے یہ تصوف کا لباس کیوں پہن رکھا ہے؟''

دوسرے نے کہا۔ ''رنگا سیار ہے رنگا سیار۔ اس کو یہیں برہنہ کر کے شہزادی کا لباس اتروالو۔''

لوگوں نے آپؒ کو گھیرے میں لے کر پٹائی شروع کر دی اور شہزادی کا لباس اسی وقت اتار لیا۔ حمامی کی جان میں جان آئی۔ اس نے تماشائیوں سے کہا۔ ''اب آپ لوگ اس کے ساتھ جو سلوک مناسب سمجھیں کریں۔ میں تو اسے نہایت نیک اور متقی سمجھتا تھا لیکن یہ تو چور نکلا۔''

لوگوں نے بیک آواز جواب دیا۔ ''یہ چور ہے، اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو چوروں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔''

تماشائیوں نے ایک دم شور مچا دیا۔ ''چور ہے چور، حمام کا چور۔''

حمامی نے کپڑے پاتے ہی اپنی راہ لی۔ لوگوں نے آپؒ کو مار پیٹ کر چھوڑ دیا۔ آپؒ زخمی حالت میں ایک گوشے میں تشریف لے گئے اور اپنے نفس سے کہا۔ ''بول، اب تو کیا کہتا ہے۔ تو تو اس شہر میں مستقلاً ہی ٹک گیا تھا۔ اب اس ذلت و رسوائی کے بعد بھی کیا تو اس شہر میں رہنے کی ہمت کر سکتا ہے؟''

اس کے بعد آپؒ کو لوگوں نے حمام کا چور کہنا شروع کر دیا۔ آپؒ نے اس شہر کو چھوڑ دیا اور ایک قریبی قصبے میں چلے گئے لیکن آپؒ کی شہرت وہاں آپؒ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ آپؒ نے جس جگہ قیام کرنا چاہا وہاں چند بزرگ بیٹھے آپؒ ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک بزرگ کہہ رہے تھے۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ ابراہیم خواصؒ نے چوری کیوں کی؟ انہیں یہ بات ہرگز زیب نہ دیتی تھی۔''

دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ ابراہیمؒ نے ایسا کیوں کیا؟ وہ اس شہر میں ایک عرصے سے بزرگ اور محترم شخص کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ اس عزت اور احترام نے ان کے دل میں غرور اور تکبر پیدا کر دیا تھا۔ اس غرور کو توڑنے کے لیے چوری کی ذلت اور رسوائی کا سہارا لینا از حد ضروری تھا۔''

پہلے بزرگ نے زیر لب تبسم سے کہا۔ ''حضرت! جب چوری شرعاً ناجائز ہے تو ابراہیمؒ کو اس ناجائز فعل سے بچنا چاہیے تھا۔ اللہ انہیں دینی معاملات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

دوسرے بزرگ نے جواب دیا۔ ''حضرت! ابراہیم خواصؒ کو خدا نے جو عقل دی ہے آپ تو اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ آپ جس فعل کو غیر شرعی اور ناجائز قرار دے رہے ہیں، جہاں تک میں سمجھتا ہوں ابراہیم خواصؒ اسے جائز اور شرعی ثابت کر سکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

اسی وقت ابراہیم خواصؒ بھی اجازت لے کر ان کے پاس جا بیٹھے۔ پہلے بزرگ نے منہ بنایا اور دوسرے نے آپؒ کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور کہا۔ ''حضرت! زہے نصیب، جو آپؒ ہم میں تشریف لائے۔''

آپؒ نے کہا۔ ''ابھی تم دونوں کس مسئلے پر بحث کر رہے تھے؟''

پہلے بزرگ نے طنزاً کہا۔ ''یہ حضرت آپؒ کی چوری کے فعل کو شرعی اور جائز قرار دے رہے ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ بات ہرگز نہیں آتی کہ ایک حرام امر شرعی اور جائز کس طرح قرار پا سکتا ہے۔''

آپؒ نے ہنس کر کہا۔ ''حضرت! خدا آپ کا بھلا کرے، جس طرح زندگی کو بچانے کے لیے حرام شے کو بھی حلال قرار دے دیا گیا ہے اسی طرح ایمان کو بچانے اور تکبر اور سرکشی کو توڑنے کے لیے چوری جیسے غیر شرعی اور ناجائز کام کو بھی شرعی اور جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں نے چوری، چوری کی نیت سے نہیں کی تھی بلکہ اپنے سرکش نفس کی اصلاح کی خاطر کی تھی اور بخدا

میں اس میں کامیاب ہو چکا ہوں۔''

دونوں بزرگ آپؒ کے استدلال سے خاموش ہو گئے۔

☆☆☆

آپؒ ہمیشہ اپنے ساتھ سوئی، دھاگا، قینچی اور ڈوری رکھا کرتے تھے۔ لوگ کہتے کہ ایک طرف تو آپؒ لوگوں کو توکل کا درس دیا کرتے ہیں اور دوسری طرف سوئی، دھاگے، قینچی اور ڈوری ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہیں، کیا ان کی موجودگی میں بھی آپ توکل کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

آپؒ نے جواب دیا۔ ''یہ حقیری چیزیں توکل کے منافی نہیں ہیں، تو تصوف کو پہلے اچھی طرح سمجھ لے اس کے بعد اعتراض کر۔''

آپ صحرا میں مارے مارے پھر رہے تھے کہ اس صحرا میں ایک جگہ آپؒ کو ایک عورت نظر آگئی۔ اس پر وجدانی کیفیت طاری تھی۔ وہ پریشان حال، سر برہنہ پھر رہی تھی۔ آپؒ اس کے پاس پہنچے اور کہا۔ ''اے عورت! کیا تو اپنی جنس سے واقف ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں نے خود کو پہچان لیا ہے۔''

آپؒ نے کہا۔ ''اگر تو نے خود کو پہچان لیا ہے تب پھر یہ کیا کہ تو ننگے سر پھر رہی ہے، تو اپنا سر کیوں نہیں ڈھانپتی؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ابراہیمؒ! تم اپنی آنکھیں کیوں نہیں بند کر لیتے؟''

آپؒ نے کہا۔ ''میں عاشق ہوں اور آنکھیں بند کر لینا عشاق کا شیوہ نہیں۔''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں مست ہوں اور مستوں کو سر ڈھانپنے کا ہوش کب رہتا ہے۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''تو نے کس میکدے سے پی ہے، جس کا نشہ اتنا گہرا چڑھا ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''ابراہیمؒ! میں حیران ہوں کہ یہ سوال تم کر رہے ہو حالانکہ تم خوب جانتے ہو کہ یہاں دوسرا کوئی میکدہ ہی نہیں کیونکہ ہم دونوں ہی یہ جانتے ہیں کہ دونوں عالم میں خدا کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

آپؒ نے پوچھا۔ ''کیا تو میرے ساتھ رہنا پسند کرے گی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں مرد کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی بلکہ میں فرد کی خواہاں ہوں۔''

اس عورت کو آپؒ نے وہیں چھوڑا اور کسی اور طرف نکل گئے۔ دوران سفر آپؒ نے ایک جنگل میں پانی کی طلب میں ادھر ادھر پھرنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد ایک درخت کے نیچے انہیں پانی نظر آیا۔ یہ اس کے نیچے پہنچ گئے لیکن ان کے پہنچتے ہی ایک شیر غراتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔ انہوں نے سوچا اگر ان کی موت اس شیر کے ذریعے ہی لکھی گئی ہے تو انہیں کوئی نہیں بچا سکتا اور اگر زندگی باقی ہے تو شیر کی مجال نہیں کہ انہیں نقصان پہنچائے۔ یہ راضی بہ رضائے الٰہی درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ شیر آپؒ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ لنگڑا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر آپؒ پر ڈالی اور زمین پر بیٹھ گیا اور زخمی پیر آپؒ کی طرف بڑھا دیا۔ آپؒ نے دیکھا اس کا پیر زخم کی وجہ سے پھولا ہوا ہے۔ آپؒ اس سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہوئے۔ زمین پر سے ایک لکڑی اٹھائی اور اس سے شیر کے زخم کو آہستہ آہستہ کھرچنا شروع کر دیا۔ زخم سے خون اور پیپ خارج ہونے لگی۔ شیر نہایت تحمل اور برداشت سے چپ چاپ بیٹھا زخم صاف کراتا رہا۔ زخم صاف کر چکنے کے بعد آپؒ نے اپنی گدڑی پھاڑی اور اس میں سے پٹی نکال کر اس کے زخم پر باندھ دی۔ شیر نے محبت بھری نظروں سے آپؒ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ نے شیر سے کہا۔ ''افسوس کہ میں یہاں جنگل میں اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شہر میں ہوتا تو زخم پر دوا بھی لگا دیتا۔''

شیر نے دم ہلائی اور ایک طرف چلا گیا۔ آپؒ نے پانی سے پیاس بجھائی اور درخت کی جڑ سے ٹیک لگا کر ذرا دم لینے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد شیر واپس آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو بچے بھی آئے تھے۔ ان تینوں کو دیکھ کر آپؒ کھڑے ہو گئے۔ شیر آپ سے دہاڑا اور دم ہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں بچے بھی دم ہلا رہے تھے پھر یہ تینوں آپ کا طواف کرنے لگے۔

آپؒ نے کہا۔ ''تم تینوں میرا شکریہ ادا کر رہے ہو حالانکہ تمہیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ میں نے وہی کیا جس کا خدا نے مجھے حکم دیا تھا۔''

شیر نے ادھر ادھر گھوم پھر کر دہاڑنا شروع کیا گویا کہہ رہا ہو اس جنگل میں کس کی مجال ہے جو آپؒ کو گزند پہنچانے کی جرأت کرے۔ اس واقعے کو ایک مدت گزر گئی اور آپؒ کی صحرانوردی اور دشت گردی کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بار ایک مرید بھی آپ کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ حسب سابق آپؒ ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ آپؒ نے مرید کے ساتھ ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ وقت تھا آپؒ نے نماز کی نیت باندھی، ساتھ ہی مرید بھی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی نماز جاری ہی تھی کہ کسی طرف سے

شیر کے غرانے کی آواز سنائی دی۔ اس آواز نے مرید کو اتنا خوف زدہ کیا کہ وہ نیت توڑ کر درخت پر چڑھ گیا لیکن آپؒ پر شیر کی غراہٹ کا کوئی اثر نہ ہوا اور بہ دستور نماز پڑھتے رہے۔ اسی دوران شیر ایک طرف سے نمودار ہو کر اس درخت کے نیچے آگیا۔ مرید اوپر خوف زدہ بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ شیر نے اس کے پیرو مرشد کو اب کھایا اور اب کھایا۔ شیر آپؒ کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور آپؒ کو نماز پڑھتے دیکھتا رہا پھر اٹھا اور آپؒ کے تین چکر لگاتا رہا۔ دائیں بائیں اور پیچھے، سامنے جانے سے گریز کرتا رہا۔ مرید حیرت اور خوف سے یہ سب دیکھتا رہا۔ آخر شیر نے ایک طرف کی راہ لی اور مرید اس یقین کے باوجود کہ شیر جا چکا ہے ڈر کی وجہ سے درخت سے نہیں اترا۔ آپؒ نے نماز پوری کی اور مرید کا خیال کیے بغیر اپنی راہ لی۔ مرید نے آپؒ کو جاتے دیکھا تو فوراً درخت سے نیچے آگیا اور تیز تیز قدم بڑھاتا آپؒ کے پاس جا پہنچا۔ آپؒ نے پوچھا۔ ”تو کہاں رہ گیا تھا؟“

مرید نے کپکپاتی آواز میں جواب دیا۔ ”حضرت! کیا آپؒ نے شیر کے غرانے کی آواز نہیں سنی تھی اور کیا آپؒ نے اسے اپنے آس پاس چکر لگاتے نہیں دیکھا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”میں نماز میں مشغول تھا۔ کیا تو نے اس کی آواز سنی تھی اور اسے چکر لگاتے دیکھا تھا؟“

مرید نے کہا۔ ”ہاں حضرت! لیکن میں حیران ہوں کہ اس نے آپؒ کو گزند کیوں نہیں پہنچایا؟“

اسی وقت آپؒ کے پیر میں کسی زہریلے مچھر نے کاٹ لیا۔ آپؒ نے اس کی اتنی زیادہ تکلیف محسوس کی کہ درد سے تلملانے لگے۔ مرید نے دریافت کیا۔ ”کیا ہوا حضرت؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”غالباً مچھر نے کاٹ لیا ہے، کسی زہریلے مچھر نے۔“

مرید نے حیرت سے کہا۔ ”حضرت! حیرت ہے کہ آپؒ شیر جیسے درندے سے خوف زدہ ہوئے نہیں لیکن ذرا سے مچھر نے کاٹ لیا تو آپؒ اتنے بے چین ہو گئے۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”جس وقت شیر آیا تھا میں اللہ کے حضور میں کھڑا تھا اور ایک خاص کیفیت نے مجھے سرشار اور بے خود کر رکھا تھا لیکن اس وقت جبکہ مچھر نے کاٹا ہے میں اپنے آپ میں تھا اس لیے اس کی تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔“

اسی طرح ایک اور مرید آپؒ کا ہمسفر تھا اور ان دونوں کا ایک ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں سانپوں کی کثرت تھی۔ وہاں کے لوگوں نے بھی ان دونوں کو خبردار کیا کہ اس نواح میں ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ سانپوں کے کاٹنے کی اکثر وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ آپؒ نے مرید کو ساتھ لیا اور پہاڑ کی کھوہ میں چلے گئے۔ اس پہاڑی کھوہ میں سانپوں کی بہت زیادہ کثرت تھی۔ مرید نے سانپوں کو بلوں میں سے نکلتے اور ادھر ادھر رینگتے دیکھا۔ اس نے آپؒ کو خوف سے آواز دی۔ ”حضرت! یہ آپ کہاں لے آئے ہیں مجھے۔ یہاں تو سانپ اس طرح رینگتے پھر رہے ہیں جس طرح کیچوے رینگتے ہوں۔ یہاں سے بچ کر نکلنا تو بہت ہی مشکل بات ہے۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”گھبرا مت، اللہ کو یاد کر تجھے سانپ نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔“

آپؒ کی ہدایت پر مرید نے عبادت شروع کر دی۔ آپؒ خود بھی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ سانپ ان دونوں سے دور دور گھومتے رینگتے رہے اور اپنے اپنے بلوں میں آتے جاتے رہے۔

صبح ہوتے ہوتے مرید کی آنکھ لگ گئی لیکن آپؒ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہے۔ صبح جب مرید کی آنکھ کھلی تو مرید گھبرا کر آپؒ کی طرف رجوع ہوا۔ اس نے دیکھا، آپؒ آنکھیں بند کیے اللہ اللہ کا ورد فرما رہے ہیں اور آپؒ کے قریب ہی ایک موٹا اور لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ مرید نے گھبرا کر عرض کیا۔ ”حضرت! آپؒ کو کچھ خبر بھی ہے کہ آپؒ کے قریب کتنا موٹا اور لمبا سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ اگر آپؒ فرمائیں تو میں اسے ہلاک کر دوں؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تجھے نہیں معلوم کہ یہ رات جو گزر چکی ہے نہایت افضل اور برکتوں والی رات تھی اور میں تجھ پر حیران ہوں کہ تو اس افضل رات میں بھی خدا کی یاد سے غافل ہو کر سو رہا۔“

مرید نے دیکھا، آپؒ کے کپڑے پر ایک بچھو رینگ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کے عرض کیا۔ ”حضرت! آپؒ کے لباس پر بچھو رینگ رہا ہے۔“

اس کے بعد مرید بچھو کو مارنے کے لیے اٹھا لیکن آپؒ نے منع کر دیا، فرمایا۔ ”نہیں، اسے مارنا مت کیونکہ میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے کسی چیز کا ضرورت مند نہیں بنایا بلکہ دوسروں کو میرا محتاج کر دیا ہے۔“

بچھو کچھ دیر تک تو رینگتا رہا، اس کے بعد اتر کے ایک سوراخ میں چلا گیا۔

☆☆☆

آپؒ تنہا سفر کر رہے تھے۔ کئی دن کئی رات سفر کر چکنے کے بعد آپؒ کو آبادی کی جستجو ہوئی۔ طبیعت میں پریشانی تھی اور انسانوں میں پہنچنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے پھر اچانک ایک طرف سے مرغ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ آپؒ نے اس خیال سے کہ ادھر آبادی ضروری ہوگی۔ مرغ کی آواز کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ ابھی آپؒ نے زیادہ راستہ طے نہیں کیا تھا کہ ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور آپؒ کی گردن پر ایک زوردار مکا رسید کر کے فرار ہو گیا۔ آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ”اے اللہ! کیا اپنے متوکلین کی تو یوں ہی عزت کرواتا ہے؟“

اسی وقت کسی نے جواب دیا۔ ”ابراہیمؒ! جب تک تو نے اپنے رب پر توکل کیا، مخلوق نے تیری عزت کی لیکن جب تو نے مرغ کی آواز کے سہارے انسانوں کی ہمسائیگی پر توکل کا ارادہ کیا تو تجھے لوگوں کی نظروں سے گرا دیا گیا۔ حالانکہ تو اس سے بھی بڑی سزا کا مستحق تھا۔“

آپؒ مکے کی ضرب سے نڈھال آگے بڑھے اور عرض کیا۔ ”الٰہ العالمین! اب میں دوبارہ ایسی غلطی نہیں کروں گا، اس بار تو مجھے معاف کر دے۔“

مکے کی تکلیف گردن کو ٹیڑھا کیے ہوئے تھی لیکن آپؒ نے اس تکلیف کی پروا کیے بغیر ادھر کا رخ کیا جدھر آبادی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ ابھی آپؒ نے تقریباً ایک فرلانگ کا راستہ طے کیا تھا کہ پھر ایک آواز سنائی دی۔ ”اے ابراہیم خواص! کیا تم اس شخص کو پہچان سکتے ہو جس نے ابھی تھوڑی دیر قبل تمہاری گردن پر ایک مکا رسید کیا تھا؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”خدایا! میں تیری مشیت اور مدد کے بغیر ایک ذرے تک کو پہچاننے یا سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“

آواز آئی۔ ”اپنے سامنے دیکھ، یہ کس کی لاش ہے؟“

آپؒ نے اپنے سامنے دیکھا، ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ اسے کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔

اسی آواز نے مطلع کیا۔ ”یہ اسی شخص کی لاش ہے جس نے تیری گردن پر مکا رسید کیا تھا۔“

ابھی آپؒ کچھ ہی دور چلے ہوں گے کہ ایک شخص نے آپؒ کا نام لے کر آپؒ کو سلام کیا۔ آپؒ نے پوچھا۔ ”تو کون ہے، میں تجھے پہچانتا نہیں حالانکہ تو نے میرے نام سے مخاطب کیا ہے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”اے خواص! میں ایک آتش پرست ہوں اور آپؒ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”مجھ سے کیا چاہتا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”آپؒ کا ساتھ، آپؒ کی قربت، آپؒ کی معیت۔“

آپؒ نے کہا۔ ”لیکن میں زیادہ تر حالت سفر میں رہتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”میری خواہش ہے کہ میں بھی آپؒ کا شریک سفر ہو جاؤں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”لیکن جہاں میں جانا چاہتا ہوں وہاں تیرا گزر ممکن نہیں۔“

آتش پرست نے کہا۔ ”خواص! میں ہر شے سے بے نیاز ہو کر آپؒ کے ساتھ چلوں گا تاکہ آپؒ کی صحبت سے میں بھی فیض حاصل کر سکوں۔“

آپؒ نے کہا۔ ”میرے ساتھ رہنے میں تجھے فاقوں کی اذیت جھیلنا پڑے گی۔“

اس نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔“

آپؒ نے کہا۔ ”تب پھر چل میرے ساتھ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

آتش پرست آپؒ کے ساتھ ہو گیا۔ یہ دونوں ایک ساتھ ایک ہفتے تک حالت سفر میں رہے۔ آتش پرست کا فاقوں سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے آٹھویں دن نڈھال ہو کر عرض کیا۔ ”حضرت! اب بھوک ناقابل برداشت ہو چکی ہے اور کمزوری میرے پیر پکڑ رہی ہے۔ آپؒ خدا سے کھانا طلب فرمائیے ورنہ میرا اب آپؒ کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔“

آپؒ نے آسمان کی طرف دیکھ کر عرض کیا۔ ”خدایا! تو نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ یہ آتش پرست کھانا مانگ کر میرا امتحان لے رہا ہے۔ اب تو ہی مجھے ندامت سے بچا سکتا ہے۔ تجھے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، میری آبرو رکھ لے۔“

آپؒ نے ابھی دعا ختم ہی کی تھی کہ ایک شخص دور سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ دونوں اسے دیکھتے رہے یہاں تک کہ جب وہ

کسی قدر قریب آ گیا تو پتا چلا کہ اس کے سر پر خوان رکھا ہوا ہے۔ اس نے آپؒ کے قریب آ کر دریافت کیا۔ ”آپ دونوں میں ابراہیمؒ خواص کس کا نام ہے؟“

آتش پرست نے آپؒ کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپؒ کا نام ہے۔“

خوان بردار نے عرض کیا۔ ”یہاں سے ذرا فاصلے پر ایک بستی ہے۔ اس کے حاکم نے یہ کھانا آپؒ کو بھیجا ہے کیونکہ کچھ دیر پہلے خدا نے اسے حکم دیا تھا کہ ابراہیمؒ خواص اپنے آتش پرست ساتھی کے ہمراہ بھوکے پیاسے پھر رہے ہیں۔“

آپؒ کا دل بھر آیا، گداز آواز میں عرض کیا۔ ”میرے خدا نے میری دعا سے پہلے ہی میری ضرورت محسوس کر لی تھی۔ میں کس زبان سے اس کے لطف و کرم کا شکریہ ادا کروں؟“

اس کے بعد خوان پر سے کپڑا جو اٹھایا تو لذیذ کھانوں کی خوشبو نے آتش پرست کو بے چین کر دیا۔ خوان میں گرم گرم روٹیاں، تلی ہوئی مچھلی، تازہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی رکھا ہوا تھا۔ دونوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور خدا کا شکر ادا کر کے اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ان دونوں کو ایک ہفتے تک پھر بھوکا رہنا پڑا اور آتش پرست ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ اب اسے کچھ کہنے میں تامل ہو رہا تھا۔ آٹھویں دن پھر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ آخر اس نے پھر زبان کھولی، بولا۔ ”حضرت! ایک بار پھر اپنے خدا سے کھانے کی درخواست کیجیے، میں تو بھوک سے عاجز آ گیا ہوں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”میں تیرے کہنے سے ایک بار اپنے خدا سے کھانا طلب کر چکا ہوں، اب تو بھی تو کچھ کر، میں تیرا کمال تو دیکھوں۔“

آتش پرست نے نہایت بے بسی سے آپؒ کی شکل دیکھی اور اپنے ہاتھ کا عصا زمین پر رکھ دیا، بولا۔ ”آپؒ کہتے ہیں تو میں بھی کوشش کرتا ہوں کہ اپنا کمال دکھاؤں۔“

اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ کچھ دعا مانگی پھر بہ آواز بلند کہا۔ ”اب میں اپنی دعا کی تاثیر کا انتظار کروں گا۔“

ابراہیمؒ خواص حیرت سے اپنے آتش پرست ساتھی کی حرکات و سکنات دیکھ رہے تھے۔ آخر ان دونوں نے ایک بار پھر ایک شخص کو دور سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب یہ شخص ان دونوں کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر انہیں بہت تعجب ہوا کہ یہ بھی وہی شخص تھا، جو ایک بار پہلے بھی خوان لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی سوال کیا۔ ”آپ دونوں میں آتش پرست کون ہے؟“

آتش پرست نے جواب دیا۔ ”میں ہوں، شاید تم میرے ہی پاس آئے ہو؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں۔ تمہیں یہ خوان بھیجا گیا ہے۔“

آتش پرست نے خوشی خوشی خوان لے لیا اور اس پر سے کپڑا جو ہٹایا تو یہ دیکھ کر وہ دونوں حیرت زدہ رہ گئے کہ اس میں بھی وہی سب کچھ موجود تھا جو پہلے خوان میں ملا تھا۔ ابراہیمؒ خواص کو حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کہ اب ان میں اور آتش پرست میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا۔

آتش پرست نے خوش ہو کر آپؒ سے کہا۔ ”آیئے ہم دونوں خوب شکم سیر ہو کر کھائیں۔“

آپؒ نے ندامت سے جواب دیا۔ ”تم تنہا کھا لو، مجھے بھوک نہیں ہے۔“

آتش پرست نے حیرت سے کہا۔ ”کئی دنوں سے ہم دونوں نے کچھ کھایا نہیں پھر آپؒ کو بھوک کیوں نہیں ہے؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تم اصرار نہ کرو میں نہیں کھاؤں گا۔“

آتش پرست نے آپؒ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ ”نہیں جناب انکار سے کام نہیں چلے گا۔ آپؒ کو میرے ساتھ کھانا ضرور پڑے گا۔ جب آپؒ کھانا کھا چکیں گے تو میں آپؒ کو دو خوش خبریاں سناؤں گا۔“

آپؒ نے کہا۔ ”اگر تم کھانا کھلانے پر مصر ہی ہو تو اپنی دونوں خوش خبریاں مجھے پہلے سنا دو، میں کھانا بعد میں کھاؤں گا۔“

آتش پرست نے جواب دیا۔ ”پہلی خوش خبری تو یہ ہے کہ آج سے میں مسلمان ہو رہا ہوں، مجھے کلمہ پڑھا کے مسلمان کر لیجیے اور ارکان دین کی تعلیم دیجیے۔“

آپؒ نے خوش ہو کر سوال کیا۔ ”اور دوسری خوش خبری؟“

اس نے جواب دیا۔ ”دوسری خوش خبری یہ ہے کہ اس وقت ہم دونوں جو کچھ کھائیں گے، یہ مجھے آپ ہی کے طفیل ملا ہے۔“

آپؒ نے کہا۔ ”ذرا صاف صاف بیان کرو۔“

اس نے جواب دیا۔ ”جب آپؒ نے مجھ سے یہ کہا کہ آج میں اپنا کمال دکھاؤں تو میں اپنی جگہ بہت شرمسار اور نادم تھا

کیونکہ میں اپنی حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھا، آخر میں نے خدا سے یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! ابراہیمؒ خواص کے صدقے میں مجھے ندامت سے بچا لے۔ اس دعا کے فوراً بعد ہمیں یہ خوان مرحمت فرما دیا گیا۔ اب آپؒ ہی بتایئے کہ کیا میں اب بھی آتش پرست رہ سکتا ہوں؟“

آتش پرست اسی وقت مسلمان ہو گیا اور ان دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور مکہ معظمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر اس نے ابراہیمؒ خواص کا ساتھ چھوڑ دیا اور خانہ کعبہ کا مجاور بن گیا۔

☆☆☆

ایک بار پھر آپؒ حج کی غرض سے حجاج کے قافلے میں شامل ہو گئے لیکن راستے میں قافلے سے علیحدگی اختیار کر لی کیونکہ انہیں کسی کا سہارا لے کر چلنا ناگوار گزرتا تھا۔ انہوں نے حجاج کا عام راستہ چھوڑ دیا اور ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ اس راستے پر تین دن اور تین رات چلتے رہے اور انہیں کھانے کا خیال تک نہ آیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک سرسبز و شاداب جنگل میں داخل ہو گئے۔ اس جنگل میں میوے دار درختوں کی کثرت تھی اور پھولدار درختوں اور پودوں سے پورا علاقہ اٹا پڑا تھا۔ ایک جگہ ایک خوب صورت تالاب بھی موجود تھا۔ آپؒ اس کے حسن اور دلکشی سے اسے جنت سمجھ بیٹھے۔ یہ حیران اور متجسس ابھی کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے کہ ایک طرف سے چند لوگوں کی ایک جماعت آتی دکھائی دی۔ ان کا چہرہ تو آدمیوں ہی جیسا تھا لیکن بقیہ حصہ انسانوں سے ذرا مختلف تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ، شانے غائب لیکن ہاتھوں کے نیچے بغل سے ان کا دھڑ بتدریج چوڑا ہوتا چلا گیا تھا۔ دونوں ٹانگیں غیر معمولی لمبی تھیں۔ پوشاکیں پہنے، خوب صورت پٹکوں سے کمریں کسی ہوئیں۔ انہوں نے آتے ہی آپؒ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور انسان کی طرح عرض کیا۔ ”ابراہیمؒ! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ۔“

ان میں سے ایک نے آپؒ کو مخاطب کیا۔ ”ابراہیمؒ! ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے، ہمارا خیال ہے آپؒ ہمیں اس سے مطلع فرما کر ہماری ذہنی الجھنیں دور فرما دیں گے۔“

آپؒ نے کہا۔ ”لیکن جب تم لوگ اپنا تعارف نہیں کرواتے، میں تم سے کس طرح باتیں کروں۔“

ایک نے اپنے ساتھیوں کی شکل دیکھی اور پھر جواب دیا۔ ”حضرت! ہم لوگ جن ہیں۔ آپؒ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپؒ جس مرتبے کے انسان ہیں ہم میں ایک بھی آپؒ جیسا نہیں ہے۔“

آپؒ نے نرمی سے کہا۔ ”پوچھو، تم لوگ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

ایک جن نے جواب دیا۔ ”ہم نے خدائے بزرگ و برتر کا کلام رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے۔ العقبہ میں ہمیں آپؒ کا شرف حضوری بھی حاصل رہا ہے۔ آپؒ کے کلام مبارک نے ہم سے ہماری دنیا کے سارے کام نکال لیے اور اس کے صلے میں خدا نے ہمیں یہ جنت نظیر جنگل عطا فرمایا ہے۔“

آپؒ نے بات کاٹ دی، پوچھا۔ ”یہاں سے وہ جگہ کتنی دور ہے جہاں سے میں نے حجاج کا قافلہ چھوڑا تھا؟“

آپؒ کے سوال پر ایک جن مسکرایا اور جواب دیا۔ ”اے ابراہیمؒ خواص! اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار عجائب و اسرار ہیں، ان میں سے ایک یہ جنگل بھی ہے اور یہاں جس جگہ تو موجود ہے تجھ سے پہلے ایک انسان اور آ چکا ہے تو دوسرا انسان ہے۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”مجھ سے پہلے یہاں کون آیا تھا؟“

جن نے جواب دیا۔ ”وہ بھی تیرے جیسا ایک بزرگ تھا۔ اس نے یہیں وفات پائی اور اس کی قبر اس تالاب کے کنارے موجود ہے جسے تو خود بھی دیکھ سکتا ہے۔“

اس کے بعد جن نے قبر کی طرف اشارہ کیا جو تالاب کے کنارے بنی ہوئی تھی۔ اس قبر کے تین طرف ایک باغیچہ بنا ہوا تھا جس میں طرح طرح کے پھول کھلے تھے۔ ان پھولوں کو آپؒ نے اس سے پہلے کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔

جن نے کہا۔ ”ابراہیمؒ خواص! اس وقت تیرے اور تیرے ساتھیوں کے درمیان برسوں کا فاصلہ حائل ہے۔“

آپؒ نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، پہلے بزرگ کا ذکر کرو۔“

ایک جن نے کہا۔ ”ایک دن ہم سب اس تالاب کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہم میں محبت کا ذکر چھڑا ہوا تھا، ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک ایک شخص ہم میں آ گیا اور اس نے آتے ہی ہمیں سلام کیا۔ ہم نے سلام کا جواب دے کر دریافت کیا کہ جناب کہاں سے آ رہے ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نیشاپور سے چلا آ رہا ہوں۔“

ہم نے پوچھا۔ ”وہاں سے کب چلے تھے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”سات دن پہلے۔“

ہم نے پوچھا۔ ”گھر چھوڑنے کی وجہ؟“

اس نے جواب دیا۔ ”خدا کا یہ کلام۔ اللہ کی طرف رجوع کرو اور اس کے فرماں بردار بن جاؤ قبل اس کے کہ تم پر عذاب آئے پھر تمہاری مدد نہ ہوگی۔“

پھر جن نے ذرا رک کر کہا۔ ”ہم نے اس مرد قلندر سے پوچھا۔ ”انابت کا عذاب کے کیا معنی ہیں؟“

اس نے جواب دیا۔ ”انابت کا مطلب ہے کہ اپنے آپ سے رجوع ہو کر اسی کا ہو رہے اور تسلیم کے معنی ہیں کہ اپنی جان اس کے سپرد کر دے اور یہ سمجھے کہ میری نسبت خدا اس کا زیادہ مستحق ہے بلکہ مستحق ہی نہیں مالک بھی۔ اس کے بعد جب اس نے عذاب کے معنی بتانا چاہے تو اس کی زبان سے لفظ عذاب نکلا ہی تھا کہ اس نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ ہم لوگوں نے اسے یہاں تالاب کے کنارے دفن کر دیا۔“ اس کے بعد اس جن نے افسوس سے کہا۔ ”خدا اس سے راضی ہو، بڑا صاحب دل اور اہل جذب انسان تھا۔“

آپؒ اس شخص کی قبر پر گئے۔ قبر کے سرہانے نرگس کے پھولوں کا ایک بہت بڑا گلدستہ رکھا ہوا تھا جس پر عبارت لکھی تھی۔ ”یہ خدا کے دوست کی قبر ہے، اسے اس کی غیرت نے ہلاک کر دیا۔“

گلدستے کے پاس ہی ایک کاغذ رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ ”عذاب تو بہت بڑی شے ہے خشیتِ الٰہی رکھنے والوں کے لیے لفظ عذاب ہی اتنا مہیب اور مہلک ہے کہ اہل جذب اس کا متحمل نہیں ہو سکتا جس کی مثال یہ شخص ہے جو اس قبر میں سو رہا ہے۔“

جب آپؒ نے یہ عبارت جنوں کو پڑھ کر سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور بیک آواز کہا۔ ”ہماری الجھن دور ہو گئی۔ ہمیں اپنے متنازعہ مسئلے کا جواب مل گیا۔“

اس کے بعد آپؒ نے بڑی تکان محسوس کی اور نیند سے آپؒ کی آنکھیں بند ہونے لگیں یہاں تک کہ آپؒ سو گئے۔ آپؒ کتنی دیر سوئے کچھ پتا نہ چلا لیکن جب آنکھ کھلی تو آپؒ ایک نئی جگہ پر پڑے ہوئے تھے۔ آپؒ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وہ ایک فرش پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے مسجد کی محراب تھی اور یہ جگہ ان کی دیکھی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ آخر آپؒ کھڑے ہو گئے، ہوش و حواس صحیح طور پر کام نہیں کر رہے تھے۔ آپؒ کے قدموں میں انہی پھولوں کی پنکھڑیاں بکھری پڑی تھیں جو آپؒ جنوں کی بستی میں دیکھ آئے تھے۔ آپؒ باہر نکلے تو یہ جگہ سمجھ میں آ گئی۔ یہ حضرت عائشہؓ کی مسجد تھی۔ آپؒ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ آپؒ مسجد میں واپس گئے اور پھولوں کی بکھری پنکھڑیاں آپؒ نے سمیٹ لیں اور ان کی خوشبو سے سال بھر تک محظوظ ہوتے رہے۔

☆☆☆

ایک شخص آپؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ”میں آپؒ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ہم نشینی کا شرف عطا فرمایئے۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”کیا تو جانتا ہے کہ میں زیادہ تر حالت سفر میں رہتا ہوں، کیا تو سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار ہے؟“

اس نے کہا۔ ”حضرت! میں خود ایک درویش ہوں اور دنیا کو ترک کر چکا ہوں۔ میرے لیے سفر کی صعوبتیں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ میں آپؒ کی ہم نشینی میں بڑی سے بڑی صعوبت جھیلنے کو تیار ہوں۔“

آپؒ نے کہا۔ ”میری ہم نشینی کے لیے ایک شرط بھی ہے اگر تو میری شرط مان لے گا تو تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے وہ شرط بھی بتا دیجیے حالانکہ میں شرط سنے بغیر ہی ماننے کو تیار ہوں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”میں اس شرط پر تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا کہ ہم دونوں میں سے ایک حاکم بن جائے اور دوسرا محکوم تاکہ دوران سفر سارے امور بہتر طریقے سے انجام پا سکیں۔“

امیدوار نے کہا۔ ”آپؒ حاکم بن جائیں اور میں محکوم۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

آپؒ نے کہا۔ ”بہتر ہے، اب تو میرے ساتھ رہ سکتا ہے۔“

ان دونوں نے ایک ساتھ سفر شروع کر دیا۔ پہلی ہی منزل پر آپؒ نے درویش سے کہا۔ ”تو یہیں ٹھہر میں پانی لے کر آتا ہوں۔“ وہ ٹھہر گیا، آپؒ پانی لائے، آگ جلائی اور سارا کام خود ہی انجام دیتے رہے۔ آپؒ کے ہم نشین درویش نے شرما کر عرض کیا۔ ”حضرت! کوئی کام میرے سپرد بھی کیجیے۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”یہ بات تو ہم دونوں میں پہلے ہی طے پا چکی ہے کہ میں حاکم رہوں گا اور تو محکوم اور بحیثیت حاکم میں تجھے حکم دیتا ہوں کہ اپنی زبان بند رکھے گا اور مجھے میرے کاموں سے نہیں روکے گا۔“

درویش خاموش ہو گیا۔ آپؒ ہر جگہ ہر کام خود ہی انجام دیتے رہے۔ ایک جگہ بارش شروع ہو گئی۔ آپؒ نے اپنی چادر شامیانے کی طرح تانی اور اس کے نیچے درویش کو بٹھا لیا اور خود بارش میں بھیگتے رہے۔ یہ کیفیت پوری رات رہی۔ درویش پہلو بدلتا رہا اور بمشکل اپنی زبان بند رکھ سکا۔ صبح اس نے آپؒ سے کہا۔ ”حضرت! اب تک آپ نے جو کچھ کیا وہ حاکم کا نہیں محکوم کا فرض تھا۔ میں شرم و ندامت سے ہلاک ہو جاؤں گا۔ خدا کے لیے آپؒ محکومی سے پرہیز کریں اور حاکم کی شان اختیار کریں۔“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تو غلط سمجھ رہا ہے، میں اگر تجھے یہ حکم دوں کہ تو میری خدمت کر تو یہ بڑی زیادتی ہوگی اور حکم سے سرتابی بھی۔ جب میں تیرا حاکم ہوں تو ایک حاکم کا یہ فرض ہے کہ اپنے محکوم کی خدمت کرے تو میرا نوکر نہیں محکوم ہے اور حاکم اپنے محکوم کا خدمت گزار ہوتا ہے۔“

یہ درویش خاموش ہو گیا اور مکہ معظمہ تک آپؒ کے ساتھ رہا پھر الگ ہو گیا۔

واپسی میں آپؒ شامی علاقے سے گزر رہے تھے کہ آپؒ کا گزر ایک ایسے باغ کے پاس سے ہوا جہاں تُرش انار کے درختوں کی کثرت تھی اور پھلوں سے درخت پٹے ہوئے تھے۔ آپؒ کا جی چاہا کہ کاش ایک آدھ انار مل جاتا لیکن پھر توکل نے انہیں اپنی خواہش کی تکمیل سے باز رکھا۔ آپؒ ان درختوں کے پاس سے ہٹ گئے۔ آگے جا کر آپؒ کو ایک ایسا شخص دکھائی دیا جو دونوں ہاتھوں اور پیروں سے بیکار تھا۔ ہاتھ تھے لیکن بیکار تھے، پیر تھے لیکن مفلوج تھے۔ وہ کولہے کے بل گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ آپؒ اس کے قریب گئے تو پتا چلا اس کے جسم میں کیڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔ آپؒ کو اس پر بہت رحم آیا، بولے۔ ”اے شخص! اگر تو اجازت دے تو میں تیری صحت یابی کے لیے دعا کروں؟“

اس نے ترشی سے جواب دیا۔ ”نہیں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”تو مجھے دعا سے کیوں منع کر رہا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”عافیت مجھے پسند ہے اور یہ اذیت میرے مولا کو پسند ہے۔ اس لیے اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی پسند کو اپنی پسند پر ترجیح دوں۔“

اس کے جسم پر مکھیوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ آپؒ نے کہا۔ ”اچھا، اگر تو پسند نہیں کرتا کہ میں تیرے حق میں دعا کروں تو یہ اجازت دے کہ میں تیرے جسم کی مکھیاں اڑا دوں۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”اے خواص! پہلے اپنے دل سے ترش انار کی خواہش تو نکال دے اس کے بعد میری طرف توجہ دینا۔“

آپؒ نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو نے یہ کس طرح سمجھ لیا کہ میرے دل میں انار کی خواہش ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”خدا شناس پر خدا ہر شے واضح کر دیتا ہے۔“

آپؒ نے پوچھا۔ ”کیا یہ کیڑے تجھے تکلیف نہیں پہنچا رہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”یہ سب اللہ کے حکم سے اذیت پہنچانے پر مامور ہیں، اس لیے میں اذیت نہیں محسوس کرتا۔“

اسی دوران آپؒ کو کسی نے اطلاع دی کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک کلیسا ہے جس میں لوگوں کے بقول ایک راہب ستر سال سے روپوش ہے۔ آپؒ اس کلیسا میں تشریف لے گئے اور بہ آواز بلند راہب کو مخاطب کیا۔ ”اے شخص! جو لوگوں کے بقول ستر سال سے اس کلیسا میں روپوش ہے، ابراہیمؒ خواص تجھ سے ملنا چاہتا ہے۔“

آپؒ جواب کے انتظار میں ایک کھڑکی کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کچھ دیر بعد کھڑکی کھلی اور وحشت زدہ پریشان حال سا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”اے خواص! تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

آپؒ نے جواب دیا۔ ”تو نے اس بلا کی رہبانیت کیوں اختیار کر رکھی ہے؟“

راہب نے کہا۔ ”میں راہب نہیں ہوں بلکہ وہ شخص ہوں جس کے نفس نے کتے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ میں اس کتے کی نگرانی میں لگا ہوا ہوں کیونکہ میں خوب جانتا ہوں کہ اگر میں باہر نکلا تو میرے نفس کا کتا خدا کی مخلوق کو ستانے سے باز نہیں رہے گا۔ میں مخلوق کو اس کے شر سے بچائے ہوئے ہوں۔“

آپؒ نے اس راہب کے حق میں دعا کی۔ ”خدایا! اس راہب کو صحیح راہ پر ڈال دے کیونکہ یہ نہیں جانتا کہ نفس کے کتے کی نگرانی جس طرح یہ کر رہا ہے اگر ہر شخص اسی طرح کرنے لگے تو دنیا کا کاروبار ہی رک جائے۔“

راہب نے کہا۔ ”خواص! تم میرے لیے ناحق دعا کر رہے ہو۔ تم اس طرح کب تک خاک چھانتے رہو گے۔ آخر تم کے تلاش کر رہے ہو پہلے تم خود کو تلاش کرلو۔ جب تم اپنے آپ کو پا جاؤ تو پھر اپنے نفس کی نگرانی شروع کر دینا کیونکہ خواہشاتِ نفسانی بھیس بدل بدل کر دن میں تین سو ساٹھ قسم کا لباس الوہیت پہن کر آتی ہیں اور بندے کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیل کر چلی جاتی ہیں۔“

آپؒ خاموش ہو گئے اور خود سے کہا۔ ”جب خدا نے خود ہی اس کے دل اور فکر پر قفل ڈال دیے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔“

آپؒ کے ہمعصر ابوالحسن الخرانی کو صوفیوں سے بڑی چڑ تھی۔ ایک دن آپؒ کی مجلس میں یہ بھی موجود تھے۔ آپؒ اپنے ارادتمندوں سے فرما رہے تھے۔ ”انسان کے لیے تین مصیبتیں ہیں پہلی مصیبت زر و مال سے محبت، دوسری عورت سے محبت اور تیسری سرداری سے اور حکم چلانے کی محبت ہے۔ اگر کوئی شخص ان تینوں پر غالب آنا چاہے تو روپے کی محبت کو پرہیزگاری سے مغلوب کرلے۔ عورت کی محبت کو ترکِ شہوات سے اور سرداری کی محبت کو گمنامی کی زندگی اختیار کر کے، ختم کر دے۔ لوگو! اچھے مرید کا اللہ مطلوب ہوتا ہے اور صدق یقین اس کے بھائی ہیں۔ خلوت اس کا گھر، تنہائی اس کی مونس، دن اس کا غم، رات اس کی خوشی، اس کا دل اس کا رہنما، قرآن اس کا مددگار، گریہ اس کا لباس، بھوک اس کی غذا، عبادت اس کی رونق، معرفت اس کی سپہ سالار، حیات اس کا سفر، زمانہ اس کی منزلیں، پرہیزگاری اس کا راستہ، صبر اس کا اوڑھنا، سکون اس کا بچھونا، صدق اس کی سواری اور موت کا خوف اس کا ڈر ہوتا ہے۔“

ابوالحسن پر اس وعظ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ آپؒ کے پیچھے ہو لیے۔ آپؒ نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ آخر ابوالحسن اپنے گھر گئے اور ساری کتابیں لوگوں میں تقسیم کر دیں اور آپؒ کی صحبت اختیار کرلی۔ آپؒ نے ایک عرصے بعد ان پر توجہ دی اور اپنی ہم نشینی کا شرف بخشا۔

ایک دن آپؒ زور زور سے اپنے سینے پر ہاتھ مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”مجھے اس خدا کے دیدار کا اشتیاق ہے جو مجھے ہر لمحہ دیکھتا رہتا ہے۔“

آپؒ سے لوگوں نے پوچھا۔ ”آپؒ کھاتے کہاں سے ہیں کیونکہ کھانا کہیں سے آتا تو نظر آتا نہیں۔“

آپؒ نے جوش میں جواب دیا۔ ”مجھے کھانا اسی جگہ سے ملتا ہے جہاں سے شکم مادر میں بچے کو ملتا ہے اور جہاں سے جنگلی جانور کھاتے ہیں۔“

آپؒ اپنے وطن رے کی مسجد میں تشریف فرما تھے کہ پیٹ کی مروڑ سی محسوس ہوئی۔ بعد میں پتا چلا کہ آپؒ کو مرض پیچش لاحق ہو گیا ہے۔ یہ مرض اتنا بڑھا کہ آپؒ دن میں ساٹھ ساٹھ بار رفع حاجت کے لیے تشریف لے جاتے اور ہر بار واپس آ کے غسل کرتے اور دو رکعت نماز ادا کرتے۔

ایک دن لوگوں نے پوچھا۔ ”حضرت! آپؒ کو کس چیز کی خواہش محسوس ہوتی ہے؟“

آپؒ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”بھنی ہوئی کلیجی کی خواہش محسوس ہو رہی ہے۔“

اس کے بعد آپؒ غسل خانے میں تشریف لے گئے اور وہیں آپؒ کا انتقال ہو گیا۔

وفات کی خبر سن کر لوگ آپؒ کی میت پر جمع ہونے لگے۔ آپؒ کی میت میں ایک دوسرے بزرگ بھی شریک ہونے کے لیے تشریف لائے اور انہوں نے آتے ہی آپؒ کا تکیہ اٹھایا۔ وہاں سے روٹی کا ایک ٹکڑا برآمد ہوا۔ ان بزرگ نے کہا۔ ”لوگو! بہ خدا اگر یہ ٹکڑا ان کے تکیے کے نیچے سے نہ نکلتا تو میں ان کے جنازے میں ہرگز شریک نہ ہوتا۔“

کسی نے پوچھا۔ ”حضرت! وہ کیوں؟“

بزرگ نے جواب دیا۔ ”اس صورت میں، میں سمجھتا کہ خواص کا انتقال محض توکل پر ہی ہوا ہے اور توکل کا اگلا مقام رد توکل آپؒ کو حاصل نہیں ہوسکا جبکہ ہر صوفی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تمام مراتب حاصل کرے نہ یہ کہ صرف ایک ہی صفت پر جم جائے اور دوسری صفات سے محروم رہ جائے۔“

آپؒ کے علم کی بابت یہ قول بہت مشہور ہے کہ ”علم تو بس اسی کا ہے جو علم کی پیروی کرے اور اس کو کام میں لائے کیونکہ غیر کے سرمائے سے تجارت کرنے والا مفلس ہوتا ہے۔“

ماخذات

الطبقات الکبریٰ، علامہ عبدالوہاب الشعرانی۔ روضۃ الریاحین، ابی محمد عبداللہ ۔سفینۃ الاولیاء، شہزادہ دارا شکوہ۔ تذکرۃ الاولیاء، شیخ فرید الدین عطار



محبت کی انتہا پر پہنچنے والی ایک جنونی محبت کا اظہار

نسیم انور

خس کم

دنیا مختلف مزاجوں کا مجموعہ ہے کبھی محبت میں تمام عمر ساتھ رہنے کی خواہش کبھی نظر کا انداز بدل جانے پر نظرانداز کرنے کا فن... یہاں بھی جب محبت جبر میں بدلی تو نہ صرف نظر کا انداز بدلا بلکہ زندگی بھی ایک نئی سمت میں رواں ہوگئی۔

میڈیلن پُرسکون ناشتے سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ایلیٹ کچن میں داخل ہوا اور اس نے ناشتے کا مزہ کرکرا کر دیا۔

”کیا تم یہ نہیں سمجھتیں کہ شکر بے بی کے لیے بری ہے؟“ ایلیٹ نے حسبِ عادت اپنا مخصوص سوالیہ انداز اپناتے ہوئے کہا جس کا اسے جواب مطلوب نہیں ہوتا تھا۔

میڈیلن نے اپنے سیریل کے پیالے پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے ایلیٹ کی جانب مجرمانہ نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ”انڈوں سے مجھے متلی آنے لگتی ہے۔“

”تمہیں تو ہر شے سے متلی آتی ہے۔“ ایلیٹ نے اپنے ہونٹ پر سے ایک رواں علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

میڈیلن نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”یہ ہارمونز کی وجہ سے ہوتا ہے۔“ اس نے اپنی کرسی پیچھے کھسکاتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پیالے میں موجود بقیہ سیریل نالی میں بہا دیا اور خالی پیالہ ڈش واشر میں رکھ دیا۔

”سو اب تم خود کو بھوکا مارو گی؟“

میڈیلن تھکن کے باعث ایلیٹ سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس کی کوکھ میں موجود بچے نے پیٹ میں اندر لات مار کر اسے نیند سے بے دار کر دیا تھا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے تھے پھر اس کے بعد اسے نیند نہیں آئی تھی۔

”یقیناً نہیں، تم بے معنی باتیں کیوں کر رہے ہو؟“

”مجھے تمہاری صحت کے بارے میں فکر ہے۔“ ایلیٹ نے کہا۔ ”یہ بات بے معنی کیوں کر ہوئی؟“

”ایلیٹ، پلیز!“

”کیا! تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟“

”مجھ سے پہلے کی طرح پیار کرو۔“ میڈیلن نے دل ہی دل میں کہا پھر بلند آواز سے بولی۔ ”کچھ نہیں، امید ہے کہ کام پر تمہارا دن خوش گوار گزرے گا۔“ میڈیلن یہ کہہ کر بیڈروم میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنی اس خواہش کو کچل دیا کہ بلند آواز سے چیخنا شروع کر دے۔

صورت حال یہ نہیں ہونی چاہیے تھی جواب تھی۔

پانچ ماہ قبل جب انہیں حمل ٹھہرنے کی نوید ملی تھی تو دونوں نے خوشی کے مارے بچوں کے مانند کلکاریاں بھری تھیں۔ وہ دیر تک بچے کے نام کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ ایلیٹ کا اصرار تھا کہ بچے کا نام اس کے دادا کے نام پر ہوریس رکھا جائے جبکہ میڈیلن نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر بیٹی ہوئی تو وہ اس کا نام اپنی نانی کے نام پر برتھا رکھے گی۔ ایلیٹ نے اس موقعے پر اسے پیلے گلاب، اچار کا جار اور ایک سلور بریسلٹ دے کر حیران کر دیا تھا۔ وہ اسے باقاعدہ چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس بھی خود لے جاتا تھا لیکن دو ماہ قبل سے ایلیٹ کچھ بدل سا گیا تھا۔ اب وہ اس سے مسلسل لڑنے لگا تھا۔ اس نے میڈیلن کے سراپے اور اس کے کھانے پینے پر تنقید کرنا شروع کر دی تھی۔ اب میڈیلن اپنے چیک اپ کے لیے بھی ڈاکٹر کے پاس تنہا ہی جاتی تھی۔

میڈیلن کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے ابھرے ہوئے پیٹ پر رکھ دیا۔ کوکھ میں موجود بچے کی حرکت محسوس کرتے ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ شاید بچے کی آمد پر حالات پھر سے پہلے کی طرح بہتر ہو جائیں۔

اوہ خدایا! حالات بہتر ہو جانے چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کے شوہر کا کسی کے ساتھ افیئر چل رہا ہے تو پھر وہ اسے چھوڑ کر جانے پر

مجبور ہوگی اور اگر وہ چلی گئی تو وہ اسے نہیں بخشے گا بلکہ سزا دے گا۔ اور وہ سزا جسمانی نہیں ہوگی، وہ اس پر ہاتھ کبھی نہیں اٹھائے گا اور نہ ہی اس پر چیخے چلائے گا۔ البتہ وہ اپنے وکیل کو میڈیلن کی اس لت کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا جو چار سال قبل اسے درد دافع دواؤں کی عادت پڑ چکی تھی۔ وہ ان کے بچے کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا جو اس کے بس میں ہو سکتا ہے۔ جیت اسی کی ہوگی۔ میڈیلن کو بچے سے محروم ہونا پڑے گا۔

اس لیے کہ جیت ہمیشہ ایلیٹ ہی کی ہوتی تھی۔ وہ کبھی ہار نہیں مانتا تھا۔

☆☆☆

ایلیٹ ڈائننگ روم کی میز پر جھک گیا اور نقشے کے ایک کونے پر بنے ہوئے نیلے رنگ کے ایک چھوٹے سے دھبے پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ وہ مقام ہے جہاں میں کل رات اور ہفتے کے روز قیام کروں گا پھر اتوار کی صبح مضافات میں پیدل لمبی سیر کو نکل پڑوں گا۔“ اس نے اپنی لمبی انگلی نقشے پر بنی ہوئی اس بل کھاتی سبز لکیر پر پھیرتے ہوئے کہا جو سنورج جھیل سے پہاڑوں کے دامن تک چلی گئی تھی۔ ”میں حد سے حد سہ پہر تین بجے تک لوٹ آؤں گا، اوکے؟“

”میں چاہتی ہوں کہ تم تنہا مت جاؤ۔“ میڈیلن نے فکر مند لہجے میں کہا۔

”جیری کے بچے اس ویک اینڈ پر آئے ہوئے ہیں۔ اس نے ساتھ چلنے سے معذرت کر لی ہے اور مارک دفتر کے کام کی زیادتی کی وجہ سے جانے سے قاصر ہے۔ کیا میں دوسروں کی مصروفیت کی بنا پر اپنے طے شدہ پروگرام تبدیل کر دوں؟“ ایلیٹ نے اپنی عادت کے مطابق مخصوص سوالیہ انداز اپناتے ہوئے کہا۔

”لیکن وہ ایک غیر آباد اور شہر سے دور دراز علاقہ ہے۔“ میڈیلن نے ایک بار پھر تشویش کا اظہار کیا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کر رہا ہوں، میڈیلن۔ میں احمق نہیں ہوں۔ میں متعدد بار تنہا پیدل لمبی سیر کرتا رہا ہوں۔“ ایلیٹ نے ایک بار پھر نقشے پر بنے ہوئے چھوٹے نیلے رنگ کے دھبے پر انگلی رکھ دی اور بولا۔ ”کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس علاقے کو نشان زد کر دوں تاکہ تم بھول نہ جاؤ؟“

”سنورج جھیل، اتوار کی سہ پہر واپسی۔ میں نہیں بھولوں گی۔“ میڈیلن نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

ایلیٹ نے ایک پل کے لیے میڈیلن کے چہرے پر نظریں جما دیں۔ میڈیلن کو یوں لگا جیسے وہ آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لے گا لیکن ایلیٹ دوسرے لمحے سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”مجھے اپنا سفری تھیلا تیار کرنا ہے۔ تم سونے کے لیے چلی جاؤ۔ تمہاری آنکھوں کے نیچے ایک بار پھر سیاہ حلقے پڑ رہے ہیں۔“

☆☆☆

لیکن ایلیٹ اتوار کی سہ پہر تین بجے تک گھر نہیں لوٹا پھر پانچ بج گئے پھر سات بج گئے۔ میڈیلن نے درجن بھر سے زیادہ مرتبہ ایلیٹ کے سیل فون کا نمبر ڈائل کیا لیکن ہر مرتبہ اس کی وائس میل سنائی دی۔ وہ بے تاب ہو کر ٹہلتی رہی پھر ڈنر کرنے کے بعد دوبارہ ٹہلنا شروع کر دیا۔

جب رات کے دس بج گئے اور ایلیٹ کی کوئی خبر نہیں ملی تو اس کے سر میں درد ہونے لگا۔

کیا وہ راستہ بھول گیا ہے یا اسے کوئی چوٹ وغیرہ آگئی ہے یا وہ اس کے ساتھ کوئی ظالمانہ کھیل کھیل رہا ہے شاید یہی بات ہو۔ ٹھیک ہے، وہ اس بارے میں صبح کوئی فیصلہ کرے گی۔ اس رات میڈیلن کو صحیح نیند نہیں آئی۔ صبح بیدار ہونے پر خوف اور دہشت کا احساس اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ مکان میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میڈیلن نے ایک بار پھر ایلیٹ کے سیل فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی پھر اس نے ایلیٹ کے دفتر اور اس کے بہترین دوست کو فون کیا۔ وہ بھی ایلیٹ کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر رہے۔ تب میڈیلن نے ایلیٹ کے بھائی سے اور ریگن میں رابطہ کیا۔ کسی کو بھی ایلیٹ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں فکر مند ہو گیا اور سب ہی نے تشویش کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میڈیلن نے کانپتے ہاتھوں سے رینجر اسٹیشن کو فون نمبر ملا دیا۔

”کیا آپ کے شوہر نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ پیدل لمبی سیر کرنے کس علاقے میں جا رہے ہیں؟“ رینجر نے ملائم لہجے میں کہا۔ ”بدقسمتی سے ہم اس علاقے میں پیدل لمبی سیر کا پرمٹ جاری نہیں کرتے......“

میڈیلن کا دھیان اس ای میل کی طرف چلا گیا جو گزشتہ شب اس نے ایلیٹ کے لیپ ٹاپ پر پڑھی تھی۔ یہ ای میل مونا نامی کسی عورت نے بھیجی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اس کا شوہر کسی پہاڑ پر سے لڑھک کر اپنی ٹانگ تڑوانے کے بعد پہاڑی سلسلے میں کہیں پھنس گیا ہے یا کسی پہاڑی کی چوٹی تلے پانی کی کمی کے باعث بے ہوش پڑا ہے؟

”میڈم کیا آپ جانتی ہیں کہ وہ پیدل لمبی سیر کرنے کس علاقے کی طرف گئے تھے؟“ رینجر نے پوچھا۔

”آئی ایم سوری۔“ میڈیلن نے اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر خوشی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں۔“

جوڑا

مریم کے خان

وہ جو زندگی کے ایک حسین موڑ پر ملے اور شادی کے بندھن میں بندھنے کے بعد ایک روز خوب صورت سفر پر روانہ ہوئے تو کسے خبر تھی کہ سمتیں بدلتے بدلتے حالات اس قدر بدل جائیں گے... وہ جو ایک دوسرے کی چاہ میں گم تھے جانے کیسے اتنی گہرائی میں اتر گئے کہ جب آخری تہ تک پہنچے تو دنیا حیران رہ گئی... یہ سچ ہے کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں مگر... زمین پر رہنے والے انہیں جوڑ توڑ کر مسخ کردیتے ہیں... یہی ماجرا ان بیوپاریوں کا بھی تھا جو جانے کونسی منزلوں کی تلاش میں نکلے اور اپنا بھی نشاں کھو بیٹھے۔

دنیا کھنگالنے والے ایک خونیں

جوڑے کی لرزہ خیز کتھا

سڈنی سے برسبین کی طرف جانے والی فیری تیار تھی اس کا ہارن رہ رہ کر سیاحوں کو خبردار کر رہا تھا کہ وہ جلد از جلد فیری پر سوار ہو جائیں ورنہ رہ جائیں گے۔ شون اور مائیکا ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کھڑے تھے اور ایک جاپانی سیاح ان کے ویڈیو کیمرے سے ان کی مووی تیار کر رہا تھا۔ اس نے مووی بنائی اور کیمرا ان کو تھما کر بولا۔ ”سوری، مجھے دیر ہو رہی ہے فیری چلنے والی ہے۔“ مائیکا ہنسی۔ ”تم فکر مت کرو فیری نہیں جائے گی، یہاں

تمہیں جتنے لوگ گھومتے پھرتے اور تصویریں بنواتے دکھائی دے رہے ہیں ان سب کو اسی فیری سے جانا ہے۔"

اسی اثنا میں فیری کے کپتان نے میگافون پر وارننگ دی۔ "فیری دس منٹ میں ڈاک چھوڑ دے گی۔ تمام مسافر جلد از جلد سوار ہو جائیں۔"

اس پر سب عجلت میں فیری کی طرف لپکے تھے۔ یہ دو منزلہ فیری تھی جس میں سوار ہونے کے لیے اس پر دو عدد تختے لگے تھے سب کو ان سے گزر کر فیری میں جانا تھا۔ ہجوم کی وجہ سے شروع میں کچھ دشواری پیش آئی لیکن پھر عملہ آگیا اور اس نے ترتیب سے سب کو فیری پر چڑھا دیا۔ آخری مسافر کے جاتے ہی تختے ہٹا دیے گئے اور فیری سست روی سے ڈاک سے دور ہونے لگی۔ سیاح اب عرشے پر کھڑے سڈنی کی بندرگاہ اور عمارتوں کو دیکھ رہے تھے۔ شون اور مائیکا اپنی بنائی ہوئی مووی کا جائزہ لے رہے تھے اور خوش ہو رہے تھے۔ یہ ان کا ہنی مون ٹرپ تھا اور ان کا ارادہ جنوب مشرقی آسٹریلیا میں واقع بے فیلڈ نیشنل پارک جانے کا تھا۔ برسبین سے کوئی چھ سو میل جنوب میں وسیع رقبے پر پھیلا ہوا یہ پارک جزیرہ نما تھا۔ تین طرف سے سمندر میں گھرے اس نیشنل پارک میں کئی جزائر بھی شامل تھے اور دنیا کے دشوار ترین ساحل بھی یہاں تھے لیکن اس کی خوب صورتی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ صرف اس کی خوب صورتی کی وجہ سے تمام تر دشواریوں کے باوجود ہر سال بیس ہزار سے زیادہ سیاح یہاں آتے تھے۔

فیری سے برسبین تک سولہ گھنٹے کا سفر تھا۔ اس دوران فیری کہیں رکتی تو نہیں تھی لیکن وہ دنیا کے چند حسین ترین ساحلوں اور جزائر کے پاس سے گزرتی۔ یہ گریٹ بیریئر ریف کا علاقہ بھی تھا۔ ان سولہ گھنٹوں میں سیاحوں کو دیکھنے کو بہت کچھ ملتا اس لیے سب خوش تھے۔ سیاحوں میں نصف غیر ملکی تھے۔ شون اور مائیکا اوپری عرشے پر آگئے۔ انہوں نے نیچے دو نشستیں لی تھیں لیکن انہیں اوپر زیادہ مزہ آ رہا تھا۔ شون تقریباً پینتیس برس کا متوسط قامت اور نرم چہرے والا شخص تھا۔ اس نے گول شیشوں کی عینک لگا رکھی تھی۔ سر کے بال سامنے سے کسی قدر اڑ گئے تھے لیکن وہ برا نہیں لگ رہا تھا۔ مائیکا عمر میں اس کے برابر ہی تھی۔ مضبوط جسامت اور چوڑی کاٹھی کی وجہ سے وہ ایتھلیٹ لگتی تھی۔ نقوش دلکش اور بال سنہری تھے۔ وہ ہنسنے مسکرانے اور ہر وقت خوش رہنے والی عورت لگتی تھی۔ اس نے اوپر آکر تیز سمندری ہوا کو اپنے جسم پر محسوس کرتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کر کے چیخ ماری۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر مسکرانے لگے۔ شون کھسیا گیا، اس نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

"لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

"تو دیکھنے دو۔" مائیکا بے پروائی سے بولی۔ بہر حال اس نے دوبارہ چیخ نہیں ماری۔ کچھ دیر بعد آس پاس موجود افراد بھی اپنی دلچسپیوں میں گم ہو گئے تو شون نے سکون کا سانس لیا۔ وہ زیادہ توجہ کا عادی نہیں لگ رہا تھا اور شاید اسے لوگوں کی توجہ سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ وہ سڈنی سے پانچ بجے روانہ ہوئے پھر شام ہوتے ہی سورج ڈوبا اور تیزی سے اندھیرا ہوا، لوگ نیچے آگئے۔ شون اور مائیکا بھی نیچے آگئے تھے۔ انہوں نے فیری کے بار کا رخ کیا، وہاں شون نے مائیکا سے کہا۔ "تم جانتی ہو مجھے اچھا نہیں لگتا کہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہوں۔"

"سوری۔" مائیکا نے معذرت کر لی۔ "تم جانتے ہو یہ میرے لیے کتنا اہم موقع ہے اور میں جذباتی ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے لیکن اب خیال رکھنا۔" شون نے دبے لہجے میں کہا۔

مائیکا نے سر ہلایا۔ "مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

وہ میس میں آگئے۔ سات بجے سے وہاں رش ہو گیا تھا اور انہیں ایک جوڑے کے ساتھ ٹیبل شیئر کرنا پڑی تھی۔ ساتھ بیٹھے تو اخلاقاً تعارف بھی ہوا۔ نوجوان براؤن اسمتھ تھا۔ وہ لمبا تڑنگا اور ورزشی جسم کا مالک تھا، خوش شکل اور تر و تازہ۔ اس کی گرل فرینڈ جوڈی الائیڈ بھی خوب صورت تھی۔ دونوں کی جوڑی جچ رہی تھی۔ تعارف کے دوران کھانا آگیا اور وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ براؤن اور جوڈی پہلے اٹھ گئے، ان کے جانے کے بعد مائیکا نے کہا۔ "اچھے ہیں دونوں۔"

"ہاں۔" شون نے اسٹیک چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"شاید آگے بھی ہمارے ساتھ ہوں۔"

"نہیں، ہمیں بے فیلڈ جانا ہے اور ہر سیاح وہاں نہیں جاتا۔"

کھانے کے بعد وہ اپنی نشستوں پر آگئے۔ یہ نشستیں طیارے جیسی بڑی اور پھیل جانے والی آرام دہ تھیں۔ بارہ بجے تک سیاح اوپری عرشے اور نیچے میس اور بار میں ہلا گلا کرتے رہے تھے پھر رفتہ رفتہ سناٹا چھانے لگا اور بالآخر خاموشی طاری ہو گئی۔ مائیکا کب سوئی اسے پتا نہیں چلا۔ شون نے اسے بازو ہلا کر بیدار کیا۔ "اٹھ جاؤ، تھوڑی دیر میں ہم برسبین پہنچنے والے ہیں۔"

مائیکا نے گھڑی کی طرف دیکھا، آٹھ بجنے والے تھے جب تک وہ ناشتے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہوئے، فیری برسبین کی بندرگاہ میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ ایک چھوٹی لیکن کم رش والی جیٹی پر رکی۔ بندرگاہ سے نکل کر وہ ایک رینٹ اے کار تک آئے۔ اب انہیں ذرا مشکل علاقے میں سفر کرنا تھا، اس لیے شون نے ایک چوڑے ٹائروں والی فور وہیل ڈرائیو منتخب کی، یہ دو نشستوں والی جیپ تھی جس کے پچھلے حصے میں بیٹھنے کے لیے آمنے سامنے گدیلی نشستیں تھیں۔ مائیکا نے جیپ دیکھ کر منہ بنایا۔ "میں تو سوچ رہی تھی ہم کسی کار میں سفر کریں گے۔"

"اس میں زیادہ مزہ آئے گا۔" شون نے اسے سمجھایا۔ "یہ کھلی ہے، ہم ہوا اور دھوپ سے لطف اندوز ہوں گے۔"

"اور بارش ہو گئی تو؟"

"تو ہم اس سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔" شون نے کہا تو مائیکا مسکرانے لگی۔ پھر وہ اچھل کر جیپ کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ یہ تقریباً نئے ماڈل کی جیپ تھی اور اس کا کرایہ بھی اچھا خاصا تھا لیکن شون دے سکتا تھا۔ انہوں نے اپنا سامان جیپ کے عقبی حصے میں رکھا اور روانہ ہو گئے۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ وہ برسبین میں نہیں رکیں گے۔ وہ دو دن سے ٹرپ پر نکلے تھے اور آج تیسرا دن تھا۔ شہر سے نکلنے کے بعد مائیکا نے ویڈیو کیمرا نکالا اور آس پاس سے گزرتے منظر کے ساتھ اپنی اور شون کی مووی بنانے لگی۔ یہ چھوٹا اور جدید ترین ہائی ڈیفی نیشن ڈیجیٹل کیمرا تھا۔ ان کے پاس اس کی دو عدد اضافی بیٹریاں تھیں تاکہ بے فیلڈ پارک میں انکی ویڈیو بنانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ان کے ہنی مون کا مرکزی نقطہ یہی قدرتی پارک تھا۔ یہ آئیڈیا مائیکا کا تھا۔ شون کو اختلاف ہوا تھا۔

"تم جانتی ہو وہاں رہائش اور دوسری سہولتیں نہیں ہیں، اس صورت میں ہمیں بہت مشکل پیش آئے گی۔"

"یہی تو اصل زندگی ہے۔" مائیکا نے جوش سے کہا۔ "بعد میں ہمارے پاس کتنی یادیں ہوں گی۔"

اس بار شون اس سے متفق ہو گیا۔ اب وہ بے فیلڈ پارک کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ مائیکا الٹی لیٹ کر اور کیمرا سیٹ کے اوپری حصے میں رکھ کر ویڈیو بنا رہی تھی۔ شون بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ایسے ہی ایک لمحے پر وہ سڑک پر توجہ نہیں رکھ سکا تھا، اچانک اس نے سامنے دیکھا تو اسے ایک جوڑا سڑک کے کنارے جیپ کی راہ میں دکھائی دیا وہ مشکل سے دس گز دور تھا۔ شون نے بریک لگاتے ہوئے اسٹیئرنگ گھمایا۔ جیپ کے ٹائر چرچرائے اور وہ جوڑے کے پاس سے گزر گئی۔ جوڑا بھی بدحواس ہو کر سڑک سے اتر گیا تھا جیپ چند گز دور جا کر رک گئی۔ دھچکے سے مائیکا لڑھک کر سیٹ سے نیچے گری۔ شون نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے سیدھا کیا اور پھر عقب میں دیکھا۔ "تم ٹھیک ہو؟"

"ہاں۔" مائیکا نے بہ مشکل سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔

جوڑا اب جیپ کی طرف آ رہا تھا۔ لڑکی آگے تھی اور خاصی غصے میں تھی۔ وہ آتے ہی شون پر برس پڑی۔ "تم نے ہمیں مار دیا تھا۔"

"سوری۔" شون نے معذرت کی۔ "میری توجہ ایک لمحے کے لیے سڑک سے ہٹی تھی مگر میں نے تم کو بچا لیا۔"

لڑکی کا ساتھی خاصا لمبا اور تنومند شخص تھا، اس کے بال لمبے اور چہرے پر ہلکی ڈاڑھی مونچھیں تھیں۔ وہ اتنا لمبا تھا کہ جیپ کے پاس آکر کھڑا ہوا تو اینگل آئرن سے نیچے صرف اس کا منہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرد اور سخت لہجے میں کہا۔ "اگر ہم میں سے کسی کو چوٹ آجاتی تو اس کا ذمے دار کون ہوتا؟"

"میں معذرت کر چکا ہوں۔" شون نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں اپنی غلطی بھی مانتا ہوں۔ اس کی تلافی کے لیے اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو۔"

"یہ اچھا خیال ہے۔" لڑکی خوش ہو گئی۔ چھوٹی سی نیکر اور مختصر سی بنیان میں اس کا صحت مند جسم نمایاں تھا۔ اس کے بھورے مائل موٹے بال بکھرے ہوئے تھے اور ماتھے پر ایک بینڈ کی مدد سے اس نے انہیں قابو کر رکھا تھا۔ اس کے بازو اور پیٹ پر ٹیٹوز کھدے تھے۔ شون کی پیشکش پر وہ فوراً ہی بے تکلفی سے جیپ کے عقبی حصے میں سوار ہو گئی اور مائیکا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے نینسی کہتے ہیں۔"

"مائیکا۔" مائیکا نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "یہ میرا شوہر شون ہے ہم ہنی مون منانے نکلے ہیں۔"

"ریئلی۔" نینسی خوش ہو گئی۔ اس دوران میں اس کا ساتھی مرد کسی غصہ ور گوریلے کی طرح سڑک کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ مائیکا نے پوچھا۔

"تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم فریزر آئی لینڈ جا رہے ہیں۔" نینسی نے بتایا۔ "اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"بے فیلڈ پارک۔" مائیکا نے کہا۔ "فریزر آئی لینڈ ہمارے اصل راستے سے کچھ ہٹ کر ہے۔" اس نے نقشہ

نکالا۔ ''ہم تمہیں ہاروے بے تک پہنچا سکتے ہیں یہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے، یہاں سے تم کشتی کے ذریعے فریزر آئی لینڈ جا سکتی ہو۔''

''میں تمہاری شکر گزار ہوں گی۔'' نینسی نے کہا اور پلٹ کر اپنے ساتھی کو پکارا۔ ''ڈین آجاؤ، ہم ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔''

اس پر ڈین نے کسی گوریلے کی طرح غراتے ہوئے شون اور مائیکا کو شامل کر کے نینسی کو ایسی ناقابل بیان بات کہی کہ اس کے ساتھ شون اور مائیکا بھی ہکا بکا رہ گئے۔ اس کا رویہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی صورت ان کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہے۔ نینسی نے معذرت خواہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور جیپ سے اتر گئی۔ اس کے اترتے ہی شون نے جیپ آگے بڑھا دی۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''بہت واہیات آدمی تھا۔''

مائیکا نے اس سے اتفاق کیا۔ ''میرا خیال ہے یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ نینسی کے پاس سے ہلکی سی بو آرہی تھی جیسے وہ چرس کا نشہ کرتی ہو۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو اچھا ہوا وہ ہمارے ساتھ نہیں گئے۔'' شون نے جیپ کی رفتار تیز کی۔ انہوں نے ایک جگہ رک کر ناشتا کر لیا تھا اور وہ رات سے پہلے ہاروے بے تک پہنچ جانا چاہتے تھے۔ ایک رات وہاں رک کر وہ بے فیلڈ کی طرف روانہ ہو جاتے۔ چھ گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ ہاروے بے تک پہنچ گئے۔ سمندر کے ساتھ یہ چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی تمام تر رونق وہاں آنے والے سیاحوں کی مرہون منت تھی۔ بہت خوب صورت ساحل جو ناریل اور پام کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سفید ریت کے بعد بہت نیلا پانی تھا۔ ساحل کے ساتھ سڑک پر پارکنگ میں بے شمار گاڑیاں موجود تھیں اور سیاحوں کی چہل پہل جاری تھی۔ مائیکا خوش ہو گئی۔ انہوں نے ہوٹل کا رخ کرنے سے پہلے کچھ دیر تیراکی کی۔ یہ جگہ مائیکا کو اتنی اچھی لگی کہ اس نے مزید ایک دن یہاں رکنے کو کہا لیکن شون نے اسے یاد دلایا۔

''اگر ہم نے تاخیر کی تو برسبین سے واپسی کی فیری نکل جائے گی، دوسری صورت میں ہمیں بے فیلڈ میں ایک دن کم کرنا پڑے گا، اب جیسا تم کہو۔''

''نہیں بے فیلڈ اہم ہے۔'' مائیکا فوراً اپنی فرمائش سے دست بردار ہو گئی۔ ''ہم صبح ہی روانہ ہو جائیں گے۔''

ان کا ارادہ بے فیلڈ پارک کے انتہائی جنوب مشرق میں واقع ان سمندری چٹانوں تک جانا تھا جو لہروں کے کٹاؤ سے آبی غاروں میں بدل گئی تھیں لیکن وہاں تک کا سفر نہایت طویل اور دشوار تھا۔ پروگرام نپا تلا ہوا تھا۔ اسی لیے مائیکا ہاروے بے میں رکنے کے ارادے سے باز آگئی۔ اگلی صبح وہ چھ بجے روانہ ہوئے تھے کیونکہ ان کا ارادہ شام تک بے فیلڈ پارک پہنچنے کا تھا۔ راستے میں انہیں یپون نامی ریسورٹ پر رک کر کچھ سامان لینا تھا۔ یہ ریسورٹ بے فیلڈ پارک میں تھا لیکن اصل پارک کا آغاز یہیں سے ہوتا تھا۔ چار گھنٹے میں وہ ڈھائی سو میل کا فاصلہ طے کر کے یپون پہنچ گئے۔ یہ چھوٹا سا ریسورٹ تھا جہاں ایک ہوٹل اور ایک اسٹور تھا۔ وہ اسٹور کے سامنے رکے۔ مائیکا نیچے آئی تو اس نے دیکھا کہ جیپ کے اگلے ٹائر تلے آج کا اخبار آیا ہوا تھا۔ کسی نے پورا اخبار پڑھے بغیر ایسے ہی پھینک دیا تھا۔ ٹائر ہٹائے بغیر اسے نکالا نہیں جا سکتا تھا۔ مائیکا نے شون کو بتایا۔

''واپسی پر اخبار نکال لیں گے ممکن ہے یہاں کے بارے میں کوئی اہم خبر ہو۔''

وہ اندر آئے تو اسٹور میں تین افراد تھے۔ ایک سفید فام عمر رسیدہ عورت، اس کا بڑی عمر کا مقامی شوہر جو آسٹریلیا میں بسنے والے قدیم باشندوں کی نسل سے تھا اور ان کا نوجوان بیٹا جس میں دونوں نسلوں کی ملی جلی خصوصیات تھیں۔ اسٹور میں کھانے پینے سے لے کر ہائی کنگ اور ٹریکنگ سے متعلق ہر طرح کا سامان تھا۔ یہ اسٹور آنے والے سیاحوں کے لیے تھا۔ وہاں ایک طرف کھانے پینے کا کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ مائیکا اور شون نے عورت کو کھانے کا آرڈر دیا اور ضروری سامان کی خریداری میں لگ گئے، جب تک وہ سامان لے کر اس کے شوہر کو ادائیگی کر کے فارغ ہوئے، عورت نے مطلوبہ چیزیں ٹرے میں سجا کر سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ جلدی جلدی کھانے میں لگ گئے۔ شون نے عورت سے کہا۔ ''کیا بات ہے، یہاں بس ہم ہی ہیں۔''

عورت نے کہا۔ ''اکثر لوگ صبح سویرے آگے جا چکے ہیں۔''

''دوپہر کے بعد یہاں سناٹا ہو جاتا ہے۔'' نوجوان نے کہا۔ وہ رسیوں کے بنڈل جما کر رکھ رہا تھا۔

''پارک کے حالات کیسے ہیں؟'' مائیکا نے پوچھا تو نوجوان نے بے ساختہ ماں کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

''ٹھیک ہیں؟''

''سننے میں آیا ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں یہاں سیاح غائب ہوئے ہیں؟'' شون نے کہا۔

بوڑھے آدمی نے شانے اچکائے۔ ''صرف سیاح؟

پولیس نے کچھ سرگرمی بھی دکھائی لیکن کچھ ہوا نہیں، ممکن ہے یہاں آنے والے واپس چلے گئے ہوں۔''

''مگر کسی نے تو ان کے بارے میں رپورٹ درج کی ہو گی۔'' شون نے اصرار کیا۔

''میں نے کہا نا کوئی خبر نہیں آئی۔'' بوڑھے کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔

لنچ مکمل کر کے وہ سامان اٹھا کر باہر آئے۔ مائیکا ٹائر تلے دبے اخبار کو بھول گئی تھی۔ جیپ چلی اور اخبار وہیں پڑا رہ گیا۔ اس کے فرنٹ پیج پر ایک جوڑے کی تصویر تھی اور اس کے نیچے سرخی تھی۔ ''جوڑا جو بے فیلڈ پارک میں غائب ہو گیا۔''

یپون سے آگے سڑک جلد ختم ہو گئی اور ایک کچا راستہ آگیا۔ یہ جیپ ایسے ہی راستوں کے لیے موزوں تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے انہیں اپنے پیدل سفر کا آغاز کرنا تھا جیپ یہاں سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ وہاں چند گاڑیاں اور کھڑی تھیں اور ایک گاڑی کے پاس ایک جوان آدمی اپنا بیگ تیار کر رہا تھا۔ اس نے بیگ کی زپ بند کی اور اسے پشت پر لاد لیا۔ شون اور مائیکا بھی سامان اتارنے لگے۔ اوپر ڈھلان پر دور کچھ لوگ جاتے دکھائی دے رہے تھے گویا سیاحوں کی خاصی تعداد موجود تھی۔ مائیکا ان کی طرف دیکھ رہی تھی، شون نے آہستہ سے کہا۔ ''آگے جا کر یہ لوگ بکھر جائیں گے اور بھیڑ ختم ہو جائے گی۔''

مائیکا نے سر ہلایا اور اپنا بیگ پشت پر لاد لیا۔ شون پہلے ہی اپنا بیگ لاد چکا تھا۔ یہاں ان کی جیپ کو کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ یہاں دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ یہاں صرف سیاح اور ٹریکر آتے تھے۔ ڈھلان پر ایک راستہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا تھا، اس کے آغاز پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ ''بے فیلڈ پارک میں خوش آمدید۔''

مائیکا نے شون کی طرف دیکھا اور ہنسی۔ ''ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔''

''اصل مرحلہ آبی غاروں تک پہنچنا ہے اور اس کے لیے ہمیں بہت لمبا سفر کرنا ہے اس لیے چل پڑو۔'' شون نے راستے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ مائیکا اس کے پیچھے تھی لیکن کچھ دور جانے کے بعد وہ آگے تھی اور شون پیچھے آرہا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ پارک میں ہر تھوڑے فاصلے پر راستوں کی نشان دہی کرنے والے بورڈز لگے ہوئے تھے اور انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ایک ندی کے کنارے سفر کر رہے تھے۔ اس کا پانی کہیں اوپر سے بہتا ہوا آرہا تھا۔ مائیکا آرام سے پتھر پھلانگتی چل رہی تھی، اس کے پاؤں بہت اچھی طرح راستے پر جم رہے تھے جب کہ شون اکثر مقامات پر لڑکھڑا جاتا تھا۔ پھر وہ ایک آبشار تک پہنچے، انہیں یہاں سے پار جانا تھا اور آبشار کا تیز بہاؤ خوفزدہ کرنے والا تھا۔ شون نے مائیکا کی طرف دیکھا۔ ''میں پار نہیں جا سکتا۔''

''ہمیں جانا ہو گا۔'' وہ بولی اور ذرا آگے جا کر پاؤں سے دھارا چیک کیا۔ ''پانی اتنا تیز نہیں ہے۔''

''لیکن یہاں کائی بہت ہے، پاؤں پھسل سکتا ہے۔''

''اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔'' مائیکا نے آبشار سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''دوسری صورت میں ہمیں واپس جانا ہو گا اور اس سے بہت وقت ضائع ہو گا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' اچانک ہی براؤن کی آواز آئی۔ وہ آبشار کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ صرف سینڈو اور شارٹ میں اس کا جسم چمک رہا تھا۔ وہ آرام سے قدم اٹھاتا ہوا ان کی طرف آگیا اور تیز پانی میں ایک بار بھی اس کے قدم نہیں ڈگمگائے تھے۔ اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس طرف جانا ہے۔''

شون ہچکچا رہا تھا لیکن جب مائیکا نے متوقع نظروں سے اسے دیکھا تو وہ مجبوراً حرکت میں آیا اور اپنی چھڑی بہتے پانی میں ٹیکتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ کئی بار اس کے قدم لڑکھڑائے مگر بالآخر وہ دوسری طرف پہنچ گیا۔ اس نے پلٹ کر فاتحانہ انداز میں مائیکا کو دیکھا تو وہ مسکرائی اور براؤن کی طرح آرام سے چلتی آبشار کے پار دوسری طرف پہنچ گئی۔ براؤن چہل قدمی کرتا ہوا آیا۔ اس کے پاس بس ایک چھوٹا سا بیگ اور پانی کی ایک بوتل تھی۔ بہ ظاہر وہ اکیلا ہی تھا، مائیکا نے پوچھا۔ ''تمہارا سامان اور جوڑی کہاں ہے؟''

''دونوں ایک جھیل کے کنارے ہیں۔ میری گھڑی گر گئی تھی میں اسے تلاش کرنے آیا تھا۔'' اس نے اپنی بیش قیمت رسٹ واچ دکھائی۔

''یہ خاصی قیمتی ہے۔'' شون نے دلچسپی سے کہا۔

''زیادہ نہیں سترہ ہزار ڈالرز کی ہے۔'' براؤن نے سرسری سے انداز میں کہا تو مائیکا نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تمہارے نزدیک سترہ ہزار ڈالرز کی کوئی حیثیت نہیں ہے؟''

''اہمیت تو ہے۔'' براؤن نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ شام سے پہلے

ہمیں اپنی پہلی منزل تک پہنچنا ہوگا۔“

”پہلی منزل؟“

”ہاں تم لوگ آبی غاروں کی طرف نہیں جارہے؟“

شون حیران ہوا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”بس چل گیا۔ ہم خود بھی اسی طرف جارہے ہیں۔“ براؤن پلٹ کر چلنے لگا۔ مائیکا اس کے پیچھے لپکی۔

”نہیں، بتاؤ تمہیں کیسے پتا چلا کیونکہ ہم نے تو کسی سے ذکر نہیں کیا۔“

”میں نے فیری میں تم لوگوں سے ہی سنا تھا۔ اتفاق سے ہمارا بھی اسی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ میں نے سوچا ہم ساتھ سفر کریں گے۔“

”ساتھ سفر کرنا اچھا ہے۔“ شون بولا۔ ”میں نے سنا ہے یہاں سیاح غائب ہوئے ہیں۔“

براؤن نے شانے اچکائے۔ ”سنا تو میں نے بھی ہے لیکن مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں ہے۔“

براؤن کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ مائیکا نے آہستہ سے شون سے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے گھڑی گم ہونے کا بہانہ ہے یہ اصل میں یہاں ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”شاید۔“ شون نے آگے جاتے براؤن کو دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ آگے پیچھے ایک چھوٹے سے پہاڑی راستے پر سفر کر رہے تھے۔ وہ ایک پگڈنڈی تھی جو کبھی چٹانوں پر چڑھ جاتی اور کبھی کسی پہاڑ سے لگ کر گزرنے لگتی تھی۔ ایسی ہی ایک جگہ سے راستہ بہت تنگ تھا اور اوپر سے مسلسل گرتے پانی کی وجہ سے راستہ چکنا ہوگیا تھا۔ براؤن انہیں روک کر خود آگے گیا۔ شون نے آہستہ سے مائیکا سے کہا۔ ”یہ خود کو بہت ہوشیار اور ماہر ظاہر نہیں کر رہا ہے؟“

”وہ ہے۔“ مائیکا نے جوابی سرگوشی کی۔

”اوکے وہ ہے لیکن وہ اسے بہت جتا نہیں رہا ہے؟“

”اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔“

”اے آجاؤ۔“ براؤن نے پکارا۔ وہ چھجے کے ایسے حصے میں کھڑا تھا جہاں یہ بہت پتلا اور خطرناک ہوگیا تھا۔ اس سے نیچے کوئی ستر اسّی فٹ تک خلا تھا اور پھر چٹانیں تھیں ان پر گر کر بچنا محال تھا اس لیے انہیں بہت احتیاط سے یہ راستہ طے کرنا تھا۔ پہلے شون گیا اور اس بار وہ لڑکھڑایا نہیں تھا بلکہ کسی قدر بہادری سے اس نے یہ راستہ طے کیا۔ شاید وہ براؤن پر جتانا چاہ رہا تھا کہ صرف وہی مرد نہیں ہے۔ مائیکا پیچھے تھی۔ شون کے بعد اس نے راستے پر قدم رکھا اور سرک سرک کر آگے بڑھنے لگی۔ وہ پانی سے چکنی ہونے والی جگہ پہنچی اور ایک قدم آگے بڑھایا تھا کہ عین اسی لمحے اوپر سے بجلی کا تیر گرجتا ہوا گزرا۔ مائیکا لڑکھڑائی اور اس کے منہ سے چیخ نکلی لیکن اس سے پہلے کہ وہ گرتی، براؤن کا ہاتھ مضبوطی سے اس کے ہاتھ پر جم گیا اور اس نے اسے واپس کھینچ لیا۔ شون کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”میرے خدا۔“

”کچھ نہیں ہوا۔“ مائیکا بولی۔

وہ آگے چل پڑے۔ پہلی بار وہ سمندر کے پاس ہو رہے تھے۔ لہروں کا شور سنائی دے رہا تھا اور کبھی کبھی اس میں سی گل کی چیخیں بھی شامل ہوجاتی تھیں۔ بالآخر ایک بڑی چٹان پر چڑھے تو یہاں سے سمندر دور تک صاف دکھائی دینے لگا۔ چٹان تقریباً دو سو فٹ بلند تھی۔ سورج اب مغرب کی طرف جھک رہا تھا اور اس کی کرنوں میں سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تھک گئے تھے خاص طور سے شون کی حالت بری تھی۔ اس نے اپنا بیگ اتار دیا اور ایک طرف گھاس پر ڈھیر ہوگیا۔ مائیکا اس کے پاس پتھر پر بیٹھ گئی اور براؤن ایک نسبتاً اونچی چٹان پر چڑھ گیا۔ ان تینوں میں صرف اسی کا سانس ہموار تھا۔ اس نے اپنی بوتل سے پانی پیا اور ان کی طرف دیکھا۔ ”ہم زیادہ دیر آرام نہیں کر سکتے۔“

”میں آدھے گھنٹے سے پہلے نہیں چل سکتا۔“ شون نے اعلان کیا۔

”تمہیں اس ٹریک پر آنے کا مشورہ کس نے دیا تھا۔“ براؤن مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”ابھی آغاز ہے اور تم آرام کی باتیں کر رہے ہو۔“

شون کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے غصہ آرہا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ براؤن شرارت آمیز انداز میں مائیکا کو بتانے لگا کہ اس نے ٹریکنگ میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اور کیسے خطرناک مراحل سے گزرا تھا۔ اس نے کبھی تھکن کی شکایت نہیں کی اور وہ رویا تو بالکل نہیں تھا۔ شون کچھ دیر سنتا رہا پھر کھڑا ہوگیا اور بیگ پشت پر باندھتے ہوئے مائیکا سے کہا۔ ”اب چلو۔“

براؤن ہنسا۔ ”دیکھا...... میری باتوں سے کیسے تھکن اتر جاتی ہے۔“

شون غصے میں آکر چلنے کو تیار تو ہوگیا تھا لیکن اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پھر سب سے پیچھے رینگ رہا تھا۔ براؤن نے راستہ بدل دیا تھا۔ شون نے مائیکا سے کہا۔ ”ہمیں اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ راستے سے ہٹ گیا ہے۔“

”وہ جوڈی اور سامان لینے جارہا ہے جو کسی جھیل کے کنارے ہے۔“ مائیکا نے کہا۔ ”اب ہمیں ساتھ رہنا ہے تو اسے تھوڑا بہت برداشت تو کرنا پڑے گا۔“

شون کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ متفق نہیں ہے لیکن پھر اس نے اعتراض نہیں کیا اور وہ دونوں براؤن کے پیچھے جانے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک خوب صورت آبشار کے سامنے نکلے۔ چٹانوں کے پیالے میں پانی اوپر سے سفید دھند کی طرح گر رہا تھا اور یہاں ایک چھوٹی سی جھیل وجود میں آگئی تھی۔ جھیل کے وسط میں بانسوں سے بنا ایک تختہ تھا اور اس پر جوڈی الٹی لیٹی ہوئی غسل آفتابی کر رہی تھی۔ شون اور مائیکا یہ دیکھ کر جھینپ گئے کہ اس نے کچھ بھی نہیں پہنا ہوا تھا۔ انہوں نے رخ پھیر لیے۔ براؤن نے اپنا سامان اور کپڑے اتار کر رکھے اور صرف نیکر میں پانی میں اتر گیا۔ وہ تیرتا ہوا تختے تک گیا اور پھر اس نے چلا کر کہا۔

”تم لوگ بھی آجاؤ پانی بہت مزے کا ہے۔“

”میں جاؤں گی۔“ مائیکا نے کہا۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ شون نے جواب دیا۔ وہ جوڈی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا

”مرضی تمہاری۔“ مائیکا کہتے ہوئے خود سے سامان اور پھر لباس اتارنے لگی۔ ایک منٹ بعد وہ جھیل میں تھی۔ شون نے آس پاس دیکھا۔ چٹانوں نے اس جگہ کو تقریباً ساٹھ فیصد گھیر رکھا تھا صرف چالیس فیصد جگہ کھلی تھی۔ اس طرف بھی بلندی تھی اور گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ شون ایک طرف بڑھا۔ یہاں ایک راستہ اوپر سے آرہا تھا۔ اسے مثانے میں دباؤ محسوس ہو رہا تھا اور وہ اس دباؤ کو ہلکا کرنے لگا۔ جب وہ فارغ ہو کر پلٹا تو چونک گیا عقب میں وہی لمبے بالوں والا لمبا تڑنگا آدمی ڈین کھڑا تھا۔ پہلی بار شون نے اس کا پورا چہرہ دیکھا اور وہ اچھا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”تو تم بے فیلڈ پہنچ گئے۔“

”ہاں۔“ شون نے پتلون ٹھیک کی۔ ”تم لوگ تو رزور آئی لینڈ جارہے تھے؟“

”ہاں، لیکن پھر ہم یہاں آگئے۔“ ڈین بولا۔ نینسی ایک طرف جھاڑیوں سے برآمد ہوئی۔ اس نے ایک لمبا سا چھرا اٹھا رکھا تھا یہ شاید راستے میں آنے والی جھاڑیاں کاٹنے کے لیے تھا۔ شون واپس جانے لگا تھا کہ ڈین اس کے سامنے آگیا۔ ”اتنی جلدی کیا ہے...... مجھے تم سے کچھ حساب کرنا ہے۔“

”کیسا حساب؟“ شون فکرمند ہوگیا۔ ”اگر تم سڑک والے واقعے کی بات کر رہے ہو تو میں نے سوری کر لی تھی اور تلافی کے طور پر تمہیں لفٹ کی پیشکش بھی کی تھی۔ تم نے انکار کر دیا تھا اور بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔“

”بات ختم نہیں ہوئی تھی۔“ ڈین سرد لہجے میں بولا۔ نینسی، شون کے عقب میں آگئی تھی اور اس وقت دونوں کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ شون کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی، اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

”میرا راستہ چھوڑ دو۔“

”چلے جاؤ۔“ ڈین نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”تمہیں کس نے روکا ہے۔“

اچانک نینسی کے انداز میں تبدیلی آئی اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ڈین۔“

اس کے اشارے پر ڈین نے عقب میں دیکھا تو وہاں براؤن کھڑا تھا۔ ان کے متوجہ ہونے پر وہ مسکرایا۔ ”ہائی میں براؤن ہوں۔“

”یہ ڈین اور نینسی ہیں۔ ہمیں راستے میں ملے تھے۔“ شون نے ان کا تعارف کرایا اور جلدی سے ڈین کے برابر سے نکل کر براؤن کے پاس آگیا۔ براؤن نے پوچھا۔

”تم انہیں جانتے ہو؟“

”بس ایک بار راستے میں ملے تھے۔“ شون نے کہا اور چلتا رہا۔ براؤن نے ڈین اور نینسی کو دیکھا۔

”امید ہے پھر ملاقات ہوگی۔“

ڈین نے زیرلب کچھ کہا اور نینسی دوسری طرف دیکھنے لگی۔ براؤن پلٹ کر شون کے پیچھے آیا۔ ”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“

”عجیب لوگ ہیں۔“ شون نے کہا اور سڑک والا واقعہ سنایا۔

”سفر کے دوران عجیب عجیب لوگ ملتے ہیں۔“

جوڈی اور مائیکا جھیل سے نکل آئی تھیں اور انہوں نے کپڑے پہن لیے تھے۔ تیراکی کے لیے مائیکا نے بھی اپنے سارے کپڑے اتار دیے تھے، اگر شون کو برا لگا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنا موبائل نکال کر دیکھا۔ اس پر سگنل نہیں تھے، وہ فکرمند ہوگیا۔ ”اگر ہمیں کوئی مشکل پیش آئی تو ہم کیا کریں گے۔“

”کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“ براؤن نے کہا۔ ”ویسے یہاں بلندی پر موبائل سگنل ملتے ہیں۔“

انہوں نے سامان باندھا اور چلنے کو تیار ہوگئے۔ مائیکا، ڈین اور نینسی کے یہاں ہونے کا سن کر پریشان ہوگئی، اس

نے جوڈی سے کہا۔ ”یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ منشیات استعمال کرتے ہیں اور شاید جرائم پیشہ بھی ہیں۔“

”تم فکر مت کرو ہم چار ہیں اور براؤن اکیلا کئی افراد سے نمٹ سکتا ہے۔“

”شون لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں ہے۔“ مائیکا نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ ”لیکن وہ بزدل نہیں ہے۔“

دوسری طرف شون، براؤن سے کہہ رہا تھا۔ ”ان لوگوں کی یہاں موجودگی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ خاص طور سے ان خبروں کے ہوتے ہوئے جب کہ یہاں سیاح غائب ہو رہے ہیں۔“

”تم فکر مت کرو یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“ براؤن نے اسے تسلی دی۔ ”میں آسٹریلین آرمی کی طرف سے عراق میں لڑ چکا ہوں اور اس کی نشانی ابھی بھی میری کھوپڑی میں یہاں موجود ہے۔“ اس نے سر کے عقبی حصے کو انگلی سے بجایا تو عجیب سی آواز آئی تھی۔ ”یہاں کھوپڑی نہیں ہے اس کی جگہ ٹائٹینیم کی پلیٹ ہے۔ اصل کھوپڑی ایک گولی نے اڑا دی تھی۔ بس دماغ بچ گیا تھا۔“

شون کے لیے یہ اطلاع تھی۔ ”تم فوج میں رہ چکے ہو؟“

”چار سال۔“ براؤن نے سامان باندھتے ہوئے کہا۔ ”تین سال ٹریننگ اور ایک سال محاذ جنگ پر... زخمی ہونے کے بعد مجھے فارغ کر دیا گیا۔ اب میں سڈنی میں اپنا بزنس کر رہا ہوں۔ گرمیوں میں ٹریکنگ کرتا ہوں۔“

”یہ تمہاری گرل فرینڈ ہے۔“ شون نے جوڈی کی طرف دیکھا۔

براؤن مسکرایا۔ ”یہ راز کی بات ہے معاملہ فرینڈشپ سے آگے بڑھ گیا ہے۔ جلد میں اسے پروپوز کروں گا۔ یہ دیکھو۔“ اس نے شارٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر دکھایا۔ اس میں پلاٹینیم کی انگوٹھی تھی جس میں خاصا بڑا اشفاف ہیرا جڑا ہوا تھا۔ ”چالیس ہزار ڈالرز کی ہے۔ میں اسی ٹرپ میں جوڈی کو پیش کروں گا۔“

”بہت خوب صورت ہے۔“ شون نے تعریف کی۔

براؤن نے ڈبیا واپس رکھ لی اور اس سمت اشارہ کیا جہاں شون کی کچھ دیر پہلے ڈین اور نینسی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ”ہمیں اس طرف سے جانا ہوگا۔“

”اس طرف سے کیوں؟“

”یہ شارٹ کٹ ہے۔“ براؤن نے وضاحت کی۔ ”واپس جانے کی صورت میں خاصا لمبا سفر کرنا پڑے گا۔“

شون نے اسے غور سے دیکھا۔ ”لگتا ہے تم بے فیلڈ پارک سے اچھی طرح واقف ہو؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔“

خواتین نے بھی اپنے بیگ باندھ لیے تھے اور وہ براؤن کی رہنمائی میں آگے بڑھے۔ وہ جھاڑیوں سے نکلے تو ایک طرف سے ڈین اور نینسی کے زور سے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ایک طرف ان کے سامان کے بیگ رکھے تھے۔ شون نے براؤن سے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں، ممکن ہے ان کے سامان سے ان کی حقیقت کا پتا چلے۔“

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔“ براؤن نے جلدی سے کہا لیکن شون اس کی بات نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایک بیگ کھولا اور اسے کھنگالنے لگا۔ براؤن مضطرب انداز میں ان جھاڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ڈین اور نینسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ شون نے بیگ بند کر دیا اور کھڑا ہو گیا۔

”کچھ نہیں ہے۔“

”بس تو پھر چلو۔“ براؤن پگڈنڈی کی طرف بڑھ گیا۔ ”تم بلاوجہ مشکوک ہو یہ عام لوگ ہیں۔ سیاح عام طور سے منشیات استعمال کرتے ہیں۔“

وہ پگڈنڈی سے ہوتے ہوئے اوپر چٹانوں تک آئے۔ یہاں شون نے ایک بار پھر اپنے موبائل پر سگنل چیک کیے۔ یہاں سگنل آرہے تھے۔ براؤن نے ٹھیک کہا تھا۔ جوڈی اور مائیکا الگ سفر کر رہی تھیں اور وہ دونوں الگ سفر کر رہے تھے۔ براؤن نے پوچھا۔ ”تم کیا کرتے ہو؟“

”میں... میں کار ڈیلر ہوں۔“ شون نے جواب دیا۔

براؤن ہنسا۔ ”تم کار ڈیلر ہی لگتے ہو؟“

”کیا مطلب؟“ شون سنجیدہ ہو گیا۔

”کچھ نہیں۔“ اس نے جواب دیا اور ایک رسی کھولنے لگا۔ ”آگے ہمیں تیز رفتار ندی عبور کرنی ہے۔“

”اس رسی کی مدد سے؟“

”ہاں، میں دوسری طرف جا کر رسی باندھ دوں گا تم سب اس کی مدد سے دوسری طرف آؤ گے۔“

چند منٹ بعد ہی وہ ندی آگئی تھی۔ براؤن نے ایک مضبوط تنے والے درخت سے رسی باندھی اور پھر سامان اتار کر پانی میں اتر گیا۔ ندی میں جا بہ جا پتھر تھے لیکن بغیر کسی سہارے کے ان پر کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ بڑی مشکل سے دوسری طرف پہنچا۔ مائیکا نے آہستہ سے شون سے کہا۔ ”یہ کام صرف براؤن ہی کر سکتا ہے۔“

”ہاں، اسے تربیت ہے اور پھر وہ یہ سب کرتا رہتا ہے۔“ شون نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

براؤن نے رسی اس طرح باندھی تھی کہ وہ پانی کی سطح سے چار فٹ اوپر تھی اور پتھروں پر سے گزر رہی تھی۔ اب اس رسی کا سہارا لے کر بہ آسانی پتھروں سے ہوتے ہوئے ندی عبور کی جا سکتی تھی۔ پہلے جوڈی گئی۔ مائیکا نے شون سے کہا۔ ”مجھے پی آرہی ہے۔“

”تم لوگ بھی آجاؤ۔“ براؤن چلایا۔

”تم چلو ہم آتے ہیں۔“ شون نے جواب دیا اور مائیکا کے ساتھ جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند منٹ بعد وہ ندی عبور کر کے دوسری طرف جا چکے تھے۔ براؤن اور جوڈی آگے تھے۔ ایک گھنٹے بعد وہ دوبارہ سمندر کے ساتھ تھے لیکن یہاں بھی سمندر چٹانوں سے بہت نیچے تھا۔ براؤن اور جوڈی وہاں پڑاؤ ڈالنے کی تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا خیمہ لگا لیا تھا اور ایک طرف ترپال بھی تان لی تھی کیونکہ موسم بارش والا ہو رہا تھا۔ ترپال کے نیچے کچن تھا۔ براؤن ٹکڑے جوڑ کر کمان تیار کر رہا تھا۔ شون چونکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”شکار کی تیاری۔“ براؤن نے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے۔“

”شکار... منع نہیں ہے یہاں؟“

”منع تو ہے لیکن ہم کیا کریں یہاں بہت ہرن ہیں اور بارہ سنگھے بھی مل جاتے ہیں۔“

”میں تمہارے ساتھ چلوں؟“

براؤن نے کسی قدر طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔ ”بہتر ہوگا تم خواتین کے ساتھ رہو اور کھانا بنانے کی تیاری کرو۔“

”ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے ہم سب ساتھ لائے ہیں۔“ شون نے خفگی سے کہا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو کیا میں شکار پر تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔“

براؤن ہنس دیا۔ ”تم تو ناراض ہو گئے ہو... اوکے تم بھی چل سکتے ہو۔ آخر کسی کو شکار اٹھا کر بھی لانا ہوگا۔“

اسی اثنا میں بارش شروع ہو گئی۔ روانگی سے پہلے براؤن نے شون سے پوچھا۔ ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”نہیں۔“

براؤن نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا اور کوئی چیز نکال کر شون کی طرف اچھال دی۔ اس نے بے ساختہ اس چیز کو کیچ کر لیا اور پھر دیکھتا رہ گیا، یہ چھوٹے دستے لیکن بہت تیز پھل والی کلہاڑی تھی۔ براؤن نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”تمہارے ریفلیکسز اچھے ہیں۔“

”شکریہ۔“

چٹانوں کے اوپر گھنا جنگل تھا اور یہ چرندوں کے لیے بہترین پناہ گاہ تھا یہاں وہ شکاریوں کی نظر سے محفوظ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے مسلسل برستی بارش سے محفوظ رہنے کے لیے ہڈ والی برساتیاں پہن لی تھیں۔ براؤن آگے تھا اس نے روانہ ہوتے ہوئے شون سے کہا۔ ”تمہیں میری ہدایت پر مکمل عمل کرنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے شکار ہاتھ سے نکل جائے۔ مجھ پر نظر رکھنا۔ جب میں ہتھیلی کھولوں تو رک جانا اور جب مٹھی بند کروں تو چلنا۔“

چلتے ہوئے اچانک براؤن نے رک کر ہاتھ سے اشارہ کیا تو شون ساکت ہو گیا۔ کچھ دیر بعد براؤن نے چلنے کا اشارہ کیا اور شون نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا کہ اس نے پھر رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر چلنے کا اور اس کے فوراً بعد پھر رکنے کا اشارہ کیا۔ جب اس نے تیسری بار یہی حرکت کی تو شون بھنا کر دوسری طرف مڑ گیا۔ براؤن کو پتا نہیں چلا کہ شون وہاں سے جا چکا ہے۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے درختوں کے درمیان آگ دکھائی دی اور وہاں یقیناً کچھ افراد موجود تھے۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھا۔ کلہاڑی کا دستہ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ وہ ان درختوں کے پاس پہنچا جن کے پیچھے آگ جل رہی تھی۔ وہاں چند افراد نے سلاخ میں پروئے چند خرگوش آگ پر بھوننے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ یہ تین افراد تھے اور شون ان میں بیون کے اسٹور میں ملنے والے مقامی نسل کے بوڑھے اسٹور مالک کو دیکھ کر چونک گیا۔ اس کے دو ساتھی بھی مقامی نسل کے تھے۔ وہ بیئر سے شغل کرتے ہوئے خرگوش بھون رہے تھے اور آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اچانک شون کو عقب میں آہٹ محسوس ہوئی تو اس نے بے ساختہ گھومتے ہوئے کلہاڑی اوپر کی تو عقب میں موجود نوجوان گھبرا کر پیچھے ہٹا اور گر پڑا۔ یہ اسٹور مالک کا بیٹا تھا۔ شون اس کی طرف جھکا اور اس کا گریبان پکڑ کر وحشت زدہ لہجے میں بولا۔

”یہ کیا چکر ہے تم لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہو؟“

”نہیں... نہیں۔“ وہ گھبرا کر بولا۔ ”ہم سیاحوں کے ایک گروپ کے ساتھ آئے ہیں۔ ہم گائیڈ بھی ہیں۔“

شون نے اپنے ابتدائی ردعمل پر قابو پایا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے اعصاب ابھی تک کشیدہ تھے۔ ”تم نے

مجھے ڈرا دیا۔"

نوجوان بھی مسکرانے لگا۔ "شاید تم نے بھی سیاحوں کی گم شدگی کی کہانیاں سن رکھی ہیں۔"

☆☆☆

جوڈی نے کیتلی میں کافی چڑھائی ہوئی تھی۔ مائیکا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ بارش کا پانی ترپال کے کونوں سے جھالر کی صورت میں گر رہا تھا۔ مائیکا نے کہا۔ "براؤن کو دوسروں کا مذاق اڑانے کی عادت ہے۔"

"نہیں... وہ جولی آدمی ہے دوسروں سے جلدی بے تکلف ہو جاتا ہے، مجھے یقین ہے اس سفر کے خاتمے تک تم لوگ اسے پسند کرنے لگو گے۔"

"مجھے اس سے مسئلہ نہیں ہے لیکن وہ شون کو بہت تنگ کرتا ہے، اسے ڈی گریڈ کرتا ہے اور تم جانتی ہو کوئی مرد ان باتوں کو پسند نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کے سامنے اسے ڈی گریڈ کیا جائے۔"

جوڈی نے سر ہلایا۔ "میں براؤن سے بات کروں گی۔ اب وہ شون کو تنگ نہیں کرے گا۔"

کافی تیار ہو گئی تھی۔ جوڈی نے دھاتی مگوں میں کافی انڈیلی اور ایک مگ مائیکا کو تھما دیا۔ "تم دونوں کی شادی کیسے ہوئی؟"

"کیسے ہوئی؟" مائیکا نے پر خیال انداز میں کہا۔ "ہم دونوں اکیلے تھے پھر ہماری ملاقات ہوئی اور ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ پھر ہم نے شادی کر لی۔"

"تمہاری پہلی شادی ہے؟" جوڈی نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں... میں نے کئی بار شادی کا سوچا لیکن ہر بار ارادہ ملتوی کر دیا۔ البتہ شون کو انکار نہ کر سکی۔"

"تم لوگ سڈنی سے آئے ہو؟"

"آں ہاں۔" مائیکا نے کہا۔ اس کی نظر اوپر جنگل کی طرف لگی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا اور شون کا خیمہ لگا لیا تھا۔ "میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

لیکن آنے والا صرف شون تھا۔ جوڈی نے کسی قدر فکر سے پوچھا۔ "براؤن کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" شون نے کہا۔ "وہ جنگل میں بچھڑ گیا اور میں واپس آ گیا۔"

"تم فکر مت کرو وہ جوان مرد ہے۔" مائیکا نے طنز سے کہا۔

جوڈی کی فکر کم نہیں ہوئی تھی لیکن جب براؤن شانے پر ایک چھوٹا ہرن لادے نمودار ہوا تو وہ کھل اٹھی، اس نے مائیکا کی بات کا جواب دیا۔ "ہاں براؤن جوان مرد ہے۔"

براؤن نے ہرن ترپال کے نیچے ڈال دیا اور برساتی پر لگا اس کا خون صاف کرنے لگا۔ اس نے جوڈی سے کہا۔ "اب تمہاری باری ہے، مسٹر شون تو راستے سے ہی بھاگ آئے۔"

جوڈی نے اپنے چمڑے کے جوتے میں اڑسا ہوا چاقو نکالا اور ہرن کا پیٹ چاک کرنے لگی۔ مائیکا اور شون اپنے خیمے میں آ گئے تھے۔ شون نے تشویش سے کہا۔ "ان دونوں کا طرز عمل کچھ عجیب سا نہیں ہے۔"

"مجھے بھی لگ رہا ہے۔" مائیکا نے سرگوشی کی۔ "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ان سے ذرا الگ سفر کریں۔"

شون نے نفی میں سر ہلایا۔ "یہ مناسب نہیں ہو گا۔ اب تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے کہ ہم ان سے الگ ہو جائیں۔"

کچھ دیر بعد براؤن اور جوڈی ہرن کا گوشت آگ پر بھون رہے تھے۔ انہوں نے شون اور مائیکا کو بھی دعوت دی۔ وہ باہر آ گئے۔ براؤن نے سرخ شراب کی بوتل نکالی اور کچھ دیر بعد وہ سب بھول کر ہنستے بولتے کھا پی رہے تھے۔ ہرن زیادہ بڑا نہیں تھا اور وہ بھوکے رہ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیشتر گوشت ختم ہو گیا تھا۔ براؤن نے اپنے بیگ سے ایک اور بوتل نکالی اس میں سفید شراب تھی اور شراب میں ایک چھوٹا سمندری گھوڑا تیر رہا تھا۔ وہ شراب میں محفوظ ہو گیا تھا۔ براؤن نے کہا۔ "یہ میری خاص وائن ہے جو میں خاص موقعوں پر استعمال کرتا ہوں اس چھوٹے سے سی ہارس کو میں نے خود گریٹ بیریئر ریف میں غوطہ خوری کے دوران پکڑا تھا۔"

انہوں نے دلچسپی سے دیکھا۔ "جب شراب ختم ہو جائے گی تو یہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

"نہیں، میرے پاس ایسی دو بوتلیں اور ہیں۔ یہاں سے واپس جانے تک یہ کافی ہوں گی۔ میں نے سوچ لیا ہے یہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔"

کھا پی کر وہ سب تھک گئے تھے پھر پورے دن کے سفر کی تھکن تھی۔ پہلے جوڈی اور مائیکا گئیں اور پھر وہ دونوں بھی اٹھ گئے۔ براؤن نے اندر جانے سے پہلے کہا۔ "ہوشیار رہنا اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو آواز دے لینا۔"

شون کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "تم فکر مت کرو مجھے خطروں سے نمٹنا آتا ہے۔"

اگلی صبح سب سے تاخیر سے شون کی آنکھ کھلی۔ باہر سے تیز ہواؤں کے ساتھ باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ پھر ہیلی کاپٹر کی آواز آئی، شون پھرتی سے اٹھ کر باہر آیا۔ ایک پولیس رینجرز ہیلی کاپٹر ساحل کے ساتھ ساتھ اڑ رہا تھا۔ خیمے دیکھ کر وہ ان کی طرف آیا۔ ایک پولیس والا میگا فون سے کہہ رہا تھا۔ "ہوشیار رہو اور جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ... سیاحوں کو غائب کرنے والے لوگ ممکنہ طور پر یہاں ہیں۔"

شون نے مائیکا کی طرف دیکھا۔ "میں کہہ رہا تھا نا؟"

براؤن یوں مسکرا رہا تھا جیسے پولیس کی وارننگ کو احمقانہ سمجھ رہا ہو۔ اس نے ہیلی کاپٹر دیکھ کر ذرا بھی ردعمل نہیں دکھایا تھا اور اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔ اس نے اور جوڈی نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں اس کام میں مہارت تھی۔ البتہ شون اور مائیکا کو اپنا خیمہ اور سامان پیک کرنے میں کسی قدر مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ناشتے کی گنجائش نہیں تھی اور وقت بھی نہیں تھا اس لیے وہ روانہ ہو گئے۔ آج دن کی روشنی میں انہیں آبی غاروں والے ساحل تک پہنچ جانا تھا ورنہ راستے میں رات ہو جاتی تو انہیں کوئی جگہ مشکل سے ملتی کیونکہ یہ سارا علاقہ ناہموار پتھروں اور چٹانوں پر مشتمل تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد انہیں تین خواتین کا ایک گروپ ملا۔ وہ پولیس وارننگ کے بارے میں بحث کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کا خیال تھا کہ انہیں واپس جانا چاہیے جب کہ دو اپنا ٹریک مکمل کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ انہیں بحث میں چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ویسے بھی ان خواتین کی منزل کہیں اور تھی۔

دوپہر کے قریب وہ ایک جگہ رکے۔ اب سب کو بھوک اور پیاس لگ رہی تھی۔ براؤن اور جوڈی نے اعلان کیا کہ وہ فی الحال کچھ کھانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ہرن کے گوشت کے کچھ حصے ان کے پاس محفوظ تھے اور وہ رات میں ان سے کام چلاتے۔ شون اور مائیکا نے اپنے ذخیرۂ خوراک میں سے تلے مٹر اور فرائی آلو لیے۔ کھانے اور آرام کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہونے والے تھے کہ اچانک پولیس رینجرز ہیلی کاپٹر ان کے سر کے اوپر سے گزرا۔ وہ بہت نیچی پرواز کر رہا تھا۔ پھر وہ آگے چٹانوں میں نیچے اتر گیا۔ شون کھڑا ہو گیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"میرا خیال ہے دیکھنا چاہیے۔" جوڈی بولی۔

"میرے خیال میں تو ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔" براؤن بولا۔ "اس واقعے کا ہم سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"پھر بھی دیکھنا تو چاہیے۔" شون اس طرف بڑھا۔ مائیکا اور جوڈی اس کے پیچھے تھیں۔ وہ ایک گھاس سے ڈھکی چٹان پر چڑھ کر دوسری طرف پہنچے تو انہیں پولیس والوں کے ساتھ ڈین اور نینسی بھی دکھائی دیے تھے۔ ڈین کو زمین پر بٹھا کر ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں اور دو پولیس والے نینسی کو قابو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بری طرح مچل رہی تھی اور اس کی زبان سے جو گالیاں نکل رہی تھیں انہیں سن کر پولیس والوں کے چہرے بھی سرخ ہو گئے تھے۔ ایک پولیس آفیسر نگرانی کر رہا تھا، شون اس کی طرف بڑھا۔

"یہ کیا چکر ہے ان کو کیوں پکڑا ہے؟"

"وہیں رہو۔" پولیس آفیسر نے کہا۔

شون رک گیا تھا لیکن اس نے سوال جاری رکھے۔ "کیا یہ وہی لوگ ہیں جو سیاحوں کو غائب کر رہے ہیں؟"

پولیس آفیسر ڈین اور نینسی کے سامان کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس نے بیگ سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر ہتھیلی پر الٹا تو سب چونک گئے تھے، ڈبیا سے انسانی دانت نکلے تھے۔ یک دم معاملہ سنگین ہو گیا تھا۔ براؤن بھی پیچھے آیا تھا، شون نے اسے بتایا کہ ان لوگوں کے سامان سے کیا نکلا ہے۔ جوڈی بولی۔ "مجھے تو یہی وہ مجرم لگ رہے ہیں جو لوگوں کو غائب کرتے ہیں۔"

مائیکا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"افواہ سنی ہے کہ پولیس کو کچھ لاشیں ملی ہیں اور ان کے قاتلوں کی تلاش جاری ہے۔ ان لاشوں کے دانت بھی غائب تھے۔"

شون کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ "لاشیں...... اسی بے فیلڈ پارک میں؟"

جوڈی نے سر ہلایا۔ "پچھلے ایک سال میں...... اور کم سے کم تین لاشیں ملی ہیں لیکن اس بات کو پبلک سے چھپایا جا رہا ہے۔ شاید پولیس قاتل کی تلاش کے لیے ایسا کر رہی ہے۔"

"کم آن جوڈی یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں جو ہر بار میں لوگ کرتے رہتے ہیں۔" براؤن نے کہا۔

"نہیں...... مجھے یقین ہے یہ سب سچ ہے۔" وہ بولی، اس دوران میں ڈین اور نینسی کو باندھ کر ہیلی کاپٹر میں سوار کر دیا گیا تھا۔ اب پولیس والے ان کے سامان کی تفصیلی تلاشی لے رہے تھے۔

مائیکا نے آہستہ سے کہا۔ "میں تو انہیں صرف منشیات کا عادی سمجھتی تھی۔"

''منشیات کے عادی ہی جرائم کرتے ہیں تاکہ انہیں نشے کے لیے رقم ملتی رہے۔'' براؤن نے کہا۔ ''اب چلنا چاہیے ورنہ راستے میں شام ہوجائے گی۔''

وہ روانہ ہوئے۔ انسانی دانت نکل آنے کے بعد پولیس والے اب آس پاس کی تلاشی بھی لے رہے تھے۔ جب وہ جانے لگے تو پولیس آفیسر نے ان کے نام پوچھے اور انہیں ہدایت کی کہ وہ پیون پہنچ کر پولیس سے رابطہ کریں اور اس بارے میں اپنا بیان ریکارڈ کرائیں۔ مگر وہاں سے نکلتے ہی براؤن نے کہا۔ ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''قانون سے تعاون کرنا چاہیے۔'' شون دبی زبان میں بولا۔

''میرے نزدیک قانون سے تعاون کے لیے یہ کافی ہے کہ آپ قانون شکن نہ ہوں۔'' براؤن نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

اس بار انہوں نے رفتار تیز رکھی تاکہ وقت پر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ وہ سورج ڈوبنے سے پہلے آبی غاروں والی چٹانوں تک پہنچ گئے تھے لیکن اس کوشش میں ان کا حشر برا ہوگیا تھا۔ شون، مائیکا اور جوڈی وہاں پہنچتے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ صرف براؤن اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔ اسی نے سامان کھولا اور دونوں خیمے لگائے۔ جب تک وہ اٹھنے کے قابل ہوئے، براؤن سمندر میں غوطہ بھی لگا آیا تھا۔ ساحل پر سرفنگ بورڈ اور چھوٹی کشتیاں بھی تھیں۔ یہ پارک انتظامیہ کی طرف سے تھیں تاکہ دشوار سفر کر کے آنے والے سیاح سرفنگ کے ساتھ آبی غاروں کی سیر بھی کرسکیں۔ ان میں سے بہت سے غاروں تک صرف کشتی سے رسائی ممکن تھی۔ ڈنر کرتے ہی شون اور مائیکا اپنے خیمے میں چلے گئے تھے۔

اگلی صبح سورج بلند ہوا تو اس کی روشنی میں ساحل اور چٹانیں جگمگانے لگی تھیں۔ شون خیمے سے باہر آیا تو وہ تینوں ساحل پر لہروں سے کھیل رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہوئے شون نے ایک چھوٹا سا اسپرٹ لیمپ نکالا اور چند پتھروں کے درمیان جما کر رکھنے لگا۔ شاید وہ کافی تیار کرنے جا رہا تھا۔ براؤن یہاں تک آنے والی بال لینے آیا تھا تو اس نے شون کو اسپرٹ لیمپ جلاتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد شون بھی ان میں شامل ہوگیا۔ براؤن نے تھوڑی سی سرفنگ کی تھی۔ وہ شون کو بھی اکساتا رہا کہ وہ کشتی میں اس کے ساتھ چلے مگر شون کا ارادہ نہیں ہو رہا تھا۔ مائیکا، جوڈی ساحل پر بیٹھی تھیں مائیکا جوڈی کو شون کے ویڈیو کیمرے سے مختلف ویڈیوز دکھا رہی تھی جو انہوں نے اس سفر کے دوران شوٹ کی تھیں۔ وہ ساحل کی بہت سفید ریت پر بیٹھی تھیں۔ یہاں ساحل زیادہ بڑا نہیں تھا۔ چٹانوں کے درمیان گھرا ہوا مشکل سے دو سو گز کا ایک ٹکڑا تھا۔ نیچے آنے کا راستہ بھی پیچیدہ سا تھا۔ براؤن اور شون واپس آئے تو مائیکا نے کیمرا بیگ میں رکھ دیا۔ جوڈی نے براؤن سے پوچھا۔

''آبی غار کہاں ہیں یہاں تو سمندر ہے یا پھر یہ چٹانیں ہیں۔''

''آبی غار ان چٹانوں کے نیچے ہیں۔'' براؤن نے جنوب کی سمت سمندر کے ساتھ بلند چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''سمندر نے ان چٹانوں کو اندر سے جا بہ جا کاٹ دیا ہے اور اس سے آبی غار وجود میں آئے۔ اکثر غاروں کے اوپر چھت میں بھی سوراخ ہیں۔''

''چھت کے راستے اندر جاتے ہیں؟'' مائیکا نے دلچسپی سے پوچھا۔ براؤن نے نفی میں سر ہلایا۔

''وہاں تک جانے کا راستہ صرف سمندر سے گزرتا ہے۔''

''کیا خیال ہے، چلیں۔'' خلاف توقع شون نے کہا۔ ''ابھی دوپہر ہے یہی وقت سب سے بہترین ہوسکتا ہے ان غاروں کی سیر کا۔''

''میرا تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' مائیکا نے کہا اور اٹھ کر اپنے سامان کی طرف چلی گئی۔ وہ ساحل کے شروع میں پڑا تھا، اس نے اپنے بیگ سے ایک ربر شیٹ نکالی اور بچھا کر اس پر لیٹ گئی۔ شون نے جوڈی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

''میں بھی آرام کروں گی ابھی کل کی تھکن نہیں اتری ہے۔''

''تب ہم دونوں چلتے ہیں۔'' شون نے کہا۔ براؤن رضامند نہیں لگ رہا تھا مگر شون بھاگتا ہوا ساحل پر موجود کشتیوں تک پہنچ گیا، اس نے چلا کر براؤن سے کہا۔ ''آجاؤ۔''

''میرا موڈ نہیں ہے۔''

''آجاؤ یار، مرد بنو۔'' شون نے اس کا طعنہ اسے لوٹایا تو براؤن جوش میں آگیا۔ وہ بھی کشتیوں کی طرف بڑھا۔ یہ چھوٹی کشتیاں تھیں اور ایک وقت میں ایک آدمی چلا سکتا تھا۔ اتنی دیر میں شون اپنی کشتی لے کر لہروں میں داخل ہوگیا تھا۔ براؤن نے دوسری کشتی کی رسی کھولتے ہوئے کہا۔ ''احمق کہیں جوش میں مارا نہ جائے۔''

جب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ شون کسی جسمانی سرگرمی میں براؤن سے آگے جا رہا تھا۔ جوڈی ان دونوں کو جاتے دیکھ رہی تھی اور بور ہو رہی تھی۔ اس کی نظر شون کے کیمرے پر پڑی، اس نے مائیکا کی طرف دیکھا وہ اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کی توجہ ادھر نہیں تھی۔ جوڈی نے بیگ سے کیمرا نکالا اور اسے آن کر کے اس کے اندر موجود تصاویر اور ویڈیوز کی لسٹ چیک کرنے لگی۔ اچانک اسے ایک فولڈر نظر آیا جس پر ویڈنگ لکھا تھا۔ جوڈی نے یہ سوچتے ہوئے کھول لیا کہ اس میں مائیکا اور شون کی شادی کی تصویریں ہوں گی۔ اس میں تصویریں ہی تھیں لیکن جب اس نے انہیں کھولا تو چونک گئی تھی۔ وہ کچھ دیر تصویریں دیکھتی رہی اور اس کے چہرے پر الجھن کے ساتھ ساتھ خوف بھی تھا پھر اچانک اس نے کیمرا بیگ پر پھینکا اور اٹھ کر ساحل کی طرف دوڑی۔ وہ دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے چلا رہی تھی۔

''واپس آؤ... براؤن واپس آؤ۔''

شون اور براؤن خاصا آگے نکل گئے تھے۔ اب وہ برابر تھے۔ شون نے جوڈی کی آواز سنی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ کچھ کہہ رہی ہے۔''

براؤن نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ وہ اتنی دور تھے کہ جوڈی کی آواز آرہی تھی لیکن اس کے الفاظ سمجھ نہیں آرہے تھے۔ براؤن نے کہا۔ ''وہ واپس بلا رہی ہے۔''

''کم آن، ہم بہت آگے نکل آئے ہیں۔'' شون نے کہا اور دوبارہ چپو چلانے لگا۔ براؤن نے ہاتھ ہلا کر جوڈی کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ دیر میں آتا ہے لیکن جوڈی بہ دستور ہاتھ لہراتی اور اسے آوازیں دیتی رہی۔ براؤن اسے نظر انداز کر کے شون کے پیچھے جانے لگا۔ کھاڑی سے نکلنے کے بعد سمندر پرسکون ہوگیا تھا اور اب آبی غار سامنے نظر آرہے تھے۔ لہریں صدیوں سے چٹانوں کو کاٹتی رہی تھیں اور ان کے اندر سوراخ ہو گئے تھے۔ شون نے ایک غار کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں چلتے ہیں۔''

''یہ سب سے بڑا غار ہے۔'' براؤن نے کہا۔ ''اس کی چھت بھی کھلی ہے۔''

''تم آچکے ہو یہاں؟''

''ہاں ایک بار پہلے بھی آچکا ہوں۔''

ان کی کشتیاں غار میں داخل ہوئیں یہاں پانی ساکت تھا اور چھت سے آتی دھوپ کی کرنیں پانی پر پڑ کر آس پاس دیواروں پر رنگ بکھیر رہی تھیں۔ براؤن نے چپو رکھ دیے اور اپنی کشتی میں نیم دراز ہوگیا، اس نے اپنی سفید شراب کی بوتل نکالتے ہوئے شون سے کہا۔ ''آج تم نے مجھے حیران کر دیا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ تم اتنی مہارت سے کشتی چلا سکو گے۔''

''آج تمہاری حیرانی کے لیے اور بھی بہت کچھ ہو گا۔'' شون نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ بوتل سے گھونٹ لیتا براؤن چونکا۔

''کیا مطلب؟''

''کچھ نہیں۔'' شون نے جواب دیا۔ ''اب تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟''

''ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔'' براؤن نے کہا اچانک اسے لگا کہ غار کی دیواروں پر پڑتی روشنی کچھ زیادہ لہرانے لگی ہے صرف روشنی ہی نہیں بلکہ غار کی دیواریں بھی لہرا رہی تھیں۔ لیکن کچھ نہیں لہرا رہا تھا اصل میں اس کا دماغ چکرا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی جان نکل رہی ہو۔ بوتل والا ہاتھ کوشش کے باوجود جھکتا جا رہا تھا اور وہ کشتی کے باہر لٹک گیا۔ براؤن نے بہ مشکل کہا۔ ''یہ کیا ہے، شراب میں کچھ ملایا ہے... تم نے؟''

شون اب اسے کسی زہریلے سانپ کی طرح ساکت نظروں سے گھور رہا تھا۔ ''ہاں، جلد تم سکون کی نیند سو جاؤ گے اور پھر یہ نیند ہمیشہ کی نیند میں بدل جائے گی۔''

''لیکن کیوں... کیوں؟''

شون اپنی کشتی پاس لا رہا تھا پھر اس نے دونوں کشتیوں کو ملایا اور جھک کر براؤن کی جیب ٹٹولنے لگا۔ بالآخر

الوداع اردو

سنو! یہ فخر سے اک راز ہم بھی ''فاش'' کرتے ہیں
کبھی ہم منہ بھی دھوتے تھے مگر اب ''واش'' کرتے ہیں
تھا بچوں کے لیے بوسہ مگر اب ''کس'' ہی کرتے ہیں
ستاتی تھیں کبھی یادیں، مگر اب ''مس'' ہی کرتے ہیں
چہل قدمی کبھی کرتے تھے اور اب ''واک'' کرتے ہیں
کبھی کرتے تھے ہم باتیں، مگر اب ''ٹاک'' کرتے ہیں
کبھی جو امی، ابو تھے، وہی اب ممی، پاپا ہیں
کبھی جو تھا غسل خانہ، بنا وہ ''باتھ روم'' آخر
بڑھا جو اور ایک درجہ، بنا وہ ''واش روم'' آخر
کبھی تو درد ہوتا تھا، مگر اب ''پین'' ہوتا ہے
پڑھائی کی جگہ پر اب تو ''نالج گین'' ہوتا ہے

مرسلہ: افتخار حسین اعوان، مظفر آباد، آزاد کشمیر

اس نے ہیرے کی انگوٹھی والی ڈبیا برآمد کی اور اسے کھول کر دیکھا۔ انگوٹھی میں لگا ہیرا دھوپ میں جگمگا اٹھا تھا۔ شون نے براؤن کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اس کے لیے۔'' پھر اس نے براؤن کی قیمتی رسٹ واچ بھی اتار لی۔ ''اس کے لیے۔''

براؤن بہ مشکل سر اٹھائے ہوئے تھا۔ اس میں مزاحمت کی بالکل سکت نہیں تھی۔ لیکن اس کا ذہن کام کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ شون نے ڈین کے بیگ کی تلاشی لی تھی اور پھر پولیس کو اسی بیگ سے انسانی دانتوں والی ڈبیا ملی تھی۔ جب وہ رسی سے ندی کراس کر رہے تھے تو کچھ دیر کے لیے شون اور مائیکا ان کی نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔ یقیناً اسی دوران میں شون نے کال کر کے پولیس کو اطلاع دی ہوگی۔ بلندی پر موبائل سگنل آ رہے تھے۔ پھر صبح وہ اسپرٹ لیمپ جلا رہا تھا۔ اسے کافی تیار نہیں کرنی تھی بلکہ وہ نشہ کر رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں نشے سے چمک رہی تھیں۔ ''تم... ہمیں مار دو گے... جیسے دوسرے سیاحوں کو مارا ہوگا۔''

''تم ٹھیک سمجھے دوست۔'' شون نے اپنے شارٹ کی بیلٹ میں اڑسا ہوا پستول نکال لیا۔ ''تمہارا سامان بھی خاصا قیمتی ہے وہ بھی اچھی قیمت پر بک جائے گا۔''

''تم یہ سب کیوں کرتے ہو؟''

''منشیات کے لیے۔'' شون نے کہا۔ ''تم نے ٹھیک کہا تھا منشیات کے عادی منشیات کے حصول کے لیے جرم کرتے ہیں۔''

شون نے پستول سیدھا کیا تو براؤن نے بے ساختہ سر گھما لیا۔

☆☆☆

جوڈی تھک ہار کر رک گئی تھی۔ اس کی چیخ و پکار پر مائیکا چونک گئی تھی اور سر گھمائے اسے دیکھ رہی تھی۔ جوڈی نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر جنوبی چٹانوں کی طرف دیکھا۔ یہ تقریباً سیدھی کھڑی تھیں اور ان پر چڑھنے کا بہ ظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ مگر پھر اسے ایک جگہ راستہ محسوس ہوا اور وہ اس طرف بھاگی۔ مائیکا اسے بھاگتے دیکھ رہی تھی پھر اسے خیال آیا اور وہ اٹھ کر دوڑتے ہوئے کیمرے کے بیگ تک آئی۔ کیمرا بیگ کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا اور اس کا ایل سی ڈی کھلا ہوا تھا ابھی نہیں اس پر ایک تصویر بھی موجود تھی۔ مائیکا نے کیمرا اٹھا کر دیکھا۔ یہ اسی کی شادی کی تصویر تھی لیکن اس میں دلہا شون نہیں تھا۔ مائیکا نے کیمرا آف کر کے واپس بیگ میں رکھا اور اپنے سامان کی طرف دوڑی۔ اس نے پاگلوں کی طرح سامان کی تلاشی لی اور اس میں سے وہی کلہاڑی نکال لی جو براؤن نے شون کو دی تھی۔ وہ کلہاڑی لے کر جوڈی کے پیچھے گئی تھی۔

جوڈی دوڑتے ہوئے چٹانوں کے اوپر جانے والے راستے تک پہنچی۔ یہ مشکل تھا لیکن کوشش کر کے چڑھا جا سکتا تھا اور اس وقت جوڈی ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھی کیونکہ براؤن کی زندگی خطرے میں تھی۔ وہ پتھروں، جھاڑیوں اور بیلوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر چڑھنے لگی۔ اس کا مضبوط لچکدار جسم پوری طرح ساتھ دے رہا تھا۔ چٹانیں دو سو سے ڈھائی سو فٹ بلند تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ اوپر پہنچی تو اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ چند لمحے سانس درست کرنے کے لیے رکی اور پھر ان چٹانوں کی طرف بڑھی جن کے نیچے آبی غار تھے۔ یہاں بھی راستہ بہت دشوار اور خطرناک تھا بعض جگہیں ایسی تھیں کہ پاؤں پھسلتا تو سیدھا نیچے سمندر میں گرتی۔ آبی غاروں والی چٹانیں کسی قدر نیچے تھیں۔ ان میں سوراخ ہو گئے تھے اور جوڈی سوراخوں سے جھانک جھانک کر براؤن کو آواز دے رہی تھی۔

یہ بات یقینی تھی کہ وہ کسی غار میں جا چکے تھے کیونکہ سمندر پر کسی کشتی کا نام و نشان نہیں تھا۔ پھر وہ ایک سوراخ کے کنارے آئی اور اس نے جھانکا تو اسے براؤن کشتی میں نیم دراز نظر آیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں گردش کر رہی تھیں۔ وہ ہوش میں نہیں تھا پھر جوڈی نے شون کو دیکھا، اس کی کشتی ذرا دور تھی اور وہ پستول براؤن کی طرف سیدھا کر رہا تھا۔ جوڈی کی چیخ اور فائر ایک ساتھ گونجے تھے۔ گولی براؤن کے سر میں لگی اور وہ جھٹکے سے کشتی سے الٹ کر پانی میں گرا اور فوراً ہی پانی خون سے سرخ ہونے لگا۔ جوڈی کی چیخ پر شون نے چونک کر اوپر کی طرف دیکھا اور پھر پستول اوپر کرتے ہوئے لگاتار فائر کرتا چلا گیا۔ جوڈی ایک جھٹکے سے پیچھے آئی تھی۔ ایک گولی اس کے پاس سے گزری تھی۔ اس نے منہ ہاتھ سے دبایا ہوا تھا اور اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔ اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اس نے چونک کر دیکھا۔

وہ مائیکا تھی جس نے کلہاڑی اٹھا رکھی تھی اور وحشیانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ پھر وہ ایک چیخ کے ساتھ جوڈی کی طرف لپکی اس نے کلہاڑی سر سے بلند کر رکھی تھی۔ جوڈی تیزی سے ہٹی اور کلہاڑی چٹان پر لگی، اگر اسے لمحے بھر کی تاخیر ہوتی تو کلہاڑی اس کے سر میں اتر جاتی۔ اس نے مائیکا کے پیروں پر پیر مارا اور وہ لڑکھڑا کر گری۔ پھر اس نے لپنے

لیٹے ہاتھ گھمایا اور اس بار جوڈی کوشش کے باوجود نہیں بچ سکی۔ کلہاڑی اس کے بازو کو چھیلتی گزر گئی۔ جوڈی نے چیخ ماری اور دوبارہ پاؤں چلائے۔ مائیکا کی بدقسمتی کہ اس کا منہ بالکل سامنے تھا۔ جوڈی کے سخت چرمی جوتے بہت زور سے لگے اور وہ پلٹ کر دوسری طرف گری۔ جب تک وہ کھڑی ہوتی، جوڈی بھی اٹھ گئی تھی۔ بازو کی کھال کٹ گئی تھی اور خون بہہ رہا تھا لیکن زخم بہت گہرا نہیں تھا۔ اس نے جھک کر جوتے سے لگا چاقو نکالا۔ مائیکا کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا مگر اس کے دم خم میں کمی نہیں آئی تھی وہ پھر اٹھ کر لپکی۔ اس بار جوڈی نے آسانی سے اس کا وار خالی کیا اور چاقو گھما کر اس کی ران میں اتار دیا۔ مائیکا کے منہ سے دہاڑ نکلی اور تکلیف سے کلہاڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آبی غار میں گئی۔ جوڈی نے چاقو واپس کھینچ لیا۔ مائیکا لڑکھڑا کر پیچھے ہوئی اور اس کا توازن بگڑا۔ دوسرے لمحے وہ بھی آبی غار میں گر گئی تھی۔ اس کی چیخ دیر تک سنائی دیتی رہی تھی۔

جوڈی اٹھ کر کنارے کی طرف بڑھی لیکن ابھی وہ پاس ہی آئی تھی کہ کنارے پر ایک ہاتھ نمودار ہوا اور پھر دوسرا ہاتھ سامنے آیا جس میں پستول تھا۔ یہ شون تھا جو کسی طرح اوپر چڑھ آیا تھا۔ آخر میں اس کا سر نمودار ہوا اور جوڈی پر نظر پڑتے ہی اس نے فائرنگ شروع کر دی۔ وہ پلٹ کر بھاگی، گولیاں اس کے آس پاس سے گزر رہی تھیں۔ شون نے اندھا دھند فائرنگ کی اگر وہ ذرا سنبھل کر گولی چلاتا تو جوڈی بالکل سامنے تھی۔ پھر کلک کلک کی آواز نے بتایا کہ پستول خالی ہو گیا تھا۔ جوڈی پلٹ کر آئی۔ اس کے اندر انتقام کا جذبہ ابھر رہا تھا، اسے براؤن کی موت یاد آ رہی تھی۔ وہ کس طرح بے بسی سے مرا تھا۔ وہ زمین پر لیٹے ہوئے آگے بڑھی۔ شون کنارے کی ترچھے اور سپاٹ حصوں پر ہاتھ جما کر اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بغیر کسی سہارے کے یہ کام بہت مشکل تھا۔ جوڈی نے پاس آ کر اٹھتے ہوئے چاقو بلند کیا اور پوری قوت سے اس کے ہاتھ میں اتار دیا۔

شون کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور اگر چاقو چٹان میں نہ گڑ گیا ہوتا تو وہ نیچے گر جاتا مگر گڑے چاقو نے اسے بچا لیا تھا۔ جوڈی آگے جانے کی ہمت نہ کر سکی، اسے ڈر تھا کہ شون نے پستول دوبارہ لوڈ کر لیا ہوگا اور وہ اسے شوٹ کر سکتا تھا۔ وہ پلٹ کر بھاگی۔ اسے یاد تھا کہ مائیکا اور شون کے پاس ایمرجنسی ریڈیو تھے ان کی مدد سے پولیس سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنا بازو کا زخم دبائے بہ مشکل چٹانوں سے نیچے اتری۔ یہ بہت مشکل ثابت ہوا تھا اور ایک جگہ تو وہ بری طرح گری تھی لیکن یہاں زمین صرف پانچ فٹ نیچے اور ریتیلی تھی اس لیے وہ کسی چوٹ سے محفوظ رہی۔ وہ سامان کے پاس آئی اور اس میں واکی ٹاکی تلاش کرنے لگی۔ سیٹ اسے مائیکا کے سامان سے ملا تھا۔ اس نے واکی ٹاکی آن کیا اور بولنے لگی۔

”پلیز میری مدد کرو... ہم آبی غاروں والی چٹانوں پر ہیں اور یہاں قاتلوں نے میرے ساتھی کو مار دیا ہے وہ مجھے بھی مارنے آ رہے ہیں۔“

واکی ٹاکی سے آواز آئی۔ ”تمہاری آواز سن لی گئی ہے اور مدد آ رہی ہے، ذرا پلٹ کر دیکھو۔“

جوڈی نے پلٹ کر سمندر کی طرف دیکھا تو مائیکا کشتی چلاتی ساحل کی طرف آ رہی تھی اور دوسرا واکی ٹاکی اس کے ہاتھ میں تھا۔ گویا یہ ایمرجنسی واکی ٹاکی نہیں تھے بلکہ صرف دوطرفہ رابطے کے لیے تھے۔ جوڈی نے واکی ٹاکی پھینکا اور اوپر کی طرف بھاگی اس بار اس کا رخ اس راستے کی طرف تھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ ان قاتلوں سے بچنے کی واحد ترکیب یہی تھی کہ ان سے دور رہا جائے۔ اسے اب کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ یہی دونوں بے فیلڈ پارک میں سیاحوں کی گمشدگی اور قتل کے ذمے دار تھے۔ وہ ڈھلان پر چڑھنے لگی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا، مائیکا ساحل تک آ گئی تھی اور اب اپنی ران دبائے سامان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جوڈی کو اطمینان تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اس کا پیچھا نہیں کر سکے گی۔ شون بھی زخمی تھا۔ اگر وہ دوسرے سیاحوں تک پہنچ جاتی تو ان کی مدد سے پولیس تک جا سکتی تھی۔ ایک جگہ رک کر اس نے پتوں سے اپنا زخم صاف کیا۔ پھر اس نے راستہ بدل دیا۔ براؤن نے بتایا تھا کہ ان چٹانوں کا پچھلا حصہ ہائکرز میں مقبول ہے کیونکہ یہ بہت دشوار ہے۔ اسے امید تھی کہ وہاں اسے کچھ لوگ ضرور ملیں گے۔

☆☆☆

شون شدید اذیت میں تھا لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا اور پستول اوپر پھینکتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے چاقو کا دستہ تھاما اور زور لگا کر خود کو اوپر کھینچ لیا۔ چاقو الٹے ہاتھ کی ہتھیلی کے عین وسط میں پیوست تھا۔ اوپر آ کر اس نے زور لگا کر چاقو نکالا اور اس کے ساتھ اس کی چیخ بھی نکلی تھی۔ زخم سے خون بہہ رہا تھا اسے روکنے کے لیے اس نے اپنا رومال باندھا۔ پھر پستول اٹھا کر اس میں دوسرا میگزین لوڈ کیا اور ساحل والے حصے کی طرف بڑھا۔ وہ کنارے تک پہنچا تو اسے نیچے مائیکا دکھائی دی وہ اپنی ران پر پٹی باندھ رہی تھی۔ شون نے چلا کر اسے آواز دی۔ اس نے اوپر دیکھا اور اشارے سے شون کو بتایا کہ جوڈی واپسی والے راستے پر گئی تھی۔ شون چٹانوں کے اوپر سے ہی اس طرف بھاگا تھا۔ جوڈی کو روکنا اور ختم کرنا بہت ضروری تھا۔ اگر وہ پولیس تک پہنچ جاتی تو ان کی شناخت سامنے آ جاتی۔

شون اور مائیکا کی دوستی بہت پرانی تھی۔ دونوں نشیات کے عادی اور مجرمانہ ذہن رکھتے تھے۔ مائیکا خوب صورت تھی اور اپنی خوب صورتی کا فائدہ اٹھا کر دولت مندوں کو پھانس لیتی تھی۔ پھر وہ انہیں ہنی مون کے نام پر یہاں لے آتی۔ وہ دونوں مل کر دولت مند کو قتل کر دیتے اور اس کی لاش چھپا دیتے تھے۔ کبھی وہ کسی دولت مند جوڑے کو تاڑ لیتے اور اس کا پیچھا کر کے یہاں ان کو مار دیتے اور ان کا سامان لوٹ لیتے۔ ہر واردات میں انہیں اتنا مل جاتا تھا کہ وہ سال چھ مہینے آرام سے گزار لیتے تھے۔ گزشتہ پانچ سال میں وہ چھ افراد کو اپنا نشانہ بنا چکے تھے۔ مائیکا ہر بار نئے نام سے شکار پھانستی تھی۔ ایک بار انہوں نے ایک دولت مند جوڑے کا پیچھا کر کے اسے یہاں قتل کیا تھا۔ نوبیاہتا جوڑوں سے انہیں ہیروں کی انگوٹھیاں اور دوسری قیمتی چیزیں مل جاتی تھیں۔ لاش غائب کرنے سے پہلے شون ان کی نچلی کے دانت پلاس سے نکال لیتا تھا۔ وہ انہیں نشانی کے طور پر رکھتا تھا۔ اب ان ہی دانتوں کی مدد سے اس نے ڈین اور نینسی کو پھنسا دیا تھا۔ وہ براؤن کا کام تمام کر چکا تھا اور اب اسے جوڈی کی فکر تھی۔ بہت کم لوگوں نے انہیں ساتھ دیکھا تھا اور جب تک ان کی گمشدگی کا پتا چلتا وہ یہاں سے دور جا چکے ہوتے۔ شون نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ یہاں مزید کوئی واردات نہیں کریں گے۔ آسٹریلیا میں ایسے پارکس کی کوئی کمی نہیں تھی، وہ کسی نئی جگہ کو شکارگاہ کے طور پر منتخب کر سکتے تھے۔

☆☆☆

جوڈی بھاگتے ہوئے چٹانوں کے عقبی کنارے تک آئی۔ یہاں یہ چٹانیں زیادہ بلند تھیں اور بغیر کسی مدد کے ان پر چڑھنا یا ان سے اترنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی جگہ تلاش کرنے لگی جہاں سے نیچے اتر سکے۔ بالآخر ایک جگہ اسے رسی بندھی دکھائی دی جو نیچے جا رہی تھی۔ آنے والے ہائکرز بعد میں آنے والوں کے لیے ایسی آسانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ نیچے اترنے کی ہمت کر رہی تھی کہ اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دور ایک آدمی حرکت کر رہا تھا۔ وہ لباس سے پہچان گئی۔ وہ شون تھا۔ جوڈی عجلت میں پلٹی اور رسی کے سہارے نیچے اترنے لگی۔ اسے خوف تھا کہ شون آ گیا تو وہ اسے اوپر سے شوٹ کر دے گا۔ اس کی آمد سے پہلے وہ یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ رسی کے ساتھ بیلیں بھی لٹک رہی تھیں کبھی کبھی وہ انہیں بھی سہارے کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ زمین تین سو فٹ سے زیادہ نیچے تھی۔ بالآخر وہ نیچے اتری اور بھاگنے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اس نے سامنے دو افراد کو پایا۔ حلیے سے وہ ہائکرز لگ رہے تھے۔ وہ حیرت سے جوڈی کو دیکھ رہے تھے، ایک نے پوچھا۔ ”میم تم ٹھیک ہو؟“

”نہیں... اوپر ایک قاتل ہے۔ وہ میرے ساتھی کو مار چکا ہے اور مجھے بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ پلیز اگر تمہارے پاس کوئی ذریعہ ہے تو پولیس سے رابطہ کرو۔“

”ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے لیکن وہ آدمی کون ہے؟“

”وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا ہے، وہ اور اس کی ساتھی یہاں سیاحوں کو قتل کرتے رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ یہاں آئے مجھے یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“ جوڈی یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگی کہ وہ اس کے سامنے آ گئے۔

”ایک منٹ... ایک منٹ آرام سے۔“ پہلے والے آدمی نے کہا۔ ”تم زخمی ہو، پہلے تمہارا زخم دیکھنا ہوگا۔“

”زخم کو چھوڑو یہاں سے نکلنے کی فکر کرو، وہ آ گیا تو سب کو مار دے گا۔“

مگر وہ اسے ایک بدحواس عورت سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے اسے پکڑ کر روک لیا۔ جوڈی مچلنے لگی تھی۔ اسی لمحے اوپر سے سرسراہٹ ہوئی اور شون دھم سے نیچے کودا۔ اسے دیکھتے ہی جوڈی کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ ”چھوڑو، مجھے جانے دو احمقو...“

انہوں نے جوڈی کو چھوڑ دیا اور شون کی طرف بڑھے۔ اس نے ہاتھ آگے کیا۔ ”یہ پاگل عورت ہے۔ یہ دیکھو چاقو سے میرا ہاتھ زخمی کر دیا، میری ساتھی کی ران میں چاقو اتار دیا، اس سے پہلے یہ آبی غار میں اپنے ساتھی کو مار چکی ہے۔“

”جھوٹ کہتا ہے یہ۔“ جوڈی بولی۔ ”براؤن کو اسی نے مارا ہے، میں نے خود اسے شوٹ کرتے دیکھا تھا۔“

ایک ہائکر نے شون کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ سب اسی نے کیا ہے؟“

”میں دکھاتا ہوں۔“ شون نے ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے کہا اور جب اس کا ہاتھ سامنے آیا تو اس میں پستول تھا۔ اس نے پہلے سامنے والے ہائکر کو شوٹ کیا اور اگلے ہی

لمحے دوسرے ہاکر کو گولی ماردی۔ انہیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ان کے گرنے سے پہلے جوڈی حرکت میں آگئی، وہ پگ ڈنڈی پر بھاگی تھی۔ شون نے عقب سے اس پر فائر کیے لیکن اس بار بھی قسمت نے جوڈی کا ساتھ دیا اور کوئی گولی اسے چھو نہیں سکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ شون غصے سے دہاڑا اور اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

☆☆☆

آبی غار میں براؤن کا جسم کشتی کے ساتھ ہی پانی پر سیدھا تیر رہا تھا، اس کا منہ پانی سے باہر تھا۔ اچانک اس نے تیز سانس لی اور پھر کھانسنے لگا۔ کھانسی کے ساتھ اس کے منہ اور سانس کی نالی میں چلا جانے والا پانی باہر نکل رہا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ کر گردن تک آیا تھا لیکن پانی نے اس کا بڑا حصہ دھو دیا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا۔ اس کی کشتی الٹی ہوئی تھی اور اس کے نچلے حصے میں کلہاڑی کا پھل پیوست تھا۔ شون جا چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کلہاڑی کہاں سے آگئی؟ پھر اسے جوڈی کا خیال آیا تو وہ جلدی سے کشتی سیدھی کر کے اس پر سوار ہوگیا۔ پہلی بار اس نے اپنے زخم کو دیکھنے کی کوشش کی۔ سر پر تقریباً ایک انچ چوڑی اور دو انچ لمبی جگہ سے کھال الگ ہوئی تھی۔ یہ کھوپڑی کا وہی حصہ تھا جہاں ٹائٹینیم لگی تھی اور اس سخت ترین دھات نے اس کے سر کو گولی سے بچا لیا تھا۔ اس نے الگ ہوجانے والی کھال دوبارہ جمائی اور آس پاس دیکھا تو اسے اپنا ہیٹ پانی میں تیرتا دکھائی دیا۔ وہ ہیٹ اٹھانے کے لیے جھکا تو اسے پانی کے نیچے اپنا سی ہارس دکھائی دیا وہ بے جان انداز میں تیر رہا تھا۔ بوتل تہ میں جا چکی تھی۔

"الوداع دوست۔" براؤن نے کہا اور ٹوپی سر پر جما کر رسی سے یوں باندھ لی کہ الگ ہوجانے والی کھال اپنی جگہ سے نہ ہلنے پائے۔ کشتی سیدھی کرنے سے پہلے اس نے کلہاڑی نکال لی تھی اس نے تہ کو نقصان نہیں پہنچایا تھا اور یہ اسی کی کلہاڑی تھی۔ چپو کشتی کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اس نے چپو پکڑے اور دانت پر دانت جما کر کشتی کھینے لگا۔ اسے رہ رہ کر جوڈی کا خیال آرہا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر جوڈی کو کوئی نقصان ہوا تو وہ ان دونوں کو نہیں چھوڑے گا۔ بہت تیزی سے کشتی چلاتا وہ ساحل تک آیا، وہاں سامان بکھرا ہوا تھا لیکن کوئی اور نہیں تھا۔ کیمرا بیگ پر پڑا تھا۔ براؤن نے کیمرا اٹھا کر دیکھا اور سمجھ گیا کہ جوڈی کیا دکھا کر اسے خبردار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اوپر چٹانوں تک آیا اور ابھی سوچ رہا تھا کہ کس طرف جائے کہ اسے فائرنگ کی آواز آئی۔ اس نے سمت کا تعین کیا اور اس طرف دوڑ پڑا۔

☆☆☆

جوڈی بچ کر اب جھاڑیوں کے درمیان بھاگ رہی تھی۔ پگڈنڈی پر وہ دور سے دکھائی دیتی جھاڑیاں اسے پھر بھی تحفظ دے رہی تھیں۔ شون اس کے پیچھے آرہا تھا، اس کے بھاگنے، ہانپنے اور گالیاں دینے کی آوازیں جوڈی تک آ رہی تھیں اور وہ کوشش کر رہی تھی کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ برقرار رہے۔ اچانک وہ ٹھوکر کھا کر گری اور ڈھلان سے لڑھکتے ہوئے ایک کھلی جگہ آگری۔ اس کی کمر پر چوٹ آئی تھی اور وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ شون نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے پستول سیدھا کیا اور فائر کرنے لگا۔ جوڈی لڑھک کر ایک درخت کے تنے کی آڑ میں ہوگئی۔ غصے سے پاگل شون نے ایک بار پھر پستول خالی کر دیا تھا اور اب وہ اس کا میگزین تبدیل کر رہا تھا۔ جوڈی نے آس پاس دیکھا تو اسے درخت کی ایک خشک شاخ پڑی دکھائی دی، اس نے وہ اٹھائی اور اچانک درخت کے پیچھے سے نکل کر شون پر حملہ کیا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا، لکڑی اس کے پستول والے ہاتھ پر لگی اور پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جوڈی اندھا دھند ہاتھ چلا رہی تھی۔ شون کو چند چوٹیں آئیں لیکن پھر اس نے اچانک سر جھکا کر جوڈی کے پیٹ میں ٹکر ماری اور اسے لیتا ہوا زمین پر گرا۔ اس نے جوڈی کو مکا مارنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ جوڈی نے گھٹنا چلایا جو اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ کراہ کر گرا۔ جوڈی نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگ شون کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے ٹانگ کھینچی تو جوڈی بری طرح نیچے گری۔ وہ سرکتا ہوا اس پر سوار ہوا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچتے ہوئے غرایا۔

"اب میں تجھے اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔"

جوڈی کا سانس رکنے لگا تھا، وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی لیکن بہت کمزور انداز میں۔ اس نے شون کا منہ نوچنے کی کوشش کی مگر اس کا بھی اثر نہیں ہوا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس لیے اسے پتا نہیں چلا کہ کب براؤن نے آکر شون پر حملہ کیا اور وہ اس سے ہٹ گیا۔ جوڈی دیوانہ وار سانس لے رہی تھی، اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا ہٹا تو اس نے دیکھا کہ شون زمین پر گرا ہوا تھا اور براؤن کلہاڑی بدست اس کے سر پر سوار تھا۔ جوڈی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "براؤن تم زندہ ہو۔"

براؤن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے اس کی طرف آیا، اس نے جوڈی کو بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ "تم ٹھیک ہو نا؟"

"ہاں۔" جوڈی نے کہا پھر وہ چونک گئی۔ شون نے پستول اٹھا لیا تھا لیکن جب اس نے ہاتھ اوپر کیا تو پتا چلا کہ کلہاڑی کے وار نے اس کی ہتھیلی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، ایک حصے میں انگوٹھا اور دو انگلیاں تھیں اور دوسرے حصے میں چھوٹی اور اس کے برابر والی انگلی تھی۔ اس کے باوجود شون نے کسی نہ کسی طرح پستول پکڑ لیا اور براؤن کی طرف کرتے ہوئے گولی چلائی مگر نشانہ خطا گیا۔ براؤن اس کی طرف بڑھا۔ شون نے دوسرا فائر کیا، وہ بھی خطا گیا۔ مگر اسے تیسرا فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اگلے لمحے براؤن نے پستول چھین کر اسے شون کی طرف تان لیا تھا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔

"تم کیا سمجھتے تھے، مجھے مار دیا ہے؟"

شون ہانپ رہا تھا۔ "تم کیسے بچے؟"

"میری کھوپڑی میں دھات ہے۔" براؤن نے جھک کر کہا۔ "تمہیں بتایا تھا لیکن شاید تم بھول گئے۔"

"اب تم کیا کرو گے، مجھے مار دو گے؟"

اسی لمحے پولیس ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔ اس کے پچھلے خانے میں پولیس آفیسر اور ایک اسنائپر اپنی رائفل سمیت موجود تھا۔ جوڈی نے دیکھا ہیلی کاپٹر کی فرنٹ سیٹ پر مائیکا بیٹھی تھی اور وہ مسکرا رہی تھی۔ جوڈی کو احساس ہوا کوئی گڑبڑ ہے۔ اسنائپر رائفل سے نشانہ لے رہا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا۔ براؤن نے پستول شون کے سر سے لگا رکھا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ پولیس والے براؤن کو قاتل سمجھ رہے ہیں اور وہ اسے شوٹ کرنے والے تھے۔ جوڈی براؤن کی طرف بھاگی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ چلائی۔ "نہیں... چھوڑ دو اسے..."

براؤن کے چہرے پر سختی تھی، اس نے اجنبی نظروں سے جوڈی کو دیکھا پھر اس کا چہرہ نرم پڑنے لگا اور اس کا پتھر جیسا جسم ڈھیلا ہوگیا۔ اس نے گہری سانس لی اور پستول ایک طرف پھینک دیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ موت اس کے کتنے قریب سے ہو کر چلی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر میں پولیس آفیسر نے اسنائپر کو شوٹ کرنے کا حکم دیدیا تھا لیکن جوڈی کے درمیان میں آنے سے اس نے رکنے کو کہا۔ پھر براؤن نے پستول پھینکا تو آفیسر نے شوٹ کا حکم واپس لے لیا۔ مائیکا کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی خواہش تھی کہ اسنائپر براؤن کو شوٹ کر دے۔ مگر براؤن نے پستول پھینک کر اس کی سازش ناکام بنا دی۔ جوڈی، براؤن کو شون سے دور لے جا رہی تھی۔ وہ اچانک پلٹی اور زمین پر بیٹھے شون کے منہ پر ٹھوکر ماری۔ وہ الٹ کر گرا تھا۔ جوڈی نے نفرت سے اسے دیکھا اور زمین پر تھوک کر بولی۔

"تم سزا پاؤ گے اور ہمیشہ کے لیے جیل جاؤ گے۔"

شون جہاں گرا تھا اس سے کچھ ہی دور پستول پڑا تھا۔ جوڈی پلٹ کر براؤن کی طرف آئی اور ان کی توجہ ہیلی کاپٹر کی طرف ہوگئی اس لیے وہ دیکھ ہی نہیں سکے کہ شون پستول کی طرف رینگ رہا تھا۔ اس نے پستول اٹھایا تھا کہ پولیس آفیسر نے دیکھ لیا اور اس نے چلا کر اسنائپر کو شوٹ کرنے کا حکم دیا۔ وہ تیار تھا، اس نے رائفل گھمائی۔ شون پستول براؤن اور جوڈی کی طرف گھما چکا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، اسنائپر نے گولی چلا دی۔ شون جھٹکے سے پیچھے ہٹا اور ساکت ہوگیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔ مائیکا چلائی اور اس سے پہلے کہ کوئی اسے روکتا، وہ دروازہ کھول کر نیچے کود گئی۔ پولیس آفیسر نے تقریباً ستر فٹ نیچے چٹانوں میں دیکھا۔ مائیکا کا جسم بکھرا ہوا تھا اور آس پاس خون پھیل رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نیچے آیا اور پولیس آفیسر اس سے اتر آیا تھا۔

جوڈی نے واکی ٹاکی پر جو بات کی تھی وہ وہاں گشت کرتے پولیس رینجرز ہیلی کاپٹر کے ریڈیو پر سن لی گئی تھی اور جب ہیلی کاپٹر اس جگہ آیا تو مائیکا نے پولیس کو گمراہ کیا اور بتایا کہ وہی پولیس سے مدد طلب کر رہی تھی۔ اس کی کوشش تھی کہ براؤن کو مروا دے اور سارا الزام ان دونوں پر لگا دے۔ مگر اس کی سازش ناکام رہی۔ اگلے دن براؤن اور جوڈی کو مقامی اسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ براؤن کے سر کا ایکسرے ہوا تھا اور خوش قسمتی سے گولی نے اس کے سر کو ہلکا سا نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی اتر جانے والی کھال ٹانکے لگا کر جوڑ دی گئی تھی۔ پولیس نے تصدیق کی کہ شون اور مائیکا ہی غائب اور مرنے والے سیاحوں کی موت کے ذمے دار تھے اس کا ثبوت ان کے ویڈیو کیمرے اور میموری ڈسکس سے مل گیا جو شون کے سامان میں تھیں۔ ان کے پاس سے خاصی رقم اور ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئی تھیں جن کے بارے میں خیال تھا کہ وہ مارے جانے والوں کی تھیں۔ کم سے کم آٹھ افراد غائب تھے اور ان میں سے صرف تین کی لاشیں ملی تھیں باقی لاشوں کے بارے میں پولیس کا خیال تھا کہ انہیں پارک میں دفنا دیا گیا تھا یا کسی طرح سے سمندر برد کر دیا گیا تھا۔ براؤن اور جوڈی خوش قسمت تھے جو اس خونی جوڑے کا شکار ہونے سے بچ گئے تھے۔

روٹھے ہوئے موسم کو منانے اور گمشدہ رشتوں کو جوڑنے والی ایک حوصلہ مند دوشیزہ کی داستان

تقسیم محبت

نشور ہادی

تیز بارش کے بعد آسمان پر جب شفق پھوٹتی ہے تو رنگوں کے گویا دھارے بہتے محسوس ہوتے ہیں اور ایسا تب ہی لگتا ہے جب انسان کے اندر کی دنیا ایک نئی کروٹ لیتی ہے... اکثر محبت تنہائی کو دعوت دیتی ہے اور تنہائی سوچ کو نئی سمت عطا کرتی ہے... کسی کے ہونے اور کھودینے کا احساس دل کو گدگداتا ہے یا تڑپاتا ہے... ایسے میں اگر کوئی محبت کو تقسیم کرنے کی کوشش کرے تو اندر بہت ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے کیونکہ عشق کوئی شیرنی نہیں کہ دوچار لوگوں میں یکساں بانٹ کر منصف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے زعم میں مبتلا ہوجائے۔ عشق تو نام ہی وحدانیت کا ہے، گویا جسے چاہا جائے پھر اس کے سوا کوئی دوجا نظر نہ آئے مگر یہ کیا... یہاں دوچاہنے والوں کے درمیان سماج کی دیوار نہیں بلکہ... ایک اور چاہت حائل ہورہی ہے وہ بھی کچھ اس طرح کہ کچھ ٹوٹ پھوٹ بھی نہ ہو اور اسے جگہ بھی مل جائے عجب منطق تھی جس پر وہ بضد تھی لیکن... ایسا کب ہوتا ہے جیسا انسان چاہتا ہے... حتیٰ کہ موسم بھی کسی کے احساس کے تابع نہیں رہتا... بلکہ بدلتا وہ اپنی مرضی سے ہے اور تبدیلی کا احساس انسان کو ہوتا ہے۔ گویا جب آنکھوں میں طوفان چھپے ہوں اور دامن پر داغ لگے ہوں تو ایسے میں ساون نہ صرف آنکھوں میں کاجل پھیلا دیتا ہے بلکہ رستوں سے منزل کا نشان بھی مٹا دیتا ہے مگر جذبات میں صداقت، عزم میں پختگی اور منزل کا یقین ہو تو ایسے لوگوں پر مقدر بھی مہربان ہوجاتا ہے۔



شہر کے ایک بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر محمود ہاتھ میں بریف کیس لیے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ سیل فون پر فریحہ نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وہ اس بس اسٹاپ کے قریب اس کا انتظار کرے۔ اگر اصرار نہ بھی کیا جاتا تو محمود اس کی بات مان لیتا کیونکہ وہ اس کی محسن تھی۔ اگرچہ اس کا ایک احسان تو خاک میں مل چکا تھا لیکن اس کا پہلا احسان بھی کچھ کم نہیں تھا۔ اگر وہ نہ ہوتی تو محمود اور مدیحہ کو ایک تھانے کی حوالات میں بند کردیا جاتا۔ کسی طرح اس سے چھٹکارا بھی مل جاتا لیکن بدنامی ضرور ہوجاتی۔

بہ وجوہ محمود کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے دو سال سے زیادہ ہوچکے تھے۔ وہ اپنی چچازاد مدیحہ کو پسند کرتا تھا اور مدیحہ بھی اسے چاہتی تھی۔ وہ دونوں شادی بھی کرنا چاہتے تھے لیکن محمود کی خواہش تھی کہ پہلے وہ بی کام کرکے اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے اور اسی دوران میں مدیحہ بھی میٹرک کرلے۔ دو سال قبل وہ نویں میں داخل ہی ہوئی تھی جب ان دونوں کے گھروں میں ایک تنازعے نے جنم لیا تھا۔ اس تنازعے کے باعث محمود کا مدیحہ کے گھر آنا جانا بھی ختم ہوگیا تھا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں بھی اسی باعث ختم ہوئی تھیں۔ وہ بس سیل فون پر ایک دوسرے سے باتیں کرلیا کرتے تھے۔

گزرے ہوئے دو سالوں کے آخری دنوں میں ان کی صرف ایک ملاقات ہوئی تھی جو انہیں بہت مہنگی پڑ گئی تھی۔ مگر شکر ہے کہ اس موقع پر فریحہ آگئی۔

وہ ٹہلتے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فریحہ اس سے کیوں ملنا چاہتی تھی۔ کیا وہ اس کے استعفے کے بارے میں بات کرتی جو اس نے اپنی ملازمت سے کل ہی دیا تھا...... اسی نوعیت کے مختلف سوالات اس کے ذہن میں گونج رہے تھے۔ اسے ایک خیال یہ بھی آرہا تھا کہ کیا وہ اپنے والد کے غلط رویے کے باعث اس سے معافی مانگے گی؟ اس رویے کی وجہ سے محمود نے استعفیٰ دیا تھا۔ اس کی یہ سوچ بچار اور انتظار اس لیے تھا کہ وہ طے شدہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی وہاں آگیا تھا ورنہ فریحہ تو بالکل صحیح وقت پر پہنچ گئی۔

وہ چمکتی دمکتی قیمتی کار تھی جو محمود کے بالکل قریب آکر رکی۔ خود فریحہ ہی ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ اس نے خود ہی جھک کر اپنے برابر کی نشست کا دروازہ کھولا۔

''آئیے محمود صاحب!'' اس نے کہا۔

محمود ہچکچاتا ہوا کار میں بیٹھ گیا۔

''دروازہ بند کرلیں، پلیز!'' فریحہ نے کار بہت آہستگی سے حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔

محمود جواب بھی ذہنی طور پر بہت زیادہ الجھا ہوا تھا، چونک پڑا اور اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔

''اوہ!'' فریحہ کے منہ سے نکلا۔ ''آہستہ سے بند کرتے!...... اچھا خیر!''

''دراصل آپ کی کار کے علاوہ تو ٹیکسیوں یا بسوں میں بیٹھتا رہا ہوں۔ ان کے دروازے اتنی ہی زور سے بند کرنا پڑتے ہیں......''

''اچھا چھوڑیں یہ بات۔'' فریحہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''آپ یقیناً اس وقت بہت الجھے ہوئے ہوں گے۔ آپ کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ میں آپ سے کیا بات کرنا چاہتی ہوں، کیوں ملنا چاہتی ہوں؟''

''فطری سی بات ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''بہت سے خیالات ذہن میں چکرانے لگے تھے۔''

''مثلاً...... کوئی ایک خیال بتائیں!''

''شاید آپ مجھ سے استعفیٰ واپس لینے کے لیے کہیں!''

''ہرگز نہیں۔ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ دراصل غلطی مجھ سے ہی ہوئی تھی کہ میں نے آپ کو وہاں ملازمت دلوائی۔''

''پھر آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

فریحہ نے جواب دینے کے بجائے سوال کر ڈالا۔ ''آپ نے دو سال پہلے اپنا گھر کیوں چھوڑا تھا؟''

''وہ ایک اصولی بات تھی۔ میں مختصراً آپ کو بتا بھی چکا ہوں۔''

''بس۔'' فریحہ نے کہا۔ ''ایک اصولی بات پر ہی میں نے بھی اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔''

''کیا!'' محمود شدت سے چونک پڑا۔ یہ اس کے لیے انہونی ہی تھی کہ کوئی لڑکی خود اپنا گھر چھوڑ دے۔

''جی۔'' فریحہ نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ڈیڈی سے بات کی تھی کہ وہ آپ کا استعفیٰ منظور نہ کریں اور آپ سے معافی تو خیر نہ مانگیں لیکن آپ سے یہ اعتراف ضرور کریں کہ غلطی انہی کی تھی۔ مجھے جمال سعیدی سے سب معلوم ہوچکا ہے۔''

محمود اس کا منہ تکتا رہ گیا جبکہ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ اس کے برخلاف مجھ پر غصے کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غیر اصولی بات ہوگی جس پر وہ اور زیادہ ناراض ہوئے اور مجھے برا بھلا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میں اس بارے میں رات بھر سوچتی رہی اور آج صبح گھر چھوڑ دیا۔''

''فرمان صاحب کو بتائے بغیر؟''

''بات کرنا فضول ہوتا۔ بس ایک پرچہ چھوڑ آئی ہوں کہ جس گھر میں بیٹی کے معاملے میں بھی غیر اصولی رویہ اختیار کیا جائے، میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔''

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اس معاملے میں آپ کو اپنے والد سے بحث بھی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میرے استعفے سے......''

''بات آپ کے استعفے کی نہیں۔'' فریحہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈی اپنا یہ رویہ نہیں بدلیں گے تو اس گھر میں میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہوجائے گا۔ میں نے اپنی آئندہ زندگی کے لیے جو فیصلہ کیا ہے، وہ اصولی ہے اور ڈیڈی اسے مانیں گے نہیں لہٰذا میں نے یہ قدم اٹھانا ضروری سمجھا۔''

محمود کے چہرے پر تشویش کا تاثر بڑھا اور وہ بولا۔ ''ہمارے معاشرے میں کسی لڑکی کا یہ اقدام اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مانا کہ آپ ایک بے حد ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ اس سوسائٹی میں بھی......''

فریحہ نے پھر اس کی بات کاٹی۔ ''کیا اچھا ہو، اگر آپ یہ بحث نہ چھیڑیں۔''

''بہتر!'' محمود نے کہا۔ ''اگر آپ نے صرف میرے استعفے کی وجہ سے گھر نہیں چھوڑا تو یہ بڑی حد تک آپ کا نجی معاملہ ہے اور مجھے واقعی آپ کے کسی نجی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔ میں آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ نے اپنی زندگی کے لیے ایسا کیا اصولی فیصلہ کیا ہے جو آپ کے والد کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔''

''مجھے اس وقت آپ کی کچھ مدد درکار ہے۔'' فریحہ نے محمود کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکا۔''

''آپ اپنے نام سے کسی ہوٹل میں ایک کمرا لے لیجیے۔ تھوڑی دیر کمرے میں رک کر واپس آجائیے گا اور چابی مجھے دے دیجیے گا۔ مجھے دو ایک دن کسی ہوٹل ہی میں رہنا ہے۔ پھر میں اپنا کوئی مستقل بندوبست کرلوں گی۔''

فریحہ کا پہلا ہی جملہ ایسا تھا کہ محمود کی آنکھوں سے الجھن جھانکنے لگی لیکن اس نے فریحہ کی بات پوری ہونے کا انتظار کیا، پھر بولا۔ ''یہ پیچیدگی کیوں!'' وہ بولا۔ ''آپ خود بھی لے سکتی ہیں کمرا!''

''دراصل ڈیڈی میری طرف سے فکرمند تو ہوں گے۔ پہلے میری دوستوں سے پوچھیں گے، پھر ہوٹلوں میں چھان بین کروائیں گے۔ اس طرح انہیں معلوم ہوجائے گا کہ میں کس ہوٹل میں ٹھہری ہوں، اور میں نہیں چاہتی کہ انہیں اس کا علم ہو۔''

کار اس وقت ایک بڑے ہوٹل کے قریب پہنچ گئی تھی۔ فریحہ نے اس کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔ ''ہوٹل میں آپ خود کو بزنس مین ظاہر کیجیے گا اور اپنی آمد کسی قریبی شہر سے بتائیے گا۔'' فریحہ قدرے رک کر بولی۔ ''آپ اس کام میں کوئی ہچکچاہٹ تو نہیں محسوس کریں گے؟ دراصل میں آپ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی۔ اگر آپ اس معاملے میں میری مدد نہ کرنا چاہیں تو میں اصرار نہیں کروں گی۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!...... اتنا سا کام بھی نہیں کروں گا آپ کا......! لیکن میں اس بارے میں آپ کو کچھ سمجھانا ضرور چاہوں گا۔''

''نہ جانے آپ کیا چاہتے ہیں، لیکن ابھی تو وقت نہیں ہے۔'' فریحہ نے کار روکتے ہوئے کہا۔ ''آپ جاکے یہ کام کر ڈالیے۔ میں دس منٹ بلکہ بیس منٹ ادھر ادھر گھوم کر واپس آجاؤں گی۔ اسی جگہ ملوں گی آپ کو۔''

فریحہ نے اپنے پرس سے چند بڑے نوٹ نکال کر محمود کی طرف بڑھائے۔ ''ہوٹل میں ایڈوانس جمع کرانا پڑتا ہے۔''

محمود کو فوری طور پر اس سے روپے لینا اچھا نہیں لگا تھا مگر اسے مجبوراً لینا پڑے۔ خود اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔

وہ کار سے اتر کر ہوٹل کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا دماغ اب بھی الجھا ہوا تھا۔ اسے یہ بات نہایت غیر مناسب معلوم ہورہی تھی کہ فریحہ نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے والد کو اس کا سراغ مل سکے۔ گویا گھر چھوڑنے کا اس کا ارادہ پختہ تھا۔

محمود یہی چاہتا تھا کہ اسے سمجھا بجھا کر واپس گھر جانے پر آمادہ کرسکے۔ ایک خیال اس کے ذہن میں یہ بھی آیا کہ وہ فون پر فریحہ کے والد فرمان علی کو اطلاع دے دے کہ فریحہ کس ہوٹل میں ٹھہری ہے لیکن یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ فریحہ کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بہرحال اس کی محسن تھی۔

ہوٹل کا کمرا لینے کے بعد محمود نے کمرے میں دس بارہ منٹ بستر پر لیٹ کر گزارے۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع

تھا جب اس نے ایک آراستہ وپیراستہ کمرے کے آرام دہ بستر پر چند منٹ گزارے۔ ایسے کمرے اس نے صرف ڈراموں یا فلموں ہی میں دیکھے تھے۔ وہ خود ٹیونیشیا لائن کے ایک نہایت معمولی سے گھر میں رہتا تھا۔

وہ ہوٹل سے نکل کر اس طرف بڑھا جہاں فریحہ نے اسے کار سے اتارا تھا۔ بیس کے بجائے بائیس منٹ گزر چکے تھے لیکن فریحہ کی کار وہاں دکھائی نہیں دی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ چونکا کہ وہاں کھڑی ہوئی ایک ٹیکسی میں فریحہ پچھلی نشست پر موجود تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر محمود کی طرف دیکھا تھا۔

کار کے بجائے ٹیکسی؟ محمود کا دماغ الجھا لیکن وہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

''کار......؟'' محمود نے پوچھنا چاہا۔

''بعد میں بات کریں گے۔'' فریحہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

غالباً وہ نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور ان کی باتیں سنے۔

محمود نے اس کا مقصد سمجھ لیا۔ فریحہ نے انگریزی میں بات کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ غالباً اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے دو چار باتیں کر کے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھ سکتا تھا۔

محمود نے ہوٹل کے کمرے کی چابی اسے دے دی۔

''میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتی ہوں۔'' فریحہ بولی۔

''میں خود بھی آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ شام کو ہوٹل آجائیے گا۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد!'' فریحہ نے جواب دیا۔ ''دراصل ابھی تو میں چند گھنٹے بہت مصروف رہوں گی۔ کچھ ضروری کام کرنا ہیں ابھی مجھے!''

اس نے اپنے ''ضروری کام'' کی وضاحت نہیں کی اور محمود نے بھی اس بارے میں کوئی سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''میں آپ کو آپ کے گھر پر اتار دوں گی۔'' فریحہ بولی۔

''نہیں نہیں، ٹیکسی کو اتنا اندر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھے مین روڈ پر اتار دیجیے گا۔''

دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر کے آس پاس رہنے والے اسے ایک ایسی ٹیکسی سے اترتے دیکھیں جس میں ایک خوب صورت اور ماڈرن لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔

☆☆☆

اپنے گھر پہنچ کر محمود نے اپنا اکلوتا سوٹ اتار کر ایک ہینگر میں لٹکایا اور اس پر ہلکا پلاسٹک ڈال کر ایک کیل سے لٹکا دیا۔ اس کے پاس کپڑوں کی الماری نہیں تھی۔ ملازمت کی پہلی تنخواہ ملنے سے قبل اسے نصف تنخواہ ایڈوانس مل گئی تھی جس سے اس نے یہ سوٹ سلوایا تھا یا کچھ دوسری ضروری چیزیں خریدی تھیں۔ سوچا تھا کہ اگلی تنخواہ پر الماری خرید لے گا لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ فرمان علی کے رویے کی وجہ سے اس نے غصے میں آکر استعفیٰ ہی دے دیا تھا۔

اب اسے دوسری ملازمت کی تلاش تھی لیکن اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ یہ تلاش آسان نہیں ہوگی۔ بی کام میں بہترین پوزیشن حاصل کر لینے کے باوجود وہ دھکے ہی کھا رہا تھا اور پھر اسے فریحہ کی وجہ سے اس کے باپ فرمان علی کی تجارتی فرم میں ملازمت مل سکی تھی۔

استعفیٰ دینے کے بعد وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا تھا مگر اب اچانک فریحہ کا معاملہ سامنے آجانے کے بعد اس کی ذہنی رو اسی معاملے کی طرف بہہ رہی تھی، اس کی دلی خواہش تھی کہ فریحہ اپنے گھر واپس چلی جائے۔ یہ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ اس معاملے میں دلچسپی لینے کے باعث بات کہیں سے کہیں تک چلی جائے گی۔

شام کے قریب وہ دوبارہ اپنے گھر سے نکلا۔ بریف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ فریحہ نے ہی اسے تاکید کی تھی کہ وہ بریف کیس ضرور اپنے ہاتھ میں رکھے۔ غالباً بریف کیس ہی کی وجہ سے ہوٹل والوں کو بہ آسانی باور آسکتا تھا کہ وہ کوئی تجارتی شخص تھا۔

گھر سے نکلتے ہی اسے خیال آیا کہ فریحہ کو فون کر لے تو بہتر ہوگا۔ نہ جانے وہ اس وقت ہوٹل میں ہو، نہ ہو۔ اس نے محمود کو بلایا تو اسی وقت تھا لیکن محمود کے دماغ میں اس کی یہ بات بھی تھی کہ اسے کچھ کام کرنے تھے اور کاموں میں اسے دیر بھی لگ سکتی تھی۔

سیل فون پر اس نے فریحہ سے رابطہ کیا۔

دوسری طرف سے فریحہ نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا۔ ''کہاں ہیں آپ اس وقت؟''

''میں اپنے گھر سے تو نکل چکا ہوں۔ اچانک خیال آیا کہ آپ سے پوچھ لوں۔ آپ اپنے کاموں سے فارغ ہوکر ہوٹل پہنچ گئی ہیں نا؟''

''آپ کو آنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

''میں بس اسٹاپ کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ اس روٹ کی بس آسانی سے مل جائے گی۔ آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔''

''بس تو آجائیے آپ!'' فریحہ نے جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

محمود بس اسٹاپ پر پہنچا۔ ایک منٹ بعد ہی بس مل گئی۔ محمود کے اندازے کے مطابق آدھے گھنٹے سے ایک آدھ منٹ کم میں ہی بس اس اسٹاپ پر جا رکی جو ہوٹل سے بہ مشکل نصف فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ محمود بس سے اتر کر تیزی سے ہوٹل کی طرف بڑھا۔

فریحہ ہوٹل کے باہر ہی نظر آگئی۔

''ارے!'' محمود کے منہ سے نکلا۔ ''آپ یہیں کھڑی ہیں؟''

''میں ابھی ہوٹل میں گئی ہی نہیں۔'' فریحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ چابی میں نے آپ سے بے خیالی میں لے لی تھی۔ آپ چابی ہاتھ میں اس طرح رکھیں کہ وہ سب کو نظر آئے۔ خاص طور پر ریسپشن والے دیکھ لیں اور سمجھ جائیں کہ میں تو آپ کے ساتھ آئی ہوں۔ کمرا تو آپ ہی نے لیا ہے۔''

''لیکن...... بعد میں...... رہنا تو آپ ہی کو ہے۔ آپ اکیلی ہی آتی جاتی نظر آئیں گی۔''

''تب لوگ...... میرا مطلب ہے...... ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔'' فریحہ نے کہا۔ پھر بولی۔ ''اچھا اب چلیں گے بھی یا یہیں کھڑے رہیں گے؟''

محمود نے قدم بڑھائے۔ فریحہ نے چابی اسے دے دی تھی۔ ہوٹل کی لابی میں داخل ہوتے ہوئے بھی محمود کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ فریحہ کی یہ منطق اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ ہوٹل کی انتظامیہ کے لوگ اسے اس کے ساتھ ہوٹل میں آتے دیکھیں۔

وہ دونوں ریسپشن کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت فریحہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس ہوٹل کے کمرے بہت اچھے ہیں۔ آپ نے بہت صحیح ہوٹل کا انتخاب کیا ہے۔''

ریسپشن پر موجود چند افراد نے جن میں لڑکیاں بھی تھیں، فریحہ کی ہنسی کی آواز سن کر ان دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

محمود کو خیال آیا کہ فریحہ نے جو بات کہی تھی، اس کے ساتھ ہنسنا قطعی غیر ضروری تھا۔ یہ تو کچھ ایسی بات تھی جیسے فریحہ نے جان بوجھ کر ریسپشن کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہو۔

یہ بات محمود کی زبان پر بھی آگئی جب وہ دونوں لفٹ کے ذریعے دوسری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ لفٹ میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا ورنہ محمود یہ بات نہ چھیڑتا۔

جواب میں فریحہ نے کہا۔ ''آپ ٹھیک سمجھے محمود صاحب......! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ آئندہ جب یہ لوگ مجھے آتے ہوئے دیکھیں تو یہی سمجھیں کہ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''لیکن اس وقت میں ہوٹل میں نہیں ہوں گا۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم ہوگا کہ آپ ہوٹل میں نہیں ہیں۔''

لفٹ دوسری منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ اس کا دروازہ کھلا اور دو افراد لفٹ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے چوتھی منزل کا بٹن دبا دیا۔ لفٹ پھر چل پڑی۔ اب محمود کو چپ رہنا پڑا ورنہ فریحہ کی بات کے جواب میں وہ پھر کچھ کہتا۔ تیسری منزل پر لفٹ رکی تو وہ دونوں باہر نکلے۔

وہ کمرا قریب ہی تھا جو محمود کو ملا تھا۔ اس نے چابی سے دروازے کا لاک کھولا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

''واؤ!'' فریحہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر کمرے کی آرائش دیکھ کر تعریفی انداز میں کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ اس ہوٹل کے کمرے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ دراصل ایک مرتبہ میں یہاں آچکی ہوں۔ انگلینڈ سے میری ایک دوست آئی تھی تو یہیں ٹھہری تھی۔ میں نے وہیں تعلیم حاصل کی ہے نا......! وہاں میری بہت سی دوست ہیں۔''

محمود کو احساس ہوا کہ فریحہ جو سنگین قدم اٹھا چکی تھی، اس کی اسے قطعی پریشانی نہیں تھی۔ اس کا موڈ نہایت خوشگوار تھا، جیسے اس کے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ وہ بستر پر بیٹھ گئی۔

''آپ کرسی لے لیں۔'' وہ بولی۔ ''یہاں قریب کرلیں۔'' اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

محمود نے کرسی بستر کے قریب کرلی اور بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے لیکن پہلے آپ بتائیں کہ آپ مجھ سے کس سلسلے میں مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔''

''پہلے کچھ پی لیا جائے۔ فریج میں یقیناً بہت کچھ ہوگا۔'' فریحہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی اور پھر فریج کی طرف گئی۔ پھلوں کی ایک باسکٹ تو فریج کے اوپر ہی رکھی ہوئی تھی۔ فریحہ نے فریج کھولا۔

''او، واؤ!'' اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہاں تو بہت کچھ ہے۔'' اس نے مشروب کی دو بوتلیں نکالیں۔ اسٹراز کا ایک ڈبا فریج کے اوپر ہی رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بوتل کھولنے کے لیے اوپنر بھی تھا۔ فریحہ نے دو اسٹرا اور اوپنر

بھی اٹھایا۔ پھر وہ لوٹی۔ محمود خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ فریحہ نے قریب آکر سب چیزیں بستر کی سائڈ ٹیبل پر رکھیں، پھر کھڑے کھڑے محمود کی طرف رخ کر کے بولی۔ ''پھل بھی اٹھالاؤں؟''

''میرا تو موڈ نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ کی خواہش ہو تو......''

''نہیں۔'' فریحہ نے اس کی بات کاٹی۔ ''اگر آپ نہیں کھائیں گے تو میں بھی کچھ نہیں لوں گی۔ اچھا اب یہ بوتلیں آپ ہی کھولیں۔''

محمود اپنی کرسی سے اٹھا۔ فریحہ نے مڑ کر بستر پر بیٹھنا چاہا تو اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ اونچی ایڑی کی سینڈل پہنے ہوئے تھی۔ وہ فرش پر ہی گرتی اگر محمود اسے سہارا نہ دیتا۔ فریحہ نے بھی شاید گھبرا کر ہی محمود کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر اس کا دوسرا پیر پھسلا اور وہ بستر پر چت گری۔ محمود چونکہ اس کے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا اس لیے وہ اس کے اوپر گرا۔

''مائی گاڈ!'' فریحہ کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ زور زور سے سانسیں لے رہی تھی۔

''مجھے تو چھوڑیے!'' محمود آہستہ سے بولا۔

فریحہ نے آنکھیں کھولیں۔

''اوہ!'' وہ مسکرائی، پھر اس نے محمود کو چھوڑ دیا۔

محمود جلدی سے کھڑا ہوا۔ فریحہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور سینڈل اتار کر اپنا وہ پاؤں رگڑنے لگی جو مڑ گیا تھا۔

''کیا زیادہ تکلیف ہے؟'' محمود نے پوچھا۔ ''موچ تو نہیں آگئی؟''

''نہیں، معمولی سی تکلیف ہے۔'' فریحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''موچ آجاتی تو میں تڑپ رہی ہوتی۔''

محمود نے اوپنر سے دونوں بوتلیں کھولیں۔ ٹشو سے بوتلوں کا اوپری حصہ صاف کیا، پھر اسٹرا ڈال کر ایک بوتل فریحہ کی طرف بڑھائی۔ دوسری بوتل میں اسٹرا ڈال کر اپنے ہاتھ میں لیے کرسی پر بیٹھ گیا۔

محمود کے لیے یہ ایک چھوٹا سا حادثہ تھا۔ عام حالات میں اگر ایسا ہوتا تو فریحہ کا جسمانی لمس اس کے جسم میں سنسناہٹ پیدا کر دیتا۔

فریحہ نے اب اپنی وہ ٹانگ بھی لٹکالی تھی جس کا پیر سہلایا تھا۔ وہ ذرا بھی جھینپی ہوئی نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے اس کا بالکل خیال نہیں تھا کہ وہ ذرا دیر کے لیے ایک اعتبار سے ایک مرد کی آغوش میں رہی تھی۔

''پہلے آپ بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ بولی۔

''وہی بات جو پہلے بھی آپ سے سرسری طور پر تو ہو ہی چکی ہے۔'' محمود نے کہا۔ ''مرد کی بات اور ہوتی ہے۔ اگر کوئی غیر شادی شدہ لڑکی اپنا...... میرا مطلب ہے اپنے والد کا گھر چھوڑ دے تو خطرہ رہتا ہے۔ اخبار والوں کے کان میں بھنک بھی پڑ جائے تو اسکینڈل بنا دیتے ہیں۔ ٹی وی چینلز تو اور زیادہ آگ لگاتے ہیں۔ لڑکی کے لیے اپنی صفائی پیش کرنا ممکن نہیں رہ جاتا۔''

''میڈیا کو معلوم ہی نہیں ہو سکے گا۔ ڈیڈی اس معاملے میں کسی سے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔''

''انہوں نے سیل فون پر آپ سے رابطہ نہیں کیا؟''

''دو مرتبہ کیا لیکن میں نے کال ریسیو نہیں کی۔ پھر دو اجنبی نمبروں سے بھی کالیں آئیں۔ میں نے وہ بھی ریسیو نہیں کیں۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی ڈیڈی ہی نے کی ہوں گی۔'' فریحہ نے وضاحت سے جواب دیا، پھر بولی۔ ''آپ تو بوتل ہاتھ میں لے کر بیٹھ گئے۔ پئیں تو!'' پھر اس نے اسٹرا منہ میں لے کر ایک لمبا سپ لیا۔

محمود ایک سپ لے کر بولا۔ ''آپ کو ان سے بات تو کرنا چاہیے تھی۔ آخر آپ کو ڈر کس بات کا ہے؟''

''ڈیڈی نے جب آپ کے سلسلے میں میری بات نہیں سنی جو بہت معمولی سی بات ہے تو پھر وہ ایک ایسی بات بھی نہ مانیں گے جو میرے لیے میری زندگی کی طرح اہم ہے۔''

''ایسی کیا بات ہے؟''

''آپ پیتے تو رہیں۔ بس باتیں کرتے رہیں گے کیا؟ باتیں کرنے کے لیے وقت پڑا ہے۔''

''پی تو رہا ہوں۔'' اس مرتبہ محمود نے بھی ایک لمبا سپ لیا۔

''یہ اورنج جوس ہے جس سے بھوک کھل جاتی ہے۔ جلدی سے ختم کریں۔ پھر کھانا یہیں...... کمرے ہی میں منگالیں گے۔''

محمود ایک اور سپ لے کر بولا۔ ''ہلکی سی کڑواہٹ محسوس کر رہا ہوں میں۔''

''بیجوں کی ہلکی سی کڑواہٹ تو ہوتی ہی ہے اورنج جوس میں۔'' فریحہ نے جواب دیا، پھر بولی۔ ''ہاں تو کیا پوچھا تھا ابھی آپ نے؟''

''ایسی کون سی بات ہے آپ کی جو آپ فرمان صاحب سے ہر قیمت پر منوانا چاہتی ہیں۔''

''اسی بارے میں تو میں بھی بات کرنا چاہتی ہوں

آپ سے۔'' فریحہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''لیکن پہلے آپ بوتل ختم کرلیں۔'' وہ خود اپنی بوتل آدھی سے زیادہ خالی کر چکی تھی۔

''اچھا!'' محمود دھیرے سے ہنسا۔ ''اگر بات کرنے کی یہی شرط ہے تو فوراً ختم کیے دیتا ہوں۔'' اس نے اسٹرا نکالی اور بوتل منہ سے لگا کر غٹاغٹ پی گیا۔

دوسری طرف فریحہ نے بھی اپنی بوتل خالی کر دی۔ خالی بوتلیں سائڈ ٹیبل پر رکھ دی گئیں۔

''ہوں؟'' محمود نے سوالیہ نظروں سے فریحہ کی طرف دیکھا۔

''میرا معاملہ کچھ یہ ہے کہ میں......'' فریحہ ذرا سا رکی۔ پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''میں اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''اوہ!'' محمود کے منہ سے نکلا، پھر کچھ رک کر اس نے پوچھا۔ ''کیا اس میں فرمان صاحب رکاوٹ بنیں گے؟ جہاں تک میرے علم میں ہے، آپ کی سوسائٹی میں زیادہ تر شادیاں لڑکیوں ہی کی مرضی سے ہوتی ہیں، والدین اس سلسلے میں اپنی لڑکیوں پر دباؤ نہیں ڈالتے۔''

''لیکن مجھ پر ڈالا جائے گا۔''

''کیوں؟''

''اسٹیٹس۔'' فریحہ نے منہ بنایا۔

''کیا مطلب؟''

''اس لڑکے کا اسٹیٹس وہ نہیں ہے جو ڈیڈی کا ہے۔''

''کیا اسٹیٹس ہے لڑکے کا جسے آپ پسند کرتی ہیں۔''

''ملازمت پیشہ سمجھ لیں۔'' فریحہ نے جواب دیا۔ پھر بستر سے اٹھ کر محمود کی کرسی کے قریب آئی اور پھر کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر محمود کی گردن میں بازو ڈالتے ہوئے بولی۔ ''کچھ عرصے پہلے تک تو وہ ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اپنی بنائی ہوئی پینٹنگز بیچا کرتا تھا۔''

یک لخت محمود کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ شل ہو کر رہ گیا ہو۔ فریحہ کا یہ اشارہ صریحاً اسی کی طرف تھا۔ اس نے اپنی تعلیم اسی طرح مکمل کی تھی کہ اپنی پینٹنگز فٹ پاتھ پر بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔

''ہاں محمود!'' فریحہ نے جھک کر اپنا گال محمود کے گال سے لگا دیا۔ ''میں تم سے ہی محبت کرتی ہوں۔ تمہی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

اس پل محمود نے یوں محسوس کیا جیسے اس کا دماغ شل ہو گیا ہو۔ وہ سب کچھ اس کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ یہ ہوا کیا ہے۔

''میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا نا!'' فریحہ پھر بولی۔ ''بس وہی ایک لمحہ تھا جب تم میرے دل میں سما گئے تھے۔''

پھر اس وقت محمود کو جیسے الیکٹرک شاک لگ گیا جب فریحہ نے اپنے لب اس کے گالوں پر رکھے۔ وہ جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ وہ لکنت آمیز لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ...... یہ آپ...... کیا...... کیا کہہ رہی ہیں...... فریحہ!''

''پلیز محمود!...... اب مجھے تم کہہ کر مخاطب کرو۔ یہ آپ واپ کا تکلف بہت عرصے چل گیا۔'' فریحہ تیزی سے اس کے سامنے آگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ اس طرح آگے بڑھائے جیسے محمود کو اپنے بازوؤں میں بھر لینا چاہتی ہو۔ محمود نے جلدی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اس پر ہیجان سا طاری ہو گیا تھا۔

''یہ آپ...... کیا کر رہی ہیں فریحہ؟'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''میں تم میں سما جانا چاہتی ہوں محمود!'' فریحہ کی آواز ایسی تھی جیسے اس پر دیوانگی طاری ہو گئی ہو۔ اس نے اس طرح آگے بڑھنا چاہا جیسے محمود کے سینے سے لگ جانا چاہتی ہو، محمود نے فوراً اس کے ہاتھ چھوڑ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ ایک پل کو تو اس نے چاہا تھا کہ فریحہ کو زور سے دھکا دیدے لیکن پھر اس نے بس اتنا زور لگایا کہ فریحہ اس کے بالکل قریب نہ آسکے۔

''یہ نہ کیجیے...... فریحہ......! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔''

''عزت نہیں، محبت......! میں تمہاری محبت چاہتی ہوں محمود!'' فریحہ یکایک روہانسی نظر آنے لگی۔ ''بہت عرصے تک چاہتی رہی کہ تم میری طرف راغب ہو سکو۔ جب یہ نہیں ہو سکا اور اب تم نے استعفیٰ بھی دے دیا تو میں نے سوچا کہ تم سے تنہائی میں ملوں اور اپنا دل چیر کر تمہارے سامنے رکھ دوں۔ میں صرف تمہاری خاطر اپنا گھر بھی چھوڑ چکی ہوں۔ تمہیں حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ قربانی بھی دے دی۔'' آخر میں فریحہ کی آواز رندھ گئی اور آنکھیں بھر آئیں۔ اب وہ محمود کے قریب ہونے کے لیے زور بھی نہیں لگا رہی تھی۔

''تم نے گھر چھوڑ کر اچھا نہیں کیا فریحہ!'' محمود نے اس کے شانوں پر دباؤ کم کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''پہلے تمہیں صحیح طور پر اندازہ لگا لینا چاہیے تھا کہ تمہاری یہ قربانی رائگاں تو نہیں جائے گی۔''

"کیوں جائے گی رائگاں!" فریحہ کی آنکھوں سے دو آنسو ڈھلک گئے۔ "تم مجھے محبت کیوں نہیں دے سکتے؟"

"محبت کوئی گل دان، ایش ٹرے یا ایسی ہی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی کو دی جا سکے یا لی جا سکے۔ محبت تو ایک غیر مرئی پھول ہے جو دل میں خود بہ خود نمو پا جاتا ہے۔"

"میرے دل میں بھی اس پھول نے از خود نمو پائی ہے۔"

"لیکن میرے دل میں کھلا ہوا پھول کسی اور کی امانت ہے۔"

فریحہ کے چہرے پر ایسا تاثر ابھرا جیسے وہ چونکی ہو، یا اسے کچھ یاد آیا ہو۔ وہ بولی۔ "وہ لڑکی...... کیا نام تھا اس کا...... ہاں!...... مدیحہ......! تم اس کے ساتھ رات کے وقت ایک باغ کے کنج میں تھے جب پولیس کانسٹیبل نے تمہیں پکڑ لیا تھا اور تم دونوں کو پولیس اسٹیشن لے گیا تھا۔ تم اس لڑکی کے ساتھ وہاں کیوں تھے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ جوانی میں یہ تقاضے تو فطری ہوتے ہیں لیکن......"

"غلط خیال نہ لاؤ دماغ میں!" محمود لاشعوری طور پر بھول چکا تھا کہ فریحہ سے اس کا انداز تخاطب بے تکلفانہ نہیں ہونا چاہیے۔ "تم کو بتایا تھا میں نے کہ وہ میری چچا زاد بہن ہے۔"

"سگی بہن تو نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ......"

"فریحہ!" محمود چیخ پڑا۔ "میرے اور مدیحہ کے بارے میں تم ایسی باتیں نہ کرو۔" ساتھ ہی اس نے جھٹکے کے ساتھ اپنے ہاتھ فریحہ کے شانے سے ہٹائے اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"محمود!" فریحہ اس کی طرف لپکی۔

محمود نہیں رکا لیکن دروازہ بھی نہیں کھول سکا۔ فریحہ فرش پر گر کر اس کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

"مجھے اس طرح ٹھکرا کے نہ جاؤ محمود!" وہ سسکنے لگی تھی۔ "اگر...... اگر کوئی لڑکی...... تم سے محبت نہ کرتی...... لیکن...... تم اسے چاہتے...... اور وہ تم سے یہ برتاؤ کرتی تو تمہارے دل پر...... کیا گزرتی!" اس نے محمود کا پیر ٹخنوں کے پاس سے پکڑ رکھا تھا۔

محمود نے بے بسی سے سر جھکا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو محمود کے جوتے اور پینٹ کے پائنچے پر گر رہے تھے۔ وہ محمود کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔

محمود کی جھنجلاہٹ اور جو تھوڑا بہت غصہ تھا۔ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے جھک کر فریحہ کے شانے پکڑے اور نرم لہجے میں بولا۔ "یہ کیا کرنے لگیں تم!...... اٹھو!"

فریحہ فرش پر اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ اسے کھڑا کرنے میں محمود کو تھوڑا بہت سہارا دینا ہی پڑا تھا۔ پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بستر کی طرف لے گیا۔ اسے بستر پر بٹھا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"آنسو خشک کروا پنے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

فریحہ نے اپنے دونوں بازوؤں کی آستینوں ہی سے اپنی آنکھیں خشک کیں اور مغموم نظروں سے محمود کی طرف دیکھنے لگی۔

"چلو میں مان لیتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی ہے لیکن محبت کبھی خود غرض نہیں ہوتی۔ محبت میں تو قربانی کا جذبہ ہوتا ہے۔ اگر مجھے کسی ایسی لڑکی سے محبت ہو جاتی تو جو کسی اور سے محبت کرتی ہو تو میں اپنی محبت اس کی محبت پر قربانی کر دیتا۔"

"ہر انسان تمہاری طرح نہیں سوچ سکتا۔" فریحہ کا لہجہ مرجھایا ہوا سا تھا۔

محمود بولا۔ "انسان ہی تو اس طرح سوچ سکتا ہے، دیکھو فریحہ! مجھے مدیحہ سے اور مدیحہ کو مجھ سے محبت ہے لیکن جس روز ہم دونوں ایک باغ میں ملے تھے، یقین کرو کہ لگ بھگ دو سال بعد ملے تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ میری چچا زاد ہے لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ ہمارے گھروں کے بیچ میں خلیج پڑ گئی تھی۔ میں بہ وجوہ مدیحہ کے گھر نہیں جا سکتا تھا لیکن چھپ چھپ کر ملنا بھی میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا، باغ میں ہم کسی مجبوری کے تحت ملے تھے۔ مدیحہ مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ملاقات ضروری ہے تاکہ وہ مجھے کسی خاص صورت حال سے آگاہ کر سکے لیکن ہمیں باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ ایک پولیس مین نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم وہاں بالکل نیک نیتی سے ملے تھے۔ میرا مطلب ہے، وہ بات نہیں تھی جو تم نے سمجھی ہے۔ یہ سراسر غلط فہمی ہے تمہاری...... ویسی کوئی بات نہیں تھی۔"

فریحہ فوراً کچھ نہیں بولی۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ اس نے محمود کا ہاتھ اب بھی پکڑ رکھا تھا۔ محمود نے آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن فریحہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"نہیں محمود!" وہ جھرجھراتی سی آواز میں بولی۔ "ایسے نہیں جاؤ گے تم۔ کوئی فیصلہ تو کرنا ہوگا۔"

"کیسا فیصلہ؟" محمود کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"میری زندگی کا فیصلہ؟"

"کیا مطلب؟"

"میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کیوں، موت سے مجھے ڈر لگتا ہے، ورنہ میں خودکشی کر لیتی۔ اگر تم نے مجھے ٹھکرا دیا تو میں یہ شہر، یا شاید ملک ہی چھوڑ کر چلی جاؤں۔"

"یہ ایک اور بڑی غلطی ہوگی۔ زمانہ بہت خراب ہو چکا ہے فریحہ!...... ممکن ہے کہ تم بُرے لوگوں میں پھنس کر جرائم کی دنیا میں چلی جاؤ، یا وہ لوگ تمہیں کسی قحبہ خانے کی زینت بنا دیں۔"

"کچھ بھی ہو، کیا فرق پڑ جائے گا۔ تمہارے بغیر میں خود کو ایک زندہ لاش ہی تصور کروں گی اور لاش کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے، لاش کو اس کا علم نہیں ہوتا ہوگا۔" فریحہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں پھر آنسو ڈگمگانے لگے۔

محمود نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ "میرا دماغ ناکارہ بنا دیا ہے تم نے! آخر میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔"

"جب تم نے مجھ سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تھی، میں کچھ سوچنے لگی تھی۔ ایک خیال آنے لگا تھا میرے ذہن میں!"

"وہ کیا؟"

"مدیحہ سے تم بہت محبت کرتے ہو؟"

"بے انتہا۔"

"تو اس سے شادی بھی کرو گے؟"

"ظاہر ہے؟"

"مجھے اس سے تمہاری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تمہاری بات واضح ہو جانے کے باوجود مبہم ہے۔"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو مجھے مدیحہ سے تمہاری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"میں اس طرح مدیحہ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"محمود!" فریحہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہوں کہ تم ایک ہفتے میں چھ دن مدیحہ کے ساتھ گزارنا، مجھے ہفتے میں صرف ایک دن دے دیا کرنا۔"

"نہیں فریحہ، نہیں! مدیحہ اسے کبھی برداشت نہیں کرے گی۔"

"اسے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں اسے اس حد تک بھی دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"اچھا!" فریحہ نے اپنی آنکھیں خشک کیں اور یکایک اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ "تو پھر میں آج ہی یہ شہر چھوڑ دوں گی۔ تمہیں اندازہ ہے کہ میں اس وقت ٹیکسی میں کیوں تھی؟ وہ کار کہاں گئی جس میں تم کو بھی یہاں لائی تھی؟"

"میں کیا اندازہ لگا سکتا ہوں؟"

"وہ کار میری ایک دوست کی تھی۔ وہ میں واپس اسے دے کر ٹیکسی میں آئی تھی۔ اپنی کار میں گھر پر ہی چھوڑ آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کار کی وجہ سے ڈیڈی کو میرا سراغ مل جائے۔ یہ ہوٹل بھی میں نے اپنے نام سے اسی لیے نہیں لیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ اب میرا سراغ کسی کو بھی ملے۔ مجھے شک ہے کہ یہاں سے جاتے ہی تم ڈیڈی کو اطلاع دے دو گے کہ میں یہاں ہوں، اس لیے تمہارے جاتے ہی میں یہ ہوٹل چھوڑ کر فوری طور پر اس شہر سے بھی چلی جاؤں گی۔ یہ فیصلہ کرنے میں مجھے ایک آدھ دن تو لگے گا کہ میں یہ ملک چھوڑ کر کہاں جاؤں۔" فریحہ کا پتھرایا ہوا چہرہ ڈھیلا پڑ گیا۔ وہ اداس نظر آنے لگی۔ اس نے کہا۔ "اس کے بعد میرا جو بھی حشر ہو، مجھے قدرت کسی قحبہ خانے میں دھکیل دے یا کہیں اور......! اگر تم نہیں تو پھر میرے لیے کچھ نہیں۔" اس کے لہجے میں خوف ناک سی مضبوطی تھی۔

محمود کا ایک ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ محمود اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ فریحہ اس سے محبت کرتی تھی اور اتنی شدید محبت کہ ناکامی کی صورت میں خود کو تباہ کر لینے پر تلی ہوئی تھی۔ محمود نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے کسی لڑکی کی زندگی تباہ ہو لیکن وہ مدیحہ کو بھی دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس صورت حال کی وجہ سے اس کی عقل ناکارہ ہونے لگی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

"جاؤ!" فریحہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور مغموم لہجے میں بولی۔ "ہو جانے دو مجھے تباہ و برباد!"

"میرے جاتے ہی تم یہ ہوٹل چھوڑ دو گی؟"

"ہاں، میں یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتی کہ تم ڈیڈی کو میرے بارے میں اطلاع دے دو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ فرمان صاحب کو اطلاع نہیں دوں گا۔"

"اگر میں تمہارے وعدے پر یقین کر بھی لوں تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ میں اس ہوٹل میں پڑے پڑے کیا

کروں گی۔"

"انتظار کرنا میرا!"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"میں کچھ سوچوں گا۔"

"میرے بارے میں؟" فریحہ کا چہرہ کھل اٹھا۔

محمود نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا لیکن اس وقت تک وہ یہ نہیں سوچ سکا تھا کہ فریحہ کے بارے میں کیا سوچے گا۔ وہ مدیحہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور اسے دھوکا دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... ڈھائی سال بعد اس کی زندگی پھر ایک دوراہے پر تھی۔

***

ڈھائی سال پہلے!......

میٹرک کا آخری پرچا دینے کے بعد مدیحہ اطمینان کا سانس ضرور لیتی مگر چند ماہ سے اس کے گھریلو حالات ایسے ہوگئے تھے کہ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے سکون کا سانس لینا اب اس کے مقدر میں رہا ہی نہیں۔

چند ماہ قبل اس کے گھر میں ڈاکا پڑا تھا۔ اس کے باپ نے بہ مشکل ہی اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کے لیے جو کچھ جمع کیا تھا، وہ اس ڈاکے میں جاتا رہا تھا اور اس کے والد اس صدمے سے بیمار پڑ گئے تھے کہ اب ان کی بیٹیوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازم تھے۔ طویل علالت کے باعث وہ ملازمت بھی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد گھر کے حالات اور ناسازگار ہوتے چلے گئے۔ ڈاکے میں تو جہیز ختم ہوا تھا، اس کے بعد بینک میں جمع شدہ وہ رقم بھی ختم ہوتی چلی گئی جو رضا علی نے بیٹیوں کی شادی کے لیے پس انداز کی تھی۔

اس گھر کا تعلق نہایت متوسط درجے سے تھا جہاں خواتین کا پردہ کرنا بھی لازمی تھا۔ بڑی بہن صفیہ کالج جاتے ہوئے اور مدیحہ اسکول جاتے ہوئے برقع پہنا کرتی تھیں۔ ان دونوں کی والدہ بھی برقع اوڑھے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھتی تھیں۔ خاندان بھر میں ان کی شہرت "آپا بیگم" کے نام سے تھی۔ مدیحہ اور صفیہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ خاندان میں ان کی ماں کے اس نام کا سبب کیا تھا۔ ویسے وہ خود بھی اپنی ماں کو آپا بیگم ہی کہتی تھیں۔

ان کا خاندان زیادہ بڑا تو نہیں لیکن بہت چھوٹا بھی نہیں تھا۔ ڈاکا زنی اور رضا علی کی علالت کے بعد خاندان کے لوگوں کی آمد و رفت بھی کم ہوتی چلی گئی، جیسے روشنی کم ہوتی ہے تو سایہ بھی مدھم پڑتا چلا جاتا ہے۔

"یہی ہوتا چلا آیا ہے دنیا میں۔" ایک مرتبہ رضا علی نے بسترِ علالت پر ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا۔ "مجھے تو اب یہ ڈر لگ گیا ہے کہ ہم کسی وقت ان سے کسی مدد کے طالب نہ ہو جائیں۔"

اس موقع پر صفیہ نے کہا تھا۔ "بی اے کرنے کے بعد میں کوئی ملازمت کرلوں گی تو حالات ٹھیک ہو جائیں گے بابا!"

آپا بیگم اس وقت صفیہ کا منہ دیکھتی رہ گئی تھیں کیونکہ خاندان میں کسی لڑکی یا عورت کا ملازمت کرنا بھی ناپسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ملازمت کرنے یا نہ کرنے کے فیصلے کی نوبت آنے سے پہلے ہی یہ گھر ایک اور سانحے سے دوچار ہوگیا۔

صفیہ کی منگنی تین سال قبل رضا علی کے چھوٹے بھائی ہاشم علی کے بڑے بیٹے مسعود ہاشم سے ہو چکی تھی مگر اچانک کچھ ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ مسعود ہاشم کے لیے کوئی لڑکی تلاش کی جا رہی ہے۔ رضا علی نے چھوٹے بھائی کو بلوایا۔ وہ اس بارے میں بات کرنا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں افواہ تھی۔ لیکن وہ افواہ نہیں تھی۔ اس موقع پر منگنی توڑنے کا اعلان سامنے آگیا۔ رضا علی یہ صدمہ برداشت نہیں کرسکے اور ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ خاندان کے لوگ اس موقع پر جمع تو ہوئے لیکن بعد میں ان کی آمد و رفت پھر کم ہوتی چلی گئی۔

رضا علی کی تدفین تک آپا بیگم بہت روئی تھیں لیکن پھر ان کی آنکھیں جیسے خشک ہو کر رہ گئیں۔ انہیں پھر کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ہر وقت گم صم رہنے لگی تھیں۔

رضا علی کے چہلم پر خاندان کے کچھ لوگ آئے اور کچھ کسی نہ کسی بہانے سے ٹال گئے لیکن آپا بیگم کی زبان پر حرفِ شکایت نہیں آیا۔

گھر کے مالی حالات اب ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ بینک میں دمڑی بھی نہیں بچی تھی اور گھر کا ایک آدھ ایک آدھ سامان بکنے کی نوبت آچکی تھی۔ مدیحہ اور صفیہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے آس پاس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگی تھیں۔ یہ سلسلہ انہوں نے اسی وقت شروع کر دیا تھا جب رضا علی بیمار پڑے اور ان کی ملازمت چھوٹ گئی تھی۔

چہلم کے تیسرے دن مدیحہ نے دیکھا کہ آپا بیگم اسی دن کے اخبار کے ایک صفحے پر نشانات لگا رہی تھیں۔

"یہ کیا کر رہی ہیں آپا بیگم؟" مدیحہ نے نہ صرف پوچھا بلکہ جھک کر اخبار کا وہ صفحہ بھی دیکھنے لگی۔

"کئی اداروں میں ملازموں کی ضرورت ہے۔" آپا بیگم نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ "تین جگہ نشان لگائے ہیں میں نے......! یہاں درخواست دوں گی۔"

مدیحہ ان کا منہ تکتی رہ گئی، پھر بولی۔ "خاندان والے......"

آپا بیگم نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "جہنم میں گئے خاندان والے......! اب کبھی ان کا ذکر مت کرنا میرے سامنے!"

"بغاوت۔" مدیحہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا تھا۔

"یہی سمجھ لو۔"

"تو پھر یہ کام مجھ پر چھوڑیے......" یکایک صفیہ بول پڑی۔ "میں نے تو بہت پہلے کہا تھا کہ میں بی اے کرلوں تو کوئی ملازمت تلاش کرلوں گی۔"

"ابھی کئی مہینے باقی ہیں تمہارے امتحانات شروع ہونے میں......! پھر نتیجے کا بھی انتظار کرنا ہوگا اس وقت تک تو بیچنے کے لیے گھر میں ایک چیز بھی باقی نہیں بچے گی۔"

اس رات مدیحہ نے سیل فون پر محمود سے رابطہ کیا۔

محمود، ہاشم علی کے چھوٹے بیٹے کا نام تھا۔ وہ مسعود سے دو تین سال چھوٹا تھا۔ اس نے اپنے والد سے کچھ اختلافات کیے تھے جس کے باعث باپ نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس وقت وہ تھرڈ ایئر کا طالب علم تھا۔ اس وقت مدیحہ نے آٹھویں کلاس پاس کرنے کے بعد نویں کلاس میں قدم رکھا تھا۔ وہ آٹھویں ہی میں تھی جب وہ محمود کو اور محمود اسے پسند کرنے لگا تھا۔

اس وقت دونوں گھروں میں آمد و رفت تھی لیکن جب سے محمود کو گھر سے الگ کیا گیا تھا۔ ان دونوں کے رابطے صرف سیل فون تک محدود رہ گئے تھے۔ اگر محمود، مدیحہ کے گھر آتا تو بات کسی نہ کسی طرح ہاشم علی تک پہنچ جاتی جس سے دونوں گھروں کے تعلقات متاثر ہوتے۔ اسی خدشے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رضا علی، محمود کو سمجھا بجھا دیتے مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ خود محمود نے ہی آنا چھوڑ دیا۔

"اگر میں تمہارے گھر آؤں گا تو دونوں گھروں کے معاملات خراب ہو جائیں گے مدیحہ!" محمود نے ایک مرتبہ سیل فون پر ہی مدیحہ سے کہا تھا۔ "اس کا اثر بھائی جان اور آپا کی منگنی پر بھی پڑ سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ میری طرح تم بھی نہیں چاہو گی کہ ایسا ہو۔"

لیکن محمود کی یہ احتیاط کام نہیں آسکی تھی۔ کچھ اور وجوہات سے وہ منگنی ٹوٹ ہی گئی تھی۔

پھر اب تو خاندان میں مزید اتھل پتھل کا امکان پیدا ہوگیا تھا کیونکہ آپا بیگم ملازمت کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

مدیحہ نے سیل فون پر محمود کو اسی بارے میں بتایا۔

جواب میں محمود نے کہا تھا۔ "آپا بیگم اس فیصلے کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں...... جب خاندان والوں نے یہ نہیں پوچھا کہ بڑے ابا کے انتقال کے بعد تم لوگوں پر کیا گزر رہی ہے تو اب ان لوگوں کو آپا بیگم کے اس فیصلے پر اعتراض کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔"

"لیکن بات شاید بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔"

"نہ بڑھنے سے بھی تم لوگوں کو کیا فائدہ ہے، اور بڑھ جانے سے تمہیں کیا نقصان ہوسکتا ہے؟" محمود نے کہا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کاش میں تمہارے گھریلو معاملات میں کچھ تعاون کرسکتا۔ میں بہت مشکلات سے گزر رہا ہوں مدیحہ!"

"لیکن مجھے تم کچھ نہیں بتاتے...... آخر کیا کر رہے ہو تم، کہاں رہ رہے ہو اور تم نے آخر اپنا تعلیمی سلسلہ کیسے جاری رکھا ہے؟"

"وقت آنے پر سب جان لو گی، ابھی تو انتظار ہی کرنا ہوگا تمہیں۔ میں بہت پُراعتماد ہوں...... میرا مستقبل بہت سوں کے لیے قابلِ رشک ہوگا۔ ابا خود چاہیں گے کہ میں گھر لوٹ آؤں اور میں لوٹ بھی آؤں گا۔ مجھے کسی سے کوئی پرخاش نہیں ہے۔ امی تو مجھے بہت یاد کرتی ہوں گی اور میں بھی......" محمود ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

"محمود!" مدیحہ کی آواز بھرا گئی۔ "ہم دونوں کا کیا ہوگا؟"

"جو کچھ بھی ہوگا، بہتر ہی ہوگا! میں تو پُرامید ہوں۔"

"کتنے دن سے تمہیں دیکھا بھی نہیں!"

"مجبوری ہے...... یہ مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ ہم چھپ چھپ کر پارکوں یا ہوٹلوں وغیرہ میں ملتے پھریں۔" پھر محمود شاید اس لیے ہنسا کہ مدیحہ کی ڈھارس بندھا سکے، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اپنا تو یہ حال ہے کہ...... دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار، جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی...... بس! فی الحال تم بھی اسی پر عمل کیا کرو۔"

مدیحہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر رہ گئی......

پھر ایک ہفتے بعد ہی جیسے طوفان آگیا۔ آپا بیگم جب ایک انٹرویو کے لیے روانہ ہوئیں تو نہ صرف بے پردہ تھیں بلکہ انہوں نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا تھا۔ اس وقت ان کی

عمر بیالیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ نقش و نگار بھی اچھے تھے۔ ہلکے سے میک اپ ہی نے بہت زیادہ نکھار دیا۔ وہ خاصی پرکشش خاتون نظر آنے لگی تھیں۔

گھر کے قریب ہی کوئی دور دراز کے ایک عزیز بھی رہتے تھے جنہوں نے آپا بیگم کو اس طرح گھر سے نکلتے دیکھ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بات سارے خاندان میں پھیل گئی۔ پھر چند دن بعد ہی سارے خاندان نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ آپا بیگم جو انٹرویو دے کر آئی تھیں، اسی دن وہاں سے ان کا اپائنٹمنٹ لیٹر بھی آ گیا تھا۔

خاندان والوں نے خاصا ہنگامہ کیا لیکن آپا بیگم ٹس سے مس نہ ہوئیں......

"کل سے میں ملازمت پر جانا شروع کروں گی۔" آپا بیگم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "اپائنٹمنٹ لیٹر آج مل گیا ہے مجھے!"

نتیجہ یہ کہ خاندان والوں نے ان کے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا.... یعنی اب نہ تو خاندان کا کوئی فرد ان کے گھر آتا، اور نہ ان تینوں ماں بیٹیوں میں سے کوئی خاندان میں کسی کے گھر جاتا۔

"یہ میرے لیے اطمینان بخش فیصلہ ہے۔" آپا بیگم نے سکون سے خاندان والوں سے کہا۔ "صفیہ کے ابا کے بعد جو تھوڑا بہت میل جول رہ گیا تھا، وہ میرے لیے سکون بخش تھا بھی نہیں۔ آپ لوگوں کے چبھتے ہوئے فقرے میرے دل پر نشتر لگاتے رہتے تھے۔ اب مجھے ان سے نجات مل جائے گی۔"

اس جواب کے بعد خاندان والے نہایت بھنائے ہوئے انداز میں رخصت ہو گئے تھے۔

آپا بیگم گریجویٹ تھیں۔ خاندانی ریت رواج کے باعث وہ پہلے کبھی ملازمت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکی تھیں اور خود رضا علی بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں وہ ملازمت کریں لیکن اب صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔

✽✽✽

گھر سے نکلنے کے بعد محمود کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ایک سائبان اسے اس طرح میسر آیا کہ ایک پرانے دوست نے جو شادی شدہ بھی تھا، اسے اپنے گھر کا ایک کمرا دے دیا۔ یہ آسانی حاصل ہونے کے بعد اس نے پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے دوست پر بار بننا نہایت غلط سمجھا۔

مصوری کا شوق اسے بچپن ہی سے تھا لیکن وہ اس سلسلے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا کہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا۔ پھر بھی صرف شوق ہی کی وجہ سے اچھی خاصی تصاویر بنانے لگا تھا۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے پاس کپڑوں کے ایک سوٹ کیس کے علاوہ کچھ کینوس بھی تھے جن پر اس نے آئل پینٹ سے کچھ پینٹنگز بنائی تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اس نے وہ پینٹنگز اپنے ساتھ کیوں لے لی تھیں لیکن دوست کے گھر میں پہلی ہی رات کو اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ خیال بھی اس لیے آیا کہ وہ صدر کی ایک معروف اسٹریٹ پر دو تین افراد کو اس قسم کی پینٹنگز کا "ٹھیا" لگائے دیکھ چکا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کی بنائی ہوئی تصاویر صدر کی فٹ پاتھ پر بکنے والی تصاویر سے کم درجے کی نہیں تھیں۔

محمود نے اپنے دوست سے ہی کچھ قرض لے کر اپنی پینٹنگز کے کینوس، فریم کرائے اور فریم بنتے ہی صدر کی اس فٹ پاتھ پر جا بیٹھا جہاں مختلف لوگ پینٹنگز کے علاوہ چرمی سامان، البم، چشمے اور کچھ دیگر چیزیں بیچا کرتے تھے۔

پہلے ہی دن یہ بھی اس کے علم میں آ گیا کہ وہاں "ٹھیا" لگانے کے لیے علاقے کی پولیس کو روزانہ کی بنیاد پر کچھ دینا لازمی تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس دکاندار کی اجازت بھی ضروری تھی جس کے باہر "ٹھیا" لگایا جاتا۔ مگر اس کے لیے یہ بات مشکل اس لیے نہیں ثابت ہوئی کہ دکان دار بے حد شریف آدمی تھا۔ وہ یہ جان کر بہت متاثر ہوا کہ محمود اس طرح اپنے تعلیمی اخراجات نکالنا چاہتا ہے۔

پہلے ہی دن محمود کی دو پینٹنگز اچھی خاصی قیمت میں بک گئیں۔ محمود نے اس رقم سے رنگ اور برش وغیرہ خریدے اور اسی کمرے کو اپنا اسٹوڈیو بنا لیا جو سر چھپانے کے لیے اسے اپنے دوست سے ملا تھا۔ پینٹنگز بیچنے سے اتنی رقم حاصل نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایزل اور کلر پلیٹ جیسی چیزیں بھی خرید سکتا لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ وقتی طور پر اس کے بغیر بھی کام چلا لے گا۔

اور اس نے کام چلا بھی لیا۔ کالج کے اوقات کے علاوہ اس کا باقی دن فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پینٹنگز کے کسی خریدار کے انتظار میں گزرتا تھا لیکن انتظار کا یہ وقت وہ ضائع نہیں ہونے دیتا تھا۔ نصاب کی کتابیں اور ایک کاپی اس کے ساتھ ہوتی تھی لہٰذا اس نے فٹ پاتھ کو ہی اپنا اسٹڈی روم سمجھ لیا تھا۔

تین چار روز تو اس طرح گزرے کہ شام کے بعد اسے اپنا تمام سامان بھی آٹو رکشا میں لاد کے گھر لے جانا

پڑتا تھا اور پھر وہاں سے اسی طرح لانا بھی پڑتا تھا لیکن پھر اس کا یہ خرچ دکاندار کی مہربانی سے کم ہو گیا۔ اس شریف دکاندار نے اسے یہ رعایت بھی دے دی کہ وہ اپنی پینٹنگز اس کی دکان ہی میں رکھ جایا کرے۔

اس طرح محمود کے شب و روز بہت کٹھن گزرتے تھے۔ کالج، کالج کے بعد صدر بازار کی فٹ پاتھ اور پھر گھر پہنچ کے بعد پینٹنگ جس میں وہ رات گئے تک مصروف رہتا تھا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہو پاتی تھی جس کی کسر وہ اتوار کے دن پوری کرتا تھا۔

جب تک وہ اپنے والد کے گھر پر تھا، پینٹنگ کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال پاتا تھا مگر اب مسلسل کام کرنے اور خداداد صلاحیت کی بنا پر اس کا فن خاصا نکھر آیا۔ اس کی پینٹنگز فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے دوسرے پینٹروں کی پینٹنگز سے زیادہ قیمت میں فروخت ہونے لگیں۔ اس طرح وہ اس حد تک آسودہ ہو گیا کہ اس نے پینٹنگ کرنے کے لیے ایزل اور معیاری رنگ بھی خرید لیے۔ پینٹنگز کے لیے خوب صورت فریم بھی بنوا لیا۔

اس کے باوجود محمود دل گرفتہ ہی رہتا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کسی بینک میں ملازم ہو جائے۔

ڈیڑھ سال اسی طرح گزر گیا۔ چھ ماہ بعد وہ بی کام کر لیتا۔ نہ جانے کیوں وہ اس سلسلے میں بہت پُراعتماد تھا کہ بے شمار بے روزگار نوجوانوں کی طرح اسے زیادہ عرصے ٹھوکریں نہیں کھانا پڑیں گی۔

ایک دن فٹ پاتھ پر وہ اپنی پینٹنگز سجائے ایک گدے پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے قریب آن کھڑا ہوا ہے۔ ایسا ہوتا رہتا تھا۔ لوگ پینٹنگز دیکھنے کے لیے رکتے تھے اور پھر آگے بڑھ جاتے تھے اس لیے اس نے اپنا مطالعہ جاری رکھا لیکن اس وقت اسے چونکنا پڑا جب اسے کھنکھناتی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔

"سنیے!"

محمود نے چونک کر سر اٹھایا۔ مخاطب اسی کو کیا گیا تھا اور مخاطب کرنے والی ایک خوب صورت لڑکی تھی جس کی عمر تیئیس چوبیس سال کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ اس کے لباس اور فیشن سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا تھا کہ اس کا تعلق کسی امیر اور الٹرا ماڈرن گھرانے سے ہوگا۔

"جی!" محمود نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "فرمایئے!"

لڑکی نے ایک پینٹنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی قیمت پوچھی۔ محمود نے قیمت بتائی۔ لڑکی نے کسی سودے بازی کے بغیر قیمت ادا کر دی۔ محمود کو اس پر تعجب نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طبقے کے لوگوں کے لیے پیسے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی اور سودے بازی کرنا وہ کسرِ شان سمجھتے ہیں لیکن اسے یہ تعجب ضرور ہوا کہ امیر گھرانے کے لوگ فٹ پاتھ سے کوئی چیز خریدنا اچھا نہیں سمجھتے اور اپنے گھر کی آرائش کے لیے آرٹ گیلریز سے اعلیٰ ترین پینٹنگز خریدنا پسند کرتے ہیں۔

محمود جب وہ پینٹنگ براؤن لفافے میں اچھی طرح پیک کر رہا تھا تو لڑکی نے اس کتاب کی طرف اشارہ کیا جو محمود نے ایک طرف رکھ دی تھی۔

"یہ کامرس کی کتاب ہے نا؟"

"جی، جی ہاں۔" محمود نے جواب دیا۔ "میں بی کام کی تیاری کر رہا ہوں۔ یہ میرا آخری سال ہے۔"

"واؤ!" لڑکی نے مسرت آمیز حیرت کا اظہار کیا۔ "اور یہ تصویریں کون بناتا ہے؟"

"میں خود ہی بناتا ہوں۔ بچپن سے ہی شوق تھا۔ اب ضرورت کے وقت یہ کام بھی آ گیا۔" محمود نے کاغذ میں لپٹا ہوا فریم لڑکی کی طرف بڑھایا تو لڑکی نے پلٹ کر دیکھا۔ دو تین قدم کے فاصلے پر پختہ عمر کا ایک شخص کھڑا تھا۔ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بالکل قریب آ گیا۔

"یہ لے جا کر گاڑی میں رکھو۔" لڑکی نے اس سے کہا۔ "میں آتی ہوں۔"

اس شخص نے فریم محمود کے ہاتھ سے لیا اور جانے لگا۔ محمود کے اندازے کے مطابق وہ اس لڑکی کا شوفر ہو سکتا تھا۔

"بہت خوب!" لڑکی نے محمود کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ شوقین پینٹر نہیں معلوم ہوتے۔ اچھی پینٹنگز ہیں آپ کی...... اور یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ نے فٹ پاتھ پر بیٹھنا بھی گوارا کر لیا۔"

"میں نے اس میں کوئی شرم نہیں محسوس کی۔"

"آپ کی پینٹنگز پر صرف ایم ڈی لکھا ہوا ہے۔ پورا نام نہیں لکھتے آپ؟"

"بس اپنے نام کا پہلا حرف اور آخری حرف لکھتا ہوں۔ میرا نام محمود ہے۔"

"کیا آپ میری تصویر بنا دیں گے؟"

"ضرور!...... کس سائز میں بنوانا چاہتی ہیں آپ؟"

لڑکی نے ایک سائز بتایا اور پوچھا۔ ''کب تک بنا دیں گے۔ میں کل آپ کو اپنے شوفر سے تصویر بھجوا دوں گی اپنی۔''

''دو دن دے دیں آپ مجھے!...... دراصل میں رات کو صرف ڈھائی تین گھنٹے کام کر پاتا ہوں۔''

''آج پیر ہے۔ کل تصویر بھجوا دوں گی۔ جمعے کو کسی وقت آ جاؤں؟''

''جی ہاں۔ اس دن تصویر آپ کو مل جائے گی۔''

''گڈ!...... ٹھیک ہے۔ میں جمعے کو آؤں گی۔ بائی!''

محمود نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔ ''بائی'' اور ''ہائے'' جیسے الفاظ اس کی زبان پر نہیں آتے تھے۔ وہ اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جہاں ایسے مواقع پر ''خدا حافظ'' جیسے الفاظ کہے جاتے تھے۔ اس کے شناساؤں میں بھی ماڈرن سوسائٹی کے لوگ نہیں تھے۔

محمود کو خاصی دیر تک تعجب رہا کہ اس سوسائٹی سے تعلق رکھنے والی لڑکی اس سے اپنی تصویر بنوانا چاہتی تھی۔ ایک اور گاہک کے آ جانے کی وجہ سے وہ اس کیفیت سے باہر نکل آیا۔ پھر اس گاہک کو نمٹانے کے بعد اس نے اپنی کتاب اٹھالی۔

شام کو اس نے اپنا سارا سامان دکان میں رکھا اور گھر روانہ ہو گیا۔ اب اس کی آمدنی اتنی ہونے لگی تھی کہ اس نے ٹیونیشیا لائن میں دو کمروں کا معمولی سا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ گھر کے قریب ہی کے ایک معمولی سے ہوٹل میں کھانا بھی کھا لیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے دوست سے ابتدا میں جو قرض لیا تھا، وہ بھی اتار دیا تھا۔

رات کو وہ ایک ادھوری پینٹنگ پر کام کرتا رہا۔ دو بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب وہ بستر پر لیٹا۔ یہی وہ وقت تھا جب مدیحہ اسے فون کرتی تھی۔

محمود کو خوشی تھی کہ مدیحہ کے گھر کے حالات اب خاصے بہتر ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے گھر بھی تبدیل کر لیا تھا۔ ایک بہتر علاقے میں تین کمروں کا ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ملازمت اب صفیہ نے بھی شروع کر دی تھی۔ اس نے آپا بیگم سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اب وہ اسی وقت شادی کرے گی جب مدیحہ کی شادی کا انتظام بھی ہو جائے گا۔

مدیحہ اب ایف اے کرنے والی تھی۔ بی اے کرنے میں اسے دو سال اور لگتے اس لیے محمود نے صفیہ کے فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔ اس وقت تک صفیہ کی عمر اچھی خاصی زیادہ ہو جاتی۔

اس رات بھی مدیحہ سے محمود نے یہی بات کی۔

جواب میں وہ بولی۔ ''میں بھی اس پر کافی سوچ چکی ہوں محمود!...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ بس جہاں تک پڑھ سکی، وہیں تک پڑھ سکوں گی۔ بس تم بی کام کر کے ملازم ہو جاؤ تو ہم شادی کر لیں گے۔ تم کہہ چکے ہو کہ تمہیں جہیز وہیز کی تمنا نہیں ہے۔''

''یقیناً نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں مدیحہ!''

''تو پھر ہم فوری طور پر شادی کیوں نہ کر لیں!''

''میں پہلے بھی تم کو بتا چکا ہوں کہ میں بہت معمولی مکان میں رہتا ہوں۔ میں اپنی محبوب بیوی کی وہاں نہیں رکھ سکتا۔''

''میں تمہارے ساتھ جھونپڑی میں بھی خوش رہوں گی محمود!'' مدیحہ جذباتی لہجے میں بولی۔

''لیکن میں تمہیں جھونپڑی میں رکھ کر خوش نہیں رہ سکتا۔''

دوسری طرف سے ٹھنڈی سانس لینے کی آواز آئی۔

☗☗☗

منگل، بدھ اور جمعرات کے دن گزر گئے۔ منگل کو فریحہ نے اپنے شوفر کے ذریعے تصویر بھجوا دی تھی۔ اسی رات سے محمود نے اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا لیکن جمعرات کو رات دو بجے تک بھی تصویر مکمل نہیں ہو سکی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ محمود اس تصویر کو زیادہ سے زیادہ خوب صورت بنانا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فریحہ تصویر دیکھ کر زیادہ خوش ہو گئی تو اسے زیادہ معاوضہ بھی مل سکتا ہے۔ اس نے یہ کام شروع ہی اس لیے کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ معاوضہ حاصل ہو سکے۔

تصویر صبح ہونے پر مکمل ہوئی۔ اسے سونے کا موقع بھی نہیں مل سکا۔ فریمنگ اس نے خود کی۔ سامان وہ گزشتہ روز خرید لایا تھا۔

جمعے کو دکانیں تین بجے کے لگ بھگ کھلتی تھیں۔ محمود مقررہ وقت پر پہنچ گیا اور بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کی خواہش تھی کہ فریحہ تصویر لینے کے لیے خود آئے، اپنے شوفر کو نہ بھیج دے۔ وہ فریحہ کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا جو تصویر دیکھ کر اس کے چہرے پر ابھرتے لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ فریحہ کے بجائے شوفر ہی آیا تھا۔

''آج بی بی صاحبہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں اس لیے وہ خود نہیں آسکیں۔'' شوفر نے کہا۔ ''لیکن تصویر وہ آج ہی دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ مکمل تو ہو گئی ہے نا؟''

''ہاں مکمل تو ہو گئی ہے لیکن جب وہ آ نہیں سکیں تو آج کیسے دیکھیں گی؟''

''انہوں نے کہا ہے کہ آپ تصویر لے کر گھر آ جائیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میں آپ کو لے چلوں گا، کار میں۔''

محمود سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھیا، چھوڑنا وہ مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ''میں شام سے پہلے اٹھ نہیں سکتا یہاں سے۔ نہ جانے کب کوئی گاہک آ جائے...... میں شام کو چل سکتا ہوں۔''

شوفر نے جواب سن کر سر ہلایا، پھر جیب سے موبائل نکال کر غالباً فریحہ سے ہی رابطہ کرنے لگا۔ اس کے پاس موبائل ہونا، محمود کے لیے تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پیسے والے لوگ اپنے ملازمین کو بھی سستے قسم کے موبائل دلا دیتے تھے۔

خیال اس کا درست ثابت ہوا جب اس نے شوفر کو کہتے سنا۔ ''بی بی صاحبہ!...... تصویر تو وہ کہہ رہے ہیں کہ مکمل ہے لیکن وہ شام سے پہلے یہاں سے نہیں اٹھ سکتے۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو شوفر نے سر ہلا کر موبائل محمود کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بات کریں۔''

محمود نے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو!''

''محمود صاحب!'' فریحہ کی آواز آئی۔ ''میں تصویر دیکھنے کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

محمود نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

''اچھا!'' فریحہ نے طویل سانس لی۔ ''تو شام کو آجائیں!''

''یہی کہا تھا میں نے آپ کے شوفر سے!''

فریحہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ میری آواز سن کر شاید ابھی آ جائیں۔''

محمود کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ وہ فریحہ کی آواز سن کر اسی وقت جانے کے لیے کیسے تیار ہو سکتا تھا۔

''میں شام کو ہی آسکوں گا۔'' محمود نے کہا، پھر اس نے اخلاقاً پوچھا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹمپریچر ہو گیا ہے معمولی سا!...... میں نے سوچا تھا کہ اگر آرام نہ کیا تو طبیعت زیادہ خراب ہو سکتی ہے۔''

''درست سوچا آپ نے...... میں شام کو حاضر ہو جاؤں گا تصویر لے کر۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

محمود نے شوفر کو موبائل واپس کیا۔ ''شام کو آ جانا۔''

''کس وقت؟'' شوفر نے پوچھا۔

محمود نے وقت بتا دیا۔ شوفر چلا گیا۔

وہ دن محمود نے بے چینی سے گزارا۔ نہ جا کر اس نے اپنے حق میں اچھا ہی کیا تھا۔ عام گاہکوں کے علاوہ اس دن اس کے دو پرانے گاہک بھی آئے تھے۔ ایک نے تو صرف ایک سینری خریدی تھی لیکن دوسرا اپنی تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے محمود کو اپنی کیبنٹ سائز تصویر دی تھی۔ اس سے محمود نے ایک ہفتے کا وقت لیا تھا۔

شام کو مقررہ وقت پر شوفر آ گیا۔ محمود نے فریحہ کی تصویر پچھلی نشست پر احتیاط سے رکھ دی اور خود شوفر کے برابر میں بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے رسمی باتیں چھیڑ دیں۔ ان باتوں میں شوفر کا نام بھی پوچھ لیا اور یہ سوال بھی کر ڈالا کہ فریحہ کے گھر میں کتنے افراد ہیں۔

''بس ملازمین ہیں یا بی بی صاحبہ کے والد، ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بھائی بہن کوئی نہیں ہے۔''

''والد کا کوئی کاروبار ہو گا؟''

''جی ہاں، فرمان انٹرپرائز کا نام سنا ہو گا آپ نے۔ اس کے مالک ہیں وہ۔''

محمود نے سر ہلانے پر اکتفا کی۔

تھوڑی دیر بعد کار ایک خوب صورت بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی۔ احاطے میں دو تین ملازمین دکھائی دیے۔ ایک برآمدے میں کھڑا تھا۔ شوفر نے محمود کو اس کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ''بی بی صاحبہ'' کے کمرے تک پہنچا دے۔

محمود اس ملازم کے ساتھ ایک کمرے تک پہنچا۔ ملازم نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور بلند آواز میں بولا۔ ''صاحب آ گئے ہیں بی بی صاحبہ!''

''آنے دو انہیں!'' اندر سے فریحہ کی آواز آئی۔ ''دروازہ بند نہیں ہے۔''

ملازم نے دروازہ کھولا۔ اندر سے ہلکی ہلکی موسیقی کے ساتھ دو تین آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ محمود نے سمجھا کہ وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں لیکن اندر داخل ہونے کے بعد اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔ وہ آوازیں ٹیلی وژن کی تھیں جس پر کوئی انگریزی فلم چل رہی تھی۔

ملازم دروازہ بند کر کے لوٹ گیا۔

کمرے میں فریحہ اکیلی ہی تھی اور غالباً بستر پر لیٹی ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھ کر اس طرح آگے آئی جیسے محمود کا استقبال کرنا مقصود ہو۔

محمود نے جھجک کر نظریں جھکا لیں۔ فریحہ اتنی باریک سی نائٹی پہنے ہوئی تھی کہ اس کے زیریں لبادے تک صاف دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ...... یہ تصویر...... کہاں......'' محمود کے لہجے میں لکنت آ گئی۔

''مجھے دیجیے!'' فریحہ نے ہاتھ آگے بڑھائے، پھر ہنس کر بولی۔ ''آپ نے نظریں کیوں جھکا لیں؟''

''ج...... جی...... وہ......'' اس مرتبہ محمود باقاعدہ ہکلا گیا تھا۔

''اوہ، سمجھی۔'' فریحہ کی ہنسی میں کھنک تھی۔ اس نے تصویر کا فریم ایک طرف رکھا، پھر ایک الماری کی طرف گئی۔ اس میں سے اس نے گاؤن نکال کر پہنا اور بولی۔ ''اب آپ نظریں اٹھا سکتے ہیں۔ میں نے گاؤن پہن لیا ہے۔''

اب محمود نے اس کی طرف دیکھا۔

''پیکنگ بھی بہت اچھی کی ہے آپ نے!'' وہ تصویر اٹھاتے ہوئے بولی، پھر اس نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیا میں نائٹی میں اچھی نہیں لگ رہی تھی؟''

محمود کی سمجھ میں نہیں آ سکا کہ کیا جواب دے۔ نہ اثباتی جواب ممکن تھا، نہ منفی! اس نے فریحہ کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

فریحہ نے تصویر پر چڑھا ہوا براؤن پیپر اتارتے ہوئے کہا۔ ''آپ کھڑے کیوں ہیں؟ بیٹھیے نا!''

''شکریہ۔'' محمود بیٹھ گیا۔ فریحہ پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔

فریم سے براؤن پیپر اتار کر فریحہ نے تصویر دیکھی۔

''واؤ!'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''بہت ہی شاندار۔'' پھر وہ اٹھی۔ اس نے ایک دیوار کے قریب لے جا کر اس پر رکھی، پھر دوبارہ اپنی جگہ آ بیٹھی اور مسکراتے ہوئے تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔ محمود اس کے تاثرات دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ!'' فریحہ نے بلند آواز سے کہا۔ پھر محمود کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''میں نے ہدایت کر دی تھی کہ جب میرے مہمان آ جائیں تو اسکواش لے آنا۔''

ایک ادھیڑ عمر ملازمہ ایک چھوٹی ٹرے میں دو گلاس رکھے اندر آئی۔

''پہلے انہیں پیش کرو۔'' فریحہ نے محمود کی طرف اشارہ کیا۔

ملازمہ محمود کے قریب گئی۔ محمود نے ایک گلاس اٹھا لیا۔ ملازمہ فریحہ کی طرف گئی۔ اسے گلاس دے کر وہ خالی ٹرے سنبھالے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''کمال کی تصویر بنائی ہے آپ نے محمود صاحب!'' فریحہ بولی۔

''شکریہ۔''

''اوہ! کیا ٹی وی بند کر دوں؟ آپ اس کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔''

''مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔'' محمود نے جواب دیتے ہوئے ٹی وی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی، لیکن اچٹتی سی نظر کے باوجود خجل ہوا۔ اس ایک پل کا منظر یہ تھا کہ ایک خوب صورت مرد ایک خوب صورت لڑکی کو اپنی بانہوں میں جکڑے اسے پیار کر رہا تھا۔

''اوہ، گاڈ...... کتنے جذباتی ہیں یہ دونوں۔'' فریحہ نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان دونوں کی فلمیں بہت پسند ہیں۔ خیر!'' وہ اٹھی۔ ریموٹ لے کر اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

''اسکواش اچھا ہے۔'' محمود نے ایک گھونٹ لے کر صرف اس لیے کہا کہ فریحہ کو اس فلم کے بارے میں مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملے۔

''آپ کا قیام کہاں ہے محمود صاحب!'' فریحہ نے پوچھا۔

''ٹیونیشیا لائن میں۔''

''اوہ! وہ تو بہت خراب جگہ ہے۔''

''گزارا ہو جاتا ہے۔''

''آپ کوئی معقول، کوئی چھوٹا سا فلیٹ لے لیں۔ کرائے پر!''

''جب اتنے پیسے ہو جائیں گے تو ضرور لے لوں گا۔''

''میں ابھی آپ کو پچاس ہزار کا چیک تو دے رہی ہوں۔''

محمود چونکا۔ ''یہ تصویر بنانے کا اتنا معاوضہ تو نہیں لوں گا میں!''

''اتنی خوب صورت تصویر کا معاوضہ تو اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے۔''

''نہیں نہیں، یہ بہت زیادہ ہے۔''

''تو پھر کتنا ہونا چاہیے؟''

''زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار۔''

''یہ تو بہت کم ہے۔''

''میں اس سے زیادہ ہرگز نہیں لوں گا۔''

''کمال کرتے ہیں آپ بھی......! میں آپ کے فن کی قدردان ہوں محمود صاحب!''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن۔'' محمود نے اپنی بات پوری کیے بغیر نفی میں سر ہلایا۔

اگرچہ اس نے وہ تصویر زیادہ محنت سے اسی لیے بنائی تھی کہ اسے زیادہ معاوضہ مل سکے لیکن پچاس ہزار بہت بڑی رقم تھی اس کے لیے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ فریحہ اس پر احسان کرنا چاہتی تھی اور اسے احسان لینا گوارا نہیں تھا......

جب وہ فریحہ کے گھر سے روانہ ہوا تو اس کی جیب میں دس ہزار سے زیادہ کا چیک نہیں تھا......

☆☆☆

فریحہ ایسی باریک نائٹی پہنے محمود کے سامنے آئی تھی کہ اس کا سارا جسم جھلک رہا تھا۔ یہ کسی بھی عام نوجوان کے لیے ایک کھلی دعوت تھی۔ کچھ دیر محمود کا ذہن بھی اس میں الجھا لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر یہ خیال دماغ سے جھٹک دیا کہ الٹرا ماڈرن سوسائٹی کی لڑکیاں اتنی ہی بے باک ہوتی ہوں گی۔

دس ہزار روپے اس نے بینک میں ڈال دیے کہ وہ کسی آڑے وقت میں کام آ سکتے تھے۔ پھر کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ایک شام جب وہ گھر جانے کی تلاش میں بس کا انتظار کر رہا تھا تو فریحہ کی کار اس کے قریب آ کر رکی۔

''ہیلو محمود! کیا دیکھ رہے ہیں آپ ادھر ادھر؟'' اس نے پوچھا۔

''گھر جا رہا ہوں۔ بس کا انتظار ہے۔''

''چلیں میں آپ کو چھوڑ دیتی ہوں۔ دراصل مجھے ادھر ہی سے گزرنا ہے۔''

''لیکن......'' محمود نے گریز کرنا چاہا۔

''ارے بیٹھیے بھی جلدی سے......! پیچھے ٹریفک رکنے لگا ہے۔'' فریحہ نے کہتے ہوئے خود ہی اپنی برابر کی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

یہ حقیقت تھی کہ فریحہ کی کار کے پیچھے ٹریفک رکنے لگا تھا اور بعض لوگ ہارن بجانے لگے تھے۔ اس وقت کسی بھی قسم کی تکرار، محمود نے مناسب نہیں سمجھی اور کار میں بیٹھ گیا۔ فریحہ نے فوراً کار آگے بڑھا دی۔

''میں تو اب آپ کو اپنا دوست سمجھنے لگی ہوں لیکن آپ مجھے کچھ بھی گردانتے کے لیے تیار نہیں ہیں شاید۔''

''آپ بڑے گھر کی بیٹی ہیں فریحہ صاحبہ!'' محمود نے کہا۔ ''مجھ جیسا غریب شخص کیسے آپ کو اپنا دوست سمجھ لے۔''

اس جواب پر فریحہ نے امارت اور غربت پر ایک لمبا سا فلسفیانہ لیکچر جھاڑ دیا۔ محمود خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر اس دن کے بعد بھی اس قسم کے ''اتفاقات'' ہوتے رہے۔ کبھی محمود کالج سے آ رہا ہوتا یا جا رہا ہوتا تو فریحہ اسے کہیں مل جاتی اور پھر اپنی کار میں ہی اسے اس کی منزل تک پہنچا دیتی۔ کبھی وہ گھر جاتے کے لیے بس کے انتظار میں ہوتا تو وہ اسے مل جاتی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ محمود اس سے بے تکلف ہو جائے لیکن محمود ٹس سے مس نہ ہوا، لیکن اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ فریحہ اس سے کیوں بے تکلف ہونا چاہتی تھی۔ وہ کچھ اسی قسم کا نوجوان تھا۔

امتحان کا زمانہ آنے تک محمود نے فریحہ کے لیے دو تصویریں اور بنائیں۔ فریحہ کے بہ قول ایک تصویر اس کی ماں کی اور ایک اس کے والد فرمان صاحب کی۔ ان دونوں تصویروں کے بھی فریحہ نے بیس ہزار روپے دیے۔ محمود نے وہ بھی بینک میں ڈال دیے۔ شاید یہ اس کی چھٹی حس کا کرشمہ تھا کہ وہ روپے مستقبل میں اس کے کام آ سکتے تھے۔

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد محمود بہت مطمئن تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اسے بہت شاندار طریقے سے پاس ہونا چاہیے تھا۔ رزلٹ کے انتظار میں اس نے وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ تصویریں بناتا اور فروخت کرتا رہا۔

آخر اس کا رزلٹ آ گیا۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی توقع کے مطابق ہی نمبر آئے تھے۔ اسی دن فریحہ بھی اس سے ملنے آئی۔ اس نے محمود کو مبارک باد دی اور اس خوشی میں اس کی دعوت کرنا چاہی۔

''دعوت تو مجھے دینا چاہیے۔'' محمود نے مسکرا کر کہا۔ وہ بہت خوش تھا۔

''چلیں آپ دے دیں، لیکن شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''آج شام کو۔''

''آج مجھے کچھ کام ہے۔ کل پر رکھیے۔''

''شام کو آپ مجھے اسی جگہ مل جائیے گا جہاں آپ اپنے گھر کے قریب میری کار سے اترتے ہیں۔''

محمود نے آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ خوش ہی اتنا تھا۔ دعوت اس نے دوسرے دن کے لیے یوں ٹالی تھی کہ اس دن اس کی جیب میں مناسب رقم نہیں تھی۔

دوسرے دن اس نے بینک سے اتنی رقم نکالی جو اس کے خیال کے مطابق کسی بڑے ہوٹل میں دو افراد کے کھانے کے بل سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس نے اپنے لیے ایک اچھا شلوار سوٹ بھی خریدا۔ گھر سے الگ ہونے کے بعد سے اب تک وہ پرانے ہی کپڑوں سے کام چلاتا رہا تھا۔ اب بھی

وہ اتنے پیسے خرچ نہ کرتا اگر اسے یہ خیال نہ ہوتا کہ فریحہ کے ساتھ اسے ایک بڑے ہوٹل میں جانا تھا اس لیے اس کا لباس مناسب ہی ہونا چاہیے۔

مقررہ وقت پر فریحہ اسے لینے آگئی۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب وہ دونوں ہوٹل پہنچے۔ یہ محمود کی زندگی کا پہلا موقع تھا جب اس نے اتنے بڑے ہوٹل میں قدم رکھا۔ یہ بات اس نے فریحہ کو بتا بھی دی۔ ''میں یہاں کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہوں۔''

فریحہ ہنس کر بولی۔ ''کوئی خاص طریقے نہیں ہوتے۔ بس آپ میرے ساتھ چلتے رہیے، جہاں میں بیٹھوں، وہیں بیٹھ جایئے گا۔''

محمود نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کی۔

ایک کرسی پر بیٹھ جانے کے چند لمحے بعد ہی فریحہ نے ایک ویٹر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے محمود سے کہا۔ ''کھانے کا آرڈر میں اپنی مرضی سے دوں گی۔''

''ضرور۔''

فریحہ نے مینو دیکھ کر آرڈر پلیس کر دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ محمود سے بولی۔ ''یہ تو آپ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ آپ اپنے گھر والوں سے ناراض ہو گئے ہیں لیکن ایسی کیا ناراضی تھی کہ آپ نے گھر ہی چھوڑ دیا۔''

''وجہ۔'' محمود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرے والد میری شادی ایک مال دار گھرانے میں کرانا چاہتے تھے جو مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں تھا۔''

''کیوں؟ مال دار گھرانوں سے کوئی چڑ ہے کیا؟'' فریحہ مسکرائی۔

''اول تو یہ کہ ٹاٹ میں مخمل کا پیوند نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ بڑے گھرانے کی لڑکیاں، غریب شوہر پر حاوی رہنا چاہتی ہیں۔''

''اور مرد کی انا یہ برداشت نہیں کر سکتی۔'' فریحہ مسکرائی۔

''ظاہر ہے۔''

''لڑکی کون تھی؟ میرا مطلب ہے، کس کی بیٹی ہے؟''

''میں نے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔''

''آپ کو اس لڑکی کے بارے میں جاننا تو چاہیے تھا۔ شاید وہ اچھے مزاج کی لڑکی ہو اور وہ آپ پر حاوی نہ ہونا چاہے۔''

''یہ ممکن ہی نہیں۔''

یہ بحث جاری تھی کہ ویٹر کھانا لے آیا۔ کھانے کے دوران میں اس موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔

''ہاں تو وہ لڑکی......'' فریحہ نے پھر وہی بحث چھیڑنا چاہی مگر اچانک خاموش ہو کر ایک طرف دیکھنے لگی۔ وہ یکلخت سنجیدہ بھی ہوئی تھی۔

محمود نے اس طرف سر گھمایا جدھر فریحہ دیکھنے لگی تھی۔ اس نے ایک جوان العمر شخص کو دیکھا جو ان کی میز کے تقریباً قریب آ چکا تھا۔ فریحہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شخص نہایت قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ جسامت بھی اچھی تھی اور وہ وجیہہ بھی تھا۔

وہ میز کے بالکل قریب آن رکا۔ وہ محمود کو بڑی کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دانت اتنی زور سے بھینچ رکھے تھے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

''فرمایئے!'' محمود نے اس سے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، فریحہ تیز لہجے میں بول پڑی۔

''کیا بات ہے رفیق!''

اب محمود نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ فریحہ نے اس شخص کو نام لے کر مخاطب کیا تھا۔ اس کا صریح مطلب یہی تھا کہ وہ اس شخص کو جانتی تھی۔

''تو کیا یہ حضرت ہیں تمہارا انتخاب؟'' رفیق نے فریحہ کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''حضرت'' سے اس کی مراد محمود ہی سے ہو سکتی تھی۔

''رفیق!'' فریحہ تیز لہجے میں بولی۔ ''بہتر ہوگا کہ یہاں ہوٹل میں کوئی تماشا نہ ہو۔''

''میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟'' رفیق نے اسے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تمہیں جواب دہی کی پابند نہیں ہوں میں!''

اب رفیق نے محمود کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم فریحہ کے صرف دوست ہو، تب تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر بات آگے تک جانے والی ہے تو میں بتا دوں کہ تم بہت گھاٹے میں رہو گے۔''

فریحہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، یا محمود کوئی جواب دیتا، رفیق جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ فریحہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''کون صاحب تھے یہ؟'' محمود نے آہستہ سے پوچھا۔

فریحہ نے جواب دینے کے بجائے پیالی اٹھا کر

چائے کا ایک گھونٹ لیا، پھر ویٹر کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”موڈ خراب ہوگیا۔ اب چلتے ہیں یہاں سے!“ فریحہ نے محمود سے کہا۔

ویٹر قریب آگیا تھا۔

”چیک!“ فریحہ نے اس سے کہا۔

یہ بات محمود کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بل تو میں ادا کروں گا۔“

فریحہ اپنا پرس کھولتے کھولتے رک گئی۔ عام حالات میں شاید وہ خود ہی بل کی ادائیگی پر اصرار کرتی لیکن اس وقت اس کا موڈ کچھ ایسا ہوگیا تھا کہ اس نے مزید کچھ نہیں کہا اور محمود نے بل ادا کردیا۔

”چلیں۔“ فریحہ کھڑی ہوگئی۔

چائے کی پیالیاں تقریباً بھری کی بھری رہ گئیں اور وہ دونوں اٹھ کر ہوٹل سے نکل آئے۔

”یہاں سے آپ ٹیکسی کرلیں محمود!“ فریحہ بولی۔ ”میں اب سیدھی اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔“

”کوئی حرج نہیں۔“ محمود نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”میں ٹیکسی کرلوں گا۔“

اس نے یہی سمجھا تھا کہ فریحہ ابھی اس سے رفیق کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ ہوگا کہ اگر وہ ساتھ رہے تو محمود پھر اس شخص رفیق کے بارے میں استفسار کر بیٹھے گا۔

جب فریحہ کار میں چلی گئی تو محمود نے ٹیکسی کی کیونکہ اس علاقے سے بسیں نہیں گزرتی تھیں......

یہ پہلا موقع تھا جب فریحہ کے کردار نے محمود کو الجھن میں مبتلا کیا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ تھک گیا لیکن وہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ رفیق سے فریحہ کا کیا تعلق تھا۔

اس نے محمود کو دھمکی بھی دی تھی۔ اگرچہ اس نے صاف صاف کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی بات محمود کی سمجھ میں آگئی تھی۔ لیکن اس دھمکی کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس نے اسے فریحہ کے ساتھ دیکھ کر غلط اندازہ لگایا تھا، تاہم یہ بات ظاہر ہوگئی تھی کہ وہ فریحہ کو کسی اور شخص کے ساتھ ”زیادہ آگے“ بڑھتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن خود فریحہ اس شخص کو پسند نہیں کرتی تھی جو اس کے رویے سے صاف ظاہر ہوگیا تھا۔

محمود کے لیے رفیق کی دھمکی، بے معنی سی بات تھی۔ وہ فریحہ کے معاملے میں ”زیادہ آگے“ بڑھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے مدیحہ سے محبت تھی۔ اگرچہ ان دونوں کو آپس میں ملے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا تھا لیکن رات کو موبائل فون پر ان کی باتیں ہو جایا کرتی تھیں۔

اسی رات کو محمود نے اسے موبائل پر، امتحان میں اپنی کامیابی کی اطلاع دی اور بڑے عزم سے بتایا کہ وہ بہت جلد ایک کامیاب انسان بن جائے گا۔ لیکن اس معاملے میں وہ بہت معصوم تھا یا خوابوں کی دنیا میں رہتا تھا۔ اس کا اندازہ اسے مہینے بھر کے اندر ہوگیا کہ اس دور میں ملازمت حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

کئی ماہ اور گزر گئے۔ ملازمت نہ ملنا تھی، نہ ملی۔ اس تگ و دو میں وہ مصوری سے بھی اتنا فائدہ نہیں اٹھا سکا جتنا پہلے اٹھا لیا کرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فریحہ سے حاصل کردہ رقم جو اس نے بینک میں ڈال دی تھی، نہ صرف وہ ختم ہوگئی بلکہ وہ اپنے دوست کا قدرے مقروض بھی ہوگیا۔

اس دوران میں کئی مرتبہ اسے فریحہ کا خیال اس لیے آیا کہ ان دنوں میں وہ بالکل غائب ہوگئی تھی۔ محمود ملازمت کی تلاش میں دھکے کھاتے رہنے کے باوجود کچھ نہ کچھ وقت تصاویر بیچنے کے لیے اب بھی بیٹھتا لیکن وہ وہاں بھی نہیں آئی تھی۔ محمود یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اس کی وجہ وہ شخص رفیق تو نہیں تھا جو ہوٹل میں ملا تھا؟

لیکن اس الجھن میں محمود مسلسل گرفتار نہیں رہا۔ اپنے مستقبل کے بارے میں اس کی امیدیں ٹوٹنے لگی تھیں جس کا اثر اس کی صحت پر بھی پڑ رہا تھا۔ اسے یہ ڈر بھی رہنے لگا کہ کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔ مدیحہ سے موبائل فون پر رابطہ رہتا تھا لیکن اس سے محمود نے اپنی بڑھتی ہوئی مایوسی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے برخلاف اس کی ڈھارس ہی بندھاتا رہا۔

ایک رات مدیحہ کا فون آیا تو وہ بہت پریشان تھی۔

”مجھے اب تم سے فوراً ملنا ہے محمود!“ اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ ”صورت حال بہت خراب ہوگئی ہے۔“

”کیا ہوا؟“ محمود بھی پریشان ہوگیا۔

”فون پر نہیں بتا سکوں گی۔ ابھی تو کمرے میں اکیلی ہوں لیکن کسی وقت بھی آپی آسکتی ہیں۔ وہ امی سے کچھ کہنے گئی ہیں۔ تم کل کسی جگہ ملو! پلیز!...... پلیز!...... جلدی بتاؤ کہاں ملو گے۔ آپی شاید آرہی ہیں۔ میں فون بند کردوں گی یہ بھی بتا دوں کہ دن میں نہیں آسکوں گی۔ شام......“ اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ خود اس نے فون بند کیا تھا۔

محمود پریشان ہوکر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ مدیحہ کی پریشانی اس کے لیے بہت بڑی پریشانی تھی۔ اس وقت گیارہ بجے تھے۔ وہ منتظر رہا کہ مدیحہ اسے دوبارہ فون کرے تو وہ اسے بتائے کہ ملاقات کہاں ہوسکتی ہے۔ ایک

گھنٹا انتظار میں گزر گیا، پھر محمود کو خیال آیا کہ وہ مدیحہ کو ایس ایم ایس کرے، لیکن اس میں بھی اندیشہ تھا کہ ایس ایم ایس کی ٹون سن کر صفیہ، مدیحہ کی طرف متوجہ ہوسکتی تھی۔ پھر پندرہ منٹ اور گزرے تھے کہ محمود کے موبائل پر مدیحہ کا ایس ایم ایس آگیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”اب فون کرنا میرے لیے مشکل ہے اس لیے ایس ایم ایس کر رہی ہوں۔ تم بھی ایس ایم ایس سے ہی جواب دو۔ میں نے اپنے موبائل کی ایس ایم ایس ٹون بند کردی ہے، آپی ابھی جاگ رہی ہیں۔ کچھ پڑھ رہی ہیں، میں نے دوسری طرف کروٹ لے لی ہے۔ موبائل میرے ہاتھ میں ہے، جلد از جلد بتاؤ کہ کل ہم سات ساڑھے سات کے درمیان کس جگہ مل سکتے ہیں؟“

اس پیغام نے محمود کی الجھن میں اور اضافہ کیا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مدیحہ اتنی شام کو ہی کیوں ملنا چاہتی تھی۔ بہرحال اس نے ایس ایم ایس کرکے مدیحہ کو بتایا کہ وہ کہاں مل سکے گا۔ اس نے ایک ایسے پارک کا انتخاب کیا تھا جو شام کے بعد بند تو نہیں ہوتا تھا لیکن تفریح کرنے والے برائے نام رہ جاتے تھے۔ ایسی جگہ کا انتخاب اس نے اس لیے کیا تھا کہ انہیں ساتھ دیکھ لیے جانے کا اندیشہ برائے نام رہ جائے۔ کسی بھری پُری جگہ پر یہ خطرہ زیادہ رہتا کہ شاید کوئی جاننے والا ان دونوں کو ساتھ دیکھ لے۔

محمود اس معاملے میں اتنا زیادہ محتاط تھا کہ اسے غیر فطری کہا جاسکتا تھا۔ مدیحہ اتنی پریشان کیوں ہے؟ اس سوال پر غور کرتے کرتے محمود خاصی رات گزرنے کے بعد سویا۔

دوسرے دن وہ دیر سے اٹھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک لائبریری کا رخ کیا جہاں وہ سبھی اخبارات دیکھ سکتا تھا۔ یہ اس کا معمول بن گیا تھا کہ اخباروں میں وہ اشتہارات تلاش کرتا تھا جو کسی ملازمت کے سلسلے میں ہوتے تھے۔ ابتدا میں تو اس نے صرف بینکوں میں کوشش کی تھی لیکن اب اتنا پریشان ہوچکا تھا کہ اسے جو بھی ملازمت مل جاتی، وہ اسے قبول کرلیتا اور بینک کی ملازمت کے لیے تگ و دو جاری رکھتا۔ اس کا خیال ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ بینک ہی کی ملازمت میں جلدی ترقی کرسکے گا۔

شام کو ٹھیک سات بجے وہ اس پارک کے پھاٹک پر پہنچ گیا جہاں اس نے مدیحہ کو بلایا تھا۔

اب پارک میں آنے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لوگ اب دھیرے دھیرے رخصت ہو رہے تھے۔ آٹھ بجے کے بعد وہاں برائے نام لوگ رہ جاتے تھے۔ جن دنوں شہر کے حالات خراب نہیں ہوئے تھے، ان دنوں وہاں خاصی رات تک رونق رہتی تھی۔

سوا سات بجے مدیحہ ایک آٹو رکشا سے اترتی دکھائی دی۔ اس نے کرایہ ادا کرتے وقت ادھر ادھر نظر دوڑائی اور محمود کو دیکھ لیا۔ محمود نے فوراً اسے اشارہ کیا اور پارک میں داخل ہونے کے لیے مڑ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ مدیحہ اس کے پیچھے پیچھے آئے اور وہ کسی ایسی جگہ رکے جہاں انہیں آڑ حاصل ہو۔ اسے خیال آیا کہ شاید مدیحہ نے اس کا اشارہ نہ سمجھا ہو اس لیے اس نے جلدی سے ایس ایم ایس کردیا۔ ”پیچھے ہی پیچھے آؤ، جہاں میں رکوں، وہیں میرے قریب آنا۔“

اس نے مڑ کر اس لیے نہیں دیکھا کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ اپنے پیچھے آنے والی لڑکی کو دیکھ رہا ہے۔

طویل عرصے کے بعد وہ مدیحہ کو دیکھ کر خوش ہوا تھا، اس کا جسم اب بھرا بھرا سا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آنے لگی تھی۔

محمود پارک کی عقبی دیوار کے قریب چلا گیا۔ اس جگہ ایک چھوٹا ٹیلا تھا کہ اس پر مختلف پھول لگائے گئے تھے۔ اس ٹیلے کی طرف بچے بڑے شوق سے آتے تھے لیکن اس وقت وہاں سناٹا ہوچکا تھا۔ پارک میں جو لوگ رہ گئے تھے، ان کی نظر اس طرف پڑ سکتی تھی اس لیے محمود اس ٹیلے کے پیچھے جاکر رک گیا۔ یہاں کسی کی نظر پڑنے کا امکان نہیں تھا۔

رات کی تاریکی ہر طرف محیط ہوچکی تھی۔ کافی فاصلے پر لگے ہوئے الیکٹرک پول کی مدھم سی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔

محمود وہیں گھاس پر بیٹھ گیا اور مدیحہ کا انتظار کرنے لگا۔ مدیحہ کو دو منٹ کے اندر اندر وہاں آجانا چاہیے تھا لیکن جب تیسرا منٹ بھی گزر گیا تو محمود کچھ بے چین ہوگیا۔

ایک منٹ اور گزرا تو محمود نے جیب سے موبائل نکالا۔ وہ مدیحہ کو اس مرتبہ کال کرنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت مدیحہ نظر آگئی۔ محمود نے طویل سانس لے کر موبائل جیب میں رکھ لیا۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم مدیحہ؟“ محمود دھیمی آواز میں بولا۔

”پھاٹک پر کھڑا ہوا ایک سپاہی مجھے غور سے دیکھنے لگا تھا۔“ مدیحہ نے اس کے قریب گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک بینچ کے پاس رک گئی تھی جہاں ایک نوجوان جوڑا دو سال کے ایک بچے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں اٹھنے ہی والے تھے بینچ سے کہ میں نے خاتون سے پوچھا کہ آپ نے کسی نوجوان لڑکی کو دیکھا ہے جو گہرے اودے رنگ کا

سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ میں نے ان پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اپنی چھوٹی بہن کو ڈھونڈ رہی ہوں جو ابھی تک گھر واپس نہیں پہنچی۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو میں ان کے بچے کا گال پیار سے تھپتھپا کر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”آگے کہیں دیکھتی ہوں۔ میں نے اسی دوران میں پلٹ کر دیکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ سپاہی میرے پیچھے نہ لگ گیا ہو۔ اس طرح مجھے اطمینان ہوا کہ وہ نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی میں اس طرف آئی۔“

”اچھا خیر......! یہ بتاؤ کہ......“

”تم اتنے کمزور کیوں ہوگئے ہو؟“ فریحہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ تین چار دن بخار آیا تھا۔ اس کی وجہ سے ہوئی ہے کمزوری۔ دو چار دن میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔ تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم پریشان ہوتیں۔“ محمود نے وضاحت سے جھوٹ بولا۔ وہ مدیحہ کو اپنی مالی پریشانی اور ملازمت کے بارے میں دھکے کھانے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔

مدیحہ نے جلدی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

”اب بالکل بخار نہیں ہے۔“ محمود نے جلدی سے کہا۔

مدیحہ مطمئن نہیں ہوئی۔ اس نے فوراً محمود کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”پیشانی تو ہلکی سی گرم......“

مدیحہ کا جملہ پورا نہیں ہوسکا۔ اس وقت ان دونوں پر ٹارچ کی روشنی پڑی تھی۔ ”محبت ہو رہی ہے!“ طنزیہ آواز سنائی دی۔

مدیحہ نے جلدی سے محمود کی پیشانی سے ہاتھ ہٹایا اور کھڑی بھی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی محمود بھی اٹھا تھا۔

ٹارچ کی روشنی سے ان کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔ وہ دیکھ نہیں سکے کہ ان پر روشنی ڈالنے والا کون تھا۔ جب اس شخص نے ٹارچ کا رخ نیچے کیا تو نظر آیا۔ وہ کانسٹیبل تھا۔

”چھپ کر عشق لڑایا جا رہا ہے!“ کانسٹیبل زور سے ہنسا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو بھائی!“ محمود جلدی سے بولا۔

”بکو مت!“ کانسٹیبل کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ”تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”تم خوامخواہ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔“ محمود نے تیز لہجے میں کہا۔ ”ہم......“

”فضول باتیں نہ کرو۔“ کانسٹیبل گرجنے والے انداز میں بولا۔ ”فوراً میرے ساتھ تھانے چلو۔“

اب محمود گھبرا گیا۔ کانسٹیبل کے زور سے بولنے کی وجہ سے لوگ وہاں جمع ہوسکتے تھے۔ اچھا خاصا تماشا بن جاتے وہ اور مدیحہ! پارک میں ابھی بالکل سناٹا نہیں ہوا تھا۔

”چلو۔“ محمود نے ہونٹ بھینچ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ”تھانے چل کر ہم اپنی صفائی پیش کردیں گے۔ یہاں پارک میں تم ہمیں تماشا نہ بناؤ۔ ہمارا تعلق شریف گھرانوں سے ہے۔“

”شریف گھرانے کے لڑکے اور لڑکیاں یہی تو کرتے ہیں۔“ کانسٹیبل نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ ”چلو میرے ساتھ۔“

”اس طرف سے چلو۔“ محمود نے پارک کے عقبی پھاٹک کی طرف اشارہ کیا جس کے باہر ایک پتلی سی گلی تھی۔ اس راستے کو برائے نام لوگ استعمال کرتے تھے۔

کانسٹیبل ہنسا۔ ”لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے اب شرم آرہی ہے۔“

حقیقت یہی تھی کہ اگر وہ مرکزی دروازے کا رخ کرتے تو لوگوں کی نظریں ان کی طرف ضرور اٹھتیں۔ محمود اگر اکیلا ہوتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس کے ساتھ مدیحہ بھی تھی۔ لوگ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتے۔

”چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ اتنی نرمی کرسکتا ہوں۔“

مدیحہ نے محمود کا بازو پکڑ لیا۔ محمود نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔

”گھبراؤ نہیں۔“ محمود نے آہستہ سے کہا۔ ”تھانے چل کر سنبھال لوں گا میں اس معاملے کو......“

”چلو!“ کانسٹیبل کے لہجے میں سختی تھی۔

پولیس اسٹیشن وہاں سے قریب ہی تھا۔ کانسٹیبل نے ان دونوں کو وہاں لے جا کر ایک افسر کے سامنے پیش کیا اور نہایت بے ہودہ الفاظ میں آفیسر کو بتانے لگا کہ پارک کے ایک اندھیرے گوشے میں وہ دونوں کس قسم کی حرکتیں کر رہے تھے۔

”جھوٹ ہے یہ!“ محمود چیخ پڑا۔

مدیحہ کا تو چہرہ ہی شرم سے سرخ ہوگیا تھا، کانسٹیبل کی باتیں سن کر!

”اچھا!“ پولیس آفیسر نے ہنس کر کہا۔ ”تو سچ کیا ہے؟“

دفعتاً ایک نہایت پرجوش آواز سنائی دی۔ ”ہیلو محمود صاحب!“

محمود نے چونک کر دیکھا کہ کمرے میں داخل ہونے والی فریحہ تھی۔ جینز، بنیان میں ملبوس اونچی ایڑی سے ”کھٹ کھٹ“ کرتی وہ تیزی سے قریب آگئی۔

پولیس آفیسر جلدی سے کھڑا ہوگیا۔

”آپ یہاں کیسے فریحہ صاحبہ!“ وہ جلدی سے بولا۔

”ابھی بات کرتی ہوں آپ سے۔“ فریحہ اسے جواب دے کر محمود کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”خیریت تو ہے؟ آپ یہاں کیسے؟“ وہ ہنسی۔ ”کسی شریف آدمی کو تھانے میں داخل ہوتے ہوئے میں پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

محمود نے اسے جواب دینے کے بجائے پولیس آفیسر اور کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔ کانسٹیبل اب کچھ گڑبڑایا ہوا سا نظر آرہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ فریحہ نے مدیحہ پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد پولیس آفیسر سے پوچھا۔

”جی...... وہ......“ پولیس آفیسر ہچکچایا۔ ”یہ ان محترمہ کے ساتھ پارک میں تھے۔ ہمارے اس بے وقوف کانسٹیبل کو کچھ غلط فہمی ہوگئی۔“

فریحہ نے منہ بنایا۔ پھر مدیحہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمود سے پوچھا۔ ”یہ کوئی عزیزہ ہیں آپ کی؟“

”جی۔“ محمود نے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

”بہت بے وقوف آدمی ہو تم!“ فریحہ نے کانسٹیبل کو جھاڑ دیا۔

کانسٹیبل نے سر جھکا لیا۔

”میرے ساتھ چلیے آپ دونوں۔“ فریحہ نے محمود سے کہا، پھر سب انسپکٹر سے بولی۔ ”اتفاق ہے۔ میں قریب کے ایک جنرل اسٹور سے کچھ خریداری کر رہی تھی۔ محمود صاحب کو جو میں نے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوتے دیکھا تو جلدی سے کار میں بیٹھ کر ادھر آگئی اور یہ بہت اچھا ہوا۔ آپ لوگ تو ان شرفا کو خاصا پریشان کردیتے۔“

”بس غلطی ہوگئی کانسٹیبل سے۔“ پولیس افسر نے شرمندگی کا اظہار کیا۔

”آئیے محمود صاحب! آپ بھی آئیے!“ فریحہ نے مسکرا کر مدیحہ کی طرف دیکھا۔

محمود حیران تھا کہ فریحہ کو دیکھ کر پولیس افسر حواس باختہ کیوں ہوگیا تھا۔ یہ سوال اس کی زبان پر بھی آگیا جب وہ تینوں پولیس اسٹیشن سے نکل رہے تھے۔

”ارے وہ!“ فریحہ ہنسی۔ ”وہ ایک بہت معمولی گھرانے کا آدمی ہے۔ شاید اپنے خاندان میں وہ پہلا شخص ہوگا جس نے کالج کی صورت دیکھی۔ اس کا باپ ہمارا گھریلو ملازم تھا اور بہت پرانا تھا۔ مجھے تو اس نے اپنے کندھوں پر کھلایا تھا۔ اسی نے تین چار سال پہلے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کے بیٹے کو اچھی سی کوئی سرکاری ملازمت دلا دوں۔ ڈیڈی سے بات کرنے کی تو اس میں ہمت تھی نہیں۔ ان دنوں میری والدہ کے بھائی محکمۂ داخلہ میں ایک اچھے منصب پر تھے اور مجھے بہت چاہتے تھے۔ اب تو ان کا انتقال ہوچکا ہے۔ بہرحال انہی کی وجہ سے اشرف کو پولیس میں ملازمت مل گئی تھی۔“

محمود سمجھ گیا کہ اشرف اسی پولیس افسر کا نام ہوگا۔ ان باتوں میں وہ اور مدیحہ، فریحہ کے ساتھ اس کی کار کے قریب جا رکے تھے۔ فریحہ نے کہا۔

”تم دونوں کو جہاں جانا ہو، میں پہنچا سکتی ہوں۔“

”ہم کل مل لیں گے۔“ محمود نے مدیحہ سے کہا۔ ”کیا خیال ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ مدیحہ ابھی تک سٹپٹائی ہوئی سی تھی، پولیس اسٹیشن کا رخ کرنے کی وجہ سے تو حواس باختہ ہی ہوگئی ہوگی۔ فریحہ کی وجہ سے اس کا الجھن میں گرفتار ہوجانا بھی یقینی امر تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ٹیکسی کرکے چلی جاتی ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ فریحہ جلدی سے بولی۔ ”میں چھوڑ دوں گی آپ کو۔“

خود محمود بھی نہیں چاہتا تھا کہ مدیحہ رات کے وقت ٹیکسی میں تنہا اپنے گھر جائے لہٰذا اس نے بھی فریحہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مدیحہ ہچکچاہٹ کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔ وہ تینوں روانہ ہوئے۔ محمود نے فریحہ کو بتادیا کہ مدیحہ کو کہاں چھوڑنا ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ فریحہ نے سر ہلا دیا۔

”بہت عرصے بعد نظر آئیں آپ؟“ محمود بولا۔

”دراصل میں ملک سے باہر چلی گئی تھی۔ اچانک جانا پڑا تھا۔ وہاں میری ایک پھوپی رہتی ہیں۔ وہ خاصی علیل تھیں۔ ڈیڈی نے مجھے فوراً ان کے پاس بھیج دیا تھا۔ میرے اتنے دن وہیں گزرے۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہوئی ہیں تو میں واپس آئی ہوں۔ آپ اپنی تو سنائیے۔ کہیں ملازمت ملی؟ بہت دبلے بھی نظر آرہے ہیں۔“

”دراصل ابھی چند دن بیمار رہا تھا اس لیے کمزوری ہوگئی ہے۔“ محمود کو وہی جھوٹ بولنا پڑا جو وہ مدیحہ سے بول چکا تھا۔ ”رہی ملازمت کی بات تو اس کی تلاش جاری ہے۔“

فریحہ نے مدیحہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، شہر کے حالات کا ذکر چھیڑ بیٹھی۔ انہی باتوں میں راستہ کٹ گیا۔ خود مدیحہ نے کار ایسی جگہ رکوائی جہاں سے اس کا نیا گھر کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

مدیحہ کو چھوڑنے کے بعد فریحہ ٹیونیشیا لائن کی طرف روانہ ہوئی جہاں محمود کو جانا تھا۔

''آپ بینک ہی کی ملازمت کرنا چاہتے ہیں؟'' فریحہ نے پوچھا۔

''نہیں۔'' محمود نے طویل سانس لی۔ ''تھک گیا ہوں اتنے ہی دن میں، کوئی بھی ملازمت مل جائے، کرلوں گا۔ اسی دوران میں بینک کی ملازمت ڈھونڈتا رہوں گا۔''

''یعنی...... فاروی ٹائم بینگ...... کہیں بھی!''

''ہاں اب تو ذہن میں یہی ہے۔''

''تو پھر کوئی مسئلہ نہیں۔ کل ہی مل جائے گی ملازمت؟''

''کیسے؟''

''میرے ڈیڈی کے ادارے میں...... آپ کو میں ابھی اپنا کارڈ دوں گی۔ کل صبح ہی چلے جائیے گا آپ وہ لے کر۔ جنرل منیجر کا نام جمال احمد سعیدی ہے۔ اسی سے ملیے گا آپ! میں اسے ابھی فون کردوں گی۔ براہ راست ڈیڈی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ہوسکتا ہے، وہاں کوئی جگہ نہ ہو۔''

''نہیں ہوگی تو جمال سعیدی کو نکالنا پڑے گی۔'' فریحہ نے زور دے کر کہا۔ ''یہ کوئی معمولی بات تو ہے نہیں کہ میں خود اسے فون کروں گی۔ میری بات ٹال سکتا ہے وہ!''

فریحہ کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔

''تو آج میں پرسکون نیند سو جاؤں؟'' محمود کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

''ہاں۔'' فریحہ ہنسی۔ ''بالکل۔''

''ایسی صورت میں مجھے ابھی سے آپ کا شکریہ ادا کر دینا چاہیے۔''

''یہ تو بے گانگی کی بات ہوگی۔''

''اچھا!'' محمود دھیرے سے ہنسا۔ ''تو پھر میں نہیں کرتا یہ بات...... اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔''

فریحہ مسکرائی، پھر سنجیدہ ہوکر بولی۔ ''میں نے آپ سے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ یہ لڑکی کون تھی آپ کے ساتھ؟''

''میرے چچا کی بیٹی ہے۔ ہمارے بڑوں کے تو ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کسی وجہ سے خراب ہوگئے ہیں لیکن ہم لوگ...... یعنی نئی نسل اپنے بزرگوں کے اس جھگڑے سے الگ ہیں۔ بس ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے کیونکہ اس کا علم ہمارے بزرگوں کو ہوسکتا ہے۔''

''مگر لڑکی کے ساتھ...... پارک میں...... اور......''

''اس کا کوئی گھریلو مسئلہ ہے۔ وہ مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ میں اس سے کسی ایسی جگہ نہیں ملنا چاہتا تھا جہاں دیکھ لیے جانے کا اندیشہ رہے اس لیے میں نے ہی اسے پارک میں بلایا تھا لیکن اس کے مسئلے پر بات ہی نہیں ہوسکی، پولیس کانسٹیبل ٹپک پڑا۔ خوش قسمتی سے آپ آگئیں ورنہ صورت حال نہ جانے کیا بنتی۔''

فریحہ نے اس سلسلے میں محمود کو مزید نہیں کریدا اور اس کی مصوری کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔

''کچھ وقت اب بھی تصویروں کی دکان لگانا پڑتی ہے۔'' محمود نے ہنس کر کہا تھا۔ ''تھوڑے بہت اخراجات تو نکالنا ہی پڑتے ہیں۔''

انہی باتوں میں محمود کے گھر کے قریب وہ مقام آگیا جہاں وہ فریحہ کی کار سے اتر جایا کرتا تھا۔ فریحہ نے اسے اپنا کارڈ دے دیا اور اسے چھوڑ کر رخصت ہوگئی۔

محمود کے دماغ میں مسلسل یہ خیال چکراتا رہا تھا کہ مدیحہ اسے فون کرنے کے لیے بے چین ہوگی۔ ایک تو وہ اپنا مسئلہ ہی نہیں بیان کرسکی تھی، دوسرے اب اس کے دماغ میں فریحہ بھی مسلسل چکرانے لگی ہوگی۔ شاید اب وہ اپنے مسئلے سے بھی زیادہ فریحہ کے بارے میں سوچ رہی ہو۔

اس وقت محمود کی بھوک بھی اڑی ہوئی تھی ورنہ وہ گھر میں قدم رکھنے سے قبل اسی علاقے کے ایک ہوٹل کا رخ کرتا جہاں وہ کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے اور بستر پر نیم دراز حالت میں مدیحہ کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ بات ہوجانے کے بعد ہی وہ کھانا کھانے جاتا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے مدیحہ کی کال ریسیو کی۔

''اکیلے ہو، یا......؟'' مدیحہ نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''اکیلا ہی ہوں۔''

''وہ محترمہ چلی گئیں؟'' مدیحہ کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

محمود نے طویل سانس لی۔ ''مجھے شبہ تھا کہ تم کسی غلط فہمی کا شکار ہوسکتی ہو۔ یقین کرو کہ اس سے تعلقات صرف کاروباری قسم کے ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ مجھ سے تصویریں بنوانے آیا کرتی تھی۔ کبھی کہیں سرراہ بھی مل جاتی تھی لیکن ادھر چند ماہ سے وہ ملک سے باہر تھی۔ مجھے اس سے یہ پوچھنے کا خیال ہی نہیں رہا کہ وہ باہر سے کب آئی ہے، لیکن اس وقت اگر وہ اتفاق سے ہمیں پولیس اسٹیشن میں داخل ہوتے نہ دیکھ لیتی اور وہ پولیس افسر بھی اس کا احسان مند نہ ہوتا تو ہم بڑی خراب صورت حال سے دوچار ہوجاتے۔ چھٹکارا تو

خیر مل جاتا لیکن بات ہمارے گھر والوں تک بھی پہنچ جاتی۔ میں تو خیر اپنے گھر والوں سے لاتعلق ہی ہوں لیکن تمہارے لیے مشکل ہوسکتی تھی۔'' محمود نے بڑی وضاحت سے جواب دے ڈالا۔

''وہ تو خیر جو ہوتا، وہ ہوتا، میں تو جب سے اسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ وہ تم سے خاصی بے تکلف ہے۔''

''بس وہ ہوجاتی ہے بے تکلف! میں ریزرو رہتا ہوں۔ تمہیں اپنے دل میں فضول خیالات نہیں لانا چاہئیں۔ اب ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے ملنے کے لیے اتنی بے چین کیوں تھیں؟''

''فون پر وضاحت سے نہیں بتا سکتی ورنہ پہلے ہی بتا دیتی۔'' مدیحہ نے کہا۔ پھر جلدی سے بولی۔ ''اماں جانی آرہی ہیں۔ میں پھر......'' اس نے اپنی بات پوری کیے بغیر ہی رابطہ منقطع کردیا۔

غالباً وہ کہنا چاہتی تھی کہ میں پھر کسی وقت فون کروں گی لیکن اسی وقت غالباً اس کی ماں کمرے میں داخل ہوگئی تھیں اور اسے جملہ ادھورا چھوڑ کر رابطہ منقطع کرنا پڑا تھا۔

محمود اپنے موبائل فون کو گھورتا رہ گیا۔ پھر وہ مدیحہ کے فون کا انتظار ہی کرتا رہ گیا اور رات آدھی سے زیادہ گزر گئی۔ اب اسے بھوک بھی لگنے لگی تھی لیکن اب وقت اتنا گزر چکا تھا کہ ہوٹل بند ہوچکا ہوتا۔ محمود ایک طویل سانس لے کر بستر سے اٹھا، کپڑے تبدیل کیے اور لیٹ گیا۔ عام طور پر مدیحہ رات کے دو بجے کے بعد فون کیا کرتی تھی لیکن اس رات تین بج گئے لیکن مدیحہ کا فون نہیں آیا۔ پھر کسی وقت محمود کی آنکھ لگ گئی۔

وہ دیر سے سونے کا عادی تھا ہی اس لیے صبح وقت پر ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جلدی جلدی تیار ہوا۔ اسے فریحہ کے والد کے ادارے میں جمال سعیدی نام کے ایک شخص سے ملنا تھا۔

تیار ہوکر وہ گھر سے نکلا۔ قریبی ہوٹل میں ناشتا کیا اور پھر دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس سارے دورانیے میں اس کا دماغ اس سوال میں بھی الجھا رہا تھا کہ مدیحہ نے اسے فون کیوں نہیں کیا۔

دفتر پہنچ کر اسے بہ آسانی معلوم ہوگیا کہ جمال احمد سعیدی کا کمرا کہاں تھا۔ وہ وہاں پہنچ کر جمال سعیدی سے ملا۔ اس نے فریحہ کا کارڈ اسے دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' جمال سعیدی نے کارڈ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر میز پر ایک طرف ڈال دیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''فریحہ صاحبہ کا فون کل ہی آگیا تھا۔ بہرحال یہ آپ کے لیے بڑا مناسب موقع ہے۔ باس کے پی اے کی جگہ خالی ہورہی ہے۔''

''لیکن مجھے اس قسم کے کسی کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''فریحہ صاحبہ نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں، کام سمجھنے کے لیے ایک ہفتہ کافی ہوگا۔ باس کا پی اے ابھی گیا نہیں ہے۔ ایک ہفتے بعد جائے گا۔ ان دنوں میں وہ آپ کو سب کچھ سمجھا دے گا۔ میں ابھی اسے بلاتا ہوں۔ آپ اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلے جائیے گا۔ اپائنٹمنٹ لیٹر آپ کو آج ہی مل جائے گا۔''

سعیدی نے جس آدمی کو بلایا، اس کا نام فیروز تھا۔ کچھ گفتگو کے بعد وہ محمود کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گیا۔

''یہ کمرا ہے صاحب کا۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''باس ابھی آئے نہیں ہیں۔ دس گیارہ بجے کے بعد آتے ہیں، میں ابھی سے آپ کو کام سمجھانا شروع کردیتا ہوں۔ بیٹھیے!'' اس نے اپنے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ''باس آپ کو یہاں دیکھ کر چونکیں گے نہیں۔ جمال سعیدی صاحب ان کو اطلاع دے چکے ہیں کہ ایک آدمی کو تربیت کے لیے رکھ لیا گیا ہے۔''

''آپ یہ ملازمت کیوں چھوڑ رہے ہیں؟''

''یہ ملازمت تو لوگ چھوڑتے ہی رہتے ہیں، اچھا ہاں......! آپ ذرا یہ فائل دیکھیے، آپ کو اس کے بارے میں سمجھا دوں۔''

یہ فقرہ محمود کے ذہن سے چپٹ کر رہ گیا کہ ''یہ ملازمت تو لوگ چھوڑتے ہی رہتے ہیں......'' فیروز کے منہ سے شاید یہ بے اختیاری میں نکل گیا تھا کیونکہ پھر اس نے فوراً ہی موضوع بدلا تھا۔

اس دن محمود نے فریحہ کے باپ فرمان کو پہلی مرتبہ دیکھا جب وہ گیارہ بجے کے قریب دفتر آیا۔ فیروز اسے دیکھ کر کھڑا ہوا تھا تو محمود بھی کھڑا ہوگیا تھا۔ فیروز نے سلام کیا تھا تو اس نے بھی سلام کیا تھا۔

''یہ محمود ہیں سر!'' فیروز نے سلام کرنے کے بعد فرمان سے کہا تھا۔ ''میری جگہ یہی آئیں گے اگلے ہفتے سے، میرا مطلب ہے کام کرنے کے لیے اگلے ہفتے سے آئیں گے۔ میں اس ہفتے انہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

فرمان نے رک کر محمود کو ایسی نظروں سے دیکھا جنہیں

محمود کے خیال کے مطابق تمسخرانہ ہی کہا جانا چاہیے تھا۔
''کتنے دن رکو گے؟'' فرمان نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔
''جی؟ میں سمجھا نہیں سر!''
فرمان نے اسے جواب دینے کے بجائے فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سن شائن والوں کی فائل لے کر آؤ۔'' پھر وہ تیزی سے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
فیروز جلدی جلدی کچھ فائلیں الٹنے لگا جو اس کی میز پر جمع تھیں۔
محمود کا دماغ الجھا رہا۔ پہلے تو فیروز نے کہا تھا کہ ''یہ ملازمت تو لوگ چھوڑتے ہی رہتے ہیں۔''
اور اب فرمان نے اس سے پوچھا تھا۔ ''کتنے دن رکو گے؟''
فیروز ایک فائل لے کر جلدی سے فرمان کے کمرے میں چلا گیا۔
لنچ ٹائم میں محمود نے اپنی الجھن رفع کرنے کے لیے فیروز کو کریدنے کی کوشش کی لیکن فیروز نے حد درجہ مبہم جواب دیے۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس موضوع پر گفتگو کرنے سے گریز چاہتا تھا۔
پھر چھٹی کے وقت تک محمود نے بھی وہ بات نہیں چھیڑی۔ چھٹی ہی کے وقت ایک چپراسی نے اسے ایک لفافہ لا کر دیا جو جمال سعیدی نے بھجوایا تھا۔ محمود نے لفافہ کھول کر دیکھا۔ وہ اس کا اپائنٹمنٹ لیٹر تھا۔ اس میں محمود کی جو تنخواہ لکھی تھی، وہ بہت زیادہ معقول تو نہیں لیکن کچھ ایسی غیر معقول بھی نہیں تھی۔
محمود اپنے گھر لوٹتے وقت سوچ رہا تھا کہ اس ماہ کی گزر اوقات کے لیے اسے ابھی ایک ماہ تو مصوری کا سہارا بہ دستور لینا پڑے گا۔ مدیحہ کا خیال اس وقت بھی اس کے ذہن میں تھا۔
رات تک مدیحہ کا فون نہیں آیا تو وہ اتنا بے چین ہوا کہ اس نے ایس ایم ایس کے ذریعے مدیحہ سے سوال کر ڈالا۔ ''کیا بات ہے؟...... تم مجھے فون کیوں نہیں کر رہی ہو؟''
لیکن ایک گھنٹے تک بھی اسے کوئی جواب نہیں ملا تو اس کی بے چینی، پریشانی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس وقت دس بجے تھے۔ مدیحہ رات کے دو بجے بھی فون کر لیتی تھی اس لیے وہ بالکل ہی ناامید نہیں ہوا۔

دو تین منٹ اور گزرے تھے کہ فریحہ کی کال آ گئی۔
''معاف کیجیے گا محمود!'' وہ بولی۔ ''میں دن میں کچھ مصروف رہی اس لیے فون نہیں کر سکی۔ ملازمت مبارک ہو۔ جمال سعیدی سے بہر حال بات ہوئی تھی میری۔ اس نے اپائنٹمنٹ لیٹر تو دے دیا ہے آپ کو!''
''جی ہاں، سب آپ کی نوازش ہے۔''
''پھر وہی بے گانگی کی بات!''
''سوری۔'' محمود شاید مسکرا دیتا لیکن اس کا ذہن مدیحہ میں الجھا ہوا تھا۔
''میں دو ایک دن میں آؤں گی آپ سے ملنے۔'' فریحہ نے کہا۔ ''آپ نے اپنا گھر تو دکھایا نہیں ہے لیکن اندازہ تو ہے کہ جہاں آپ میری کار سے اترتے ہیں، وہاں کہیں قریب ہی ہوگا آپ کا گھر! میں لوگوں سے پوچھتی ہوئی پہنچ جاؤں گی۔''
''ارے نہیں۔'' محمود جلدی سے بولا۔ ''پلیز! گھر نہ آیئے گا...... دفتر سے آنے کے بعد میں تصاویر کا اسٹال تو لگایا کروں گا دو تین گھنٹے کے لیے۔ وہاں آ کے مل لیجیے گا آپ!''
''اب تصویریں بیچنے کی کیا ضرورت ہے سڑک پر بیٹھ کر۔ ملازمت تو مل گئی ہے آپ کو!''
''اس مہینے تو گزر اوقات کسی طرح کرنا ہو گی۔''
''اوہ، اچھا...... خیر! اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''
''بندوبست'' کی وضاحت فریحہ نے نہیں کی اور رابطہ منقطع کر دیا۔
مدیحہ کا فون اس رات بھی نہیں آیا۔ دوسرے دن محمود دفتر تو گیا لیکن اس کا دماغ بہت بری طرح الجھ گیا تھا۔
لنچ سے پانچ منٹ قبل جمال سعیدی نے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور اسے ایک چیک دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی تنخواہ کی آدھی تنخواہ کا چیک ہے۔ اسے آپ جب چاہیں اور جس طرح چاہیں، ایڈجسٹ کروا دیجیے گا۔ مجھے اس بارے میں فریحہ صاحبہ نے ہدایت کی تھی۔''
فوراً محمود کے دماغ میں فریحہ کی بات گونج گئی۔ اس نے گزشتہ رات فون پر اس کی گزر اوقات کے حوالے سے کہا تھا۔ ''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

☰☰☰

تین دن گزر گئے۔ مدیحہ کا فون نہیں آیا۔ محمود روزانہ ایک ایس ایم ایس کرتا رہا لیکن اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا

تھا۔ فریحہ اس سے دوسرے ہی دن اس وقت مل چکی تھی جب وہ گھر جانے کے لیے دفتر سے روانہ ہوا تھا۔ وہ اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہوں۔ محمود کے لیے یہ کوئی الجھی ہوئی بات نہیں تھی جس پر وہ زیادہ غور کرتا۔ الٹرا ماڈرن لڑکیوں کا بوائے فرینڈز بنانا ایک عام سی بات تھی۔ اس سے زیادہ کا اس نے تصور بھی نہیں کیا۔ بس وہ احسان مند ضرور تھا فریحہ کا!

تین دن بعد جب رات کے دو بجے تک مدیحہ کا فون آیا نہ ہی ایس ایم ایس آیا تو اس نے ایک ایس ایم ایس اس تحریر کا کیا۔ ''اب اگر تم نے ایس ایم ایس سے بھی جواب نہیں دیا تو میں فون کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

ایک گھنٹے تک جواب نہیں ملا تو محمود نے اپنی دھمکی کے مطابق فون کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسے خیال آیا تھا کہ اس طرح وہ مدیحہ کے لیے کسی قسم کی پریشانی پیدا نہ کر دے۔

خود اس کی پریشانی تو بہت بڑھ چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے اپنے اوپر غصہ بھی آیا کہ اس نے مدیحہ سے اس کے نئے گھر کا پتا معلوم نہیں کیا تھا۔ فریحہ کی کار سے مدیحہ ایک اچھے اقامتی علاقے میں اتری تو تھی لیکن اپنے گھر کے سامنے نہیں اتری تھی۔ محمود نے اسے ایک گلی میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ اس کا گھر دوسری طرف کہیں ہوگا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے گھر کے سامنے نہیں اتری ہوگی تاکہ اس کی ماں یا بہن اسے اس کار سے اترتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔

اگلے دن وہ دفتر سے چھٹی کے بعد اس علاقے میں گیا اور اندھیرا پھیلنے تک ادھر ادھر گھومتا رہا لیکن اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکا۔

دو دن اور گزر گئے۔ اس سے اگلے دن دفتر پہنچ کر اس نے فیروز کی سیٹ سنبھال لی کیونکہ فیروز گزشتہ روز رخصت ہو چکا تھا۔ اب محمود ہی کو فرمان صاحب کے پی اے کی حیثیت سے اپنی ذمے داری سنبھالنی تھی۔

یہ ذمے داری سنبھالنا محمود کے لیے یوں اور آسان ہو گیا کہ ایک دن قبل ہی فرمان صاحب کسی کاروباری معاملے کو نمٹانے بیرون ملک چلے گئے تھے۔ واپسی بیس اکیس دن سے قبل ممکن نہیں تھی۔ محمود نے وہ دن فائلوں کو اچھی طرح دیکھنے اور انہیں سلیقے کے ساتھ الماری میں لگانے میں گزارے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ فیروز نے وہاں دل لگا کر کام نہیں کیا تھا۔ سب فائلیں بے ترتیب تھیں۔

ان دنوں اسے کچھ سکون اس لیے ہو گیا تھا کہ جس دن اس نے ڈیوٹی سنبھالی تھی، اسی شام اسے مدیحہ کی طرف سے ایک ایس ایم ایس مل گیا تھا۔ ''کوئی مجبوری ہے محمود......! لیکن پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں بیس پچیس دن بعد فون کروں گی تمہیں۔''

یہ پیغام عجیب بہرحال تھا۔ کہاں تو مدیحہ نے بے حد پریشانی ظاہر کی تھی اور کہاں اب اسی سے کہہ رہی تھی کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... دوسرے یہ کہ پہلے خود ہی جلد از جلد ملنے کے لیے بے چین تھی اور اب بیس پچیس دن کا وقفہ دے رہی تھی۔

ان الجھی ہوئی باتوں کے باوجود اس کا ایس ایم ایس مل جانا ہی محمود کے لیے خاصا سکون بخش ثابت ہوا تھا۔

بائیس دن بعد فرمان صاحب بیرون ملک سے لوٹ آئے۔ پھر پہلے ہی دن محمود کو محسوس ہو گیا کہ اس ملازمت پر ٹکے رہنا کسی کے لیے بھی کوئی آسان بات ثابت نہیں ہوتی ہوگی۔ فرمان صاحب ایک نہایت چڑچڑے انسان تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کا پارہ چڑھ جاتا اور محمود کو ''سوری'' کہنا پڑتا۔

چار پانچ دن میں ہی محمود کے لیے صورتِ حال ناقابل برداشت سی ہونے لگی۔

چھٹے دن اسے مدیحہ کا ایس ایم ایس ملا۔ ''ابھی چند دن اور انتظار کر لو۔ بس چار پانچ دن، یا زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ!''

محمود ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

فریحہ اس دوران میں اس سے کئی مرتبہ مل چکی تھی۔ اگلے دن بھی ملی تو محمود نے اس سے کہا۔ ''یہ ملازمت کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوگا۔''

''کیوں؟''

''آپ کے والد بہت چڑچڑے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑنے لگتے ہیں۔''

فریحہ چونکی۔ ''کیا آپ ڈیڈی کے پی اے کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں؟''

''ہاں۔''

''پہلے بھی بتایا نہیں آپ نے؟''

''ایسا کوئی ذکر ہی نہیں چھیڑا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ جمال سعیدی صاحب نے آپ کو بتا دیا ہوگا۔''

''نہیں۔ اس نے نہیں بتایا۔ میں نے بھی پوچھنے کی

ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ آپ ڈیڈی کو چند دن اور برداشت کر لیں۔ میں آج ہی جمال سعیدی کو فون کروں گی کہ وہ آپ کو کسی اور جگہ لگائے، ڈیڈی کے پی اے کے لیے کسی اور آدمی کا بندوبست کرے۔''

''ایسا ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ......''

''ہو جائے گا۔'' فریحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''دراصل میری والدہ کے انتقال کے بعد سے وہ بہت چڑچڑے ہو گئے ہیں۔''

اس کے اگلے دن محمود دفتر پہنچا تو اسے جمال سعیدی کا پیغام ملا کہ لنچ کے اوقات میں وہ آکر اس سے ملے۔

محمود اس سے ملنے پہنچ گیا۔

''پلیز محمود صاحب!...... آپ دس دن صبر کر لیں۔ ایک جگہ ہو جائے گی آپ کے لیے...... فریحہ صاحبہ نے تو کہا ہے کہ بس ایک آدھ دن میں یہ کام ہو جائے لیکن یہ میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ بس زیادہ سے زیادہ دس دن اور گزار لیں۔ فریحہ صاحبہ سے شکایت نہ کیجیے گا۔ پلیز!''

جمال سعیدی بڑے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود محمود سے اتنے دبے ہوئے انداز میں اس لیے بات کرتا تھا کہ اس کی سفارش فریحہ نے کی تھی۔ وہ شاید ڈرتا ہو کہ فریحہ اپنے باپ سے کہہ کر اسی کو ملازمت سے نہ نکال دے۔

''اچھا!'' محمود کو اس پر ترس آ گیا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح دس دن گزار لوں۔''

''فریحہ صاحبہ سے کچھ نہ کہیے گا۔''

''ٹھیک ہے۔''

محمود اس کے کمرے سے نکل آیا لیکن اسے احساس ضرور تھا کہ دس دن نکالنا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ مدیحہ کی وجہ سے اس کا دماغ ویسے ہی الجھا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں فرمان صاحب کی چڑچڑاہٹ اس کے لیے ناقابل برداشت ہی ہونے لگتی تھی۔

پانچ دن بعد محمود کو اپنی تنخواہ ملی۔ اس نے ایڈوانس ملی ہوئی رقم کٹوا دی۔ دراصل اسے اندیشہ تھا کہ دس دن پہلے ہی اس کی قوت برداشت جواب دے گئی تو وہ استعفیٰ دے دے گا۔ اگر اس کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ تصویریں بنا بنا کر بیچا کرے تو یہی سہی!

اور ایسی صورتِ حال اتفاق سے اسی دن پیش آ گئی۔

فرمان صاحب سے ایک فائل پر دستخط کروا کے وہ واپس لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ فرمان صاحب نے اسے روک لیا۔

''تم مسلمان ہو؟'' سوال کیا گیا تھا۔

محمود کا دماغ گھوم گیا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔

''جی سر!''

''کیا اس لیے مسلمان ہو کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے؟''

''جی!'' محمود نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

''قرآن شریف پڑھا ہے؟''

''جی۔ بچپن میں پڑھا تھا۔''

''عربی جانتے ہو؟''

''جی نہیں۔''

''پھر کیا خاک پڑھا...... جب سمجھا نہیں تو مسلمان کیسے ہو گئے؟ اب جا سکتے ہو۔''

محمود کمرے سے نکلا تو اس کا خون کھول رہا تھا۔ اپنی میز پر پہنچ کر اس نے فائل ایک طرف پٹخی اور ایک کاغذ پر قلم سے اپنا استعفیٰ لکھنے لگا۔ لکھ کر اس نے ٹائپسٹ کو دیا۔

''جلدی ٹائپ کر کے لاؤ میری میز پر!''

پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اپنی میز پر جا بیٹھا۔ وہ بہت ہی تلملایا ہوا تھا۔ جلد ہی ٹائپسٹ آ گیا۔ اس نے ٹائپ کیا ہوا کاغذ آگے بڑھایا۔

''لیجیے صاحب......! فیروز صاحب کا استعفیٰ میں نے ان کی ملازمت کے دو ماہ بعد ٹائپ کیا تھا۔ یہی ہوتا ہے صاحب یہاں۔ کوئی بھی دو تین مہینے سے زیادہ نہیں ٹکتا۔''

''کیا اس ادارے کے مالک کا دماغ خراب ہے؟''

''معلوم نہیں صاحب! لڑکیاں ملازم ہوتی ہیں تو ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ وہ جب ان کی شادی وادی کا چکر چلتا ہے، تبھی چھوڑتی ہیں وہ یہ ملازمت۔''

''ہوں۔'' محمود نے اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ فرمان علی عیاش ہو یا نہ ہو، ٹھرکی ضرور ہے لیکن اسے اپنے جی ایم سے یہ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی ہوگی کہ اس کی پی اے کی سیٹ کے لیے کسی لڑکی ہی کا بندوبست کیا جائے۔

محمود نے استعفیٰ ایک لفافے میں رکھ کر بند کیا اور سیدھا جمال سعیدی کے کمرے میں پہنچا۔ اس نے لفافہ جمال سعیدی کے سامنے ڈالا اور کچھ کہے بغیر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

''کیا ہے یہ؟'' جمال سعیدی نے تیزی سے پوچھا۔

''دیکھ لیجیے!'' محمود نے مڑ کر دیکھے بغیر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا...... عمارت سے نکلنے میں بھی اس نے دیر نہیں لگائی تھی۔ اپنے گھر پہنچ کر وہ بستر پر گر گیا اور اپنی

پیشانی مسلنے لگا۔
شام کو وہ صرف کھانا کھانے کے لیے گھر سے نکلا اور واپس آ کر پھر لیٹ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ دوسرے دن وہ اپنا پینٹنگ کا سب سامان نکال کر دوبارہ وہی کام شروع کر دے گا۔
ایک بار اسے خیال آیا کہ فریحہ کو فون پر اطلاع دیدے لیکن پھر اس نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ فریحہ کو اطلاع دے۔
گیارہ بجے کے قریب اسے مدیحہ کا ایس ایم ایس ملا۔ ”گھر کا پتا بھیج رہی ہوں۔ کل شام ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آ جانا۔“
محمود حیران رہ گیا۔ پتا اس علاقے کا نہیں تھا جہاں مدیحہ، فریحہ کی کار سے اتری تھی۔ اس علاقے کا پتا نہ ہونا محمود کے لیے زیادہ تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن وہ پتا شہر کے نہایت متمول علاقے کا تھا۔ یہ بات محمود کا دماغ تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کے مالی حالات اس قدر اچھے ہو گئے ہوں گے کہ انہوں نے اس علاقے میں گھر لے لیا، یا بنوا لیا۔
تو پھر؟
کس کا گھر ہو گا یہ؟
ان دو سوالوں نے محمود کے دماغ کو جیسے نچوڑ کر رکھ دیا۔ رات کو اسے ٹھیک سے نیند بھی نہیں آ سکی اور دوسری صبح اسے فریحہ کا فون موصول ہوا۔
”مجھے آپ سے فوراً ملنا ہے، ابھی!“
”خیریت؟“ محمود نے پوچھا۔
”یہ میں ملاقات ہونے پر ہی بتا سکوں گی۔“
محمود اگرچہ ذہنی طور پر بہت الجھا ہوا تھا لیکن فریحہ کو ٹالنا اسے مناسب نہیں معلوم ہوا۔ وہ اس کی محسن تھی۔
”کہاں ملنا ہے؟“ اس نے پوچھا۔
فریحہ نے جگہ کے بارے میں بتایا اور پھر کہا۔ ”بریف کیس ضرور ساتھ لایئے گا۔“
”بریف کیس؟“ محمود کو تعجب ہوا۔
”ہاں۔ ضروری ہے، وجہ بھی آپ کی سمجھ میں آ جائے گی۔ بس آپ دیر نہ کیجیے گا۔“
اس سے پہلے کہ محمود مزید کچھ کہتا، دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔
محمود نے ملازمت حاصل ہوتے ہی ایڈوانس رقم ملنے کے بعد ایک بریف کیس خرید لیا تھا کہ شاید اب اس کی ضرورت پڑے لیکن یہ خیال اسے آ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی ضرورت فریحہ کی وجہ سے پڑے گی۔
بریف کیس جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ محمود نے اس میں کچھ پرانے رسالے اور کتابیں وغیرہ بھریں تاکہ وہ ہلکا پھلکا نہ محسوس ہو۔

☆☆☆

مقررہ وقت پر محمود شہر کے ایک مشہور علاقے کے ایک بس اسٹاپ پر پہنچ گیا۔ فریحہ کار لے کر آئی اور محمود کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے کہنے پر محمود نے ہوٹل میں ایک کمرا لیا۔ اسی کمرے میں ان کی دوسری ملاقات شام کو ہوئی۔ فریحہ کھل کر سامنے آ گئی۔ اس کا اظہار محبت، محمود کے پیروں سے اس کا لپٹ جانا، رو پڑنا۔ بہت کچھ ہو گیا۔ محمود کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ اگر اس نے فریحہ کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تو وہ وہی سب کچھ کر گزرے گی جو اس نے کہا تھا۔ اس کی اس تباہی کا ذمے دار محمود خود کو ہی سمجھتا لیکن اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ مدیحہ کو دھوکا دیتا۔ وہ فریحہ کو ہوٹل میں چھوڑ کر اور اس سے یہ وعدہ کر کے ہی وہاں سے روانہ ہو سکا کہ وہ فرمان صاحب کو اس ہوٹل میں فریحہ کے قیام کی اطلاع نہیں دے گا اور اس کے پاس واپس بھی آئے گا، اس کے بارے میں، یعنی اس کی محبت کے بارے میں بھی کچھ سوچے گا۔
لیکن ہوٹل سے روانگی کے بعد اس کا دماغ شل سا ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فریحہ کے لیے کیا کر سکے گا۔
اس وقت آٹھ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ اسے ساڑھے آٹھ بجے اس پتے پر بھی پہنچنا تھا جہاں مدیحہ نے اسے بلایا تھا۔ وقت کم تھا اس لیے محمود کو ٹیکسی کرنا پڑی۔ پھر بھی اسے ڈر تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اس کا یہ ڈر درست بھی ثابت ہوا لیکن وہ کچھ زیادہ لیٹ نہیں ہوا تھا۔ گھر تلاش کرنے میں زیادہ وقت تو نہیں لگا تھا لیکن پانچ منٹ کی تاخیر بہر حال ہو گئی تھی۔
ایک ملازم کو اس نے اپنا نام بتایا۔
”آیئے!“ ملازم نے مودبانہ انداز میں ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”بیگم صاحبہ آپ کی منتظر ہیں۔“
محمود کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا ہو۔ ”بیگم صاحبہ“ کے الفاظ اس کے دماغ پر دھماکا سا کر گئے تھے۔ اسے خیال یہ آیا تھا کہ مدیحہ کی شادی کسی مال دار شخص سے ہو چکی تھی۔ کوئی ملازم کسی غیر شادی شدہ عورت

کے لیے ”بیگم صاحبہ“ کے الفاظ منہ سے نہیں نکال سکتا تھا۔
لیکن اس وقت اس کا ہیجان یکلخت ختم ہو گیا جب اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا اور وہاں اسے آپا بیگم بیٹھی نظر آئیں۔ فوراً اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ ملازم نے ”بیگم صاحبہ“ کے الفاظ آپا بیگم کے لیے استعمال کیے تھے۔
وہ نہایت قیمتی ساری میں ملبوس ایک صوفے پر بیٹھی تھیں۔ محمود نے انہیں ڈھائی سال بعد آج دیکھا تھا۔ وہ اس وقت سے زیادہ پرکشش اور باوقار دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک شاندار بنگلے کے ڈرائنگ روم، نہایت قیمتی ملبوس اور میک اپ کے باعث انہیں پروقار نظر آنا ہی چاہیے تھا۔
محمود بھونچکارہ گیا تھا۔
”کیا بڑوں کو سلام کرنے کی عادت نہیں رہی تمہیں؟“ آپا بیگم اسے گھورتے ہوئے بولیں۔
”جی...... نہیں...... جی نہیں...... وہ...... دراصل......“
”حیران رہ گئے ہو!“ آپا بیگم کا لہجہ سپاٹ رہا۔
”جی!“
”آؤ، بیٹھو!“ آپا بیگم نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔
”آداب چچی جان!“ محمود کہتا ہوا آگے بڑھا۔
”جیتے رہو۔“
محمود ان کے سامنے بیٹھ کر مستفسرانہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔
”تم مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“ وہ بولیں۔
”جی۔“ محمود نے نظریں جھکا لیں۔
”کیا کر رہے ہو آج کل؟“
”بی کام کر چکا ہوں۔ ایک ملازمت مل گئی تھی۔ کسی وجہ سے کل استعفیٰ دے دیا ہے۔ اب کوئی دوسری ملازمت تلاش کروں گا۔“
”کتنی تنخواہ مل سکے گی؟“
”ابتدا میں پچیس تیس ہزار تو مل ہی جائیں گے۔“
”اب مدیحہ ایک بہت مال دار ماں کی بیٹی ہے۔“
”جی...... لیکن...... میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔“
”اس سے تمہاری شادی کے لیے میں تیار ہوں لیکن میری دو شرطیں ہیں۔“ آپا بیگم سپاٹ لہجے میں بول رہی تھیں۔
محمود سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔
”تفصیلات مدیحہ تمہیں خود بتانا چاہتی ہے۔“ آپا بیگم نے کہا اور پھر آواز دے کر ادھیڑ عمر ملازمہ کو بلایا۔

''انہیں بے بی کے کمرے میں پہنچادو۔'' ملازم کو حکم دیا گیا۔ پھر آپا بیگم نے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ! مدیحہ سے مل لو۔''

محمود اٹھ کر ملازمہ کے ساتھ چل پڑا۔

مدیحہ کو غالباً معلوم تھا کہ محمود کو اس کے پاس بھیجا جائے گا۔ اسی لیے اس نے قدموں کی آہٹ سنتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔

''یہ کیا حالت بنالی ہے تم نے اپنی؟'' محمود تیزی سے آگے بڑھا۔

مدیحہ کی صحت بہت زیادہ خراب نظر آرہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔

''ٹھیک تو ہوں۔'' مدیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

محمود کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ مدیحہ نے دروازہ بند کرلیا۔

''آؤ، بیٹھو!''

محمود نے اس کا بیڈ روم بھی نہایت قیمتی چیزوں سے آراستہ دیکھا، لیکن اس پر توجہ دینے کے بجائے پھر مدیحہ سے پوچھ بیٹھا۔ ''یہ کیا حالت ہوگئی ہے تمہاری؟''

''اسی کو بہت سمجھو کہ ابھی زندہ تو ہوں۔'' مدیحہ کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''ارے! ارے!'' محمود کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

مدیحہ ٹیشو پیپر سے اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ پھر کچھ توقف سے بولی۔ ''بہت حیران ہوئے ہوگے تم یہاں آکر؟''

''قدرتی بات ہے!...... آخر یہ سب......''

''یہ آپا بیگم کا انتقام ہے...... خاندان والوں سے......'' مدیحہ نے جواب دیا۔ ''ہمیں بہت حقیر سمجھ لیا گیا تھا نا؟''

''لیکن کیا تم اس کا دوش مجھے دوگی؟ میں تو خود ہی اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر زندگی گزار رہا ہوں۔''

''میں نے ایک بات کہی۔ تمہیں دوش نہیں دے رہی ہوں۔ جو رویہ خاندان والوں نے اپنایا تھا، اس کا صدمہ بھی تھا آپا بیگم کو، اور غصہ بھی......! اسی لیے وہ تم سے میری شادی کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ تمہیں یاد ہوگا، جب میں نے آخری مرتبہ فون کیا تھا تو بات پوری نہیں کرسکی تھی۔ آپا بیگم آگئی تھیں۔ میں اگر اطمینان سے موبائل بند کرکے رکھ دیتی تو شاید انہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا لیکن میں نے گھبرا کر موبائل فون چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اس پر انہوں نے ڈانٹ کر مجھ سے موبائل لے لیا تھا۔ اس طرح انہوں نے جان لیا کہ وہ کال میں نے ہی تمہیں کی تھی۔ اس سے پہلے وہ مجھ سے کہہ چکی تھیں کہ میں تمہارا خیال بھی اپنے دل سے نکال دوں لیکن جب انہوں نے دیکھ لیا کہ میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا تو وہ بے حد ناراض ہوئیں۔ انہوں نے مجھ پر پابندی لگا دی کہ گھر سے نہیں نکلوں گی۔ میرا موبائل بھی انہوں نے اپنے قبضے میں کرلیا۔ میں اسی دن شدید بخار میں مبتلا ہوگئی تھی۔ کافی دن تک بیمار رہی ہوں۔''

''وہ تو تمہاری صحت سے اندازہ ہو رہا ہے لیکن تمہارا موبائل اگر انہوں نے لے لیا تھا تو مجھے تم نے ایس ایم ایس کیسے کیے؟''

''میں نے نہیں کیے۔ آپا بیگم نے کیے تھے لیکن مجھے بتادیا تھا۔ میری بیماری کی وجہ سے وہ کچھ نرم پڑی تھیں اور انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم ان کی دو شرطیں پوری کرسکے تو وہ تم سے میری شادی کرنے کے لیے تیار ہوجائیں گی۔''

''شرطیں......؟ کیسی شرطیں؟''

''آپا بیگم نے مجھے فوراً نہیں بتائی تھیں۔ کل بتائی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب ہم اس نئے گھر میں منتقل ہوجائیں گے تبھی وہ مجھے شرطیں بتائیں گی اور تمہیں یہاں بلائیں گی۔''

''پہلے تم نے جب گھر بدلا تھا تو مجھے کوئی اور پتا بتایا تھا۔''

''غلط نہیں بتایا تھا۔ پہلے ہم اسی گھر میں منتقل ہوئے تھے لیکن اس کے کچھ عرصے بعد جب آپا بیگم نے شادی کرلی تو......''

''شادی کرلی؟'' محمود چونکا۔

''ہاں۔'' مدیحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''وہ بہت پیسے والے آدمی ہیں۔ انہوں ہی نے یہ نیا گھر بنوا کے ممی کو دیا ہے، وہ فرمان انڈسٹریز کے مالک ہیں، فرمان علی نام ہے۔''

محمود مدیحہ کا منہ تکتا رہ گیا۔ اس نے فرمان انٹرپرائز ہی میں ملازمت کی تھی جس کے مالک فریحہ کے والد فرمان علی تھے۔

مدیحہ کچھ رک کر افسردہ سے لہجے میں بولی۔ ''آپا بیگم تمہیں چار پانچ دن پہلے بلاتیں لیکن مقررہ وقت تک اس گھر کی فنشنگ نہیں ہوسکی تھی۔ اس میں چار پانچ دن اور لگ گئے۔ آپا بیگم تمہیں اس نئے گھر میں اس لیے بلانا چاہتی تھیں کہ تم ان کی شان و شوکت دیکھ سکو۔''

''ان کی شرطیں تمہیں بتائیں تم نے!'' محمود نے پوچھا مگر اس کا ذہن فرمان علی ہی میں الجھا ہوا تھا۔

''کیا بتاؤں!'' مدیحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم ان کی ایک شرط پوری کرنے میں تو کامیاب ہوسکتے ہو لیکن دوسری شرط پوری کرنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ بس میں اصرار کرتی رہی ہوں آپا بیگم سے کہ تم دوسری شرط بھی پوری کردو گے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نہیں کرسکو گے۔ میں آپا بیگم سے اصرار اس لیے کرتی رہی کہ تم سے آخری بار مل تو لوں۔'' مدیحہ کی آواز بھرا گئی۔

محمود اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر مدیحہ کی طرف دیکھتا رہا۔

مدیحہ نے اپنے جذبات پر قابو پانے میں کچھ وقت لیا، پھر بولی۔ ''ان کی ایک شرط تو یہ ہے کہ تمہارے لیے میرا رشتہ مانگنے کے لیے تمہارے والدین آپا بیگم کی چوکھٹ پر آئیں۔''

''اوہ!'' محمود کے منہ سے نکلا۔

مدیحہ کہتی رہی۔ ''آپا بیگم کے دل میں آگ لگی ہوئی ہے کہ تمہارے گھر والوں نے ہمارا سوشل بائیکاٹ کیا تھا۔ ہم سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اگر وہ خود اس چوکھٹ پر آئیں گے تو آپا بیگم کے کلیجے کی وہ آگ ٹھنڈی ہوجائے گی۔ میں سمجھتی ہوں، آپا بیگم نے یہ شادی کی ہی اس لیے ہے کہ انتقام لے سکیں۔''

محمود نے پہلو بدلا۔

مدیحہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ شرط تو تم پوری کرسکتے ہو۔ اتنے عرصے بعد گھر جاؤ گے تو ضرور تمہیں گلے سے لگالیا جائے گا۔ تم نے تعلیم بھی حاصل کرلی ہے۔ تمہارے گھر میں کسی نے بھی اتنا نہیں پڑھا۔ اس اعتبار سے تم ایک کامیاب انسان کی حیثیت سے وہاں قدم رکھو گے، اور اگر چچا جان نے کچھ بڑا پن دکھانے کی کوشش بھی کی تو چچی جان ان پر دباؤ ضرور ڈالیں گی۔ وہ ان سے یہ بات منوالیں گی کہ میرا رشتہ مانگنے کے لیے وہ آپا بیگم کے پاس آئیں۔ ویسے تو میں سمجھتی ہوں کہ ساری دنیا ہی پیسے والے کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔''

''لیکن......'' محمود کچھ کہتے کہتے رکا، پھر بولا۔ ''دوسری شرط کیا ہے؟''

''آپی کا رشتہ ایک بہت مالدار گھرانے میں طے ہوچکا ہے۔ اگلے مہینے ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہوچکی ہے۔ بڑے گھر میں ان کا رشتہ طے ہونا تعجب کی بات اس لیے نہیں ہے کہ ہمارے نئے والد کے پاس دولت کی بہت ریل پیل ہے۔ وہ اپنی سوتیلی بیٹیوں کے لیے بھی اعلیٰ درجے کے رشتے حاصل کرسکتے ہیں۔''

''میں نے شرط پوچھی تھی تم سے مدیحہ!''

''شرط۔'' مدیحہ نے ٹھنڈی سانس لے کر نظریں جھکالیں۔ ''شرط یہ ہے کہ تم بھی مجھے وہ آسائشات مہیا کرو جو آپی کو حاصل ہوں گی۔''

''ہوں۔'' محمود تلخی سے مسکرایا۔ ''یعنی کار، بنگلا، زیورات اور...... اور...... نہ جانے کیا کیا!''

مدیحہ نے پھر ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم یہ دوسری شرط کسی قیمت پر بھی پوری نہیں کرسکتے۔ بس آخری بار ملنا چاہتی تھی تم سے۔ اس بہانے دیکھ لیا تمہیں۔''

''تم اس رات مجھ سے کیوں ملی تھیں جب ہمیں ایک پولیس کانسٹیبل پولیس اسٹیشن لے گیا تھا۔''

''مجھے یہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ آپا بیگم ان بدلے ہوئے حالات میں تم سے میری شادی کے لیے تیار نہیں ہوں گی، میں تمہیں انہی سب حالات سے باخبر کرنا چاہتی تھی۔ مشورہ بھی کرنا تھا کہ ہم دونوں کو ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔''

''کوئی حل تھا تمہارے ذہن میں؟''

''نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید تم......!''

محمود کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ مدیحہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ محمود نے کال ریسیو کی جو فریحہ کی تھی۔ اس نے فریحہ کی بات سنے بغیر کہا۔ ''میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں آؤں گا، پھر بھی......''

''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے محمود!'' فریحہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک بہت ضروری چیز خریدنے کے لیے میں کمرے سے نکلی تھی۔ ہوٹل ہی کی ایک شاپ سے کچھ خریدنا تھا۔ وہاں مجھے رفیق نے دیکھ لیا۔''

''کون رفیق؟'' محمود نے بے ساختہ پوچھا۔

''بھول گئے؟'' فریحہ بولی۔ ''جب تم نے اپنے پاس ہونے کی خوشی میں میری دعوت کی تھی تو وہاں ایک شخص نے آکر بدتمیزی کی تھی۔ میں نے تمہیں اس کا نام بتایا تھا۔''

''ہاں ہاں، اب یاد آگیا۔''

''میں اس کی نظروں سے بچ کر ہوٹل سے نکل آئی تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈتا رہ گیا ہوگا۔ اب میں ایک اور ہوٹل میں ہوں۔ مجبوراً مجھے یہ کمرا اپنے ہی نام سے لینا پڑا ہے۔ شناختی کارڈ تو دینا پڑتا ہے نا ہوٹل والوں کو۔ اسی لیے مجھے ڈر ہے کہ ڈیڈی مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ رفیق نے انہیں اطلاع ضرور دی ہوگی۔ وہ مجھے بہت جلد تلاش کرسکتے ہیں اس لیے میں یہاں زیادہ دیر تک

رکنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی۔ تم فوراً میرے پاس آؤ۔ ایک گھنٹے بعد میں تمہیں یہاں نہیں ملوں گی۔ میں نہیں چاہتی، کسی قیمت پر نہیں چاہتی کہ ڈیڈی مجھے تلاش کرلیں۔ چلی جاؤں گی میں اس شہر سے، اور یہ ملک ہی چھوڑنے کی کوشش کروں گی۔ خواہ تمہارے خیال کے مطابق میں برباد ہی کیوں نہ ہوجاؤں۔" فریحہ نے سسکی لی۔

"کس ہوٹل میں ہو؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

فریحہ نے ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتایا۔

"اچھا میں آرہا ہوں۔" محمود نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

"کیا ہوا؟ کون ہے؟" مدیحہ بے چینی سے پوچھ بیٹھی۔

"ایک دوست ہے، بہت پریشانی میں ہے۔ مجھے جانا ہوگا مدیحہ!"

"آج کے بعد ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔" مدیحہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں کل آؤں گا۔ میں آپا بیگم سے یہ بات کہہ کر جاؤں گا۔" محمود کھڑا ہوگیا۔

"کل تک تم کیا کرسکو گے؟"

"کل تک یہی سوچوں گا کہ کیا کرسکتا ہوں۔"

فریحہ جس طرح ہوٹل میں پیش آچکی تھی، اس سے محمود بہت متاثر ہوگیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات طے تھی کہ فریحہ نے اسے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا اور ناکامی کی صورت میں وہ خود کو تباہ و برباد کرنے پر تل چکی تھی۔ محمود اس کا احسان مند بھی تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فریحہ خود کو تباہی کے راستے پر ڈال دے۔

ڈرائنگ روم میں اس نے آپا بیگم سے کہا۔ "میں کل آؤں گا چچی جان! کل ہی بتا سکوں گا کہ میں آپ کی شرطیں پوری کرسکتا ہوں یا نہیں!"

آپا بیگم کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ نظر آئی تھی لیکن محمود اسے نظر انداز کرتا ہوا گھر سے نکل آیا تھا۔

❊ ❊ ❊

ٹیکسی کے ذریعے اس ہوٹل تک پہنچنے میں محمود کو دیر نہیں لگی۔ اس نے ٹیکسی ہوٹل کے احاطے میں داخل کروانے کے بجائے پھاٹک کے قریب رکوالی۔ راہ میں تھا تو فریحہ کی کال آئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ وہ اسے ہوٹل کے پھاٹک کے باہر ہی مل جائے گی۔

وہ اس وقت اسی کار میں تھی جسے وہ اپنی کسی دوست کی کار کہتی تھی۔ وہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے خود ہی محمود کے لیے برابر کی نشست کا دروازہ کھولا۔ محمود نے بیٹھ کر آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ دروازہ بند ہونے سے پہلے ہی کار حرکت میں آچکی تھی۔

"تم نے تو کہا تھا کہ......" محمود نے کہنا چاہا۔

"ہاں، میں نے ہوٹل کا کمرا لیا ہے لیکن چونکہ اپنے نام سے لینے پر مجبور تھی اس لیے گھبرائی ہوئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے نام کی وجہ سے ڈیڈی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے میں نے اپنی دوست کو فون کیا تھا کار کے لیے۔ اس نے شوفر کے ذریعے کار بھجوادی تھی۔ شوفر کو رخصت کرنے کے بعد ہی میں نے تمہیں فون کیا تھا کہ ہوٹل کے باہر ہی مل جاؤں گی۔"

"اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"کوئی منزل...... فی الحال تو نہیں ہے۔" فریحہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بس میں ہوٹل میں نہیں رکنا چاہتی۔ دوسرے یہ کہ میں تمہارا جواب چاہتی ہوں۔"

"میں نے سوچنے کی مہلت لی تھی تم سے!"

"لیکن اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" فریحہ نے کہا۔ "رفیق نے مجھے ہوٹل میں دیکھا تھا۔ اسے شبہ ہوگیا ہوگا کہ میں اب کسی اور ہوٹل کا رخ کروں گی۔ نتیجہ یہ کہ اب وہ سارے ہوٹلوں کو چھان مارے گا۔ کم از کم میرے دماغ میں یہی بات آئی ہے۔"

"آخر تم اس شخص سے اتنا بھاگ کیوں رہی ہو؟"

"ڈیڈی اسی سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ یہ معاملہ خاصے عرصے سے چل رہا ہے اور میں ٹالتی رہی ہوں۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ میں نے تمہیں دیکھا اور تمہیں پسند کرنے لگی۔"

"تم اسے کیوں ناپسند کرتی ہو۔"

"اب تو اس لیے بھی کہ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔" فریحہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "لیکن پہلے بھی میں اس سے شادی کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ وہ نہایت سخت گیر شخص ہے۔ اس کی ایک بیوی تو اس کے ظلم وستم سے تنگ آکر خودکشی کرچکی ہے۔"

محمود چونک کر بولا۔ "تمہارے ڈیڈی کو اس کا علم نہیں؟"

"شروع میں تو نہیں تھا لیکن بعد میں ہوگیا۔"

"اس کے باوجود وہ چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی اسی سے ہو......؟"

"ہاں۔" فریحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ "بعد میں وہ اس سے خائف رہنے لگے تھے۔"

"خائف؟" محمود نے حیرت سے کہا۔

فریحہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔ اس کی نظریں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کار ایسی سڑکوں پر دوڑا رہی تھی جہاں ٹریفک بہت کم تھا۔

"مگر کیوں؟" محمود نے بے چینی سے پوچھا۔ "کیا وہ کوئی جرائم پیشہ شخص ہے؟"

"جرائم پیشہ اگر ہے تو مجھے اس کا علم نہیں۔"

"تو پھر تمہارے ڈیڈی اس سے خائف کیوں رہنے لگے؟"

"وہ انہیں بلیک میل کررہا ہے۔"

"کس معاملے میں؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

فریحہ کے چہرے پر پریشانی ظاہر ہونے لگی۔

"بتاؤ فریحہ!" محمود نے زور دے کر کہا۔

"پلیز محمود! پلیز! مجھے علم نہیں۔ بس میں تمہارا فیصلہ جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے اپنی محبت مل جائے گی یا نہیں؟...... ایک بات بتادوں میں تم کو۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے سوچا تھا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا۔ تمہاری یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی کہ اگر میں نے یہ شہر یا یہ ملک چھوڑا تو میں ایسے غلط ہاتھوں میں بھی پہنچ سکتی ہوں جو مجھے کسی قحبہ خانے کی زینت بنادیں گے یا مجھ سے اسی قسم کے کام لینے پر مجبور کردیں گے۔ یعنی کال گرل بنادیں گے۔ میں وہ ذلیل زندگی اپنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں نے دوسرا راستہ سوچا ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"میں نہ تو خود کو تباہی کے راستے پر ڈالوں گی اور نہ ڈیڈی کو تباہ ہونے دوں گی۔" فریحہ نے جواب دیا اور پھر یکایک اس طرح چپ ہوئی جیسے بے اختیار کوئی بات اس کے منہ سے نکل گئی ہو جو اسے اپنی زبان پر نہیں لانا چاہیے تھی۔

جو بات اس کے منہ سے نکل گئی تھی، اس نے محمود کو چونکا دیا۔ "تمہارے ڈیڈی کس طرح تباہ ہوسکتے ہیں؟"

"اگر میں زندہ رہی اور ڈیڈی نے میری شادی اس سے نہ کی تو وہ رفیق کی وجہ سے کسی پریشانی کا شکار ہوجائیں گے جو میں نہیں چاہتی۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم میرے نہ ہوسکے تو میں خودکشی کرلوں گی۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میں کچھ لینے کے لیے اپنے کمرے سے نکلی تھی۔ ہوٹل کی ایک شاپ سے میں نے ایک چھوٹا سا چاقو خریدا تھا۔ وہ اتنا بڑا تو نہیں ہے کہ میں اسے اپنے سینے میں گھونپ کر مرسکوں لیکن اتنا تیز ضرور ہے کہ میں اس سے اپنی شہ رگ کاٹ سکتی ہوں۔ یہ کام میں کسی ویران جگہ پر جاکے کروں گی تاکہ مجھے بچانے والا کوئی نہ ہو۔ میرا خون بہتا رہے گا اور میں آخرکار مرجاؤں گی۔"

محمود اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔

وہ پھر بولی۔ "اگر تمہیں یقین نہ ہو تو میرا پرس دیکھ لو۔ چاقو اسی میں رکھا ہے۔"

پرس ڈیش بورڈ پر رکھا تھا۔ محمود نے وہ جلدی سے اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ہزار ہزار روپوں کی دو گڈیوں کے علاوہ کچھ متفرق نوٹ بھی تھے۔ عورتوں کی ضروریات کا چھوٹا موٹا سامان بھی تھا اور ایک چھوٹا سا چاقو بھی......

محمود نے وہ چاقو نکال کر دیکھا۔ وہ چھوٹا ہی سا تھا لیکن اس کی دھار بہت تیز تھی۔ محمود نے وہ اپنی جیب میں ڈال کر پرس واپس رکھ دیا۔

"اس سے کیا ہوگا!" فریحہ تلخی سے ہنسی۔ "ایسے ہزاروں چاقو اور خریدے جاسکتے ہیں۔ ایسے چاقو خریدنے کے لیے لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

محمود دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

"پریشان ہوگئے کچھ؟" فریحہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"دوراہے پر آن کھڑا ہوا ہوں۔" محمود کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "ایک طرف تم ہو اور دوسری طرف......"

"مدیحہ۔" فریحہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کیسے نام ہیں ہم دونوں کے! جیسے ہم دونوں بہنیں ہوں۔ تم خود کو دوراہے پر کیوں سمجھ رہے ہو؟ میں نے کہا تو تھا شاید تم سے! مجھے اس سے تمہاری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اسے تم زیادہ وقت دیا کرنا۔ میرے لیے تو اتنا بھی کافی ہوگا کہ تم ہفتے دس دن میں بھی میرے پاس آجایا کرنا۔ مجھے یہ خوشی تو حاصل رہے گی کہ میں نے اپنی محبت پالی۔" آخر میں فریحہ گلوگیر ہوگئی تھی۔

"وہاں بھی میرے سر پر دو امتحان کھڑے ہوگئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟ کیسے امتحان؟"

"تمہارے پاس سے میں سیدھا مدیحہ کے گھر ہی گیا تھا۔ وہاں اس کی والدہ نے بھی دو ایسی شرائط رکھی ہیں جن میں سے ایک تو میں یقیناً پوری نہیں کرسکتا۔"

"کیا شرائط ہیں؟ مجھے بتاؤ......! شاید میں تمہاری کوئی مدد......"

"نہیں۔" محمود نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"میں تمہاری کوئی مدد نہیں لینا چاہتا فریحہ......! اول تو تم کچھ کر نہیں سکتیں اور اگر کر بھی سکو تو میں خود کو اپنی ہی نظروں میں گرالوں گا۔"

"تم مجھے بتاؤ تو۔"

"پہلے تم مجھے بتاؤ وہ بات جس نے میرا دماغ بہت بری طرح الجھا دیا ہے۔ فرمان صاحب کو رفیق کس طرح بلیک میل کر رہا ہے؟"

فریحہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے سوچ بچار کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کار اس وقت بیس پچیس میل کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

"ابھی تک......" آخر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نہیں جانتی کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ بنی ہے یا نہیں لیکن میرے دل میں تو صرف تم ہو محمود......! تم نے اگرچہ نہیں بتایا کہ مدیحہ کے معاملے میں تمہارے سامنے کیا شرطیں آگئی ہیں لیکن میں تمہیں وہ بات بتائے دیتی ہوں جو تم جاننا چاہتے ہو۔"

محمود ابھی تک سر آگے جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اب وہ سیدھا ہوا اور سوالیہ نظروں سے فریحہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرے والد، آج جو کچھ ہیں، شادی سے پہلے نہیں تھے۔" فریحہ نے کھوئے کھوئے سے انداز میں بولنا شروع کیا۔ "ایک معمولی سے آدمی تھے۔ وہ ایک تاجر تو جب بھی تھے لیکن معمولی...... اتنے معمولی کہ ان کے پاس موٹر سائیکل سے بڑی کوئی سواری نہیں تھی۔ وہ ایک میڈیکل اسٹور کے مالک تھے۔ میڈیکل اسٹور، پلس جنرل اسٹور۔ میری والدہ وہاں سے دوائیں یا دوسری چیزیں خریدا کرتی تھیں۔ یہ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں جب میری والدہ نوجوان تھیں۔ ڈیڈی سے ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ میری ممی ان کے اسٹور پر جاتی رہیں تو وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ میری ممی بس قبول صورت تھیں لیکن ڈیڈی اپنی جوانی میں بہت وجیہہ اور خوب صورت تھے۔ میرے نانا اس وقت بہت بڑے بزنس مین تھے۔ میری نانی کا انتقال ہو چکا تھا۔ نانا کینسر کے مریض بن چکے تھے لیکن یہ بات انہوں نے اپنی بیٹی...... یعنی میری ممی کو نہیں بتائی تھی۔ ڈاکٹروں نے ان کو بتا دیا تھا کہ وہ ایک سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال زندہ رہ سکیں گے۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد، اپنی زندگی میں ہی ممی کی شادی کر دیں۔ ممی نے ڈیڈی کو پسند کر لیا۔ میرے نانا نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک معمولی آدمی سے کریں۔ ان کے دماغ میں یہ خیال بھی تھا کہ ڈیڈی نے ممی کو صرف اس لیے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے کہ وہ ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی بیٹی تھیں، لیکن جب کئی ماہ تک ممی اپنی ضد پر قائم رہیں تو انہوں نے ڈیڈی سے ان کی شادی کر دی۔ پھر شادی کے صرف دو ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ہی ممی کو ان کے قانونی مشیر بیرسٹر بخاری سے معلوم ہوا کہ ان کے والد کینسر کے مریض تھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنا سارا بزنس، منقولہ اور غیر منقولہ جائداد وغیرہ ممی اور ڈیڈی کے نام کر دی تھی۔ وصیت میں یہ بھی تھا کہ ممی اگر ڈیڈی کی زندگی میں طبعی موت کا شکار ہو جائیں تو پھر سب کچھ ڈیڈی کا ہو جائے گا۔ شاید نانا کے دماغ میں یہ خیال ہو کہ ڈیڈی کسی طرح ممی کو ختم کر کے مختارِ کل بن سکتے ہیں لیکن ایسا ہوا نہیں۔ ممی کی موت طبعی ہی تھی۔ اس طرح سب کچھ ڈیڈی کا ہو گیا۔"

فریحہ بے تکان بولے چلی جا رہی تھی اور محمود اس کا منہ تکتے ہوئے خاموشی سے سن رہا تھا۔

فریحہ نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "وصیت میں یہ بھی تھا کہ اگر ڈیڈی نے ممی کی حیات میں دوسری شادی کی تو انہیں ساری دولت سے ممی کے حق میں دستبردار ہونا پڑے گا اور اگر ممی کی طبعی موت صاحب اولاد ہونے کے بعد ہوئی تو بھی ڈیڈی دوسری شادی نہیں کر سکیں گے۔ اگر کریں گے تو ان کے پاس جو کچھ ہے، وہ ایک ٹرسٹ کے نام ہو جائے گا اور ٹرسٹ ہی ممی کی اولاد کی پرورش اور تعلیم وغیرہ کا ذمے دار ہوگا۔ ہاں اگر اولاد بالغ ہوئی تو سب کچھ ٹرسٹ کے بجائے اسی کے نام ہوگا۔"

"اگر وہ دوسری شادی نہ کریں تو؟" محمود پوچھ بیٹھا۔

"تو وہی ہر چیز کے مالک رہیں گے۔ ان کے بعد ہی اولاد سب چیزوں کی حق دار ہوگی۔" فریحہ نے جواب دیا۔ "اولاد اگر صرف ایک لڑکی ہوئی تو اس کی شادی پر وہ اسے اپنی کل ملکیت کا نصف حصہ اس کی شادی پر اس کے جہیز میں دیں گے۔"

"کیا اس وصیت کی شرائط ملکی قوانین سے متصادم نہیں ہوں گی؟"

"مجھے علم نہیں اس کا۔ اگر کچھ پیچیدگیاں ہوں گی تو ظاہر ہے کہ بیرسٹر بخاری نے ان کا کوئی حل نکال لیا ہوگا۔ میں نے کبھی ضرورت نہیں محسوس کی کہ وہ وصیت دیکھوں یا بیرسٹر بخاری سے اس بارے میں کوئی بات کروں۔ وہ اب اپنے پیشے سے ریٹائر تو ہو چکے ہیں مگر زندہ ہیں۔ ان

کا بیٹا ایڈووکیٹ ہے۔ بیرسٹر صاحب نے اپنے اس قسم کے معاملات اسی کو سونپ دیے ہوں گے۔ میں اس سے بھی مل سکتی تھی لیکن میں نے کہا نا کہ مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔"

"اور رفیق سے تمہاری شادی تمہارے والد اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس سے خوف زدہ ہیں؟"

"ہاں۔" فریحہ نے جواب دیا۔ "میں نے بتایا تھا نا! مجھے شبہ ہے کہ رفیق ڈیڈی کو بلیک میل کر رہا ہے۔ ڈیڈی کی کوئی کمزوری اس کے ہاتھ آگئی ہے۔"

محمود کے دماغ میں کوندا سا لپکا، کہیں ایسا تو نہیں کہ فرمان علی نے چوری چھپے دوسری شادی کر لی ہو جس کا علم رفیق کو ہو گیا ہو؟ اس کے ساتھ ہی محمود کے ذہن میں یہ کوندا بھی لپکا کہ کہیں آپا بیگم ہی تو فرمان علی کی دوسری بیوی نہیں؟

"کیا ہوا محمود!" فریحہ تعجب سے بولی۔ "اچانک تمہارے چہرے سے ایسا لگنے لگا ہے کہ تم ہیجان میں مبتلا ہو گئے ہو؟"

"ہاں۔" محمود نے کہا۔ "مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ...... مگر...... ٹھہرو۔ پہلے میں تمہیں مدیحہ کے معاملے سے باخبر کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں خود وہ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔"

محمود نے کچھ بھی چھپائے بغیر سب کچھ فریحہ کو بتا دیا۔

فریحہ بولی۔ "آپا بیگم...... مدیحہ کی والدہ...... انہیں کوئی مال دار شخص کہاں سے مل گیا؟"

"وہ اس عمر میں بھی اچھے نقوش کی مالک اور پروقار نظر آنے والی خاتون ہیں۔ مجھے ابھی یہی خیال آیا ہے کہ شاید وہی تمہارے ڈیڈی کی دوسری بیوی ہوں۔"

سڑک پر اس وقت آگے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی ورنہ فریحہ کا اضطراری طور پر بریک لگانا کسی حادثے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی اور حیرت سے محمود کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ہاں فریحہ!" محمود نے متفکر لہجے میں کہا۔ "مدیحہ نے مجھے اگر فرمان صاحب کا صرف نام بتایا ہوتا تو یہ بات ممکن تھی کہ وہ کوئی اور فرمان صاحب ہوں لیکن اس نے فرمان انڈسٹریز کا نام بھی لیا تھا۔"

فریحہ کا چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ پھر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "تو یہی ہو سکتا ہے کہ رفیق کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا ہوگا۔ اسی بنیاد پر وہ ڈیڈی کو بلیک میل کر رہا ہوگا۔ ڈیڈی خوف زدہ ہوں گے کہ اگر رفیق نے ان کا یہ راز فاش کر دیا تو وہ سارے مال و دولت سے محروم ہو جائیں گے۔ ان کا جو کچھ بھی ہے، وہ سب مجھے مل جائے گا۔"

"شاید...... یا غالباً...... یہی بات ہو سکتی ہے۔"

اسی وقت ان دونوں نے دیکھا کہ بائیں جانب کی فٹ پاتھ پر سامنے سے ایک موٹر سائیکل چلی آرہی تھی۔ موٹر سائیکل چلانے والے کے پیچھے بھی کوئی بیٹھا تھا حالانکہ ان دنوں ڈبل سواری پر پابندی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی کہ غیر قانونی طور پر موٹر سائیکل فٹ پاتھ پر چڑھا دی جائے۔

ان دنوں شہر میں ٹارگٹ کلنگ بھی ہو رہی تھی اور اسی کی وجہ سے ڈبل سواری پر پابندی لگائی گئی تھی۔

یہ ساری باتیں چشم زدن میں محمود کے دماغ میں چکرا گئیں لیکن چشم زدن میں ہی موٹر سائیکل بالکل قریب آگئی تھی اور موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ریوالور بھی نظر آگیا تھا جس کی نال کار ہی کی طرف تھی۔

محمود بائیں جانب ہی بیٹھا تھا۔ اگر گولی چلائی جاتی تو وہی اس کا نشانہ بنتا۔ اس نے بے اختیار خود کو آگے کی طرف جھکا لیا لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بھی ریوالور سے چلی ہوئی گولیاں اس کے نہیں لگتیں۔ جھکنے کے ساتھ ہی وہ چیخا بھی تھا۔ "جھک جاؤ فریحہ!"

لیکن فریحہ نہ جانے کس طرح اچھل کر محمود کی کھڑکی کی طرف آگئی تھی۔ اس کا پیٹ محمود کی پشت پر آیا اور سینہ کھڑکی پر چھا گیا پھر وہ جھٹکے سے گری۔

موٹر سائیکل گزر چکی تھی۔

محمود نے بہ مشکل فریحہ کو سنبھالا اور پھر چیخ پڑا۔ "فریحہ!"

لیکن فریحہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ اس کے سر اور بائیں شانے سے خون ابل رہا تھا۔ اسے دونوں ہی گولیاں لگی تھیں۔ سر پر لگنے والی گولی کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

کئی گاڑیوں کے بریک لگنے کی آوازیں آئیں۔ دو گاڑیاں فریحہ کی کار کی دائیں جانب یا پیچھے رکی تھیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اتر کر کار کی طرف آنے لگے، لیکن بالکل قریب نہیں پہنچ سکے کیونکہ محمود برق سرعت سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر کار حرکت میں لے آیا تھا۔ فریحہ کا سر اس کی گود میں اور جسم بائیں جانب کی سیٹ پر تھا۔

"نہیں...... نہیں فریحہ...... نہیں...... تم ہرگز نہیں

مروگی...... ہرگز نہیں۔" وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑاتے ہوئے کار کی رفتار تیز کرتا چلا جارہا تھا حالانکہ اسے ڈرائیونگ کی پریکٹس نہیں تھی۔ اس نے اپنے ایک دوست کی کار پر ڈرائیونگ صرف سیکھی تھی۔

ایک بڑا اسپتال چند فرلانگ کے فاصلے ہی پر تھا۔

کار جب وہاں پہنچی تو کئی ٹی وی چینلز کی گاڑیاں وہاں موجود تھیں۔ غالباً کوئی بڑی شخصیت اسپتال آئی تھی۔ کیمرے متحرک تھے جن کا رخ بڑی تیزی سے کار ہی کی طرف ہوگیا کیونکہ محمود بے ہوش فریحہ کو کار سے اتار رہا تھا۔ کیمرا مین دیکھ چکے تھے کہ محمود کے کپڑے خون میں لت پت ہوچکے تھے اور بے ہوش فریحہ کے جسم سے خون ابل رہا تھا۔



کوئی بڑا مجرم تھا جو چند دن قبل پولیس مقابلے میں فائرنگ سے شدید زخمی ہوا تھا۔ چند دن میں اس کی حالت اب اتنی سنبھل چکی تھی کہ پولیس اسے اسپتال سے جیل منتقل کرنے والی تھی۔ اسی کی کوریج کے لیے ٹی وی کیمرے وہاں پہنچ چکے تھے مگر انہیں اپنے اصل مقصد کے حصول سے پہلے ہی ایک سنسنی خیز "تماشا" ہاتھ آگیا جسے براہ راست نشر کرنا ان کے چینل کے لیے یقیناً فائدہ مند ہوتا۔

وہی نشریات اتفاق سے مدیحہ نے دیکھ لیں.... وہ ٹی وی کے سامنے تو بیٹھی تھی لیکن گم صم......! دھیان کہیں اور ہی تھا لیکن جب اس نے ٹی وی اسکرین پر محمود کو دیکھا جس کے کپڑے خون آلود تھے اور وہ ایک اسٹریچر کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رپورٹر کی آواز سنائی دی تھی۔ "ٹارگٹ کلر کی موٹر سائیکل سلپ ہوگئی تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ لوگوں نے ان دونوں کو پکڑ لیا تھا۔"

مدیحہ زیادہ نہیں سن سکی اور زور زور سے چیخنے لگی۔ "آپا بیگم!...... آپا بیگم...... آپا بیگم!" اس کا انداز ہذیانی سا تھا۔

وہ اس وقت تک چیختی ہی رہی جب تک آپا بیگم کے ساتھ ہی اس کی بہن صفیہ بوکھلائی ہوئی وہاں نہیں پہنچیں۔

"کیا ہوا؟" صفیہ نے تیزی سے پوچھا۔

مدیحہ نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔

اس وقت اسکرین پر آپریشن تھیٹر نظر آرہا تھا اور رپورٹر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اب اسے آپریشن تھیٹر میں لے جایا جاچکا ہے اور......"

"محمود...... آپا بیگم۔" مدیحہ کی آواز لرز رہی تھی۔

"کیا ہوا اسے؟" آپا بیگم نے تیزی سے پوچھا۔

"خون میں ڈوبا ہوا تھا۔" مدیحہ جیسے رو پڑنے کے قریب تھی۔

اسی وقت لائٹ چلی گئی۔

"رحیم! جنریٹر چلاؤ۔" آپا بیگم نے چیخ کر کہا۔

"چلاتا ہوں بیگم صاحبہ!" کسی جانب سے آواز آئی۔ وہ کوئی ملازم ہی ہوگا۔

دوسری طرف اس سانحے کی اطلاع فرمان علی کو موبائل فون پر ملی۔ اطلاع دینے والا ان کا جنرل منیجر تھا۔ اس نے ٹی وی پر وہ منظر دیکھا تھا جب فریحہ کو زخمی حالت میں کار سے نکالا جارہا تھا۔

فرمان علی اس وقت فریحہ کی وجہ سے پریشان، برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں جنرل منیجر نے اسپتال کا نام بتایا۔ ٹی وی پر اسپتال کی عمارت نظر آئی تھی اور وہ شہر کا بہت مشہور اسپتال تھا۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر نہایت تیز رفتاری سے اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں ان کا سامنا محمود سے ہوا جس کے جسم پر خون آلود کپڑے تھے۔

جنرل منیجر نے فرمان علی کو یہ اطلاع بھی دی تھی کہ فریحہ کو کار سے اتارنے والا محمود تھا۔

"کہاں ہے فریحہ؟" فرمان علی نے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔ "ٹی وی پر آیا تھا کہ......"

"آپریشن تھیٹر میں۔" محمود نے ان کی بات کاٹتے ہوئے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ایک گولی ان کے شانے میں اور ایک گولی ان کے سر پر لگی ہے۔"

دو پولیس کانسٹیبل اور ایک اے ایس آئی بھی اس وقت محمود کے قریب موجود تھے۔

"آپ کون ہیں؟" اے ایس آئی نے فرمان علی سے پوچھا۔

فرمان علی سے پہلے محمود بول پڑا۔ "یہ فریحہ صاحبہ کے والد ہیں۔ فرمان علی صاحب!"

اے ایس آئی بولا۔ "ہم دعا ہی کرسکتے ہیں کہ آپ کی بیٹی ٹھیک ہوجائے۔ ایف آئی آر آپ پولیس اسٹیشن آکر کٹواسکتے ہیں۔ ویسے ان موٹر سائیکل سواروں کو......"

"میری بیٹی......" فرمان علی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"ابھی تو ان کا آپریشن ہورہا ہے۔ یہاں دو کانسٹیبل تعینات کردیے گئے ہیں۔"

فرمان علی آپریشن تھیٹر کی جانب دیکھنے لگا۔ محمود بہت مضطرب نظر آرہا تھا۔ پولیس والے چلے گئے۔

"تم فریحہ کے ساتھ ہی تھے؟" فرمان علی نے محمود سے پوچھا۔

"جی۔"

اسی وقت فرمان علی اسپتال کی اس راہ داری میں آتی ہوئی خواتین کو دیکھ کر چونکے۔ وہ مدیحہ، صفیہ اور آپا بیگم تھیں۔ ان کے پیچھے محمود نے اپنے والد، والدہ اور بھائی سعود کو بھی آتے دیکھا۔ مدیحہ کے چہرے پر تو ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا ہی حال محمود کی والدہ کا تھا۔ اس کے والد اور سعود اتنے پریشان نہیں تھے۔

فرمان علی تیزی سے آگے بڑھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تینوں ماں بیٹیاں قریب آجاتیں، فرمان علی ان کے قریب پہنچ کر ان سے باتیں کرنے لگے۔

محمود کے گھر والوں کی نظر آپا بیگم وغیرہ پر پڑی ہی نہیں۔ وہ تینوں تیزی سے محمود کے قریب آگئے۔

"یہ کیا ہوا ہے میرے بچے!" محمود کی والدہ اس سے لپٹ کر رونے لگیں۔ "یہ خون......"

"یہ بس میرے کپڑوں پر ہے اماں!" محمود نے جواب دیا۔ "میں زخمی نہیں ہوں۔ خون ایک لڑکی کا ہے جس پر ایک شخص نے گولیاں چلائی تھیں۔ میں ہی اس لڑکی کو اٹھا کر اسپتال لایا تھا۔"

"تم غائب کہاں ہوگئے تھے میرے لال!" ماں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "کوئی اس طرح ناراض ہوتا ہے اپنے گھر والوں سے؟"

محمود کے والد نظریں جھکائے کھڑے رہے۔ غالباً وہ اس وقت بھی محمود سے خوش نہیں تھے۔

"کون لڑکی تھی وہ؟" محمود کی والدہ نے پوچھا۔

"آپریشن ہورہا ہے اس کا۔ سر میں گولی لگی ہے۔ اس کے لیے تھی نہ کہیں اماں!...... وہ ہے...... ہے......" محمود جذباتی ہوگیا۔

اس وقت فرمان علی آپا بیگم، مدیحہ اور صفیہ بھی قریب آگئے تھے۔ انہوں نے بھی محمود کا یہ جملہ سنا۔ "گولیاں تو مجھ پر چلائی گئی تھیں اماں، مجھے ہی بچانے کی کوشش میں گولیاں اس کے لگی ہیں۔"

"تو پھر اسے بھی اللہ ضرور بچائے گا۔" محمود کی والدہ نے کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

آپا بیگم، مدیحہ اور صفیہ کے قیمتی کپڑوں نے تو محمود کے والد اور بھائی کو چونکایا ہی تھا لیکن یہ بات انہیں بڑی عجیب لگی ہوگی کہ فرمان علی کا ایک ہاتھ آپا بیگم کے شانے پر تھا۔

"آپا بیگم نے دوسری شادی کرلی ہے۔" محمود اس لیے بول پڑا کہ اس کے گھر والوں کے دماغ میں کوئی بے ہودہ خیال نہ آسکے۔

اس بات پر محمود کی والدہ بھی چونکی تھیں۔

"تمہارے لیے دوسرے کپڑے لے آؤں بازار سے۔" مدیحہ نے محمود کے قریب آکر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔ "گھر جا کر ہی بدلوں گا کپڑے لیکن جب تک فریحہ کا آپریشن نہ ہوجائے، اس کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہ مل جائے، میں یہاں سے نہیں ہٹنا چاہتا۔"

اس وقت محمود کے والد نے مدیحہ کو بڑی تیز نظروں سے گھورا تھا۔ انہیں یقیناً یہ گراں گزرا تھا کہ مدیحہ نے ان کے بیٹے سے بات کی تھی اور چہرے سے بے حد جذباتی بھی نظر آرہی تھی۔

فرمان علی کے اشارے پر آپا بیگم اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ محمود اور اس کے گھر والوں سے کچھ دور ہٹ گئیں۔ مدیحہ کے چہرے سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اسے محمود کے قریب سے ہٹتے ہوئے خود پر کافی جبر کرنا پڑا تھا۔

"دوسری شادی کرلی ہے اس نے!" محمود کے والد تلخ لہجے میں بولے۔

"جی ہاں۔" محمود نے کہا۔ "شادی کی ہے، کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ دو بیٹیوں کی بے سہارا اماں اگر شادی نہ کرے تو کیا وہ تینوں اجتماعی خودکشی کرلیں...... فرمان صاحب کوئی معمولی آدمی بھی نہیں ہیں۔ فرمان انڈسٹریز کے مالک ہیں۔"

"ہوا کریں! ہماری جوتی سے!"

اس وقت محمود کی ماں اپنے شوہر پر بگڑ گئیں۔ "اب اس وقت تو ایسی باتیں نہ کرو۔"

محمود کے والد زیرلب بڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔



آخر فریحہ کا آپریشن مکمل ہوا اور ڈاکٹر نے ان لوگوں

کو بتایا۔ ”آپریشن سو فیصد کامیاب رہا ہے۔ شکر ہے کہ سر میں لگنے والی گولی دماغ کو نہیں چھو سکی اور شانے کا آپریشن تو معمولی ہی تھا، بہرحال فی الحال اسے آئی سی یو میں رکھا جائے گا۔ ابھی اسے ہوش بھی نہیں آیا ہے، کچھ وقت لگے گا۔“

”اب گھر چلو۔“ محمود کی ماں نے اس سے کہا۔ ”بعد میں پھر آ جانا۔“

”کپڑے بدلنے مجھے اپنے گھر جانا ہوگا پہلے۔“ محمود نے کہا۔ اب فریحہ کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد اس کا چہرہ بھی خاصی حد تک پرسکون نظر آنے لگا تھا۔

”کہاں رہتے ہو تم!“ ماں بولیں۔ ”چلو، تمہارے ساتھ میں بھی چلوں گی۔ تمہیں اپنے ساتھ ہی گھر لے جاؤں گی۔ بہت تڑپایا ہے تم نے مجھے۔“

محمود نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔

”میری طرف کیا دیکھنے لگے۔“ باپ نے ترخ کر کہا۔ ”تم خود گھر چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے نہیں نکالا تھا تمہیں!“

٭٭٭

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب محمود نے اپنے گھر جا کر خون آلود کپڑوں سے نجات حاصل کی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ آئی تھیں اور اسے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی تھیں اس لیے محمود نے ٹیکسی روک لی تھی ورنہ اس علاقے میں اتنی رات گئے کوئی اور ٹیکسی نہیں ملتی...... باپ نے ان کے ساتھ آنا گوارا نہیں کیا تھا اور مسعود کو بھی روک لیا تھا۔ محمود صرف اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا۔

”چلیے اماں!“ اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد کہا۔

”اپنا سامان بھی تو سمیٹو۔ اب تم یہاں نہیں رہو گے۔“ ماں نے کہا۔

”سب کچھ سمیٹنے، باندھنے میں دیر لگ جائے گی اماں...... سامان کا معاملہ کل پر رکھیں۔ ابھی ٹیکسی والا اتنی دیر نہیں رکے گا، اور صرف ٹیکسی میں یہ سب سامان آ بھی نہیں سکتا۔“

بات معقول تھی۔ ماں بیٹے ٹیکسی میں وہاں سے روانہ ہوئے۔

محمود کا صبح سے اب تک کا وقت مسلسل حرکت میں گزرا تھا لیکن اسے تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ تمام حالات میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ تھکن کا احساس ہو ہی نہیں سکا۔

یہ خیال تو اسے پہلے ہی آ چکا تھا کہ وہ ایک دوراہے پر آن کھڑا ہوا تھا لیکن اب اسے یہ احساس بھی ہو رہا تھا کہ اس دوراہے پر اسے اپنی زندگی کے سب سے بڑے امتحان سے بھی گزرنا تھا۔ مدیحہ کی محبت اس کے دل سے ختم نہیں ہو سکتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ فریحہ کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا جو اسے بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیل گئی تھی۔ اگرچہ ڈاکٹروں نے اس کی زندگی بچالی تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ اگر محمود اسے نہ اپناتا تو وہ بعد میں یقیناً خودکشی کر لیتی۔

وہ انہی خیالات میں الجھا رہا۔ ماں نے راستے بھر اس سے نہ جانے کیا کیا محبت بھری باتیں کیں، اسے کچھ احساس نہ ہو سکا۔ وہ بس غیر شعوری طور پر ”ہوں...... ہاں“ کرتا رہا۔

گھر پہنچنے کے بعد بھی اس نے ٹیکسی روکے رکھی۔ اس نے ماں سے بھی کہہ دیا کہ وہ گھر میں تھوڑی دیر رک کر پھر اسپتال جائے گا۔ وہ فریحہ کے لیے بہت فکرمند تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر نے اطمینان دلایا تھا کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن محمود کا دل گھبرا رہا تھا۔

”اپنے باپ سے معافی مانگ لینا۔“ گھر میں داخل ہوتے وقت ماں نے اس سے کہا۔ ”وہ بڑے ہیں آخر، باپ ہیں تمہارے، اور پھر غلطی بھی تمہاری تھی۔ انہوں نے نہیں نکالا تھا تمہیں گھر سے!“

محمود نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ماں کی بات کسی حد تک ٹھیک بھی تھی۔ ٹھیک نہ ہوتی تو بھی محمود کو باپ سے معافی مانگنے میں کوئی عار نہیں محسوس ہوتا۔

جب اس نے معافی مانگی تو باپ بھی جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے محمود کو گلے سے لگا لیا۔ ماں اسی دوران میں چائے بنا کر لے آئیں۔ باتوں باتوں میں محمود کو معلوم ہوا کہ اس کے بھائی کی منگنی صفیہ سے توڑنے کے بعد اس کی شادی کسی اور لڑکی سے کر دی گئی تھی مگر ان میں نباہ نہیں ہو سکا تھا۔ چند مہینے بعد ہی طلاق ہو گئی تھی۔

”اب آرام کر لو بیٹا!“ ماں نے کہا۔ ”اسپتال جا کر کیا کرو گے......؟“

”میرا دماغ فریحہ کی طرف لگا ہوا ہے اماں جان!“

”معاملہ کیا ہے اس لڑکی کا؟“

”وہ مجھ سے شدید محبت کرتی ہے۔“ محمود نے جواب دیا اور فریحہ کے بارے میں کوئی بات نہیں چھپائی۔

سب کچھ جاننے کے بعد ماں نے حیرت سے کہا۔

”تم تو مجھ سے کہا کرتے تھے کہ تم مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”وہ چاہت ختم نہیں ہوئی، ہو بھی نہیں سکتی لیکن فریحہ؟...... اس کی اہمیت سے بھی میں انکار نہیں کر سکتا۔ اگر وہ نہ ہوتی تو شاید اس وقت میں آپ کے سامنے زندہ نہ ہوتا۔“

”تو پھر...... کیا کرو گے؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے خیر!...... ابھی تو مجھے اجازت دیں۔“

محمود گھر سے روانہ ہو گیا۔ اسپتال پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ اسپتال میں فرمان صاحب موجود تھے۔

”ابھی اسے ہوش نہیں آیا ہے۔“ فرمان صاحب نے بتایا۔ ”ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ وہ اسے اسپتال کے باہر لے گئے۔ لان پر ٹہلتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

”اور ظاہر ہے کہ آپا بیگم نے بتایا ہوگا!“

”ہاں، تم مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو لیکن تم میری بیٹی کے ساتھ کیوں تھے...... اس نے گھر چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ اس شخص سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی جہاں......“

”فریحہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”کیا وہ تم سے...... میرا مطلب ہے...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

”آپ جو کچھ کہنا چاہ رہے ہیں، میں سمجھ رہا ہوں اور وہی حقیقت بھی ہے۔“

فرمان صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ ”لیکن تم تو مدیحہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”پلیز فرمان صاحب!...... ابھی اس معاملے میں بات نہ کیجیے۔ اس مسئلے پر سوچ سوچ کر مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ میرا دماغ بکھر جائے گا۔“

”خیر!...... ایک بات تمہیں بتا دوں۔ میں فریحہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اب تک میں اس پر شادی کے سلسلے میں ایک دباؤ ڈالتا رہا ہوں لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میری بیٹی اب اپنی خواہش کے مطابق جیے گی، خواہ میں برباد ہی کیوں نہ ہو جاؤں۔“

فرمان صاحب تیزی سے مڑے اور اسپتال کی عمارت کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ محمود ان کی طرف دیکھتا اور سوچتا رہا۔ ”فریحہ ایسی لڑکی نہیں ہے فرمان صاحب جو اپنے نانا کی وصیت کے مطابق آپ سے آپ کا سب کچھ

سردار یات

ایک چرسی نے آنکھوں کا عطیہ دیا۔
ڈاکٹر۔ ”آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟“
چرسی۔ ”جس کو بھی یہ آنکھیں دیں اسے بتانا کہ یہ آنکھیں 2 کش (سوٹے) لگانے کے بعد کھلتی ہیں۔“

⊙⊙⊙

سردار کو گلی میں سے 1000 کا نوٹ ملا جس پہ لکھا تھا ”عید مبارک“ اس نے اپنی جیب سے 1000 کا دوسرا نوٹ نکالا اور وہیں رکھ دیا اور اس پہ لکھ دیا ”خیر مبارک“

⊙⊙⊙

ڈاکٹر۔ ”آپ کے ایکس رے میں آپ کی ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے۔“
سردار۔ ”چلو شکر ہے ایکس رے میں ٹوٹی ہوئی ہے اگر اصل میں ٹوٹ جاتی تو کافی خرچہ آتا۔“

⊙⊙⊙

سردار کی بس نہر میں گر گئی
پولیس۔ ”بس کیسے گری؟“
سردار۔ ”مجھے نہیں پتا؟“
پولیس۔ ”کیوں؟“
سردار۔ ”وہ آج کنڈیکٹر نہیں آیا تو میں پیچھے لوگوں سے کرایہ لینے میں لگا ہوا تھا۔“

⊙⊙⊙

ایک سردار دوسرے سردار سے۔ ”آج رات کو نیشنل جیوگرافک چینل ضرور دیکھنا، اس میں 21 انچ کا کن کھجورا دکھائیں گے۔“
دوسرا سردار۔ ”یار میں تو نہیں دیکھ سکتا۔“
پہلا سردار۔ ”کیوں؟“
دوسرا سردار۔ ”ہمارا ٹی وی 14 انچ کا ہے۔“
مرسلہ: رضوان تولی کریڈوی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

چھین لے۔“

محمود کی وہ رات اسپتال ہی میں گزر گئی۔ وہ بار بار ڈاکٹرز سے ملنے بھی جاتا رہا اور اسے تسلی دی جاتی رہی۔ فرمان صاحب بھی رات بھر اسپتال ہی میں رہے تھے۔ صبح انہیں ڈاکٹرز نے بتایا کہ فریحہ کو ہوش آ گیا تھا لیکن اس پر اتنی نقاہت طاری تھی کہ بار بار اس کی آنکھیں کھلتے کھلتے بند ہوجاتی تھیں۔ ایک ڈاکٹر نے یہ بھی کہا۔

”شام تک وہ خاصی بہتر ہوجائیں گی۔ ممکن ہے آپ لوگوں کو ان سے ملا دیا جائے۔“

اب محمود نے مکمل طور سے سکون کی سانس لی۔ اب سے پہلے اسے یقین نہیں تھا کہ فریحہ کی زندگی خطرے سے باہر آچکی ہے۔

”اب آپ گھر جا کے آرام کریں فرمان صاحب!“ محمود نے کہا۔ ”آپ کے چہرے سے معلوم ہورہا ہے کہ آپ بہت نڈھال ہوچکے ہیں۔ ویسے بھی شام سے پہلے تو فریحہ سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”ہاں۔“ فرمان صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اب تم بھی جا کے آرام کرلو بیٹے!“ ان کے لہجے میں ایسی شفقت تھی کہ محمود ان کا منہ تکتا رہ گیا۔

فرمان صاحب مڑ کر بیرونی راستے کی طرف بڑھتے چلے گئے تھے۔

☗☗☗

اتفاق تھا کہ شام کو فرمان صاحب اور محمود ساتھ ساتھ ہی اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے ان سے کہا۔ ”اب وہ بات کرنے کے قابل ہوچکی ہیں، لیکن بہتر ہوگا کہ ابھی آپ ان سے نہ ملیں۔ انہیں اور ایک آدھ دن آرام کرنے دیں، وہ بھی ملنے کے لیے بے چین ہیں لیکن مناسب ہوگا کہ آپ لوگ انہیں اور وہ آپ کو دیکھنے پر اکتفا کریں۔“

ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا گیا۔ آئی سی یو کی ایک دیوار پر لگے ہوئے شیشوں پر اندرونی جانب جو پردے لٹکے ہوئے تھے، انہیں ایک ایسی جگہ سے ہٹا دیا گیا کہ سامنے بستر پر لیٹی ہوئی فریحہ کو دیکھا جاسکے۔

اس طرح فریحہ نے بھی ان دونوں کو دیکھا۔ اس کا شانہ اور سر، پٹیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر بہت خفیف سا مسکرا سکی۔ اس کے ہونٹ بھی ہلے، جیسے وہ کچھ بولنا چاہتی ہو مگر اس کے قریب کھڑی ہوئی نرس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کچھ کہا بھی۔

”بس اب ہٹ جائیے فرمان صاحب!“ محمود بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ ہمیں دیکھ کر جذباتی ہوتی رہے گی۔“

فرمان صاحب کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ خود محمود بھی اپنے اوپر مشکل سے قابو پائے ہوئے تھا۔ وہ دونوں وہاں سے ہٹ گئے تو اندر سے کسی کے اشارے پر کسی نے پردے برابر کردیے......

”ابھی گھر سے چلا ہوں تو رفیق کا فون آیا تھا۔“ فرمان صاحب نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بہ قول اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ٹی وی پر کل کے اس حادثے کی خبر سنی تھی۔ تمہیں اور فریحہ کو بھی دکھایا گیا تھا۔ تم فریحہ کو زخمی حالت میں کار سے اتار رہے تھے۔ رفیق نے فون پر تمہارے خلاف بکواس شروع کی ہی تھی کہ میں نے اسے بری طرح لتاڑ دیا۔ کہہ دیا اس سے کہ وہ فریحہ کو کیا، ساری دنیا کو بتاتا پھرے کہ میں نے دوسری شادی کرلی ہے، اب مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میری بیٹی بس اپنی زندگی گزارے گی۔“

محمود ان باتوں سے دم بہ خود رہ گیا۔ ان باتوں کا صریح مطلب یہ تھا کہ اس کی اور فریحہ کی شادی پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

اسی دن محمود کو جواب دینے کے لیے آپا بیگم کے پاس نہ صرف خود جانا تھا بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ لے جانا تھا لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پارہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس نے اسپتال آنے سے پہلے اپنی ماں کو ساری بات بتا بھی دی تھی۔ ماں آپا بیگم کے پاس جانے کے لیے تیار بھی ہوگئی تھیں اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے شوہر کو بھی اس کے لیے تیار کرلیں گی۔ انہوں نے یہ تک کہا تھا کہ وہ اسپتال سے آکر ان دونوں کو آپا بیگم کے گھر لے چلے لیکن وہ گھر جانے کے بجائے اسپتال کے لان میں بینچ پر سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اسے یقین تھا کہ مدیحہ سے اس کی شادی کا نتیجہ فریحہ کی خودکشی کی صورت میں نکلے گا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“

محمود نے آواز سنی تو چونک کر دیکھا کہ مدیحہ اس کے برابر میں آبیٹھی تھی مگر اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔

”تم!“ محمود کے منہ سے نکلا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

”نہیں۔“ مدیحہ بولی۔ ”صفیہ اور آپا بیگم نہیں ہیں۔ میں آپا بیگم سے اجازت لے کر اکیلے ہی آئی ہوں۔ میں تم سے فریحہ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ محسوس

ہورہا ہے محمود، اور اپنے اس احساس کی تصدیق یا تردید چاہتی ہوں۔“

محمود چند لمحے خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا، پھر اس سے نظریں چرا کر بولا۔ ”میں تم سے محبت کرتا ہوں مدیحہ، صرف تم سے لیکن...... فریحہ مجھے چاہتی ہے اور اتنا چاہتی ہے کہ میری یہ زندگی...... میری یہ سانسیں، مجھ پر اس کا قرض ہیں۔“

”میں سب کچھ تفصیل سے جاننا چاہتی ہوں۔“

محمود پھر چند لمحے خاموش رہا اور سوچتا رہا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اس سے کچھ نہیں چھپانا چاہیے۔ اس نے بات وہاں سے شروع کی جب فریحہ نے پہلی مرتبہ اس کے پاس آکر ایک تصویر خریدی تھی۔

بلاکم وکاست سب کچھ سننے کے بعد مدیحہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ محمود اس کے اندرونی تاثرات کا ذرا بھی اندازہ نہیں لگا سکا۔ جب مدیحہ نے ان سب باتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تو محمود بولا۔ ”آج مجھے تمہارے گھر بھی آنا چاہیے، اپنے والدین کے ساتھ، آپا بیگم سے وعدہ کرکے آیا تھا میں۔“

”نہیں۔“ مدیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آج نہ آنا، میں اس بارے میں آپا بیگم سے بات کرکے آئی ہوں کہ ابھی وہ اس معاملے میں تم سے عجلت کی توقع نہ رکھیں۔ میرے ذہن میں جانے کیا کیا خیالات تھے۔ انتشار کا شکار تھی میں، لیکن اب سب کچھ جاننے کے بعد انتشار ختم ہوگیا ہے۔ یکسو ہوگئی ہوں میں...... اور میں نے ابھی فیصلہ کیا ہے کہ ہمیں اپنی شادی کے سلسلے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ اس طرح فریحہ کی موت کے ذمے دار ہم دونوں ہی بن جائیں گے۔ ہمیں فریحہ کی مکمل صحت یابی تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”تمہارے ذہن میں کیا ہے مدیحہ!“ محمود مضطرب ہوگیا۔

”فریحہ ٹھیک ہوجائے گی تو میں اس سے بات کروں گی۔“

”کیا بات کروگی؟“

”یہی کہ تمہاری محبت میں وہ زیادہ ایثار کرسکتی ہے یا میں کرسکتی ہوں۔“

”کیسا ایثار؟“ محمود کا اضطراب بڑھا۔

”یہ تم مناسب وقت آنے پر جان لوگے؟“

محمود کے خاصے اصرار کے باوجود مدیحہ نے مزید کوئی بات نہیں کی۔

”ویسے۔“ مدیحہ بولی۔ ”اگر تم اپنے والدین کو میرے گھر لاسکتے ہو تو کسی وقت بھی لے آنا لیکن میرے رشتے کے سلسلے میں ان سے کوئی بات نہ کی جائے، بس میل جول ہوجانا چاہیے۔“

محمود نے پھر یہ جاننے کی کوشش کی کہ مدیحہ کے دل میں کیا تھا لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

دو دن بعد انہیں اسپتال سے اجازت ملی کہ وہ فریحہ سے مل سکتے ہیں لیکن اس طرح کہ ایک وقت میں ایک ہی شخص ملنے جائے گا اور اس کے پاس دو منٹ سے زیادہ نہیں رکے گا۔

”سب سے پہلے وہ آپ سے ملنا چاہتی ہے۔“ ڈاکٹر نے محمود سے کہا، پھر فرمان صاحب سے بولا۔ ”ان کے بعد آپ سے!“ فرمان صاحب نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”ڈاکٹر!“ مدیحہ بول پڑی۔ ”میرا نام مدیحہ ہے۔ فریحہ کو بتا دیجیے گا کہ میں بھی اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“

اس وقت محمود ایک نرس کے ساتھ، فریحہ سے ملنے روانہ ہوچکا تھا۔ اسے فریحہ کے بستر کے قریب پہنچا کر نرس چلی گئی۔

”بہت اچھا لگ رہا ہے تمہیں قریب دیکھ کر!“ فریحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرزی اور آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

”میں بھی بہت خوش ہوں فریحہ کہ موت تمہارے قریب سے گزر گئی۔“ محمود نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”لیکن تمہیں ایسا کرنا نہیں چاہیے تھا۔“

”اگر میں اس سے زیادہ کچھ کرسکتی تو وہ بھی کرگزرتی۔“

”میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں فریحہ!“

فریحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش تم میری محبت کو سلام کرسکتے!“

محمود چپ رہ گیا۔ فریحہ کے ہونٹوں پر آئی ہوئی مسکراہٹ میں اداسی رچ گئی۔ وہ کچھ توقف سے بولی۔ ”میں نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ میرے لیے اسپتال میں تمہارے اور ڈیڈی کے علاوہ تو کوئی نہیں ہوگا لیکن یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ مدیحہ بھی ہے۔ کیا وہ جان چکی ہے کہ تم یہاں کیوں ہو؟“

”ہاں فریحہ! میں نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔“

”اداس ہوگئی ہوگی وہ!“

"نہیں۔" محمود نے جواب دیا۔ "اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ ابھی اس نے ڈاکٹر سے کہا تھا کہ وہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

"اوہ! وہ ملنا چاہتی ہے۔"

"ہاں۔"

"میں اس سے ضرور ملوں گی، بلکہ ڈیڈی سے بھی پہلے اس سے ملوں گی۔"

"ایسا نہ کرو۔ فرمان صاحب کو صدمہ ہوگا۔"

فریحہ نے کچھ سوچا، پھر آہستہ سے بولی۔ "اچھا!...... کیا ڈیڈی کو تمہارے بارے میں میرے جذبات کا علم ہوچکا ہے۔"

"سب کچھ بتادیا ہے میں نے انہیں بھی۔" محمود نے جواب دیا اور پھر یہ بھی بتادیا کہ فرمان صاحب نے اس سے کیا باتیں کی تھیں...... انہی باتوں میں رفیق کا ذکر بھی ہوگیا۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔" فریحہ کی مسکراہٹ کچھ گہری ہوگئی۔

اسی وقت نرس قریب آئی۔ ملاقات کا وقت ختم ہوچکا تھا۔

محمود کے بعد فرمان صاحب فریحہ سے ملنے گئے۔ دو منٹ بعد جب وہ باہر آئے تو اپنی آنکھیں پونچھ رہے تھے لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ گویا ان کے آنسو خوشی کے آنسو تھے۔

ان کے بعد مدیحہ گئی۔ محمود پر اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس کے دماغ میں اس سوال کی گونج پھیلتی رہی کہ ان دونوں میں کیا باتیں ہوسکتی ہیں۔ جب مدیحہ باہر آئی تو محمود نے تیزی سے اس کے قریب پہنچ کر سوال کرڈالا۔ "کیا باتیں ہوئیں؟"

"بہت اچھی باتیں۔" مدیحہ مسکرائی اور محمود نے محسوس کیا کہ وہ بے حد خوش تھی...... اس خوشی کا سبب کیا تھا؟ یہ محمود نہیں جان سکا۔

دو ماہ بعد فریحہ کو اسپتال سے ڈسچارج کردیا گیا۔ ڈسچارج ہوتے وقت اور گزرے ہوئے دو مہینوں میں بھی محمود نے اسے خوش ہی دیکھا تھا۔

فریحہ کے ڈسچارج ہونے سے ڈیڑھ ماہ قبل محمود اپنے والدین اور بھائی کو مدیحہ کے گھر لے جاچکا تھا۔ آپا بیگم نے بڑے ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیورانی کو گلے لگالیا تھا اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لائی تھیں۔ اس ملاقات میں محمود کے والدین کی طرف سے محمود اور مدیحہ کے رشتے کی کوئی بات نہیں کی گئی تھی۔

فریحہ کے ڈسچارج ہونے کے دو دن بعد محمود کی ماں نے مسکراتے ہوئے محمود سے کہا۔ "آج میں آپا بیگم سے بات کر آئی ہوں۔ انہیں مدیحہ سے تمہارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شادی کی تاریخ بھی طے کر آئی ہوں۔"

"یہ کیا کر بیٹھیں آپ؟" محمود کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔

"فریحہ کی وجہ سے گھبرا گئے؟ چلو فون کرلو اسے!...... اس کے اور مدیحہ کے درمیان کوئی معاہدہ ہوچکا ہے۔"

"کیسا معاہدہ؟"

"کہہ تو رہی ہوں۔ فون کرکے بات کرلو اس سے۔" ماں یہ کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

محمود نے فوراً موبائل پر فریحہ سے رابطہ کیا۔

"دو دن بعد یاد آئی میری؟" فریحہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

"میں پریشان تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تم سے کس طرح ملوں، کیا بات کروں۔ ابھی میری والدہ نے کچھ بتایا ہے تو میں تمہیں فون کررہا ہوں۔ کیا تمہارے اور مدیحہ کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہے؟"

"ہاں۔" فریحہ نے طویل سانس لی۔

"کیسا معاہدہ؟"

"یہ تمہیں مدیحہ سے شادی کے دن معلوم ہوگا۔"

"تمہیں علم ہے اس کا؟" محمود نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں، بس اب کوئی سوال مت کرنا۔"

"مدیحہ نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تم سے مل کر بات کرے گی کہ میری محبت میں تم زیادہ ایثار کرسکتی ہو یا وہ زیادہ ایثار کرسکتی ہے۔"

"ہم دونوں ہی نے ایثار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یعنی؟"

محمود کو جواب نہیں ملا۔ حقیقت کا علم اسے اسی شام ہوسکا جب اسے دلہا بنا کر میرج ہال لے جایا گیا جہاں دو دلہنیں گویا اس کی منتظر تھیں۔

وہ رات محمود کی زندگی کا ایک عجیب خواب تھی جب اس کے ایک بازو پر فریحہ اور دوسرے بازو پر مدیحہ کا سر تھا!...... وہ دونوں یہی معاہدہ کرچکی تھیں کہ ایثار سے کام لیتے ہوئے محمود کی محبت آپس میں تقسیم کرلیں گی۔